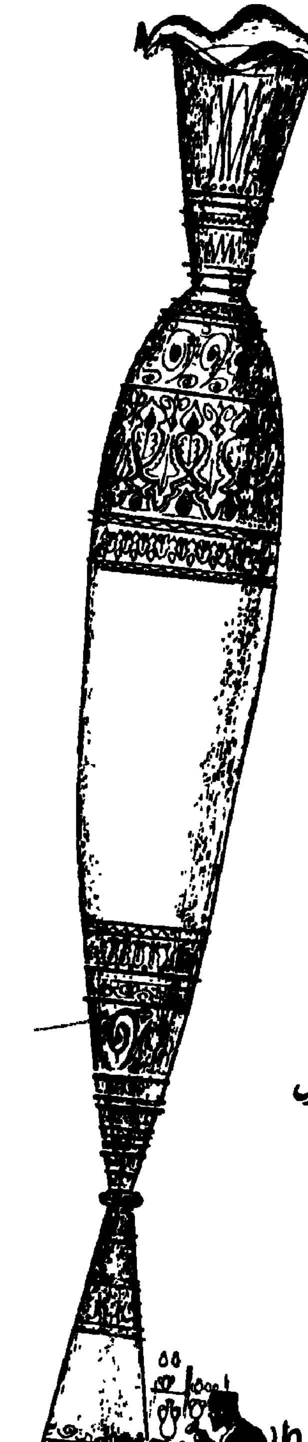

سیپ



فکرِ نو کا ترجمان

سہ ماہی

سیپ

(۴۱)

مدیر

نسیم درّانی

فی پرچہ تین روپے　　سالانہ بارہ روپے

حلقۂ فکرِ نو

محمد

بلاک ڈی ۔ شیر شاہ کالونی کراچی ۲۸

ترتیب

سرورق

جمیل نقش

افسانے

مضامین

نظمیں

کتب خانہ

طنز و مزاح

تراجم افسانے

غزلیں

دوہے گیت

طویل نظمیں

تبصرے

اداریہ

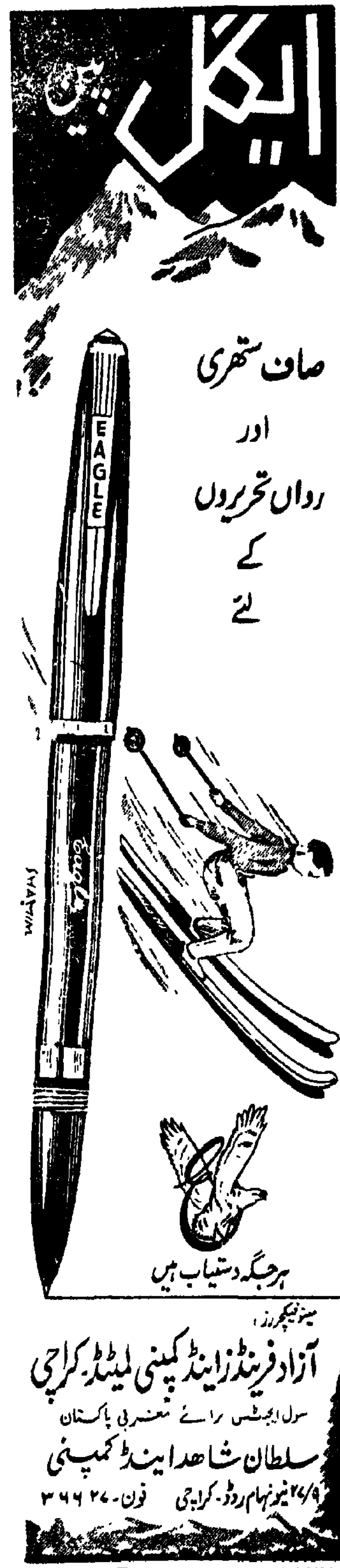
آج کے دور نے زندگی کے ہر شعبہ میں برق رفتاری کی برکتوں سے وقت کی اکائی کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ اسکو گرفت میں لانے کے لئے سچے ادیب جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو اس تیز رفتاری کا ساتھ دیتے ہوئے ہانپنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہر تخلیق پہ "شراب کہنہ" کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ کبھی شکایت ہوتی ہے کہ موضوع پرانا ہے۔ کبھی انداز تحریر پہ قدامت کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے اور یہ الزامات بالراست ادیب پر عائد ہوتے ہیں۔

برق رفتاری کی وہ برکتیں جن سے آج کا دور عہد انسانی کا ترقی یافتہ دور کہلانے کا مستحق ہوا ادیبوں کیلئے آزمائش لے کر آیا۔ اور نقادوں نے انکو ہدف ملامت بنا لیا مگر یہ بچارے نقاد بھی وجودیت، خارجیت، داخلیت اور مابعد الطبیعیت کے چکروں کے پھیر سے نہ نکل سکے شاید انکی نگاہیں بھی چاروں اور اندھی ہوئی روشنی کی بنا پر بند ہو گئی تھیں اور یوں تخلیق کا کام کرنیوالوں پر قدامت پسندی کا الزام لگانے والے نادانستہ طور پر خود کو بھی موردِ الزام ٹھہراتے رہے ہیں۔

کچھ لوگوں نے اس تیز رفتاری کی بنا پر ہانپنا کانپنا سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں حقیقت سے راہ فرار اختیار کی اور تجریدی تحریروں کی گپھاؤں میں دنیا سے لاتعلق کسی ایسے سنیاسی کی طرح جا بیٹھے جو جدیدیت اخبارات میں "بہتوں کا بھلا" کرنیکا اشتہار دیتا پھرتا ہے۔ جو اڑ ملے تھے اور راہ فرار اختیار کرنے کے اہل بھی نہ تھے وہ وقت کی تیز رفتار رتھ کے پیچھے اس رفتار کی ڈوریوں سے بندھے گھسٹتے رہے۔ جو زمانہ ہے انکو یہ سزا اس جرم پر ملی کہ وہ برق رفتاری کا ساتھ دینے کے لئے خود اپنی تحریروں سے کوئی وسیلہ تلاش نہ کر سکے۔ شاید ای ایم فاسٹر بہت ذہین تھا کہ جو پہلے ہی چھٹا ناول نہ لکھنے کی وجہ بتلاتے ہوئے یہ کہہ چکا تھا کہ میرے چاروں طرف کے حالات، روایات اور معاشرے اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ جب میں کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ دور اور اس دور کا رد عمل ختم ہو چکا ہے۔

یہ وہ دور نہیں جب ادیب کیلئے اپنے ماحول کا عکاس ہونا ضروری تھا۔ اسلئے کہ تیز رفتاری کی برکتوں سے ہر آن ماحول اور اسکے تمام تر ذہنی، فکری، معاشی، مادی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور روایتی اقدار و متعلقات اتنی عجلت سے تبدیل اور متغیر ہو رہے ہیں کہ کسی منظر کو اسکی پوری حقیقت کے ساتھ محفوظ کرنا ناممکن ہو چکا ہے اور نہ ہی یہ دور "نئی صبح" اور "سرخ سویرے" کی آمد کی پیش گوئیوں کا ہے۔ یہ دور ایسے کرداروں کی تخلیق کا دور ہے جو اتنے توانا ہوں کہ وقت کی رفتار کا ساتھ دے سکیں۔ یہ دور خالصتاً تخلیق اور تعمیر کا دور ہے۔ وہ تعمیر اور تخلیق جو وجود کے اندر کی جاتی ہے جس سے ایک تر و تازہ ذہن ابھرتا ہے، ایک مضبوط کردار ابھر کر آتا ہے اور ایک باریک بین اور دور رس نگہ پیدا ہوتی ہے۔ نکتہ سنجی اور نکتہ رسی نقادوں کیلئے چھوڑ دیجئے کہ وہ تخلیقی مصنفین کے پیرو کار ہیں۔ حاشیہ آرائیاں اور نکتے وہ بعد میں پیدا کرتے رہیں گے۔

آج کے ادیبوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ حال میں رہ کر حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں اور یہ کوشش اس سمت میں ہونی چاہئے کہ وہ ایسے کردار تخلیق کریں جن میں وقت کی پھیلی ہوئی اکائی کو سمیٹنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ماحول اور معاشرے کے جدید و کہن روایت و بغاوت کے چکر میں پھنس کر انکو "قدامت پسندی" اور "کہنہ موضوع" کے الزامات کے علاوہ کچھ نہیں مل سکتا، کہ نقاد ہمیشہ یونہی بغلیں بجانے کے عادی ہیں ان کے پاس کچھ کہنے کے لئے اس بنا پر نہیں رہا کہ تخلیقی ادیبوں کی طرف سے ان کو کوئی نئی بات نہیں مل رہی لہذا وہ بھی بے چارے پرانا پھٹا ڈھول پیٹنے پر مجبور ہیں۔


ایگل پین
EAGLE
صاف ستھری
اور
رواں تحریروں
کے
لئے
ہر جگہ دستیاب ہیں
مینوفیکچررز:
آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی لمیٹڈ. کراچی
سول ایجنٹس برائے مغربی پاکستان
سلطان شاھد اینڈ کمپنی
۲۶/۹ نیو نہام روڈ۔ کراچی فون۔ ۲۷۰۶۶۳
CRESCENT
EP-24/60


انسانیت کی خدمت ایٹکو
کے لئے موجبِ فخر ہے
بیماریاں انسان کی دشمن ہیں اور
ایٹکو بیماریوں کو شکست دینے کے درپے ہے
انسانیت کی بہترین خدمت
پُراثر ادویات کی تخلیق اور فراہمی ہے۔
ایٹکو اس میدان میں
علمِ جہاد بلند کئے ہوئے ہے۔
ایٹکو کی ادویات
اعلےٰ صحت
کی ضامن ہیں۔
ایٹکو
بیماریوں کے دشمن
صحت کے دوست
ATCO
ایٹکو لیبوریٹریز - کراچی

افسانے

سیف کلامی

راجندر سنگھ بیدی

بیوی یا بیماری

جب سے دنیا بنی ہے بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصے میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ ہے!

بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنا شوہر بتاتی ہیں ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ بیچ بیچ میں اس بات پہ بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی امید اور خوشی میں وہ ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سسرال کی چوکھٹ پہ پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نو آموز (شوہر) دولہا دلہن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے۔ اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے جو اس کے پہنچنے پہ خوب ہی ہنستی ہیں۔ چونکہ اسے کسی دوسرے کا منہ تو ملتا نہیں اس لئے اپنا سا منہ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو پکا کرنے کے لئے بیوی تندرستی کے دن یعنی کنوار پنے اور میکے کو یاد کر کے رونے لگتی ہے۔ جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑتا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ [illegible] آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آ جاتے ہیں جب وہ واقعی طبی نقطۂ نظر سے clinically بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے اپنے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے۔ اور اسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری ڈاکٹر کو نبض دکھلانے یا اسے دوائیں لا کر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہیں۔ بُرے بُرے منہ بناتی ہیں۔ میاں پیار کا دھوکہ دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں وہ قُر قُر کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے آدھی باہر گرتی ہے اور کچھ دیر کے بعد جنابہ بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے۔ "تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں"۔ اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا، یا ہر رنگ کا جھوٹ سمجھیں ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر میاں آس پاس نہ ہوں یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں کسی دوسرے کی نہ سنیں تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں۔ وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں یا اس بات کو جاننے کے لئے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہوتا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام ہے۔ اگر میاں کے چہرے پہ بیوی کی بیماری

کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں "مرد ہے!" اگر وہ کبھی ہمدردی کا اظہار کرنے کی غرض سے کروٹ کروٹ ساتھ مرے تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی۔ لیکن اندر سے کہیں گی "زنخا ہے موا!"

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے مان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو در اصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو الجھانے کے لئے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہوئی تو روز سویرے اٹھ کر شکایت کرے گی "آج میرا سر کچھ بھاری بھاری ہے"۔ پھر وہ ناک سکیڑے گی ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لے گی۔ اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں۔ آپ بڑی محبت جو الفاظ اردو میں لکھتے وقت مجت معلوم ہونے لگتا ہے کہ ساتھ کہیں گے "اوہو اسپرین ہے گھر میں!" چنانچہ اسپرین ہوگی۔ کوڈا پائرین بھی ہوگی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں، اور آپ سوچنے لگیں گے، ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصہ ہوتا ہے۔ جسے وہ کمر کہنے پر مصر ہوتی ہیں۔ یاد رہے یہ عورت کے بدن کا وہ حصہ ہے جس پہ ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور لعلی کے مضمون میں اسے نازک پتلا ہونا تو کیا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ سے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کمرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے۔ مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصور کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتی کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصہ سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے۔ مگر کمر سے نہیں کیونکہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہرحال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ کوئی انٹی فلاجسٹین اثر نہیں کرتا۔ اور نہ درد شقیقہ وعصابیہ Neuro lgia دور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں۔ "بنو! آج تم بڑی حسین لگ رہی ہو"۔ پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر کے درد کے لئے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی۔

میں جانتا ہوں کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پہ ہنسنا اچھی بات نہیں مگر اس کا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جوتشی ہے۔ رمال ہے۔ یا ولی اللہ اور جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی بیماری کے ایام میں میاں جنت اور دوزخ کے بیچ عالم برزخ میں کہیں لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہیں۔ دل کو کرید و تو ایک مستی ہے جو اس کان سے اس کان تک چلی جا رہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی توقع یہی وجہ ہے کہ مسکنت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے "ہائے میں مر گئی"۔ لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ اگر اس نے کہا "میں مر گیا" تو وہ سچ مچ مر جائے گا! جلدی یا آسانی سے مر جانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لئے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پرپیچ جنسی سلسلے کے بہ نسبت بہت سیدھا اور سادا ہے۔ غالباً اسی لئے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان مردوں کو تو ہوتا ہوا تا نہیں۔ حالانکہ اس بیچارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر۔ وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یوں ہی کباب ہوتی رہتی ہیں۔ اور کسی طرح سے اس کا بھلا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے وہ مرد کے رنڈوا ہو جانے کو اپنے بیوہ ہو جانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائشی اور غلطی بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے۔ اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے کہ بیویوں کی زبان اگر وہ بیحد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے

وہ تشبیہ اور استعارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا: "اب کتنے مہینے رہ گئے" تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیئے۔ گویا عورتوں کی زبان میں اس ابجد کا کوئی دخل نہیں جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خط تصویر Hieroglyphics سے ملتی جلتی ہے۔ جسے مصر کے لوگ تو کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں۔ اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے۔ جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں جس کی بیماری لو بھی ٹیڑھی اور ناقابل علاج ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامت اعمال عیادت کے لئے چلے بھی جائیں تو آپ صاحب خانہ سے پوچھتے ہیں "کیسی طبیعت ہے گھر میں؟"

"اب تو اچھی ہے بھگوان کی دیا ہے"

"کیا تکلیف تھی؟"

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کے چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے "زنانہ تکلیف"۔ مطلب اس کے بعد بکواس بند کیجئے۔ آپ کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ میری کی بیماری شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ لیکن آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر نکل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہئے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو بکواس بند کر کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہو گی جو مہینے میں چند دن بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں دنیا جہاں کی جملہ بیوی جات کا قصہ ہے۔ ان ایام میں وہ چھوئی موئی بنی ہوں گی جیسے انہیں ہیضہ ہو گیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آ رہی ہیں۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں۔ گری گرمے پڑے ہیں اور غصہ کہاں یہ اتار رہی ہیں جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے۔ اگر کسی مہینے یہ چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹے کھٹے ڈکار آئیں گے۔ سر چکرائے گا۔ ابکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف اس بیماری پہ غصہ آئے گا۔ دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہو گا اور تلافی مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں، قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا جنہیں لے کر بیوی خوش تو ہو گی مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لئے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پہ رکھ دے گی جو لکڑی کا نہیں نسیان کا بنا ہوتا ہے۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ گول گپے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹی کھائے گی۔ مرد کو جب کوئی بڑی بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے۔ لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی۔ اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیماری میں تو پھر میاں کے لئے تھوڑی سی تسکین کی گنجائش

ہے۔ لیکن دوسری میں یکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پہ الٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا۔ یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ مہنگائی کا زمانہ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ اور کچھا پنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتے ہوئے پاتا ہے۔ دے سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے۔ نہ اٹھ سکتا ہے اور نہ بیٹھ سکتا ہے اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں۔ میاں کے لئے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں؟ بیوی تو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے۔ "It's a boy" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے "Congratulation!" اس سے پہلے کہ میاں بیوی کی حالت ——— پوچھ سکے نرس جا چکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا سارا اندر اُبل کر باہر آجاتا ہے۔ مگر وہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے ہنسے یا روئے۔ وہ ہنس اس لئے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لئے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہوگیا۔ جو بڑا ہو کر ضرور محبت میں مبتلا ہوگا اور پھر شادی کر کے باقی زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ چنانچہ اس وقت کے میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پہ کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے۔ اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپھی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "اس دکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے"! لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے۔ اس لئے دواؤں کا بنڈل کھولنے کے بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے۔ جس میں گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساری نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبہ جس میں سے طلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبت اور تاسف کے آنسو لئے ایک الٹی رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پہ باندھ دیتا ہے۔ اور ساری اس کے قدم پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"بنو یہ رشوت ہے، مول نہیں"۔

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے جو ارگٹ اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے کو جسے بیوی کہتے ہیں محبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے جس میں ایک بیوی اپنے نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پہ حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات الٹ جاتی ہے۔ بجنسہ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلہ میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرشام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسداللہ خاں غالب کے ساتھ ہوا تھا ؎

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کرشن چندر

کنواری

میگی ایلیٹ اسی برس کی پُروقار خاتون ہیں۔ بڑے قاعدے اور قرینے سے سجتی ہیں۔ یعنی اپنی عمر، اپنا مرتبہ، اپنا ماحول دیکھ کر سجتی ہیں۔ لبوں پر ہلکی سی لپ اسٹک، بالوں میں دھیمی سی خوشبو، رخساروں پر رُوژ کا شائبہ سا۔ اتنا ہلکا کہ گالوں پر رنگ معلوم نہ ہو کسی اندرونی جذبے کی چمک معلوم ہو۔ ہر شام ان کی لاغر کلائی کا کنگن بدل جاتا ہے۔ میگی ایلیٹ کے پاس چاندی کے چھ سات کنگن ہیں جنھیں وہ بدل بدل کے پہنتی ہیں۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر میگی ایلیٹ آج بھی اچانک گھبرا جاتی ہیں۔ پھر رک کر کچھ عجیب طرح سے شرما کر مسکراتی ہیں۔ جیسے یہ مسکراہٹ دیکھنے والے سے اپنا بدن چرا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مس میگی ایلیٹ اپنی طویل عمر کے باوجود ابھی تک کنواری ہیں۔ ان کے تبسم میں ایک عجیب ان چھوئی سی کیفیت ہے...!

میگی ایلیٹ بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان میں ستائیس برس کی عمر میں آگئی تھیں۔ وہ کارنوال کی رہنے والی تھیں۔ بیرونٹ کریم بھائی انہیں لندن سے اپنی سکریٹری بنا کے لائے تھے۔ اور میگی ایلیٹ نے بھی بمبئی جانا اس لئے پسند کر لیا کہ وہ انگلینڈ میں اپنی محبت کی بازی ہار چکی تھیں وہ اس تکلیف دہ ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتی تھیں۔ جہاں انہیں اپنی محرومی کا احساس کسی پالتو کتے کی طرح ہر دم اپنے پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لندن چھوڑ کر بمبئی آگئیں۔ مگر سکریٹری کی حیثیت سے زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ کیونکہ ابھی محبت کی محرومی کا احساس نیا نیا تھا۔ اس لئے وہ بیرونٹ کریم بھائی سے ملاقات کرنے کے لئے آنے والے مردوں سے بلا ضرورت تلخی کا سلوک کر بیٹھتیں۔ بیرونٹ کریم بھائی نے انہیں سکریٹری کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مگر نرم دل کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے میگی ایلیٹ کو مسز کریم بھائی کی سکریٹری بنا دیا۔

کئی برس میگی ایلیٹ مسز کریم بھائی کی سکریٹری رہیں۔ جب مسز کریم بھائی کی وفات ہو گئی تو انہیں مسز کریم بھائی کے بچوں کی گورنس بنا دیا گیا۔ بیرونٹ کریم بھائی مر گئے۔ بچے جوان ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ وہ خاندان سے باہر چلی گئیں۔ مگر میگی ایلیٹ خاندان کے اندر ہی رہیں۔ اب وہ بیرونٹ کریم بھائی کے سب سے بڑے لڑکے ارشاد کریم بھائی کی بیوی سکینہ کو انگریزی پڑھانے اور مغربی آداب سکھانے پر مامور تھیں۔ اور ان دنوں بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان کے ساتھ بمبئی سے مسوری آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گرمیوں میں بیرونٹ مرحوم کا سارا خاندان مسوری آتا تھا۔ ٹفل ڈوک کے مشہور دیودار والی گھاٹی پر دو منزلہ کریم کاٹیج انگریزی گھاس والے لان اور انگریزی پھولوں والے قطعوں اور سلیٹی بجری والی روشوں اور سکینہ کریم بھائی کی اونچی سوسائٹی والی پارٹیوں کی وجہ سے بے حد مشہور تھا۔ جی۔ سی کلب کی رکنیت مشکل نہ تھی مگر سکینہ کریم بھائی کی دعوتوں میں بلایا جانا بہت مشکل تھا اور اس کے لئے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ میں چونکہ تاش کا عمدہ کھلاڑی ہوں اور سکینہ کو برج سے عشق ہے۔ اس لئے میں اپنی دو ہزار روپے ماہوار کی قلیل آمدنی کے

باوجود کریم کالیج کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ پھر اسی تاش کے چسکے کے طفیل سکینہ مجھے سہ پہر کی چائے پر بھی بلانے لگی۔ ہوتے ہوتے میرے دن کا بیشتر حصہ کریم کالیج میں گزرنے لگا اور سکینہ کی لڑکی عائشہ مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہے! کیا ہرج ہے۔ اول تو سکینہ خود اس قدر سمجھدار ہے کہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتی پھر مس ایلیٹ اس قدر محتاط رہتی ہیں۔ پھر میں خود اس قدر ڈرپوک ہوں کہ کبھی کسی لڑکی کو لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس لئے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا، انگلیوں کو چھو لینا، عائشہ کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ لے لینا، اس کی بڑھائی ہوئی پلیٹ سے مورین کریم کھا لینا اور کبھی کبھی تاش کے دوران میں ذرا مخصوص لہجے میں اسے پارٹنر کہہ دینا بھی میرے لئے کافی ہے۔ چلئے زندگی میں پارٹنر نہ بنے تاش کے کھیل میں بن گئے! اور یوں غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے تاش کا کھیل ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے کبھی جیت ہے۔ کبھی پتے اچھے آتے ہیں کبھی بھدے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے، صلح و صفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اپنے پتے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ ان پتوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ جہاں گلاب کھلے ہیں۔ مالی کی بیوی بیمار ہے۔ ایک لکڑہارا لکڑیاں لے کر بیچنے کے لئے بازار لے جا رہا ہے۔ ڈنڈی والوں کے کپڑے پھٹے ہیں۔ آسمان پر سپید بادل گھوم رہے ہیں۔ دیودار کی شاخ میں بلبل نے گھونسلہ بنایا ہے مالی کے بیٹے نے گدھا سنبھالا ہے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے۔ چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو فضا میں تیرنے لگتی ہے اور عائشہ تنک کر مجھ سے کہتی ہے۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ اپنا پتا جلدی سے چلو۔"

میں گھبرا کر اپنے پتے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیونکہ تاش کا کھیل کسی کے لئے زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب زندگی کی ساری تاش سمیٹ کر الگ رکھ دی جائے گی۔ تمہاری قسمت کا بادشاہ اور یکہ بیگم اور غلام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور تم اس تاش میں سے ایک پتہ نکال نہ سکو گے۔ کسی کو پارٹنر نہ کہہ سکو گے۔ تمہاری بازی ختم ہوئی اور بس اتنی ہی تمہاری بازی تھی... اس لئے اپنا پتا جلدی سے چلو۔

اصل میں جو میں اس طرح سے سوچتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک دفعہ محبت کی بازی ہار چکا ہوں۔ دوبارہ زندگی کو داؤ پر لگانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میری طرح سنا ہے مس ایلیٹ بھی اس میدان میں ہار چکی ہیں۔ مگر پھر بھی داؤ لگانے سے باز نہیں آتیں۔ یہ بھی ان کی زندگی سے گہری محبت کا ثبوت ہے۔ ہمیشہ مجھ سے چہل کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ جانتی ہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلا بتیس برس کے مرد اور اسّی برس کی عورت کے درمیان کیا ہو سکتا ہے۔ مگر چہل کرنے سے باز نہیں آتیں۔ "پاشا اپنے ماتھے کی لٹ سنبھال لو۔ ورنہ میرا دھیان اپنے پتوں میں نہیں رہ سکتا۔" "پاشا کہاں دیکھ رہے ہو! کیا دیودار کے اس پیڑ پر تاش کے پتے لٹکے ہیں؟" "اب کے میں ضرور جیتوں گی۔ کیوں کہ میرے پتوں میں ایک پاشا بھی ہے۔" وہ میرے نام کی خاطر بادشاہ کو پاشا کہنے لگی ہیں۔ مس ایلیٹ کے معصوم مذاق سے سبھی محظوظ ہوتے ہیں۔ عائشہ بھی ہنس دیتی ہے۔ پھر میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ وہ جھکی جھکی آنکھیں مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ میں دونوں ہاتھ بڑھا کر عائشہ کو اپنے بازوؤں میں لے سکتا ہوں۔ مگر نہیں لے سکتا۔ کیونکہ تاش کھیلنے والے دوسرے بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک طرف عائشہ کی ماں سکینہ بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف کریم بھائی اسٹیٹ کے منیجر عاقل فاضل بھائی بیٹھتے ہیں، جنہوں نے عائشہ کے لئے نیروبی کے ایک کروڑپتی تاجر کا بیٹا ڈھونڈ رکھا ہے۔ زندگی کی تاش کس قدر آسان ہوتی۔ اگر دوسرے کھیلنے والے نہ ہوتے۔ اب تم ان سہمی سہمی نگاہوں کے چھوٹے چھوٹے پتے میری طرف کیوں پھینکتی ہو عائشہ۔ ان دُکی تکیوں سے کیا ہوگا۔ جبکہ یکہ اور بادشاہ۔ بیگم اور غلام اور نہلے پر دہلا دوسروں کے ہاتھ میں ہیں؟ نو بڈ پارٹنر!

اپنا ہنسی مذاق مس ایلیٹ سے تو چلتا ہی تھا۔ مگر اس کی کیفیت ایک معصوم چہل سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ ماسٹر متین احمد کے سلسلے میں مس ایلیٹ زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھیں اور دن بدن گہری دلچسپی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ماسٹر متین احمد یہاں مسوری میں آکر تین ماہ کے لئے ملازم رکھے گئے تھے۔ بچوں کو پڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے۔ اسٹیٹ منیجر فاضل بھائی نے بہت سوچ سمجھ کے متین احمد صاحب کو ماسٹر مقرر کیا تھا کیوں کہ ماسٹر متین احمد خاصے بوڑھے تھے۔ ۰۰ برس کے قریب عمر ہوگی۔ دو بیویاں یکے بعد دیگرے وفات پا چکی تھیں۔ پوتوں نواسوں والے تھے

چھڑی لئے کمر اور سر جھکا کر اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو اور بھی گرا کر چلتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت میں بڑھاپے کا پیلا پن اور بڑھاپے کی جھریاں آگئی تھیں۔ مگر اس عمر میں بھی حوصلہ جوان رکھتے تھے۔ اور دلگیر تخلص کرتے تھے۔ اپنا کلام جو آج تک کہیں نہ چھپا تھا مس ایلیٹ کو ہر روز سناتے تھے۔ مس ایلیٹ ہر چند کہ اردو شاعری میں کوئی استعداد نہ رکھتی تھیں۔ اب مصرع پر مصرع اٹھاتی تھیں اور اس کوشش میں رہتی تھیں کہ کسی طرح گرہ بھی لگ جائے۔ حالانکہ اس نیک دل خاتون کی شاعرانہ صلاحیتوں کی معراج ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مگر اب وہ دونوں ماسٹر متین احمد اور مس میگی ایلیٹ کبھی کبھی برآمدے کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے، کبھی کسی لان پر ٹہلتے ہوئے، ڈفل ڈوک کے دیوداروں میں گھومتے ہوئے شاعری پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور بحث کے دوران میں میگی ماسٹر جی کا مفلر ٹھیک کرتی جاتی تھیں۔ ورنہ سردی لگ جانے کا اندیشہ ہے اور سردی میں شعر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ کبھی ان کے سر کی ٹوپی کا رخ بدل دیتی تھیں کہ یوں زیادہ اچھا لگتا ہے۔" کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کے ڈوک کے نالے کے پتھروں پر قدم جما کے چلتی ہوئی نالہ پار کر جاتیں۔ ہر روز شام کو نالہ پار کرنا ضروری تھا۔ مرد کے بازو کا سہارا کتنا اچھا لگتا ہے۔ مرد کی انگلیوں کا مضبوط لمس جیسے کسی کمزور بیل کو پیڑ مل جائے۔ صحت میں آج بھی میگی ماسٹر جی سے بہتر نظر آتی تھیں۔ مگر نالہ دیکھتے ہی چھ سال کی بچی کی طرح ڈرنے اور رکنے لگتی تھیں۔ اور اپنے سارے جسم کا بوجھ غریب ماسٹر جی پر ڈال دیتی تھیں۔ ماسٹر جی بھی ہانپتے کانپتے ہونٹ چباتے دمے کے مریض کی طرح سانس لیتے ہر روز بڑی بہادری سے مس میگی ایلیٹ کو نالہ پار کرا دیتے تھے۔ پھر دم اس قدر پھول جاتا کہ نالے کے اس پار پتھر پر بیٹھ کر دیر تک منہ سے کچھ نہ بول سکتے وادی کا منظر دیکھتے رہتے۔ اپنے سانس کی دھونکنی ٹھیک کرنے میں انہیں کئی منٹ لگ جاتے۔ مگر وہ خاموشی کے اس لمبے وقفے کو کسی طرح اپنی جسمانی کمزوری پر محمول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب دم میں دم آتا تو کہتے۔ "یہاں سے وادی کا منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ یہاں آتے ہی میں دم بخود ہو جاتا ہوں۔ منہ سے کچھ بول نہیں سکتا۔"

"یہی حالت میری بھی ہوتی ہے۔" میگی بھی اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہتی۔ "یہ وادی بالکل تمہاری شاعری کی طرح خوب صورت ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہتے۔ کیونکہ واپسی میں نالے کو پھر پار کرنا ہوتا۔ ماسٹر متین احمد بڑی ناامیدی سے نالے کو دیکھتے اور ان کی ہمت ڈوب ڈوب جاتی اور وہ دل ہی دل میں سوچتے۔ کل سے میں میگی کو ادھر سیر کرانے کے لئے نہیں لاؤں گا۔ مگر میگی کی یہی تو ایک کمزوری تھی۔ نالے کے اس چند گز کے پاٹ میں وہ سب کچھ پا لیتی تھی۔ وہ سب کچھ جو اسے اس زندگی میں کبھی نہ ملا۔ اس مختصر سے فاصلے میں وہ کسی کی بیوی ہو جاتی، کسی کا سہارا لے لیتی کسی کے کندھے سے سر لگا دیتی۔ کسی کی قربت کا احساس کر لیتی۔ بالکل اس الھڑ کنواری کی طرح ہو جاتی جو کسی خطرے کے سمے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کسی مرد سے لپٹ جاتی ہے۔ نالے کے پار جا کر وہ پھر ایک انگریز عورت ہو جاتی تھی۔ اپنے آپ میں مکمل، مضبوط اور خود مختار۔ مگر نالہ پار کرتے ہوئے کمزوری کے یہ چند لمحے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ اور وہ ہر روز بڑی بے صبری سے ان چند لمحوں کا انتظار کرتی تھی۔

پھر ایک دن اس کی زندگی میں پام آگئی۔ پامیلا تھوراٹ اس کی بمبئی کی سہیلی تھی۔ پامیلا نے بمبئی کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔ چند سال بمبئی میں رہ کر مسٹر تھوراٹ اور ان کی بیوی منگلور چلے گئے تھے۔ چند سال خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر خط و کتابت بند ہو گئی۔ اب بیس بائیس برس کے طویل وقفے کے بعد جب پامیلا تھوراٹ اچانک مسوری میں اسے نظر آگئی تو دونوں سہیلیوں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ نہ صرف یہ کہ دونوں نے کئی منٹ تک مصافحہ کیا بلکہ آواز میں لرزش بھی تھی۔ اور آنکھ میں آنسوؤں کا شبہ تک پیدا ہو گیا تھا۔

پام اس عرصے میں دو شوہر بھگت چکی تھی۔ وہ بے چارے دونوں مر چکے تھے۔ مگر پام ساٹھ برس کی ہو کر بھی اپنی شوخی و طراری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اپنی فطرت میں پام میگی سے بالکل الگ تھی۔ میگی دبلی تھی تو پام موٹی۔ میگی سنجیدہ تھی تو پام بات بے بات قہقہہ لگانے والی۔ میگی ہلکا سا میک اپ کرتی تھی تو پام بالکل گہرا۔ بالکل جوان عورتوں کا سا میک اپ کرتی تھی۔ اس کی آواز ابھی تک بہت اچھی تھی اور اسے بہت سے فحش لطیفے یاد تھے

اس کی کوئی اولاد نہ تھی پہلے شوہر سے ایک لڑکی ہوئی تھی۔ وہ دو سال کی عمر میں چل بسی۔ دوسرا شوہر ایک اینگلو انڈین تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں دھت رہتا تھا اور کبھی کبھی اسے پیٹتا بھی تھا۔ کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا۔ کیوں کہ اس کے بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس میں وہ عورت کو بڑی شدت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دورے میں بڑی احمقانہ باتیں کرتا ہے روتا ہے ہاتھ جوڑتا ہے۔ پاؤں پڑتا ہے کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سلوا دیتا ہے۔ پام کو جب بھی کسی نئے فراک کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے مگر آہ ..... اب تو بڑھاپا آگیا۔ پام اک آہ بھر کے چپ ہوگئی۔

"تم تو بالکل بچہ ہو۔ بالکل بچہ!" میگی نے بڑی عمر کی بہن کا رشتہ لیا۔ اور پام کی الجھی لٹ ٹھیک کرنے لگی۔ "یہ بال کیسے بنا رکھے ہیں..."۔ میگی کے لہجے میں مامتا کی لرزش سی آگئی۔ جسے سن کر پام کچھ اور پھیل گئی۔ اٹھلا کر بولی:۔

"اب ہم سے نہیں ہوتا میگی۔"

"تم کہاں ٹھہری ہو؟" میگی نے پام سے پوچھا۔

"پہلے تو کلارکس میں ٹھہری تھی۔ ایک گجراتی فیملی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی۔ ان لوگوں کو جلدی واپس جانا پڑ گیا۔ خاندان میں کوئی موت ہوگئی تھی۔ وہ لوگ سب چلے گئے ہیں۔ مگر ایسی گرمی میں واپس احمد آباد نہیں جا سکتی۔ اس لئے میں ان کی ملازمت سے الگ ہوگئی ہوں۔ اور اب مسز ٹریورز کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ بڑی کمینی عورت ہے۔ ابھی تک دو روز کی ابلی ہوئی پتیوں کی چائے پیتی ہے۔ جیسے یہ مسوری نہ ہو۔ انگلینڈ ہو اور جنگ ابھی تک جاری ہو۔"

میگی پامیلا کو مسز ٹریورز کے بورڈنگ ہاؤس سے کریم کاٹیج میں اٹھا لائی اور اس سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی جیسے پام اس کی برابر کی سہیلی نہ ہو۔ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ میگی پام کے بال بناتی پام کے کپڑے نکالتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ اس کو مشورہ دیتی۔ وہ کون سی چیز کھائے، کون سی چیز نہ کھائے۔ کبھی کبھی اسے ایک سخت گیر ماں کی طرح ڈانٹ بھی دیتی اور پام میگی کی محبت پا کر بے طرح اٹھلانے لگی تھی اور ساٹھ برس کی ہو کر تیس برس کی خاتون کی سی ادائیں دکھانے لگی۔ اور جب دیکھتی کہ میگی کی محبت بہت زور مار رہی ہے تو تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگتی!

اب میگی، پام اور ماسٹر جی (ماسٹر متین احمد) کا تکڑم بن گیا تھا۔ تینوں برآمدے کے دوسرے کونے میں الگ جا کر بیٹھتے تھے۔ تاش کھیلتے تھے۔ اپنی بیماریوں اور ان کی دواؤں پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے تھے اور ہر وقت تین شریر بچوں کی طرح مسرور اور مگن نظر آتے تھے۔ آپس میں ان کی کیا باتیں ہوتی تھیں یہ تو ہم نہیں جان سکے البتہ اتنا ضرور احساس ہونے لگا کہ ان تینوں میں کا تھ جھین رہا ہے۔ ماسٹر جی جو پہلے صرف میگی پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ اب میگی کے اصرار کرنے پر پام پر بھی کسی قدر اپنی توجہ دینے لگے۔ آہستہ آہستہ یوں ہو گیا کہ تعلقات برابر کے ہو گئے۔ ماسٹر جی اپنی آدھی توجہ میگی اور آدھی توجہ پام کو دیتے تھے۔ اور کسی طرف ڈنڈی نہ مارتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر ہوتے ہوتے غیر شعوری طور پر پام کی طرف پلڑا جھکتا چلا گیا۔ کیوں کہ پام ساٹھ برس کی تھی اور میگی اسی برس کی۔ پام کے چہرے پر جھریاں بہت کم تھیں۔ اور پام کسی قدر زندہ دل تھی اور کیسے عمدہ لطیفے سناتی تھی۔ میگی کی روح بلاشبہ پام سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں سچائی اور شدت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر جسم کو دیکھو تو ہڈیاں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور پام تو بالکل گرم پانی کی بھری ہوئی ربڑ کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور شریر پام پلڑا اپنی طرف جھکتے دیکھ کر غریب ماسٹر کو اور بھی اکسانے لگی اور اکسانے لگی۔ اور اپنی سہیلی کی ساری خاطر و مدارات بھول کر اسے جلانے پر تل گئی۔

بے حیا بلی! میگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ پہلے تو میگی نے طرح دی اور بار بار وہ طرح دیتی رہی کبھی نگاہیں پھیر لیتی۔ جیسے اس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ پھر یوں غائب ہو جاتی جیسے اس نے کچھ سنا نہ ہو۔ پھر جب دل خون ہونے لگتا اس وقت بھی یوں ہنس دیتی جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ مگر پلڑا جھکتا ہی گیا۔ اور ہم دیکھتے رہے۔ اور ان تینوں سے دور ہی دور اپنے برج کی میز سے اس دلچسپ ڈرامے کو دیکھتے رہے جو اب اپنی معراج کو پہنچ رہا تھا۔

ایک مہکتی ہوئی نارنجی شام میں جب ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی اور ہم لوگ جی۔سی کلب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔عائشہ اور میں کالے سنگ مرمر کے شیر دل والے چوترے پر کھڑے سکینہ اور فاضل بھائی کا انتظار کر رہے تھے ، جو اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے تھے۔ گئی تو عائشہ بھی تھی۔مگر کمرے سے جلدی نکل آئی تھی۔ کیونکہ اس طرح سے ہم دونوں کو اکیلے میں ساتھ رہنے کے لئے چند منٹ مل جاتے تھے۔اس وقت عائشہ ایک کالے پتھر کی ٹیڑھی بیٹھی ہوئی تنک مزاجی سے بار بار اپنے دائیں پاؤں کا سینڈل ہلا رہی تھی اور قریب کے مرمریں ستون پر چڑھی ہوئی زرد گلاب والی بیل سے پھولوں کی کچی کلیاں توڑ توڑ کر میرے پاؤں پر پھینک رہی تھی۔ ایک کلی میری پتلون کی موہری میں جا اٹکی اور میں اسے نکالنے کے لئے جو جھکا تو مجھے عائشہ کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ اور اس کے سینے کے تھرتھراتے ہوئے ابھار اپنے بہت قریب نظر آئے۔کیونکہ عائشہ بہت قریب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔میں نے جھکے جھکے اس کی طرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس کے سانس کی آنچ اور اس کے حُسن کی پگھلتی ہوئی لَو اپنے رخساروں پر محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور بالکل منتظر تھے۔ ایسے میں میں نے سکینہ کو برآمدے کے اندر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔میں نے جلدی سے پتلون کی موہری سے زرد گلاب کی کچی کلی کو نکالا اور سیدھا ہو کر اسے زور سے دور پھینک دیا۔

" بزدل ! " عائشہ ناگن کی طرح پھنکاری ۔ پھر سکینہ کو آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

میگی اور پام اور ماسٹر جی بھی تینوں باہر جا رہے تھے مگر کلب کو نہیں۔ نالے پر سیر کرنے کے لئے کچھ دنوں سے یہ اکٹھے سیر کرنے کے لئے نالے کو جاتے تھے۔ آج سردی بڑھتی ہوئی دیکھ کر میگی اپنے دبلے چھریرے بدن میں جھرجھری محسوس کر کے کانپ اٹھی۔ اس نے پام اور ماسٹر جی دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

" ٹھہرو ! میں اندر سے اپنا اونی کوٹ پہن کے آتی ہوں ۔ ۔ ۔ "

" اونی کوٹ موسم گرما کی رت میں ؟ " پام نے طنز آمیز انداز میں سوال کیا۔

مگر میگی اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے کر اندر چلی گئی۔

چند لمحوں تک تو پام چپ رہی اور اپنے دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر ڈولتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی اور اس نے سر کے اشارے سے ماسٹر متین احمد کو اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا۔

ماسٹر متین احمد نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ بہت بے چین نظر آئے۔ ادھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پام کے پیچھے ہو لئے۔ پام نالے کی سمت جا رہی تھی۔ماسٹر متین احمد کو ساتھ لے کر۔

چند لمحوں میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر جی پام کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے پام نے ان کے بازو کا سہارا لے لیا تھا۔ وہ بازو جواب تک صرف میگی کے لئے وقف تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہی میگی کچھ گنگناتی ہوئی اپنا ہلکا گرے اونی کوٹ پہن کر باہر نکل آئی۔ جب اس نے دیکھا کہ ماسٹر جی اور پام نہیں ہیں تو وہ ایکبارگی ٹھٹھک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اک دم اس کے کوٹ کی طرح گرے ہو گیا۔ زیر لب ہونٹوں کی گنگناہٹ اک دم رک گئی۔ اس نے ادھر دیکھا ، اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سکینہ سے پوچھا۔

" یہ لوگ کہاں ہیں ؟ "

" چلے گئے ! " سکینہ نے بے حس لہجے میں کہا۔

میگی کی ڈولتی ہوئی پتلیاں بڑی تیزی سے ادھر اُدھر گھومیں۔ جیسے کوئی پرندہ اچانک زخمی ہو کر تڑپنے لگے۔ سکینہ ان آنکھوں کی اذیت کی تاب نہ لا سکی۔ بڑے غصے سے بولی۔

" میگی تمہیں ہو کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بچی تو نہیں ہو۔ پام تم سے عمر میں کتنی کم ہے ؟ "

میگی نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر سیدھا سکینہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر بڑی نخوت سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"عمر کم ہے تو کیا ہوا... میری طرح کنواری تو نہیں ہے!!"

پھر مس میگی ایلیٹ عمر اسّی سال، ایک عورت، اپنی ایڑی پر گھوم گئی اور ایک ناقابل تسخیر غرور سے سر اٹھائے ہوئے برآمدے میں چلی گئیں ——— واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دروازہ بند ہوگیا۔ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسیں یا روئیں؟

سکینہ اک دم بہت سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں ہم سے چرالی تھیں اور اب تیز تیز قدموں سے آگے چل رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے فاضل بھائی جلدی جلدی سے قدم بڑھانے لگے۔

عائشہ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

میں نے گلاب کی بیل سے ایک زرد کلی کو توڑ لیا۔ اور اسے سونگھتے ہوئے بولا۔

"نو بڈ پارٹنر!"

عصمت چغتائی

چٹان

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے گائے۔ مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منہ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی۔ جسم بھر گیا۔ بال گھیر دار ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر بڑا زور دار شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی۔ کانوینٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لئے اس کے ماں باپ نے ڈر کے اسے جلدی سے کانوینٹ سے اٹھا لیا۔ اور جھٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی تھی۔ مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اس پر کڑی نگرانی تھی۔ اور بھیا کی بھی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اسے پکی گرہستن نہ بنا دیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لہٰذا وہ اسے گرہستن بنانے پر جُٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھس گھسا کے واقعی سب نے گرہستن بنا دیا۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور ٹھس ہو گئی۔ اماں اسے خوب مرغی کا شوربا، گوند سٹورے کھلاتیں، بھیا ٹانک پلاتے اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی۔ آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے۔ بھیا کو بس گلابی رنگ پسند تھا۔ یا پھر سرخ ــــ بھابی زیادہ تر گلابی یا سرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ گلابی ساڑی پر سرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی۔

شادی کے وقت اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر دلہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پر کٹی میم ہے۔ اب اس کے بال تو بڑھ گئے تھے۔ لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بال کس کر میلی دھجی ہی باندھ لیا کرتی تھی۔ اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی۔ اور میکے سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر اس کی تعریفوں کے گن گاتے تھے۔ بھابی تھی بڑی پیاری سی۔ سجل نقشہ۔ مکھن جیسی رنگت۔ سڈول ہاتھ پاؤں۔ مگر اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی۔

بھیا اس سے نو برس بڑے تھے، مگر اس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے، روز ورزش کرتے۔

بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے، بڑے حساب سے سگریٹ پیتے۔ یونہی کبھی دھسکی بیر چکھ لیتے۔ اُن کے چہرے پر اب بھی لڑکپن تھا۔ تھے بھی تیس اکتیس برس کے۔ مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے۔

اف بھیا کو جین اور اسکرٹ سے کیسی نفرت تھی۔ انہیں بے بنے فیشن کی بے آستینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیص سے بھی بڑی گھن آتی تھی۔ تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ۔ خیر، بھابی بیچاری تو شلوار قمیص کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ تو بس زیادہ تر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی۔ کوئی جان پہچان آجاتا تو بھی بے تکلفی سے دہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی۔ کوئی پر تکلف مہمان آتا تو عموماً وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑھی لپیٹ لیتی۔ وہ گھر ہستن تھی، ماں تھی، بہو تھی اور جیتی تھی، اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور شاید بھابی یونہی گود ڈھبی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی۔ بہوئیں بیاہ کر لاتی جو صبح اٹھ کر اسے جھک کر سلام کرتیں گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا، ہم سب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ اکیرہ دیئے بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔ انہوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا اور وہ جھٹ سے اٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئی۔ ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ہائے بھابی تھی کہ فرشتہ میں تو کالج سے آکر باورچی خانہ میں جانے پر کسی طرح مجبور ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور نہ ہی میرا شام کا پر تکلف لباس باورچی خانہ کے لئے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنا ہی کب آتے تھے دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا۔ وہ اس کی طرف جٹی ہوئی تھی، رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ کیپیں اڑانے میں مصروف تھیں۔ مدکیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور اڑنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آکر جلین بھیا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بھیا مارے غصہ کے بھنا اٹھے۔

"کون پاجی ہے؟" انہوں نے جدھر سے گیند آئی تھی ادھر دیکھ کر ڈانٹا۔

بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں، ایک دفعہ میں بھیا منڈیر پر تھے۔ اور مجرم کے بال ان کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ گونجی اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اچھل کر الگ ہو گئے جیسے انہوں نے بچھو کے ڈنک پر ہاتھ ڈال دیا ہو، یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری... آئی ایم ویری سوری..." وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اُس طرف ایک دبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور لیمو کے رنگ کا سلیولیس بلاؤز پہنے اپنے میرلین منرو کی طرح کٹے ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔ اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لئے اندر سے نکلی۔ اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی کہ ضرور کوئی ہنسی کی بات ہوگی ہے۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھدکنے لگا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ بھیا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اس کے بال پکڑ لئے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو فٹ بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیا کو اپنی تیکھی مکار دنگی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیا مسحور سناٹے میں اُسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ ان دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا بھابی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی۔ اس کا پھدکتا ہوا پیٹ سہم کر رُک گیا۔ ہنسی نے اس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم پھدک کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

"آیئے چائے پی لیجئے۔" میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اُس پار سے اس طرف کر لئے۔ سفید چھوٹے چھوٹے مکاسن ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے

کی طرح ٹھکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح گمگ رہا تھا۔ اس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ لیموں کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور ناخن رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی ذرہ بھر لائی لگ رہی تھی۔ حالانکہ مشکل سے دو اینچ اونچی ہوگی۔ اس کی ہڈی بڑی نازک تھی اس نے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرو لو۔

بھیا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی انہیں یوں تاک رہی تھی جیسے بلی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پرپھڑپھڑائے بڑھ کر دبوچ لے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منا آکر اس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔ وہ ہمیشہ اس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہی ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اس نے چٹاخ پٹاخ دو چانٹے جڑ دیئے۔

شبنم پریشان ہوگئی۔

"ارے ارے۔۔۔ روکئے نا۔" اس نے بھیا کا ہاتھ چھو کر کہا۔

"بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی۔" اس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا۔ انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے۔ اور پھر بھابی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی ہو گئی تھی۔ شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابی منے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چل دی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابی ہے۔" میں نے بھابی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بھابی؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ان کی بھیا کی بیوی۔"

"اوہ۔" اس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ "میں۔ میں سمجھی!" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تیئس سال ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"مگر..... ڈونٹ بی سلی۔" شبنم ہنسی۔ بھیا بھی اٹھ کر چل دیئے۔

"خدا کی قسم۔"

"اوہ۔۔۔ جہالت۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ بھابی نے مارٹینیر سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمبرج کیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں۔۔۔ میں چھبیس سال کی ہوں۔"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں۔"

"اف، اور میں سمجھی وہ تمہاری ممی ہیں۔ دراصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں۔ مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔ برا لگا ہوگا انہیں۔"

"نہیں۔۔۔ بھابی کو کچھ برا نہیں لگتا۔"

"چہ۔ بے چاری۔"

"کون۔۔۔ بھابی نا۔" جانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیا اپنی بیوی پہ جان دیتے ہیں۔" صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

"بیچارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہوگی۔"

"پچیس چھبیس سال کے تھے۔"

"مگر مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بھی بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں۔" شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمہارا یہ اندازہ غلط نکل رہا ہے۔۔۔ بھیا نے بھابی کو دیکھ کر بے حد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھیں۔"

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟"

"ہوتا کیا ــــ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں۔ بچوں کی ملکہ ہیں۔ کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ دوسرے بھیا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے۔" میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔

"بھئی چاہے مجھے کوئی پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کے لئے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ بنوں ــــ اوہ معاف کرنا تمہاری بھابی کبھی بہت خوبصورت ہوں گی، مگر اب تو۔۔۔"

"اونہہ، آپ کا نقطۂ نظر بھیا سے بالکل مختلف ہے۔" میں نے بات ٹال دی۔ اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی طرف جا رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی گدھی سہلا رہے تھے۔ جیسے کسی نے وہاں جلتی آگ رکھ دی ہو۔ چڑیا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی۔ پل بھر کو پلٹ کر اس نے اپنی شربتی آنکھوں سے بھیا کو تولا اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابی لان پر جھکی ہوئی پیالیاں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا جو بھیا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان تھرتھرا رہا تھا۔

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ شبنم پھولا ہوا لال اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے پپو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اس کا ننھا سا پکینیز کتا ٹانگوں میں الجھ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسہ دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں احمقوں کی طرح کھڑے گدھی سہلا رہے تھے۔ اور وہ انہیں منہ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولھے مٹک رہے تھے۔ باہیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ــــ بھابی گودام میں اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی ــــ" میں نے دل میں سوچا ــــ مگر غصہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انہیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں تو شبنم جیسی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ انہیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ پھر وہ کیوں کھڑے اسے تک رہے تھے اور ایسی بھی کیا بے سدھی کہ ان کا جسم سمبا کی تال پر لرز رہا تھا اور انہیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آ گیا ــــ بھیا نے ہم سب کو آواز دی۔ اور بوائے سے کہا بھابی کو بھیج دے۔

رسماً شبنم کو بھی بلاوا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں مگر جب وہ منے کو پدھی پر چڑھائے منڈیر پھلانگ کر آئی تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی۔ منا اسکارف لگاموں کی طرح تھامے ہوئے تھا۔ اور وہ گھوڑے کی چال اچھلتی ہوئی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منے کو اس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی۔"

"نہیں بابا ــــ آنٹی میں دم نہیں ــــ" شبنم چلائی۔ بڑی مشکل سے منے کو بھیا نے اتارا۔ منہ پر ایک چانٹا لگایا۔ ایک دم تڑپ کر شبنم نے اسے گود

سیپ کراچی

میں اٹھالیا اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

" شرم نہیں آتی ۔۔۔ اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہیں" بھابی کو آتا دیکھ کر اس نے منے کو ان کی گود میں

دے دیا۔ اس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

" دیکھئے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی"۔ اس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا۔

"اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا"

" ہوں۔ دم بھی ہے ۔۔۔ جو ہاتھ توڑ دو گی ۔۔۔" بھیا نے اس کی کلائی مروڑی ۔ وہ بل کھا کر اتنی زور سے چیخی کہ بھیا نے لرز کر اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ

ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی ۔ چائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں۔ وہ بالکل کمسن چھوکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھیں۔ بھابی گم سم

بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے شبنم کے وجود سے ڈر کر انہوں نے کچھ اپنی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہوگی۔ جی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی

رہنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ ڈٹ کر کھاتیں ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے۔ مگر وہ ۔۔۔ نے نہایت انہماک سے کیک اڑانے میں معروف

تھیں۔ جیتی لگا لگا کر سمجھے نگل رہی تھیں سکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ کر وہ کھائے جا رہی تھیں۔ بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر

ہم سب ہی پریشان تھے اور شاید بھابی بھی فکر مند ہوں گی مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں انہیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا

کرتیں۔ مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے سے لگنے لگے

تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح و شام سمندر میں تیرتے ۔ بھابی اچھا بھلا تیرنا جانتی ۔ مگر بھیا کو سوئمنگ سوٹ پہنی عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک

دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم ننھی منی دو ۔ دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابی جو دیر سے منے کو پکار رہی

تھیں، آگئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی، دوڑ کر انہیں پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر انہیں پانی میں گھسیٹ لیا۔ جب سے شبنم آئی تھی بھیا

بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ رات کھلکھلا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے کھینچ لیتے۔ انہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے، مگر وہ ان

کے ہاتھوں میں سے بوبل مچھلی کی طرح پھسل جاتی۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے ۔ جیسے تخیل میں وہ شبنم ہی کو اٹھا رہے تھے اور بھابی کٹی گائے کی

طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ یا کری اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں۔ اس وقت جو انہیں پانی میں ڈھکیلا گیا تو وہ گٹھڑی کی طرح لڑھک گئیں۔

ان کے کپڑے جسم پر چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقہ پر ابھر آیا۔ کمر پر جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ اتنی

بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

" اُفوہ کتنی موٹی ہو گئی ہو تم" بھیا نے ان کے کولھے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔ "اف توند تو دیکھو ۔ بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو"

" ہنہہ چار بچے ہونے کے بعد کمر ۔۔۔"

" میرے بھی تو چار بچے ہیں ۔۔۔ میری کمر تو ڈنلوپلو کا گدا نہیں بنی"۔ انہوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا۔ اور بھابی منہ تھوتھائے

بھیگی مرغی کی طرح پیر مارتی جھرجھریاں لیتی ریت میں گہرے گہرے گڈھے بناتی منے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں

دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ سے اوندھے منہ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانیوں کے مربہ پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں، اُن کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور آنکھیں سرخ

تھیں۔ گنا پارچہ کی گڑیا جیسے موٹے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربہ اور کریم کھانے پر جٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری

لی جیسے خوبانیاں نہ ہوں سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اُس نے نفاست سے ککڑی کا ٹکڑا کترتے ہوئے کہا۔ اور بھیا بھابی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپاشپ مربہ اڑاتی رہیں۔

"حد ہے!" انہوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا اور تقریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل لی۔ انہیں مربہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لئے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چربی کی چٹانوں کی صورت میں اُن کے جسم کے قلعے کو ناقابلِ تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اٹھیں گی۔ بھیا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لئے بس کرو — ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے ایسا بھی کیا چٹورپن۔" بھیا نے کہہ ہی دیا، موم کی دیوار کی طرح بھابی پگھل گئیں۔ بھیا کا نشتر چربی کی تہوں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر بہے۔ ہچکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دبلی پتلی نازک لڑکیاں کس لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دکھ کے ہنسی آتی تھی جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی ہوئی اٹھنے لگیں۔ مگر ہم لوگوں نے روک لیا۔ اور بھیا کو ڈانٹ ڈپٹ خوشامد کر کے واپس انہیں بٹھا لیا۔ بیچاری ناک سڑکاتی بیٹھ گئیں۔ مگر جب انہوں نے کافی میں تین چمچے شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی۔ بھیا مارے غصے کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنا کر اٹھے اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اُس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا یا کرتی تھیں۔ اور بار بار پہلے سے غصہ ہو کر بجائے منہ پھلانے کے وہ خونخوار بلی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتیں۔ ان کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اڑا دیتیں۔ پھر بھیا انہیں اپنی ہی بانہوں میں جکڑ کر بے بس کر دیتے اور وہ اُن کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ پھر ملاپ ہو جاتا اور جھینپی کھسیانی وہ بھیا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ ان کے گریبان کو رفو کرتیں اور میٹھی میٹھی شکر گزار آنکھوں سے انہیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں۔ لڑتی ہوئی چھوٹی سی ریشمی بلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کو ان پر غصہ آنے کے بجائے اور شدت سے پیار آتا۔ مگر جب سے ان پر گوشت نے دھاوا بول دیا تھا وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ انہیں اول تو غصہ ہی نہ آتا۔ اور اگر آتا بھی تو فوراً ادھر اُدھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اُس دن انہوں نے اپنے بھاری بھر کم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا۔ بھیا صرف ان کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ روئی کے گٹھر کو یوں لڑھکتے دیکھ کر انہیں سخت گھن آئی۔ نہ غصہ ہوئے، نہ بگڑے، شرمندہ اداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی اور ایک دن بھیا کے سالے آکر بھابی کو لے گئے۔ طفیل بھابی کے چچا زاد بھائی تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے بھابی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گپند کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سٹ پٹا گئے۔ پھر انہوں نے بھابی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیا اُس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ طفیل نے شام تک ان کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے آئے۔

"دہلی کے مکان میں نے اُن کے مہر میں دیئے۔" انہوں نے رکھائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھر تھر کانپنے لگیں۔

"ہاں — طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعہ پہنچ جائیں گے۔"

"مگر طلاق — طلاق کا کیا ذکر ہے — ؟"

"اسی میں بہتری ہے۔"

"مگر — بچے — ؟"

"یہ چاہیں تو انہیں لے جائیں — ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔"

ایک چیخ مار کر بھابی بھیا پر جھپٹیں — مگر انہیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی۔ سہم کر ٹھٹک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اُس سے شادی کر لو — میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا۔ اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب — کیا ہو سکتا ہے۔"

مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلائے چلی گئیں۔

"بے وقوف —" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اٹھا لیا۔ "گدھی کہیں کی، چل اٹھ" — اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد اُن کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا خود مختار تھے بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں انہیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ انہیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔

بھابی چلی گئیں — فضا ایسی خراب ہو گئی تھی کہ بھیا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن پر چلے گئے۔

سات آٹھ سال گزر گئے۔ کچھ کم و بیش ٹھیک اندازہ نہیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ اماں کا انتقال ہو گیا۔ ابا کی موت کے بعد وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا، مگر بھیا کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ کبھی ابا کی بھی نہیں سنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔

آشیانہ اجڑ گیا۔ بھرا پرا گھر سنسان ہو گیا۔ سب اِدھر اُدھر اڑ گئے۔ سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں الجھے رہے۔ مگر جب ان کا خط آیا کہ وہ بمبئی آ رہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اٹھا۔ بھیا جی ٹرین سے اترے تو ہم دونوں بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ ان کا سامان اتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیا سے اُس کی خیریت پوچھنے کو مڑی، دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا، اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لئے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی، مگر آج میرے منہ سے بے اختیار بھابی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار — ان چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تودا کیسے بن گئی؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے۔ ایک تولہ گوشت اِدھر نہ اُدھر وہی کمسن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دو چار سفید چاندی

کے تارکنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے تھے۔ ویسے کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں، اپنا سر اس کے قدموں میں دے مارتی ہیں — پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اس کے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں اور نئی لہریں پھر سرفروشی کے ارادے سینے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان — ؟ ان سجدوں سے دور — طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔ اٹل، لاپرواہ اور بے رحم! جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا تھا — شبنم آزاد لڑکی ہے، پکی عمر کی ہے — بھابی — تو بہ میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی — بھیا کے قابو میں آ گئی — یہ ناگن انہیں ڈس کر بے سدھ کر دے گی۔ انہیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزہ تو لہروں کو صرف چٹان ہی چکھا سکتا ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں چھٹی نہیں تھی اُن کی —" شبنم نے کھٹی ڈکاروں بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔ اور میں حیرت سے اس گوشت کے ڈھیر میں اُس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈھ رہی تھی جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر یہ کیا؟ بجائے اس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ بھابی تو مکھن کا ڈھیر تھی — مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی — اس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ شربتی کھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھیں۔ پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نازک نازک لچکیلی شاخوں جیسی باہیں مگدر کی طرح گاؤدم ہو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھیں مسکارے سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نُچ گئی تھیں جبھی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی۔

بھیا رٹز میں ٹھہرے۔ رات کو ڈنر پر ہم وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا۔ مصری حسینہ اپنے چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی۔ اُس کے کولھے دائروں میں لچک رہے تھے — سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے — باریک شفان میں سے اس کی روپہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے تراشے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں — بھیا کی بھوکی آنکھیں اُس کے جسم پر بچھوؤں کی طرح رینگ رہی تھیں — وہ بار بار اپنی گُدّی پر انجانی چوٹ سہلا رہے تھے۔

بھابی — جو کبھی شبنم تھی — مصری رقاصہ کی طرح لہرائی ہوئی بجلی تھی۔ جو ایک دن بھیا کے حواس پر گری تھی۔ آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی۔ اُس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل بدہضمی کی وجہ سے ممی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے تھے۔ نیان لائٹس کی روشنی میں اس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی انجانے ناگ نے اسے ڈس لیا ہو۔ مصری رقاصہ کے کولھے طوفان برپا کر رہے تھے۔ اور بھیا جی کے دل کی ناؤ اس بھنور میں چک پھیریاں کھا رہی تھی۔ پانچ بچوں کی ماں شبنم — جو اب بھابی بن چکی تھی، سہمی سہمی نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لئے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھی۔

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی — ساز کراہے — ڈرم کا دل گونج اٹھا۔ مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لئے اور نڈھال ہو کر مرمریں فرش پر پھیل گئی —

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا — شبنم کی آنکھیں بھیا جی کو ڈھونڈھ رہی تھیں — بیرا اسٹرابیری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بے خیالی میں شبنم نے پیالہ اسٹرابیریوں سے بھر لیا — اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھیں چوٹ کھائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔

بھیڑ بھاڑ سے دور — نیم تاریک بالکنی میں بھیا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ ان کی پرشوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے

ابھر رہی تھیں۔ شبنم کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سُم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیا رقاصہ کا بازو تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے۔ اور ہمارا تعارف کرایا۔

"میری بہن" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لچک کر میرے وجود کو مان لیا۔

"میری بیگم" انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔۔۔ جیسے کوئی میدان جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اُس نے اُن کی رفیقۂ حیات کو نہیں خود اُن کی لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیا کی طرف دیکھا۔ اس ایک نظر میں لاکھوں فسانے پوشیدہ تھے۔ "اُف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابل پرستش ہیں وہ لوگ اور قابل رحم بھی جو ایسی ایسی سزائیں بھگتتے ہیں۔"

"شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لئے اس نے کریم کا جگ اٹھا کر سبھریوں پر انڈیل دیا اور جُٹ گئی۔

بیچارے بھیا جی! ہینڈسم اور مظلوم — سورج دیوتا کی طرح حسین اور رومنٹک شہد بھری آنکھوں والے بھیا جی چٹان کی طرح اٹل — ایک امر شہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر چُور چُور اُن کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

دوسری نئی نویلی لچکتی ہوئی لہر ان کی پتھریلی باہوں میں سمانے کے لئے بے چین اور بے قرار تھی!

محمد احسن فاروقی

شادی کا سوال

وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ وہ شادی نہ کرے گا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ اس قابل ہی نہ تھا۔ نہیں اس کے گھر والوں اور اس کے دوستوں کے پاس صاف ثبوت موجود تھے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے دوسری صنف کی طرف رجحان دکھا چکا تھا۔ اس وقت اس کے شباب کا آغاز تھا اور اس کی ماں نے اسے ایک لڑکی کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا کہ اس لڑکی کو الگ کر دیتے ہی بنی تھی۔ اس کے ساتھ کے کھیلنے والوں کے پاس اس کی حرکتوں کے ایسے مشاہدے موجود تھے جو ڈاکٹری معائینے سے کہیں زیادہ یقین دلانے والے ثبوت بہم پہنچاتے تھے۔ اس کے دوستوں کو تعجب بھی ہوا تھا کہ وہ ایک دن کیوں اپنی شادی کے اس قدر خلاف ہو گیا تھا۔ اس مخالفت کا احساس اس کے گھر والوں کو بھی ہو گیا تھا۔ مگر ان لوگوں نے اس کی زیادہ پرواہ نہ کی تھی۔ خاص طور سے اس کی ماں نے یہ کہہ دیا تھا کہ جب وقت آئے گا تو شادی کر ہی لے گا ابھی بچپنے بکنے دو۔

اس کا انکار جنسیاتی جھجک پر نہیں مبنی تھا۔ کیونکہ ایک غلط قسم کا سہی مگر اسے جنسیاتی تجربہ ضرور ہو چکا تھا اور وہ اس کی سنسنی کا تصور کر کے اکثر لذت محسوس کرتا تھا۔ اسے گھر بار بال بچوں کے ساتھ رہنے کا بھی شوق ہوا کرتا تھا۔ جس کا وہ کبھی کبھی دوستوں کے درمیان اظہار بھی کر دیا کرتا تھا۔ اس کا انکار ایک عجیب و غریب راز پر مبنی تھا جو اس کے دل ہی میں تھا۔ اور اس کی تصور کی دنیا ہی کو آباد کئے رہتا تھا۔ اسی زمانہ میں جب وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ تھا جسے اس کی ماں نے ہٹا دیا تھا۔ اسے ایک اور لڑکی پڑوس کے مکان میں کوٹھے پر دکھائی دی تھی۔ نہ معلوم کیسے اس لڑکی کا گلابی ڈوپٹہ اڑ کر کوٹھے پر چلا گیا تھا اور وہ اسے اٹھا کر اوڑھ رہی تھی۔ جب اس نے اس کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسی جھلک نے اس پر پراسرار اثر کیا تھا۔ اور وہ ایک دفعہ دیکھنے اور پھر دیکھنے کی خواہش کے عالم میں سڑک پر چکر لگانے لگا تھا۔ لڑکی کے گھر والے نئے نئے اس کے پڑوس میں آکر رہے تھے۔ خاندان چھ آدمیوں کا تھا۔ ماں باپ تین بھائی اور ایک بہن جو سب سے بڑی تھی تینوں بھائیوں سے جو ایک دو دو برس بڑے چھوٹے تھے۔ اس کی ملاقات پہلے ہی دن ہو گئی تھی۔ ماں اور بیٹی پردہ دار کہی جا سکتی تھیں مگر صرف اس حد تک کہ وہ مردوں کی محفل میں نہیں آتی تھیں۔ ورنہ کھلی سواری پر بیٹھ کر جانے یا برآمدوں اور کھڑکیوں پر کھڑے ہو کر سڑک کی سیر کرنے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ جس مکان میں وہ آکر رہے تھے۔ اس کے سامنے ایک بڑا کشادہ لان تھا۔ جس ایک بڑا پھیلا ہوا کیتھے کا پیڑ تھا۔ مکان بہت بڑا اور دو منزلہ تھا۔ اوپر کی منزل پر ایک برآمدہ تھا جس کے اونچے اونچے در بالکل کھلے تھے۔ اور ان میں اتنے اونچے کٹہرے لگے تھے کہ ان پر ٹک کر کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ یہ برآمدہ سڑک پر سے بھی دکھائی دیتا تھا اور سڑک پر گزرنے والا اس کے کٹہروں پر جھکے ہوئے شخص کو صاف دیکھ سکتا تھا۔

اصل میں اسی برآمدے پر اس نے اس لڑکی کو کٹہرے پر جھک کر کارنس پر سے ڈوپٹہ گھسیٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پھر وہ ڈوپٹہ کو اوڑھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ سڑک پر خواہ مخواہ نہ معلوم کتنے بار روز گزرنے لگا تھا۔ اور دن میں کم از کم ایک بار ضرور اسے وہ لڑکی دکھائی دیتی

ہر بار اس کی لڑکی کی کوئی خاص ادا ضرور ہوتی جو دن بھر اس کے سامنے رہتی۔ اور رات کو خواب میں اور زیادہ حسین دکھائی دیتی۔

عام طور سے اس لڑکی کو معمولی صورت کا بتایا جاتا تھا۔ مگر اس کے لئے اس لڑکی کی صورت سے زیادہ حسین صورت ممکن ہی نہ تھی۔ وہ اس کی صورت پر غور کیا کرتا تھا۔ اس کی ناک بالکل اس کی شکل کی تھی۔ جیسی وہ حد سے زیادہ پسند کر سکتا تھا۔ اس کا گیہواں رنگ ہی وہ رنگ تھا جو اس کے دل کو گورے رنگ سے زیادہ متاثر کرتا تھا۔ اس کا میانہ قد پتلی کمر اور سینوں کا اوسط ابھار ہی وہ کرشمہ تھا جس کی اسے لاشعوری طور پر بچپن سے تلاش تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ عین مجسمہ حسن جس کی تلاش کے لئے اسے جنم دیا گیا تھا اس کے سامنے صورت مجاز میں آ گیا تھا۔

لڑکی کے بھائیوں سے اس کی دوستی بڑھتی گئی۔ ان لوگوں کے لئے نیچے کی منزل میں ایک بڑا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا جس میں تینوں کی الگ الگ میزیں تھیں جن پر کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بڑا سا تخت تھا۔ جس پر دری اور چاندنی تھی۔ اس تخت پر دن رات ہر قسم کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ سب سے بڑا بھائی اس کا ہمسن تھا اور اس کا ہم جماعت بھی ہو گیا تھا۔ اس سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ دونوں زیادہ تر ساتھ رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ اس گھر میں بلا جھجک چلا جاتا۔ صرف کوٹھے پر جو زنانہ حصہ تھا نہ جا پاتا۔ کیونکہ اس کے دوست نے کبھی کوٹھے پر چلنے کو نہیں کہا تھا۔ بہر حال وہ لڑکی بیشتر کوٹھے کے برآمدے کے چکر لگاتی رہتی اور اسے دن میں کئی کئی دفعہ دکھائی دے جاتی۔ اسے اس سے اکیلے میں ملنے کی تمنا تھی اور مبہم سی امید تھی کہ یہ تمنا کسی دن پوری ہو کر رہے گی۔

اسی طرح کوئی سال بھر گزر گیا ہو گا کہ ایک دن اسے بڑا ہی عجیب تجربہ ہوا۔ ساون کے مہینہ کا ایک بہت ہی حسین دن تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں عجیب پر کیف روشنی تھی۔ کبھی ہلکی پھوار پڑ جاتی کبھی بوندا باندی ہو کر رہ جاتی۔ اس گھر کے بغیچے کی ہر چیز پر عجیب مستی چھائی ہوئی تھی۔ لان کی گھاس کا سبز رنگ خاص طور پر ابھرا نظر آ رہا تھا۔ کیتھے کے پیڑ پر کوئی پراسرار سایہ پڑ رہا تھا۔ اور اس کی پتیاں وجد کے عالم میں ہلتی نظر آ رہی تھیں۔ ساون کے شروع سے ہی اس پیڑ میں جھولا ڈال دیا گیا تھا جس میں ایک لمبا سا پٹرا پڑا تھا۔ تاکہ پانچ آدمی ایک ساتھ بیٹھ سکیں۔ اور ایک پٹرے کے کونے پر کھڑا ہو کر پینگ بڑھا سکے۔ صبح سے نہ معلوم کتنے بار سب لوگ اس جھولے پر جھول جھول کر اتر آئے تھے۔ پیڑ کے تنے سے لگی ہوئی بید کی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ شخص بیٹھ جاتا جو جھولنا نہیں چاہتا۔ مگر دوسروں کو جھولتے ہوئے دیکھنے میں دلچسپی رکھتا۔

وہ سب جھولتے رہے۔ وہ لڑکی بار بار برآمدے پر آتی اور چلی جاتی۔ آج اس کا حسن بھی اپنے کمال پر تھا۔ اس کے کپڑے نہایت سادے تھے ڈوپٹہ بھی سفید تھا۔ بالوں میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی اور چوٹی بندھی بے بندھی پیچھے کمر تک دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اس کے چہرہ کا رنگ عجیب نکھار پر تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آسمانی نور اس پر اتر آیا ہے۔ اس کا رنگ اتنا کھلتا ہوا اور کھلتا ہوا کبھی پہلے نہیں نظر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسی پر کیف چمک تھی جو کبھی پہلے نہیں دکھائی دی تھی۔ اس کے بار بار آنے جانے میں دلکش رقص کی کیفیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مست ہو ہو کر ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک نئی دنیا بسا رہی تھیں۔ اس کا سڈول جسم ایک قیامت کی نوید تھا۔ اس کی اداؤں میں شرم کی جگہ بیباکی نے لے لی تھی۔ اور وہ اپنے کپڑوں سے یعنی اس پوری دنیا سے بے نیاز ہو کر کسی ایسے عالم میں گم تھی جس میں اسے اپنے حسن کے سوا اور کچھ نہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ اس عالم کو جھولے پر سے تاکتا رہا۔ اسے بھی یہ پرواہ نہیں رہی تھی۔ اس کی محویت کوئی شبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے کہ نہیں۔

دوپہر کے وقت سب لوگ کھانا کھانے چلے گئے تھے۔ وہ ایک آدھ نوالا نگل کر پھر جھولے پر آ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہی اسے اوپر کے برآمدے پر وہ آسمانی رقص پھر دکھائی دینے لگا تھا اور اس کے جھولے کے پینگ کو کوئی نامعلوم طاقت بڑے بڑے زور سے بڑھانے لگی تھی۔ وہ پینگوں کی تیزی سے ڈر کر چیخنے لگا تھا۔ وہ کٹہرے سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کے چیخنے پر مسکرانے لگی تھی۔ وہ مسکراہٹ

کیا کیف رکھتی تھی؟ وہ کیا تھی؟ وہ لڑکی کیا ہوگئی تھی؟ وہ خود کہاں پہونچ گیا تھا؟ کیا کیا واردات سامنے آتے گئے؟ یہ سب روحانی دنیا سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں۔ اور اس مادی دنیا کے لوگوں کی بنائی ہوئی زبان کے ذریعہ نہیں ادا ہوسکتے۔ سب لوگ پھر جھولنے کو واپس آگئے تھے اور جھولا جھولنے لگے تھے۔ وہ پھر جھولنے پر نہ بیٹھا بلکہ بید کی کرسی پر بیٹھا رہا تھا اور محویت کے عالم میں برآمدے کو دیکھتا رہا تھا۔ جہاں وہ روحانی رقص اس مسکراہٹ کے کرشمے کے ساتھ برابر جاری رہا تھا۔ معلوم نہیں کس وقت وہ گھر چلا آیا تھا۔ اپنے پلنگ پر پڑ گیا تھا۔ سوتا رہا تھا یا جاگتا رہا تھا۔ وہ برآمدہ اور اس میں کھلتا ہوا وہ کرشمہ اسی روح میں کب تک پیوست رہا تھا!

پھر ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحبزادے آئے ہیں۔ جن کے ساتھ اس لڑکی کی شادی عرصے سے ٹھہری ہوئی تھی اور کچھ ہی عرصے کے بعد اس لڑکی کی شادی بھی ہوگئی تھی اور وہ ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان والے بھی پردیس سے چلے گئے تھے۔ مگر اس کے اوپر اس عجیب وغریب تجربہ کا یہ اثر ہوا تھا کہ کوئی صورت بھاتی ہی نہیں تھی۔ کسی لڑکی کی طرف نگاہ ہی نہیں اٹھتی تھی۔ وہ جوان ہوچکا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر ملازمت پر آچکا تھا۔ اور اس کے ماں باپ کی خواہش تھی کہ اب اس کی شادی ہوجائے مگر شادی کا خیال کرتے ہی اسے اس دن کا سماں یاد آتا۔ اس کی تمام طاقتیں سلب ہوجاتیں۔ اور وہ دل میں کہتا کہ شادی کرکے کیا کرے گا۔ شاید جنسی رجحان اور جنسی احساس اس میں بالکل غائب ہوگیا تھا۔ وہ سچ مچ شادی کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔

مگر چار برس گزر جانے کے بعد ایک دن اس کے والد نے اس کی شادی ٹھہرا دی، اس نے محض مخالفت کی مگر شادی ہوکر رہی۔ اسے اپنی بیوی کی طرف رجوع ہونے میں کچھ دن لگے۔ اس نے بیوی کو اپنے تجربے کا پورا حال سنایا۔ بیوی نے بتایا کہ اکثر عورتیں مردوں کو جادو سے باندھ دیتی ہیں۔ یہ بات مشہور رہی۔ ایک صاحب نے جادو اتارا۔ اس رات اسے بیوی حسین ترین عورت دکھائی دی۔ پرانا خواب بالکل ٹوٹ گیا۔ بیوی کے ساتھ زندگی میں عجیب کیف ملا۔ پرانا زمانہ اور اس کھوئی لڑکی کی یاد ایک وہم ہوگئی۔ وہ اپنے پرانے تجربے کو جب بھی یاد کرتا تو اسے ہنسی آتی۔ وہ اسے حماقت کہکر اپنی بیوی سے بیان کرتا۔ دونوں خوب ہنستے۔ شادی کامیاب تھی اور دونوں کے بچے ہوئے۔

مگر اب ایک نیا گل کھلا۔ اسے پھر ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ یہ کچھ اس کی بیوی سے ملتی جلتی تھی اور کچھ اس لڑکی سے جس کو اس نے عنفوان شباب میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے چھپ کر اس کے عشق میں چکر لگانے لگا۔ اب اس میں زیادہ جسارت آگئی تھی اور یہ لڑکی زیادہ تہذیب یافتہ تھی۔ وہ اس کے گھر جانے لگا۔ گھنٹوں بیٹھا اس سے باتیں کرتا۔ اس سے شادی کرکے اس کے ساتھ رہنے کا تصور باندھتا اور یہ نہ سوچتا کہ اس کی بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا۔ ایک دن اس نے اس لڑکی سے شادی کی تجویز پیش ہی کر دی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے بہت شاق گزرا۔ غم غلط کرنے کے لئے وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ خاص اوقات پر اسے اپنی بیوی سے زیادہ حسین عورت کوئی نہیں معلوم ہوا کرتی تھی۔ اب بیوی اور بھی زیادہ حسین لگنے لگی اور اس نے طے کر لیا کہ کسی اور عورت سے تعلق پیدا کرنے کا خیال بھی نہ کرے گا۔

مگر کوئی سال بھر کے اندر اس کی آمد ورفت ایک صاحب کے یہاں شروع ہوئی جن کی بدنام مگر بڑی جاذب نظر تندرست لڑکی پر اس کی نگاہ پڑ گئی۔ اس لڑکی کی متعدد وجوہات سے شادی نہیں ہوسکی تھی۔ اور اس کے والد چاہتے تھے کہ کوئی بھی اسے لے جائے۔ وہ اس کے بھرے بھرے جسم چنچل شوخ چال پر فریفتہ ہوا تھا۔ لڑکی خود اسے اشارے کرتی اور جلد دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ لڑکی کافی بدنام تھی۔ اس کی بیوی کو پتہ لگ گیا۔ میاں بیوی میں سخت جھگڑا ہوا اور یہ معاملہ بھی آخر کو ختم ہی ہوگیا۔

دو سال بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہونچا جہاں تین لڑکیوں کا کسی سرکاری کام کے سلسلے میں دن بھر ساتھ رہتا تھا۔ ان میں سے ایک ہو بہو اس طرح کی تھی جیسی اس کی پہلی محبوبہ۔ اسے دیکھ کر اسے جھولے کا سماں یاد آیا۔ مگر اس سے اسے محبت نہیں ہوئی۔ دو اور لڑکیوں میں سے ایک حسینان روزگار میں سے تھی اور ہر طرف سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور تعریفیں کرکے جاتے۔ اس سے بھی اسے محبت نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کے حسن کا وہ اتنا زیادہ معترف رہا کہ لوگ

یہی سمجھتے رہے کہ اس کو اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اصل میں اسے تیسری لڑکی سے عجیب قسم کی محبت ہوئی۔ یہ لڑکی دبلی پتلی چھوٹے قد کی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اور بلا کی چلبلی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے پاگلوں کی طرح پھرنے لگا۔ جب وہ سامنے آتی تو محویت کے عالم میں گم ہوکر اسے اس طرح دیکھتا کہ آگے کوئی بات منہ سے نہ نکلتی۔ وہ سوشل لڑکی تھی، سینماؤں، پارٹیوں ڈراموں میں خاص خاص رنگوں میں دکھائی دیتی۔ وہ ان سب مجمعوں میں جاتا رہا، جہاں سنا کوئی مجمع ہے اس کو ڈھونڈھ آئے۔ اس سے شادی کرکے سوشل زندگی میں داخل ہوجانے کے خواب دیکھتا۔ مگر صرف ایک ہی دفعہ اس سے بات چیت ہو پائی۔ ایک دفعہ وہ بہت قریب آگئی۔ اس کے چہرے کے نقائص جو دور سے نہیں دکھائی دیتے تھے صاف نظر آگئے۔ عشق کا خواب ٹوٹ گیا۔ شادی سے دل خود انکار کرنے لگا۔ وہ پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس لڑکی کے ساتھ زندگی کا جو خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسے بیوی کے ساتھ زندگی میں پورا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سن رسیدہ ہوگیا۔ بچے اس کے جوان ہوگئے۔ بیوی کے منہ پر جھریاں پڑ گئیں۔ اس کا چہرہ چکنا تھا اور دل جوان تھا۔ اس کی پہلی محبوبہ اس سے سن میں کچھ بڑی تھی۔ باقی اس کی ہمسن ہی کہی جاسکتی ہیں۔ وہ اپنے سے بہت چھوٹی عورتوں سے محبت کرنا یا شادی کرنے کا خیال بُرا ہی نہیں بلکہ ظلم اور گناہ تصور کیا کرتا تھا۔ مگر اب اسے ایک چھوٹی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ یہ نیچے درجے کی لڑکی تھی اور اس کے ماں باپ مرچکے تھے۔ قبول صورت تھی اور نانی نے پالا تھا۔ جو بالکل نادار تھی۔ یہ لڑکی اس کے گھر میں کام کاج کرنے لگی۔ اس وقت وہ نو برس کی ہوگی۔ وہ اس سے اسی طرح کھیلنے لگا جیسے بوڑھے لوگ بچوں سے کھیلتے ہیں۔ وہ لڑکی بھی اس کی خاص خدمت کرنے لگی۔ تین برس گزر گئے۔ اب لڑکی جوان ہونے لگی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ابھی جوانی نکال رہی تھی وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اور اب چاہنے لگا تھا کہ اس سے شادی کرلے۔ بیوی کو شبہے ہونے لگے۔ وہ لڑکی کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ایک دن اس لڑکی کی اسی کے طبقے کے ایک لڑکے سے شادی کرکے اسے روانہ کردیا۔ اس معاملے میں بھی انکار ہی سامنے آیا۔

اس کے بچے سب اپنے اپنے گھروں کے ہوگئے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ اتنا بڈھا ہوگیا کہ اب کسی عورت کی طرف توجہ کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ مگر اس کے دل میں ایک پراسرار تمنا ضرور رہی جس کا خیال کرکے وہ ٹھنڈی سانس بھرتا اور یہ شعر پڑھتا ؂

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط　　تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

بلونت سنگھ

گلیاں

جب وہ کلبلا کر مکان کے کونے والے کمرے میں سے باہر نکلی تو اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔ سہ پہر کے وقت گلی سنسان تھی اور اتفاق سے کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر بھاگتے ہوئے اپنے گریبان کو سنبھالا اور رعونت کے مارے کانپتی ہوئی انگلیوں سے بٹن بند کرنے لگی۔

اس کے پیچھے ہی بیلا سنگھ اور رچھپال سنگھ بھی لپک کر باہر آئے۔ یوں تو وہ آپس میں چچیرے بھائی تھے۔ لیکن ایسے موقعوں پر وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ اتفاق کا مظاہرہ کرتے۔۔۔ وہ تین بچوں کی ماں کو دبوچ لینا چاہتے تھے لیکن وہ ان کے چنگل سے بگٹٹ بھاگی جا رہی تھی۔

ان مردوں کے چہرے ایسے تھے جیسے گلال مل گیا آٹا چار دن تک جوں کا توں پڑا رہنے سے خمیرا ہو کر پھول آئے۔ ناک کے نتھنوں کے بال ٹڈی کی مونچھوں کی طرح باہر کو جھانک رہے تھے۔ کنپٹیوں اور گالوں پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ماتھے پھڑک رہی تھیں۔ سانس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر فرار ہوتی ہوئی عورت پر آخری نگاہ ڈالی۔۔۔ اور پھر مایوس ہو کر ڈھیلے گھیرے کی شلواریں پھڑ پھڑاتے، بھالوؤں کی طرح پاؤں زمین پر پٹختے وہ دونوں واپس مکان میں جا گھسے۔

فرار شدہ عورت یوں بھاگی چلی جا رہی تھی جیسے وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی اس دنیا کی حدوں کو پار کر جائے گی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں سانولا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ لیکن اس وقت زبان بھی تو سوکھ گئی تھی۔ میل کے کارن گردن کا پسینہ بھی گدلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی۔ زور زور سے دھڑکتا ہوا دل پسلیوں کی دیوار سے سر پٹخ رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ جان دے دیگی۔

پچھلے ایک برس میں کئی بار اس کے دل میں مرنے کا خیال آیا۔ کیونکہ موت کے سوا اس کے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔۔۔ اور آج اس نے آخری فیصلہ کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ بھی کر لیا تھا۔ آبادی کے باہر، دو اڑھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک گہرا کنواں تھا۔ بس اسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دینے سے اس کے سارے مسائل یک قلم حل ہو سکتے تھے۔

اس کا جنم اسی گاؤں میں ہوا تھا، لیکن اب اسے گاؤں کہنا سراسر زیادتی تھی۔ نئی نئی اسکیمیں چلیں۔ ایک میل پرے نئے کارخانے کھل جانے سے گاؤں کی آبادی بڑھی۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بہت سے لوگ اسی گاؤں میں رہنے لگے۔ کنوؤں کی جگہ ہینڈ پمپ لگ گئے۔ بعض مکانوں میں کچی اینٹوں کی دیواریں بھی پکی ہو گئیں۔ اکثر مکانوں کے آگے بہنے والی نالیاں بھی پختہ ہو گئیں۔ پہلے گنتی کی تین گلیاں تھیں۔ اب گلیوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ سادہ لوح دیہاتیوں کو یہاں گلیاں ہی گلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اور پھر جس عورت کو خودکشی کرنے کی جلدی ہو اسے یہ گلیاں بھول بھلیاں دکھائی نہ دیں تو اور

کیا ہو۔؟

اس کے دادا نے کافی لمبی عمر پائی۔ وہ ہر صبح نہار منہ آدھ پاؤ سرسوں کا خالص تیل پی جایا کرتے تھے اور اسے ہی اپنی صحت اور طویل العمری کا سبب بتاتے تھے۔ دیگر لوگ ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے تیل پیتے تو ان کے پیٹ میں رکنے نہ پاتا، جلد کا توں خارج ہو جاتا۔ اسے ہضم کر لینا بھی ان کے سینہ کا راز تھا۔ گو اس راز سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو دوسروں کو بتانے سے گریز نہ کرتے۔ وہ پرانی قسم کے شاعر بھی تھے:

الف اکھیا پورن بھگت منے.....

یا اب بنار جا (رضا) رب دی توں پتا دی نہ کھڑ کدا لے۔

آج کے لوگ انہیں جو چاہے سمجھیں لیکن اپنے زمانے میں وہ صوفی سمجھے جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کے خیالات گلیوں کے مانند ہیں ایسی گلیاں جن میں چلتا ہوا انسان نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ جب کسی کے دماغ میں ایک خیال آیا تو سمجھو کہ اس کے سامنے ایک گلی کھل گئی۔ کیونکہ انسان ایک خیال یا گلی پر دوسرے خیال یا گلی کو ترجیح دیتا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ دادا اس مسئلے پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ان کے ہم عمر ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنا کرتے، لیکن ان کی ننھی پوتی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا..... وہ ذرا پرے ہٹ کر کھڑی ہوئی اپنی روکھی سوکھی چوٹی کو گرہیں دیتی رہتی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا کیسی کیسی گرہیں اور کون کون سی گتھیاں کھول اور سلجھا رہے ہیں۔ اسے تو محض ان کا چہرہ بھلا لگتا تھا۔ حالانکہ چھدری داڑھی کے پاس ان کے گال پر ایک بڑا سا مسہ تھا۔ جس میں سے کانٹوں کی طرح تین چار بال سیدھے کھڑے عجیب سے لگتے۔

ایک مکان کی نکڑ سے دوسرے مکان کی نکڑ تک، گارے کی بنی ہوئی سپاٹ دیواریں یا پکی اینٹوں کی دیواریں، جن کی دراڑوں میں پلستر کے جال۔ ایک نالی کے بعد دوسری نالی کو پھلانگتی ہوئی، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی..... مکان، دیواریں، نالیاں.. گزرتی جا رہی تھیں۔

گرد آلود آسمان میں سورج اپنی شدت کی گرمی کے مارے خود تلملا رہا تھا۔

اس خوف سے کہ کہیں پاؤں کشادہ پائنچوں میں الجھ جانے سے وہ گر نہ پڑے اور چوٹ کھا جائے اس نے شلوار سمیٹ کر نیفے میں اڑس لی تھی۔ اسے اس پر ہنسی نہیں آ رہی تھی کہ جب موت کو لبیک کہنے کی ٹھان ہی لی تو پھر چوٹ کھانے سے ڈرنا کیا..... اس کے ٹخنے اب بھی چکنے تھے۔

یہیں پر اس کا بچپن بیتا تھا۔ اسے اپنی سگی ماں کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ سوتیلی ماں نے برا سلوک نہیں کیا اس سے، لیکن اس عورت کو پیار کرنا نہیں آتا تھا، نہ بچوں سے نہ شوہر سے۔ عجیب گھٹس عورت تھی۔ کلائی میں لوہے کا موٹا سا کڑا چڑھائے رکھتی۔ اس ٹائپ کی عورت تھی اس کی ماں۔ ہاں دادا جب تک جیتے رہے اسے بہت ہی لاڈ پیار کرتے رہے۔ دادا کی باتیں اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیں۔ مگر وہ ان کی خاموش محبت کو سمجھتی تھی۔ جس طرح اس سمے گاؤں کی گلیوں کی تعداد محض تین تھی اسی طرح ان دنوں اس کے دماغ میں خیالات کی گلیوں کی تعداد بھی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی..... دن مہینے، سال گزرتے گئے۔ نگر کی گلیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس کے دماغ کی گلیاں بھی شاخ در شاخ پھیلتی گئیں..... الجھتی گئیں..... جب دادا مر گئے تو اس کے دماغ کی بہت سی گلیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو گئیں۔

پھر وہ زمانہ بھی آیا جب اس کے بدن پر پھول کھل اٹھے۔

پیپلاں دیاں چھانواں دے۔
مُڑ مُڑ کے نہ تکیاں کر۔
منڈیاں ماں دی دھی آں دے۔
مُڑ مُڑ کے نہ......

اس کی ایک منہ لگی سہیلی نے یہ بول سنائے اور کہا کہ تجھے ایک جوان ایک نظر دیکھنے کے لئے تیری گلی کے چکر لگایا کرتا ہے۔ دھت کہہ کر وہ

بھاگی۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا جس میں پورا چہرہ دیکھنا ناممکن تھا۔ چنانچہ وہ ایک سہیلی کے گھر پہنچی۔ کسی حیلے سے ان کے بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو سر سے لے کر ناف تک دیکھا۔ مطمئن ہو کر واپس لوٹی۔ پہلے اس دل پھینک آوارہ کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ کچھ جانا بوجھا اور پھر جب اسے دور ہی سے دیکھ پاتی تو صحن کا دروازہ دھڑاک سے بند کر دیتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر جلد ہی اس کی شادی نہ ہو جاتی تو وہ صحن کے دروازے کو اسی طرح ایک دن توڑ ڈالتی۔

وہ نہیں جانتی کہ وہ جوان کس طرح اس سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوا۔ کس گلی سے سہرا باندھ کر آیا۔ اور روتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سے اسے دلہن بنا کر چلتا بنا۔ ۔ ۔ اور پھر اسے تین بچے دے کر نہ جانے کس گلی میں گھس گیا جہاں سے وہ لوٹ کر نہیں آیا۔

جب اس کا شوہر زندہ تھا تو وہ محلہ بھی آباد تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ صبح کے وقت چڑیوں کے چہچہاہٹ کے ساتھ پیتل کے چھینوں اور ڈھولک کی آوازیں دور دور کے گوردوارے سے سنائی دیتیں، اونگھتی ہوئی فضا میں گوربانی کے شبد سنہرے پروں والے پرندوں کی طرح اڑ نکلتے، چک پھیریاں لیتے۔ ان جانی، ناسمجھی، ان بوجھی روپہلی گلیوں میں سے تیرتے ہوئے نکل جاتے اور اپنے پیچھے سنہری اور روپہلی چنگاریوں کے بل کھاتے اور رقص کرتے غبار کے راستے بناتے چلے جاتے۔ اس کے من کی گہرائیوں میں نیلے پانی کی جھیل تھی جس کے کناروں پر جگنوؤں کے بادل کے بادل فراٹے بھرا کرتے تھے۔ پانی کی سطح پر کنول تھے جو اس دھندلی روشنی میں اسے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جب یکے بعد دیگرے اس نے تین بچوں کو جنم دیا تو ان بچوں میں غیروں کو تو کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ لیکن ان کی ماں انہیں پہچان گئی۔ جب بچے گلی کی دھول میں کھیلا کرتے تو ماں کا سینہ خوشی کے مارے پھول جاتا۔ ۔ ۔ وہ بچے کیسے اندھیرے میں سے کیسے اجالے میں آ گئے تھے۔ ۔ ۔

"کیسے اُجالے میں؟" بچوں کا باپ مر گیا تو اس نے بار بار اس سوال کو اپنے من میں دہرایا۔

ڈرتی ہوئی جب وہ پیپل کے ایک چھوٹے سے پیڑ کے قریب سے گزری تو اس کو پتہ نہیں چلا کہ اس پر بیسیوں ہرے بھرے طوطے بھی بیٹھے تھے۔ اسے تب پتہ چلا جب طوطے چھپاک سے گزرتی ہوئی سہمی ہوئی اور مرنے پر تلی ہوئی عورت سے ڈر کر پیڑ سے یوں پھٹ کر اڑے جیسے انار میں سے چنگاریاں چھوٹتی ہیں۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ طوطے باتیں بنانے میں بڑے استاد ہوتے ہیں۔

اگر اس کے مرد کی موت سے پہلے کوئی اس سے کہتا کہ بنا راستے کے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک تاریک گلی سے دوسری تاریک گلی میں چلتے ہوئے ایک سال گزارا جا سکتا ہے۔ تو وہ کبھی اس بات پر یقین نہ کرتی۔ لیکن اب اس نے خود یہ کارنامہ سرانجام دے دیا تھا۔ عجیب بات ہے، جس کام کو کبھی سوچا نہ تھا جس کے تصور سے دل کانپ جاتا، وہی کام کیا، کرنا پڑا۔

واہگورو اکال پرکھ کی کرپا سے کسی نے اسے بیلا سنگھ اور پھیلا سنگھ کے مکان میں سے ایسی بری حالت میں نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدنامی سے بچ گئی۔ اگر اسے اس بات کا علم ہوتا کہ اس مکان میں بلانے کے بعد اس سے اس بات کی توقع رکھی جائے گی تو وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرتی۔

کچھ روز پہلے جب کہ سورج تاریک تالاب میں چھلانگ لگانے سے پہلے افق پر کشمکش کی حالت میں کھڑا تھا۔ مویشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ گھنٹیوں کی موٹی پتلی آوازوں سے نگر کے آس پاس کے کھیت گونج اٹھے تھے۔ وہ اپنے صحن والے تندور کو گھس ملے گارے سے لیپ رہی تھی تو اسے باہر والے دروازے کی دہلیز پر موٹے موٹے بھاری جوتے دکھائی دیئے جو گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ ہر جوتے کی اکلوتی نوک اوپر کو اٹھ کر بچھو کے ڈنک کی طرح گھومی ہوئی تھی۔ ۔ ۔ اس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ مرد کے جوتے تھے وہ!

دھیرے دھیرے اس کی پلکیں اوپر کو اٹھنے لگیں اور ان کے ساتھ ساتھ نگاہ بھی۔ جگمگاتے ہرے رنگ کا تہبند، سلک کا کرتا، نیچے کو لٹکتا ہوا پگڑی کا شملہ، ٹھوڑی پر کالی داڑھی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ۔ ۔ اس کے اوپر وہ سمجھ گئی کہ مسکراتے ہوئے ہونٹ اور ناچتی ہوئی آنکھیں کھالی

دیں گی۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ یہیں سے اپنی نگاہ واپس لے آئے۔ لیکن جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے مڑ کر اوپر دیکھا تو ہونٹ مسکراہٹ سے مبرا اور چہرہ سنجیدہ تھا۔

بیلا سنگھ سر پر سجی سجائی پگڑی اٹھائے کھڑا جلیبیاں کھا رہا تھا... ان جلیبیوں کو وہ جلیب کہتے تھے۔ "جلیب لے کر ادھر سے گزر رہا تو وہ دوان وکھلا دیکھ کر رک گیا۔"

کیوں رک گئے؟ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن وہ دل میں اتنا تو سمجھتا تھا کہ عورت کے من میں یہ سوال سر اٹھا سکتا ہے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

عورت کے چپ رہنے پر اس نے سوال کیا۔

شام یکایک کتنی خاموش ہو گئی تھی۔ شاید سارے مویشی اپنے اپنے گھر میں پہنچ چکے تھے۔ عورت کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے گھر کے باہر ہانک دیا ہو۔

مڑ کر جلیبی کھاتے کھاتے بیلا سنگھ کا ہاتھ رک گیا۔ اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پل بھر کو یوں لگا جیسے وہ اب اپنے کشادہ منہ میں جلیبی کی بجائے عورت کو رکھنے لگا... لیکن نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جن بچوں کی بیلا سنگھ کو تلاش تھی وہ مکان میں سے ہی نکل آئے۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے جلیبیوں کا بڑا سا دونا ان کے حوالے کر دیا۔ "لو جلیب کھاؤ... لو... لو... کھاؤ۔"

وہ تندور لیپتی رہی۔ بیلا سنگھ بچوں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے صحن کے دروازے میں سے سر باہر نکال کر احتیاطاً دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ فوراً پاؤں گلی میں رکھا... اور گلیوں کے دھندلکے میں کھو گیا۔

بیلا سنگھ کی یاد تازہ ہو جانے سے اس کے پاؤں کو پر لگ گئے۔ اس کی وحشت اور دہشت اور بڑھی... وہ اور تیزی سے بھاگی....

آسمان کورا تھا، البتہ اس وسیع، صاف و شفاف نیلی جھیل کے کنارے پر چند نیلی، پیلی، لال، سرمئی بدلیاں جل پریوں کی طرح سہمی سی ٹھٹکی کھڑی تھیں... کچھ عورتوں، مردوں، بچوں، گایوں، بھینسوں اور کتوں نے اس فرار ہوتی ہوئی عورت کو سرسری نظر سے دیکھا اور پھر اپنے کاموں، خیالوں، گلیوں میں کھو گئے۔

کچھ روز مسلسل کسی دھندلی گلی میں سے بیلا سنگھ دھوئیں کے مرغولے کی طرح بل کھاتا ہوا آتا رہا۔ بظاہر بچوں سے پیار کرتا۔ انہیں مٹھائی کھلاتا۔ بڑی سنجیدگی سے بچوں کی ماں کو سر سے پاؤں تک دیکھتا... کبھی یوں لگتا۔ جیسے وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہہ رہا ہو: "دیکھو رنگ کرتار دے۔" یعنی بھگوان کی لیلا نیاری ہے۔

اب وہ مکان اس کی ملکیت نہیں رہا تھا... رہن اور سود در سود کے چکر میں وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بیلا سنگھ نے کہہ دیا۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ وہ وہیں رہتی رہی۔ ساہوکار نے چپ سادھ لی۔

کتنی بار اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان سب کا ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا... ذرا سی بھاگ بھاگ کر وہ تنگ آ چکی تھی۔ بیلا سنگھ اور دوسرے لوگوں میں ایک بہت بڑا فرق تو یہ تھا کہ یہ شخص سنجیدگی کا پتلا تھا۔ دوسروں کی ناچتی ہوئی پتلیوں کے پیچھے ہوس جبڑے پھیلائے دکھائی دیتی تھی۔

اب بیلا سنگھ بھی آنے لگا تھا۔ وہ بچوں کے لئے ایک اسکول کھولنے والے تھے۔ پڑھی لکھی نہ ہونے پر بھی وہ گورمکھی جانتی تھی۔ بیلا سنگھ اور پھیلا سنگھ بھی محض اتنا ہی چاہتے تھے کہ وہ بچوں کو اوڑا، ایڑا، ایڑی پڑھا دیا کرے۔ دراصل وہ اس کی مدد کا کوئی وسیلہ نکالنا چاہتے تھے۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے اس نے خوش قسمت عورتوں کو دیکھا جو اس وقت اپنے گھروں کی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں بیٹھی چرخے کات رہی تھیں۔ ایڑ نے

پر سوت لپیٹ رہی تھیں۔ بعض لاڈلے بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھی موج مار رہی تھیں۔

آخر آج وہ ان کے مکان کے نکڑ والے کمرے میں پہونچ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے ٹھٹک ٹھٹک کر قدم اٹھاتی ہوئی لوہے کی ایک کرسی کی طرف بڑھی۔ شلوار سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے اس سینہ کو جس پر تین بچے پل چکے تھے، ڈوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اس کے بالوں کی مانگ بالکل سیدھی تھی جیسی کالی گھٹا میں اڑتے ہوئے سفید بگلوں کی قطار۔ اس نے سر پر بھی دوپٹہ اس انداز سے اوڑھ رکھا تھا کہ بال اچھی طرح ڈھک گئے تھے۔ اس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے خوابیدہ سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بڑی اچھی، بڑی پیاری، بڑی سلجھی ہوئی اور بڑی سگھڑ ماں دکھائی دے رہی تھی۔

بیلا سنگھ پہلے سے بیٹھا تھا۔ چھیلا سنگھ بعد میں آیا۔ ان کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تھے، چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ کھانا کھا کر آئے تھے۔ یا پی کھا کر آئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ببول کا ایک ایک کانٹا تھا جس سے وہ دانتوں کو کرید رہے تھے۔ وہ دونوں اب بھی بڑے سنجیدہ تھے جیسے کوئی گہرا مسئلہ درپیش ہو۔

وہ نئے اسکول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔ ابھی تک تنخواہ کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر اس کے ننھے تین بچے بھی تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ گلیوں کی خاک چھانتے پھریں اور بڑے ہو کر آوارہ ہو جائیں۔ اپنے سوالات اور مسائل اس نے ان کے سامنے رکھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ضرورت محسوس نہیں کی یا شاید اسے کوئی جھجک ہو... اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں نہیں کیں۔

اسی طرح سر جھکائے وہ ان کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ پل گزرتے گئے۔ خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اٹھ کر کمرے کے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید اپنی کالی گھوڑیوں پر سوار ہو کر کھیتوں کو نکل گئے ہوں.. انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر اس نے سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ کمرے میں جوں کے توں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ بھاری بھرکم۔ لحیم شحیم۔ بھوت بنا۔ اب انہوں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ ان کی مونچھیں پھڑپھڑائیں۔ باچھیں چر گئیں۔ اور وہ ہنسنے لگے۔ آج پہلی بار وہ اس کے سامنے بے جھجک ہو کر بڑی بے تکلفی سے ہنسے۔

اسی رفتار سے اب وہ نگر کے کنارے تک پہنچ چکی تھی۔ وہ گوردوارے کے احاطے کے پاس سے گزر رہی تھی... گلی کی جانب گوردوارے کی چاردیواری اونچی دیوار تھی۔ اس کی اینٹیں ننگی تھیں۔ دیوار اور بڑے پھاٹک کی مرمت ہو رہی تھی۔ صحن میں جو کافی طویل و عریض تھا پرانے زمانے کا ایک چبوترا تھا اور چبوترے کے پاس چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس تالاب کو مذہبی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن اس میں برگد اور رتنر مینے کے پیڑ تھے جن کی گھنی چھاؤں تلے کافی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ اس سے گوردوارے کے گرنتھی جی رہتے تھے۔ ابلے پانی میں سر دھو کر چھاؤں تلے بیٹھے کیس سکھا رہے تھے۔ تالاب کے کنارے کنارے پانی میں ادھ ڈوبے مینڈک انہیں اپنی ابلی ابلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ برگد کے پتے شاخوں سے ناتا توڑ کر ہوا میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پانی کے سینے سے سینہ جا ملاتے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ڈونگے بنے پانی کی سطح پر اٹھلاتے۔

گلی کے قریب ایک جالی دار چھوٹے سے سنگ مرمر کے حجرے میں سنت اوتار سنگھ ایک تانپورہ اپنے بازو کے حلقہ میں لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بانکے کے گول ڈھنگ سے صافہ سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ گہرے گندمی رنگ کے ماتھے پر سوچ وچار اور وجدان کے دو گہرے بل خوابیدہ تھے۔ چوڑی دار پائجامے پر کھدر کا کرتا گلے میں گیندے کے پیلے پھولوں کا ہار۔ لب نیم وا شام کے کیرتن میں گائے جانے والے ایک شبد کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں تانپورے کے تاروں پر رقصاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے کچھ کچھ وقفہ کے بعد پہلو میں لٹکی ہوئی نو اِنچ کی کرپان کے دستے کو سنبھالتے کیونکہ وجد میں آکر جب وہ جھومتے تو کرپان کا دستہ ان کے کولھے میں چبھنے لگتا۔ ان کی آواز میں درد رقصاں تھا.. لَے ایسی جیسے نیم روشن سرنگ میں گہرے پانی کی ندی بہتی چلی جائے۔

کبوتر، لالیاں، ٹھنڈیوں پر کالے داغ لئے چڑے اور گٹی یہ ننھے گوردوارے کی پھلواری میں چہچہا رہے تھے۔ اپنا پیٹ بھرنے

جسے لئے وہ کسی جیتے جاگتے کیڑے پر چونچ کا وار کرتے۔ کیڑا کلبلا کر تڑپتا، بل کھاتا، سرکتا، اچھلتا، آخر جان دے دیتا اور اپنا مردہ جسم ان کا پیٹ بھرنے کے لئے تیاگ دیتا۔

گوردوارے کی حدود سے نکل کر وہ کھیتوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اب منزل اور اس کے درمیان کھیت تھے اور چند پگڈنڈیاں۔ ایک جانب ایک رہٹ کے آگے اونٹ بے ڈول چال سے دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دائرہ تھا اور اونٹ کے چکر۔ اور دوسری طرف ایک اونچے بیے پچھیلے پھیلے بے برگ و گل بیری کی جھاڑیوں کی آڑ میں سے اس کنوئیں کی بوسیدہ منڈیر دکھائی دے رہی تھی جس میں چھلانگ لگا کر وہ ڈوب مرنا چاہتی تھی۔

جس تیزی سے اس کے قدم اٹھ رہے تھے اس سے بھی زیادہ تیزی سے اس کی نظریں تیرتی، تھرکتی، پھسلتی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کی کونپلوں کو چومتی افق تک جا پہنچیں۔ کہیں کہیں کھیتوں میں مدفون بیج انگڑائیاں لے رہے تھے۔ روز روشن کے نور اور رات کے درمیان ظلمت اور مٹی کی تہ اور ان جانی دلچسپ گلیوں کا جال حائل تھا۔

عورت اور دھرتی کا ایک سا حال تھا۔ دھرتی کے سینہ پر سے بھی بپھرے ہوئے بادل کارواں در کارواں پگھلے ہوئے موتی برساتے گزر جاتے تھے۔ کن شاہراہوں سے آتے تھے اور کن منزلوں کی طرف گزر جاتے تھے۔۔۔ دھرتی نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنی کوکھ سے جنم دینا جانتی تھی۔ کتنی شکتی تھی اس میں۔ بیجوں میں سے پھوٹتی ہوئی وہ کونپلیں جو گرم ہوا کے ایک جھونکے سے مرجھا سکتی تھیں۔ مٹی کے ذرّوں سے لڑتی بھڑتی انہیں توڑتے پھوڑتے ایک روز آفتاب عالمتاب سے نگاہیں لڑائیں۔

کائنات اور زندگی کے بے معنی پن پر کڑھنا، الجھنا، رونا بسورنا آسان ہے لیکن کس میں اس بے معنی پن کے حسن کے جلوے کو دیکھنے کی تاب ہے۔ یہ شہزادی ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں تک، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک جھولا جھولتی ہے۔ بے معنی مسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ لیکن یہ بھی تو یاد رکھنے کی بات ہے کہ اگر ہماری خوشی کسی کارن پر مبنی ہے تو ہم کب تک خوش رہ سکتے ہیں؟

کچھ دیر بعد وسیع آسمان کے گوشوں سے تاریکی جلوس در جلوس نکلے گی اور ان کا نگر اس تاریکی میں گم ہو جائے گا۔ اس کے بچے تاریک تر گلیوں کو سنسان پا کر بلک بلک کر رو دیں گے۔

کنوئیں میں ڈوب مرنے کا پروگرام بھی ہو تو گلیوں میں سے ہو کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اگر منزل تک پہنچنے کے لئے ایک گلی بھی پار نہ کرنی پڑے وہ منزل کیسی؟ یا شاید منزل اسی مقام پر ہوتی ہے جہاں سے انسان منزل تک پہنچنے کے لئے بھاگ نکلتا ہے۔

مگر وہ رک گئی۔ اس کے پاؤں سے اڑنے والے دھول کے بادل اس کی پنڈلیوں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے زیر و بم کو متوازن کرنا چاہا۔ اسے کنوئیں اور اس کی گہرائی میں پوشیدہ موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی دھیرے دھیرے گھوم کر اس نے پیٹھ کنوئیں کی طرف پھیر دی۔ وہ بہادر نہیں بن گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل روشن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے اصول اور اپنی عفت کی قربانی نہیں دینے جا رہی تھی۔۔۔ تاہم اس نے بڑے سگھڑ پن سے اپنے سینہ پر دوپٹے کی تہ جمائی اور اس کا پلو سر کے اگلے حصہ تک کھینچ لیا یہاں تک کہ اس کی تابناک پیشانی اور دوپٹے کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور آنسوؤں سے دھلی دھلائی صاف و شفاف جگمگاتی آنکھوں سے نگر پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی۔

کب اور کس گلی سے دھرتی ماتا آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی، کب اور کس گلی میں وہ گھل مل کر کھو گئی۔

سیپ کراچی

قاضی عبدالستار

تحریک

تحریک بیگم ادب کے گول کمرے میں تنقید کے صوفے پر سنگار کے دھوئیں کے چھلّے بنا رہی تھیں۔ کمرے کا فرش آٹھ انچ کالم کی سرخیوں کے قالینوں سے آراستہ تھا۔ موٹے موٹے خاص نمبروں کی دیواریں قلمکار شیشے کے مانند چمک رہی تھیں۔ ان پر پیدا ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کی قدآدم تصویریں سنہری فریموں میں جگمگا رہی تھیں۔ جن کے پیروں میں دو دو فٹ کے بانس بندھے تھے اور سروں پر گھڑے کے برابر دستار ہائے فضیلت لدی ہوئی تھیں۔ ماہناموں کی بوتلوں چھت پر ادھورے خیالوں کے فانوس جھول رہے تھے۔ بیگم نئے سپنیزرے کی جھل مل کرتی ساری باندھے کسی نئے شوشے پر غور کر رہی تھیں۔ کہ ان کے لاڈلے "لیئے پالک" "للّو میاں منھ میں چٹوا دبائے گلے میں چسنی اپنے ہاتھ میں جھنجھنا لئے ٹھنکتے ہوئے آئے۔

"امّی... امّی"

"لے میں صدقے جاؤں امّی کہنے والے منھ پر"۔

"ہم میلے میں جائیں گے.... ہاں"

"میلے میں؟... میلہ کہاں ہے میرے لال؟"

"ہے۔ ابھی ایک آدمی تانگے پر بیٹھا بھونپو میں چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا"۔

تحریک بیگم کی بھٹی کرنے والے ایک شاعر نے جن کا تخلص، قلمی نام اور ایم نگار شعلہ تھا۔ تمباکو کا پاؤچ بند کر کے اور منھ کھول کر بولے۔

"یہ مشاعرے کو میلہ کہہ رہے ہیں۔ آج مشاعرہ ہے نا جھنڈے والے پارک میں"۔ اب اگر تم نہ ہوتے اس وقت تو بچہ بچارہ کیسا جی مسوس کر رہ جاتا۔

"روزنامہ... لے روزنامہ... کہاں الوپ ہو جاتی ہو جاکر۔ موئی بالکل "ماہنامہ" ہو رہی ہو کہ چاند رات کی چاند رات صورت دکھائی پڑ جاتی ہے"۔

"کچھ فرمایئے تو بی بی میں آنکھوں کے نیچے کھڑی ہوں اور آپ ہیں کہ اچھا بھلا دوغزلے کا دوغزلہ کھینچ مارا"۔

"ذرا اس کم بخت ملا دم ترتب علی کو آخر کس مرض کی دوا ہے"۔

"ان کو تو آپ نے غزلگی کو چے سے حقے کے لئے میاں تخلیق کا خمیرہ لینے بھیجا ہے۔ لو شیطان کا نام زبان پر آیا اور شیطان حاضر... بڑی عمر پائی ہے میاں مرتب علی نے"۔

"عمر... اللہ کی قسم یہ عمر آگئی. مگر ایسا تماشہ نہ دیکھا تھا. فرنگی کوچہ بھی مچھلی بازار ہوگیا ہے. کالج کے لونڈے تک قفلیاں گندھے پر لادے خمیرہ خریدنے والوں کو ڈراتے چلے آتے ہیں. بڑی مشکلوں سے دو چار چلموں کا چکا کر لایا ہوں."

"یہ تم پلاسٹک کے ڈبے کو لئے مجھے کیا گھور رہے جا رہے ہو مرتب علی."

"برا نہ مانئے بیگم تو ایک بات پوچھوں."

"مگر پوچھو."

"آپ کی عمر کیا ہوگی."

"اے تجھے کیا رنڈیاں لگی ہیں مردئے .... بھونکتا ہے عمر کیا ہوگی. اوئی... میری عمر ہے وہی مرزا شوق کی مثنوی والی."

"آپ تو بیگم واللہ انگارے اگلتی ہیں. میں نے اس لئے پوچھ لیا تھا کہ آج ان عنبریں لٹوں میں چاندی کا تار چمکتا دکھائی دے گیا."

"عمر پوچھو جا کے اپنی ہونے سونے والیوں کی .... چل اب دفعان ہو یہاں سے میں للو میاں کی کنگھی کرنے جا رہی ہوں. ارے ہاں تم ذرا ہاتھ کے ہاتھ ایک غزل گھسیٹ ڈالو. للو میاں اللہ رکھے آج مشاعرہ پڑھیں گے."

"مشاعرہ."

"تم نے تو یوں منہ کھول دیا. جیسے مشاعرہ کوئی جدید نظم ہے کہ لاکھ ٹکڑی پیٹو سمجھ ہی میں نہیں آتی. ارے وہ ضد آگیا ہے. تھوڑی دیر کے لئے بھیج دوں گی. آخر شہر بھر کے گانے بجانے والے پہونچیں گے کہ نہیں؟ ایک للو میاں کے جانے سے کون سا قہر ٹوٹ پڑے گا مشاعرے کی جان پر"

"لیکن میں تو خالی مقدمہ لکھتا ہوں... غزل وزل تو"

"اور جو سیروں غزلیں ٹانک ٹانک کر ردی کی دکان پر تولا دیں وہ کیا جبرئیل لکھونے آئے تھے."

"وہ میری تھوڑی تھیں، شاعروں کے مسودے تھے جو مزدوری پر نکلوانا پڑے."

"اچھا تو نخاص پہ کے چلے جاؤ کسی مادر زاد شاعر کے آگے چونی پھینکو اور گرما گرم لکھوا لاؤ."

"اب آپ نے لاکھ شعروں کا ایک شعر کہا ابھی گردہ صاحب کو دبوچتا ہوں."

میاں مرتب علی دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے زینے سے اترے اور چوک کی ٹیڑھی میڑھی کھانستی کھنکارتی گلیوں میں ہوتے ہوئے ایک کرم خوردہ دروازے پر جا کھڑے ہوئے. جس کی دہلیز کے برابر بچوں کے چھوٹے چھوٹے قدمچے منہ کھولے بیٹھے تھے. انہوں نے سُر نکالنے کے لئے گلا صاف کیا اور ترنم ریز ہوئے.

"اجی.... حضرت گردہ صاحب تشریف رکھتے ہیں."

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے رینگتی ہوئی نسوانی سرگوشیاں تھم گئیں اور قدموں کی چاپ کے ساتھ کھردری آواز آئی.

"ادھر چلمن کے سامنے طلوع ہو آکر."

مرتب علی بچوں کی طرح پٹر پٹر چلتے ہوئے بازو کی خستہ دیوار میں لگے ہوئے دروازے کے پاس کھڑے ہوگئے. وہ بادامی کلکتیا جوتیوں کی نوکیں چلمن سے جھانک رہی تھیں.

"اب پھوٹیئے."

"آداب بجا لاتا ہوں."

"جیتے رہو۔"

"بندے نے عرض کیا کہ گردے صاحب۔"

"یہ شریفوں کا گھر ہے کہ قصائی کی دوکان ... کون کا بخر دطن شریف ہے حضور کا ... ادنو گردے صاحب۔"

"میں۔"

"قلعی گر کی دوکان ادھر ہے پڑوس میں۔ ذرا تانا ملوٹ بنوا لیجئے جاکر۔"

مرتب علی جان لے کر بھاگنے کو تھے کہ سامنے سے رضائی کی وضع کی شیروانی پہنے اس پر سموسے کی طرح سرتی زرد کام دار رومال ڈالے سڑک کو پلکوں سے لالہ زار کرتے گردے صاحب آتے نظر آئے۔ مرتب علی کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔

"بندگی عرض کرتا ہوں غریب پرور۔"

"آداب عرض۔ آداب عرض گردہ صاحب۔"

"میں نے عرض کیا کہ آج آپ ادھر بے دھب کیسے بھول پڑے۔"

"ارے بھئی وہ بیگم نے بھیجا ہے آپ کے یہاں۔"

"یعنی آپ خود نہیں آئے ہیں بلکہ باندھے ہوئے لائے گئے ہیں اگر آپ فرمائیں تو زحمت کا سبب میں بیان کر دوں۔"

"فرمائیے۔"

"بیگم کا وہ جو یارِ غار ہے کیا نام ہے۔ بس بھلے مانس کا جس کی وکٹوریہ اسٹریٹ پر پان کی دوکان ہے۔"

"نقاد مرزا۔"

"ہاں نقاد مرزا۔ آج کل اس بے چارے کا بازار مندا چل رہا ہے۔ اس لئے بیگم کچھ عظیم شعرا کا انتخاب چھپوانا چاہتی ہیں تاکہ وہ مقدمہ وغیرہ لکھ لکھا کر کچھ کما کھائے۔"

"جی نہیں ... آپ نہیں سمجھے۔"

"واللہ ... تو ایک موقعہ اور۔"

"بوجھئے۔"

"للّو میاں کا ختنہ ہوگا۔ اور شہر کے ڈوم داڑھی سہالک کرنے گئے ہوں گے تو بیگم نے آل انڈیا مشاعرے کی سوچی ہوگی اور خاکسار کو یاد فرمائی کی عزت افزائی۔"

"یہ بھی نہیں جناب گردہ صاحب۔"

"تو پھر آپ ہی کہئے۔"

"ایک عدد غزل کی ضرورت ہے للّو میاں کے لئے۔"

"غزل ... للّو میاں کے لئے۔"

"جی ہاں غزل اور۔"

"آج ہی؟"

"جی نہیں۔ ابھی۔ اسی وقت۔"

"واللہ یہ تو ہفتوان کا طے کرنا ہے۔"

"تو طے کر ڈالئے جلدی سے۔"

"چٹکی بجاتے طے کرتا ہے۔ بیگم بھی کیا یاد کریں گی کہ کس ملک الشعرا سے سابقہ پڑا تھا۔ لیکن ایک زحمت کیجئے۔"

"وہ بھی کہہ ڈالئے۔"

"ذری ایک عدد بیڑی نکال کر سلگا دیجئے۔"

"بیڑی؟"

"جی ہاں... بیڑی... وہ جو اپنا صحت خانہ ہے بغیر بیڑی جان کے جیل خانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"خیر... بیڑی لے لیجئے۔ لیکن خوشبو بدبو کا لحاظ رکھئے گا۔"

"آپ مطمئن رہیں۔"

"میں نے کہا بیگم حضور کہاں ہیں۔ غزل بنوا لایا ہوں۔"

"تو صور کیوں بھونکے رہے ہو۔ باورچی خانے میں نقاد مرزا چلم بھر رہے ہیں انہیں لے کر اوپر آ جاؤ۔"

"میں تو حاضر ہوں۔"

"نقاد مرزا۔"

"فرمائیے۔"

"ذرا مشق کرا دیجئے بچے کو۔ سنا ہے براڈکاسٹ بھی ہوگا۔"

"براڈکاسٹ بھی ہوگا۔ یہ بری خبر سنائی آپ نے۔"

"کیوں۔"

"ریڈیو والے گنگری اور انسٹرے پر ایسا لٹو ہیں کہ نماز بھی پنچم میں ادا کرتے ہیں۔"

"یہ کون سی مصیبت ہے۔ موسیقی تو لونڈی ہے للو میاں کے گھر کی۔ آپ شین قاف دیکھئے۔ میں راگ اجالتی ہوں۔"

ریاض کرتے کرتے جب وقت تنگ ہونے لگا اور مشاعرے کی گھڑی سر پر آنے لگی تب بیگم اٹھیں۔ ایک مرحوم کا سامان امانت کھولا۔ سپاس نامے کی بھڑکدار شیروانی، نثر میں لکھے ہوئے قصیدے کی جھمجھاتی ٹوپی اور بین الاقوامی میگزینوں کے تبصروں کے چمکیلے جوتے نکالے اور درزی کاتب حسین کو طلب کیا۔ کھڑے کھڑے شیروانی کی آستینوں اور دامنوں پر قینچی چلوائی۔ ٹوپی میں ٹلنکے لگوائے۔ اور للو میاں کو اس میں داخل کر دیا۔ جوتوں میں روئی بھر کر پیروں میں اٹکا دیا۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر لباس خانے تشریف لے گئیں۔ بالوں کو سمیٹ کر پیشانی پر جوڑا باندھا۔ اس میں نکلس کو زنجیر کی طرح لپیٹا۔ رخساروں پر سنہرا، آنکھوں کے حلقوں پر ہرا، ہونٹوں پر نیلا اور ابروؤں پر سرخ میک اپ کیا۔ ناخنوں پر سفید پالش لگائی اور نئی تکنیک کا مخصوص لباس پہنا۔ جس کی صورت کچھ ایسی تھی جیسے بچوں کی سینڈوکٹ بنیائن میں ململ کے اٹنگے تہمد کو جوڑ دیا گیا ہو۔ دونوں کپڑوں کا رنگ ایک یعنی سیاہ تھا۔ اس پر چاندی کے تاروں سے دنیا کا نقشہ بنا تھا۔ ہر ملک میں ہونے والی اغوا کی وارداتوں اور ناجائز بچوں اور کوکین کے صرف کے اعداد و شمار کڑھے ہوئے تھے۔ سمندر پار سے منگائے ہوئے وہ جوتے پہنے جن کی ایڑیاں آگے اور پنجے پیچھے تھے۔ داہنی ننگی پنڈلی میں تانبے کی چوڑیوں* کے ڈھیر میں چھپی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ جب ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں تو نقاد مرزا نے انہیں دیکھا۔ داہنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کچھ کہنے کے لئے منہ

کھولا۔ لیکن تقدیر نے یاوری نہ کی۔ اور وہ رعب حسن سے بیہوش ہوگئے۔ مرتب علی کھڑے دیکھتے رہے پھر ہندوستانی فلموں کے عہد جاہلیت کے جانباز عاشقوں کی طرح غش کھا کر ڈھیر ہوگئے۔ بیگم طمانیت سے مسکرائیں اور تازہ اخبار کا پنکھا ہلایا۔ وہ دونوں کوک بھرے کھلونوں کی طرح اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بیگم نے نقاد مرزا کو بسکٹوں کا ڈبہ اور ٹافی کا پیکٹ تھما دیا۔ اور جھنجھنا اور چیڑہ مرتب علی کے حوالے کیا۔ روزنامہ کی نگاہوں سے داد وصول کرتی للّو میاں کی انگلی پکڑے نیچے آئیں اور ٹریکٹر پر بیٹھ گئیں۔ نقاد مرزا اور مرتب علی ڈرائیور کے دائیں بائیں اس طرح بیٹھے کہ خود بھی چھوٹا موٹا نقاد لگتا ...

پارک کے قلب میں لمبا چوڑا شامیانہ نصب تھا۔ عام داخلے کے دروازے پر دونوں طرف چائے کے ہوٹل اور پان کی دکانیں تھیں۔ جہاں شراب کی بوتلیں اور راناسین کی ٹکیاں بھی وافر تعداد میں موجود تھیں۔ خاص دروازے پر والنیٹر ہجوم کئے ہوئے تھے۔ بیگم کی ہاہاکار کرتی سواری دیکھتے ہی چیل کی طرح جھپٹے اور ان کے بدن کی مٹھائی پر مکھیوں کی طرح بھنبھناتے اندر آگئے۔ چبوترے سے ٹاٹ پر سوتی سوزنی بچھی تھی اور مارکین کے غلاف پہنے دو تکیے مردہ بکروں کی طرح پڑے تھے۔ اس کے تین طرف قیمتی صوفوں کی قطاروں پر حکام، تاجر اور خواتین کے لباس ان گنت بلبوں کی تیز روشنی میں جھم جھم جھار رہے تھے۔ پیچھے کرسیوں پر عام مجمع تھا جو سینما دیکھنے کے بجائے مشاعرہ سننے چلا آیا تھا۔ بیگم اپنے لواحقین کے ساتھ ڈائس کے داہنے بازو کے صوفے پر ٹک گئیں اور کالج کے لڑکوں لڑکیوں کو آٹوگراف دینے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سکریٹری صاحب چوڑی دار سیاہ پتلون، چمڑے کی بھوری جیکٹ اور اپنے ہی خشک بالوں کا وگ پہنے "مائک" پر تشریف لائے۔ گوشۂ لب میں دبے ہوئے پائپ کو پتلون کی "ہپ پاکٹ" میں ٹھونس لیا۔ اور کھنکار کر انگریزی میں تقریر کی۔ جس کے اختتام کے بعد ایک وزیر صاحب جن کی مادری زبان ملیالم تھی اور جو انگریزی کے بھی حرف شناس تھے۔ مائک پر تشریف لائے۔ صدارت قبول کرنے کا اعتراف کیا اور شکریہ ادا کر کے ڈائس پر تازہ تازہ وارد ہوئی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ مجمع نے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ پھر سکریٹری صاحب نے ایک کروڑپتی تاجر سے جن کی فرم میں وہ ایک سو بیس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ مشاعرے کے افتتاح کی درخواست کی۔ وہ اینٹھتے بل کھاتے آئے اور بزبان تلیگو ایک عدد تقریر جھاڑ دی۔ اور صدر کے برابر بچھی ہوئی دوسری کرسی پر ڈٹ گئے۔ پھر سکریٹری صاحب نے شبنم نشیں صاحب کا نام پکارا۔ ایک صاحب گلابی "ٹی شرٹ" خاکی سلیکس اور مونچھوں کی طرح نکیلی ٹو والے جوتے پہنے کندھے پر بغیر کالر کا کوٹ ڈالے تشریف لائے۔ ان کے بعد سارنگی نواز طبلے باز اور رجبرہ نواز حضرات نے ڈائس پر رکھے ہوئے مائکروفون کو گھیر لیا۔ اور سُر تال ملانے لگے۔ شبنم آتشیں صاحب جو اپنے جوتے کی چھین ٹو سے سنگت کر رہے تھے۔ یک لخت چپ ہوگئے اور سازندوں کو اشارہ کیا۔ گردن پر ڈھیر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ داہنا ہاتھ داہنے کان پر اور بایاں ہاتھ بائیں کولھے پر رکھ کر نظم شروع کی۔ جو خالص شاعری کی نمائندہ تھی۔ جس میں الفاظ کی بھوکی مادیت کے بجائے لحن کی آسودہ طمانیت سے کام لیا گیا تھا۔ مجمع داد دیتے دیتے ڈائس پر چڑھنے لگا۔ موقعہ پر موجود مجسٹریٹ نے پولیس بلالی۔ لاٹھی چارج کرایا۔ آنسو گیس چھوڑی گئی اور ربڑ کی گولی چلائے مجمع پر قابو پالیا گیا (سننے میں آیا ہے کہ مجسٹریٹ اس نادر روزگار حسن انتظامی کے صلے میں کسی بدنظم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا ہے) سکریٹری نے پھر اعلان کیا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"حضرات و خواتین۔ ہمارے مشاعرے کی خوش نصیبی ہے کہ ملک کے مشہور ہونہار کمسن شاعر اور جدید طرز کے امام حضرت دلگیر آفتاب شحنہ (للّو میاں) ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں۔ اب میں ان سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے کلام سے مشتاق سامعین کو قتل کردیں۔"

تحریک بیگم نے اپنے لاڈلے کے کان میں کچھ کہا اور ٹوپی درست کی۔ اور کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے نقاد کے مشہور فقروں کا ورد کر کے ان پر دم کیا اور ان کی نجیل یعنی انگلی نقاد مرزا کے ہاتھ میں دیدی۔ مرتب علی نے جلدی سے کچھ بسکٹ اور ٹافیاں ان کی

جیب میں ڈالیں اور بہلاتے پھسلاتے ڈائس کی طرف چلے۔ مائک کے سامنے پہونچتے ہی حضرت دلگیر آفتاب شحنہ ٹھنکنے لگے۔ لیکن ان کی آواز کو پیچھے بیٹھے ہوئے سازندوں نے اپنے سر تال میں ہضم کرلیا۔ اتنی دیر میں نقاد مرزا نے بڑی بڑی خوشامدیں کرڈالیں۔ اڑنے والی موٹر اور گانا سنانے والی بندوق لادینے کے وعدے وعید کئے لیکن جب وہ کسی طرح ملائم نہ ہوئے اور رٹی ہوئی غزل کو سنا ڈالنے پر رضامند نہ ہوئے تو ایک ملدہ دھموکا رسید کردیا۔ اور حضرت دلگیر آفتاب شحنہ نے فلک شگاف چیخ (نعرہ) بلند کیا۔ جس کے سوز و ساز سے مجمع کی جان پر بن گئی۔ اور صفت زبان داد کے لہر یا ڈونگرے برسنے لگے۔ پنڈال ملک میں بولی جانے والی تمام ادبی زبانوں کے تعریفی کلمات کے سیلاب میں بہ گیا۔ مجسٹریٹ نے حفاظتی تدابیر کے طور پر پولیس طلب کرلی۔ اور حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ زود فہم سامعین کو گرفتار کرلیا۔ اور ضبط و نظم کو برقرار رکھا۔ نقاد مرزا اور مرتب علی کے دونوں بازو حضرت دلگیر آفتاب شحنہ کو سنبھالے سنبھالے تھک گئے تھے۔ آخر انہوں نے مجمع کو چولہے بھاڑ میں جھونکا اور ڈائس سے اتر کر تحریک بیگم کے پہلو سے لگ گئے۔

دوسرے دن کے تمام اخبار حضرت دلگیر آفتاب شحنہ کے کلام معجز نظام کی تعریف سے رنگے ہوئے تھے۔

دیویندر اسر

ریت اور سمندر

اس روز اچانک میری ملاقات پریش سے ہو گئی۔ پورے پانچ برسوں بعد وہ مجھے مرینا بیچ پر مل گیا۔ وہ سمندر کے کنارے کھڑا دور سے آتے ہوئے کسی جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ پریش کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ برسوں بعد میں اپنے سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ورنہ ہر روز دوسرے لوگوں کے قصے، دوسرے دلیشوں کی باتیں، ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی کی خبریں لکھ کر مجھے ایسا احساس ہونے لگا۔ جیسے میری کوئی ہستی نہیں میں محض ایک کیمرہ ہوں جو ہر لمحہ ہر چیز کی تصویر اتار رہا ہے جو اس کے سامنے آتی ہے۔ اور انہیں الفاظ کی صورت میں اخبار کے صفحوں پر کولتار کی طرح انڈیل رہا ہے۔ دوسرے روز ہی وہ تصویریں اتنی پرانی اتنی دھندلی پڑ جاتی ہیں۔ جیسے برسوں پرانے کسی چہرے کی تصویریں ہوں۔ کرم خوردہ، ماضی کی دھول سے اٹا چہرہ بے نام، بے جان، بے حس۔

پریش سے میری ملاقات اچانک ہوئی تھی۔ میں دلی کی جلا دینے والی گرمی اور بے مصرف ہماہمی سے بھاگ کر ملٹی تال گیا ہوا تھا۔ مجھے کسی ہوٹل میں جگہ نہیں ملی۔ مجبوراً کسی دوسرے کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا پڑا اور یہ کوئی دوسرا پریش تھا جو دھیرے دھیرے میری زندگی کی پر مسرت یاد بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ گھومنے کا اتفاق مجھے بہت کم ہوا کیونکہ وہ عام طور پر کمرے میں ہی بیٹھا رہتا اور پڑھتا رہتا یا تنہا شطرنج کھیلا کرتا۔

ایک روز میں نے پریش کو دعوت نامہ دیا۔ پاٹ کلب میں ناچ کا خاص پروگرام تھا۔ میں نے اس سے چلنے کے لئے کہا لیکن اس کا وہی جواب تھا، فرصت نہیں؟ "وہاں کتنے لوگ ہوں گے۔ رنگ برنگ لباسوں میں شوخ و شنگ لڑکیاں نوجوان، خوبصورت۔" میں نے کہا۔

"پروگرام تو شاندار ہے۔ لیکن مجھے یہ کتاب ختم کرنی ہے۔ موڈ بنا ہوا ہے"۔ پریش نے جواب دیا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ حالانکہ جس لڑکی سے پریش کو متعارف کرانے کی دعوت دی تھی۔ اس کی اک نگاہ کے لئے لوگ ترستے تھے، میں نے اس کے حسن کا بڑا شاعرانہ تذکرہ کیا اور کہا کہ اس کی باہوں میں آدمی یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے قوس قزح پر جھول رہا ہے۔ لیکن اس کا جواب وہی تھا کہ آج اس کتاب کو ختم کرنا ضروری ہے۔ یہ کتاب میرے رگ و پے میں سرایت کر رہی ہے۔ اور میں اس لذت سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔

میں اکیلے ہی پاٹ کلب چلا گیا۔ نندنی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ سنہرے کٹے بالوں اور گہری بلوری آنکھوں والی لڑکی کا نام نندنی تھا۔

لانبا قد، چھریرا بدن، ہلکا سنولایا گورا رنگ۔ جب وہ پاس سے گذر جاتے تو محسوس ہوتا کہ سرخ گلاب کی پنکھڑی جسم کو چھو کر نکل گئی ہے۔ نینی تال میں نندنی کی پرکشش شخصیت کا چرچا ہر جگہ تھا۔ فلیٹس میں، کافی بار میں، یاٹ کلب میں، مال پر، جھیل کے کنارے، ریستورانوں میں، جہاں آدمی ملتے تھے۔ نندنی کے حسن کا ذکر ناگزیر تھا۔ فلیٹس پر تو لوگ نندنی کے انتظار میں اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیسے گرمی کے دنوں میں جھلسے ہوئے بدن ہوا کے ایک جھونکے کی تمنا میں ہوں اور نندنی ٹوٹتے ستارے کی نظر ڈالتی پھول سے قدموں سے آگے بڑھ جاتی۔

جب میں یاٹ کلب پہنچا تو بجلی کی سب روشنیاں جل چکی تھیں۔ تیز مگر نرم روشنیوں میں مرد اور عورتیں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ چھم چھم کرتی ہوئی زندگی میں رنگ اور خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ———— دو چار جوڑے کسی کارنر میں یا صوفے پر نیم روشنی میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ موسیقی شروع ہو چکی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کی ساری پہنے سفید موتیوں کے چمکتے ہوئے ٹاپس لگائے نندنی ہال میں گھوم رہی تھی۔ جب ناچ شروع ہوا تو وہ میرے قریب آ گئی۔ اس کے قدم آرکسٹرا کی لہروں پر تھرکنے لگے۔

ناچ ختم ہونے کے بعد ہم باہر آ گئے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ میرے ہوٹل تک آئی۔ راستے بھر ہم خاموش رہے۔ باہر ہوا سرد تھی اور چاند ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی سایہ سا گذر جاتا تھا۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو پرتیش کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمارا سواگت کیا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے پرتیش کا تعارف نندنی سے کرایا۔ "مسٹر پرتیش زندگی میں کچھ اس تیز رفتاری سے چلے ہیں کہ پہیہ ڈھری سے اتر گیا۔ اور اب مسلسل گھوم رہا ہے۔ بے سمت بے منزل، بے ارادہ"

"شاید کبھی کوئی منزل مل جائے" نندنی نے کہا۔

"شاید —" میں نے کہا۔

"کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں"۔ نندنی نے پوچھا۔

"ہرمین ہیس کے سدھارتھ" پرتیش بولا۔

پھر نہ جانے کس بات پر پرتیش اور نندنی کی بحث شروع ہو گئی۔ پرتیش نے کسی کتاب کا حوالہ دیا اور نندنی نے فوراً جواب دیا۔

"مسٹر پرتیش زندگی کا مطالعہ کسی دوسرے کی کتاب سے نہیں ہو سکتا"۔

"ہر عظیم کتاب زندگی کے دائرے کو وسیع کرتی ہے، گہرا کرتی ہے، نئے معنی دیتی ہے"۔ پرتیش نے کہا۔

"یہ سب بے عمل، شکست خوردہ ذہن کی دلیلیں ہیں"۔ نندنی اب جوش میں بول رہی تھی۔

"ہلکے نیم روشن کمروں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے، کودتے ہوئے جسم کا لمس محسوس کرتے ہوئے اور لمحہ بہ لمحہ ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے تجربے کے سوا زندگی میں اور کچھ اہم نہیں ہے میں ڈوبے ہوئے مدہوش جوان پیکروں کا لذت سے ٹوٹ جانا ہی حقیقت ہے زندگی کی — اور جو لوگ اس لذت سے محروم ہو جاتے ہیں، یا اس قابل نہیں ہوتے۔ وہ کتاب کی مصنوعی زندگی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں روشنی مل گئی ہے"۔ نندنی کا پورا وجود بول رہا تھا۔

پرتیش نے سگریٹ سلگائی اور پھر دھیرے سے بولا۔

"ہر ذی حس آدمی زندگی سے کتاب کی طرف آتا ہے۔ اور پھر کتاب سے زندگی کی طرف۔ یہ مسلسل عمل ہے شخصیت کی تکمیل کا۔

اس کی وسعت کا۔"

" میں نے کافی بنائی، اور پھر ہم سب کافی پینے لگے۔ اس دوران میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب نندنی واپس جانے لگی تو پریش بولا۔" اگر جلدی نہ ہو تو تھوڑی دیر باہر گھاس پر بیٹھ جایئے۔ وعدہ ہے کہ بحث نہیں ہو گی۔ نہ کتاب پر اور نہ زندگی پر۔" اس نے نندنی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

ہم باہر لان پر بیٹھ گئے۔ ہری ہری گھاس پر ابھی ابھی اوس پڑنا شروع ہوئی تھی۔ چیڑ کے درختوں سے چاندنی لپٹ رہی تھی۔ آسمان بہت گہرا نیلا تھا۔ اور ستارے روشن تھے۔ سفید چاندنی کے جھلملاتے ٹکڑوں سے، سامنے جھیل میں ایک شہر بس رہا تھا ایک اجنبی شہر کی پرچھائیاں، اندھیروں، روشنیوں، کھمبوں، کشتیوں، آدمیوں، سایوں سمیت مکمل شہر۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ جیسے ساری چہل پہل کی زندگی کسی غار میں سرک گئی ہو۔ دور پہاڑ گم سُم دیوار سے کھڑے تھے۔ اور سرد ہوا پیڑوں کو چیرتی ہوئی ہماری جسموں کو ٹٹول رہی تھی ۔ اس سنسان پُرسکون سناٹے میں جیسے ہم بہت نرم ہو گئے تھے۔ بہت ہلکے پرندوں کی طرح۔ اور پھر ہم اس گہرے سناٹے میں جذب ہو گئے۔ اچانک پریش بولا۔" ہوا سرد ہونے لگی ہے چلا جائے۔"

ہم جیسے کسی خواب سے چونک پڑے اور ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ ہم سب اٹھ بیٹھے۔ میں نندنی کو چھوڑنے دور تک اس کے ساتھ گیا۔

جب میں واپس آیا تو پریش سو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بند کتاب تھی۔ دوسرے روز اسے دلّی واپس جانا تھا۔ اور وہ اپنا سامان پیک کرنے میں مشغول رہا۔ میرا پروگرام چاننا پیک جانے کا تھا۔ اس لئے صبح صبح ہی روانہ ہو گیا۔ اور جب واپس آیا تو پریش جا چکا تھا۔

میں نندنی سے ملنے اس کے ہوٹل گیا۔ میں نے دستک دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہ کمرے میں نہیں ملی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ نینی تال سے چلی گئی ہے۔ اور پھر دھیرے سے بولا۔ جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہا ہو۔ رات بھر وہ باہر لان پر سرد چاندنی میں بیٹھی رہی۔ ایک شال اوڑھے ہوئے صبح اس نے بیرے سے چائے منگوائی اور سامان پیک کروایا۔ اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔

میں واپس اپنے ہوٹل آ گیا۔ نندنی اتنی جلدی کیوں چلی گئی۔ اس کا اتنی جلدی جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ نندنی کے بغیر ...نا میں کتنی اداس ہوں گی۔ پریش بھی جا چکا تھا۔ مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ میرے ذہن میں پریش کی کئی تصویریں ابھر رہی تھیں ...ری ہری گھاس پر بیٹھے ہوئے درختوں پر کھلتے ہوئے پھول دیکھتے ہوئے، پرندوں کا گیت سنتے ہوئے، پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف ...پھیلتی کرنوں کا ناچ دیکھتے ہوئے، گرتے ہوئے پانی کا سنگیت سنتے ہوئے جھیل کے کنارے پانی میں تیرتے چاند ستاروں ...ے دیئے جلتے ہوئے دیکھتے ہوئے، آرام کرسی پر نیم دراز کتاب پڑھتے ہوئے، کسی تصویر کے سامنے گم سُم کھڑے ہوئے، چاندنی ...ت میں تنہا بھیگتے ہوئے، چائے پیتے پیتے بحث کرتے ہوئے، کتنی یادیں وابستہ تھیں ان سے۔ آج اچانک اسے دیکھ کر میں خوشی ...ے سے اچھل پڑا اور اس سے لپٹ گیا

" پریش" میں چلایا۔

" ہیلو ڈیر تم یہاں کیسے" اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا کہ ایک کانفرنس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ پھر ہم سمندر کے کنارے بیٹھے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ہمارے سامنے دور دور تک سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا گہرا نیلا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ اس کے دوسرے کنارے پر لہریں آسمان کو چھو رہی تھی۔ لہریں چاندنی کی دیوار سی اٹھ کر کنارے پر آکر پھیل جاتیں۔ اور پھر واپس لوٹ جاتیں۔ کنارے کی ریت بار بار بھیگ جاتی۔ بائیں طرف سمندر میں ایک جہاز لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ اکیلا کسی خیال میں ڈوبا ہوا شام کے دھندلکے میں جہاز کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ سمندر میں جیسے روشنی کے جزیرے ابھر آئے ہوں۔ اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ بیتے ہوئے پانچ برسوں کی باتوں باتوں میں نندنی کا ذکر آگیا۔

"معلوم نہیں آج کل نندنی کہاں ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد وہ اسی روز اچانک نینی تال چھوڑ کر چلی گئی۔" میں نے کہا۔

"الٰہ آباد میں ہے۔ سنا ہے کوئی کتاب لکھ رہی ہے۔" پرتش نے بتایا۔

"کتاب" میں چونکا۔ "نندنی اور کتاب۔ کتاب تو اس کے کمرے میں محض ایک ڈیکوریشن پیس کے سوا کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہر آدمی کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے۔ جب اس کی ساری زندگی ایک کتاب بن جاتی ہے۔ اگر وہ اس [illegible] میں لے آئے تو آرٹسٹ بن جاتا ہے۔ اور اگر کھو دے تو ہجوم میں ایک چہرہ۔ جو کسی دوسرے چہرے سے مختلف [illegible]" پرتش نے کہا۔

"کیا نندنی سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

پرتش نے جیب سے ایک کتاب نکالی جس کی پشت پر لکھا تھا۔

"If I stepped out of my body, I
would breake into blossom."

نیچے نندنی کا نام لکھا تھا۔ پرتش کے لئے۔

مجھے پرتش اور نندنی کی بحث یاد آ رہی تھی۔ اور پھر وہ رات جب ہم چاندنی میں باہر گھاس پر خاموش بیٹھے بڑی دیر تک اوس میں بھیگتے رہے

"پرتش ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "نندنی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"رشتہ" پرتش زور سے ہنسا۔ "اسے سمجھنے کے لئے ہی تو وہ کتاب لکھ رہی ہے۔ اور میں سمندر کے کنارے کھڑا اس کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ لہروں کے مدوجزر سے لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

میں نے سمندر کی جانب دیکھا۔ اور پھر پرتش کی طرف — دور دو آدمی ایک کشتی کو کنارے پر لا رہے تھے۔ سائے کی طرح کشتی لہروں کی سطح پر کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوب جاتی۔

اور کنارے کی ریت بار بار بھیگ رہی تھی۔

اقبال متین

کنول اور گندم

ناریل کے جھاڑوں کے جھنڈ میں کہیں کہیں گہرے سائے بکھرے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں سورج کی کرنیں ان سایوں کی ٹھنڈک پر یلغار کر رہی ہیں اور زمین پر آ کر دھوپ کے دھبے بن گئی ہیں۔ گرم دھوپ کے یہ روشن دھبے گھنے سایوں کی ٹھنڈک کو مجروح کر رہے ہیں اور مجھے ان کی بڑھتی ہوئی تمازت کے تصور سے دحشت سی ہو رہی ہے۔ ابھی تک ہوا کے جھونکوں میں بڑی خوش گواری ہے۔ بڑی خنکی ہے جس سے مجھے سکون حاصل ہو رہا ہے۔

میرے بالکل مقابل کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ایک کیکر کا درخت کھڑا ہے جس کی پھلیاں سوکھی ہوئی ہیں۔ لیکن پتے بالکل ہرے بھرے ہیں۔ ایک مینا ابھی ابھی زمین پر اتر آئی ہے اور میرے وجود سے بے نیاز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس جھیل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جس کے سینے پر کنول ہی کنول تیر رہے ہیں۔ مجھے اس مینا کا اس طرح زمین پر چلنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اس زمین نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں اپنے قدم اس زمین سے اوپر اٹھالوں۔ ہواؤں میں ڈولوں اور بلند ہو کر فضا کی وسعتوں میں کھو جاؤں۔ اور یہ مینا سب کچھ چھوڑ کر زمین پر اتر آئی ہے۔ میں نے ایک کنکر اس کی طرف پھینک دیا ہے اور وہ ذرا سا اڑ کر رنگ برنگے پھولوں کے پودوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

کیکر کے درخت کے قریب ہی بمبو کے درخت ہیں اور اس سے کچھ فاصلے پر پھر ایک کیکر کا درخت۔ مجھے پیپل کے گھنے سایوں کی تلاش ہے جو یہاں نہیں ہیں۔ کیکر اور بمبو کے درختوں کے درمیان ایک بنچ پڑی ہے جو دھوپ کے گرم دھبوں سے اس وقت بھی محفوظ ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ بہت دیر تک محفوظ رہے گی۔ اس بنچ کی پشت ہرے رنگ کی ہے، بازو، پائے اور فریم لال رنگ کے۔ اس بنچ پر ایک آدمی گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کا رنگ کھلا ہے۔ لیکن کپڑے بہت گندہ اور میلے ہیں۔ اس نے اپنے بوسیدہ قمیص کے اندر شاید کوئی تھیلی چھپا رکھی تھی جو اس کی پشت پر بنچ کے نیچے جھول رہی ہے۔ اس تھیلی کا رنگ زیادہ ہی گندہ ہے جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے انسانی پسینے کی کھار کو اپنا روپ بنا لیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس تھیلی میں جھانک کر دیکھوں کہ اس شخص نے کیا کیا رکھ لیا ہے یا پھر اپنی انگلیاں بے تکلفی سے اس تھیلی میں گھسیڑ دوں۔ میرا یہ بھی جی چاہتا ہے کہ اس تھیلی میں سے اشرفیاں برآمد ہوں اور میں اس طرح حیرت زدہ ہو جاؤں۔ جیسے بنئے کی تجوری کو خالی دیکھ کر ہو سکتا ہوں۔ یہ آدمی میری ان سوچوں سے بالکل بے خبر سو رہا ہے اور میلی کچیلی تھیلی بنچ کے نیچے جھول رہی ہے۔

جھیل میں کنول اتنی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں کہ پانی کہیں کہیں اس طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کہ ٹھنڈے سایوں میں گرم دھوپ

کے دھبے بھی اس وقت دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں صبح کو اول وقت یہاں آیا تھا۔ کنول سے ڈھکی ہوئی اس جھیل پر ایک خوبصورت سا پل ہے۔ پل کے اس سمت پر جھیل کا جو حصہ ہے، اس پر بھی دور دور تک کنول ہی کنول بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن "مدھوبن شکارے" کے لئے جو راستہ بنایا گیا ہے۔ وہ پل پر کھڑے ہو کر دیکھا جا سکتا ہے۔ پانی کا راستہ بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کے درمیان سے گزرتا ہوا بڑا بھلا لگتا ہے۔ مدھوبن شکارا شام کو غروب آفتاب کے وقت لوگوں کو سیر کے لئے لے کر نکلتا ہے اور پھولوں کی دھرتی پر ڈولتا ہوا پانی کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

کچھ بچے، کچھ عورتیں اور مرد بھی راستے سے اس گوشہ تنہائی میں در آئے ہیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوا کہانی سننے کی خواہش میں بے کل ہوں۔ اس فضا کا سارا سکون آنے والوں نے درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ، ایک بچی سے کہہ رہا ہے۔ دیکھ رہی ہو کنول کیسے بکھرے ہوئے ہیں۔ دور دور تک صرف کنول ہی کنول ہیں۔

کوئی نوجوان ایک لڑکی سے مخاطب ہو گیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہلکورے لیتی ہوئی پانی کی سطح پر کہیں کہیں ایک آدھ کنول بڑا بھلا لگتا ہے لیکن یہاں تو ساری جھیل پر کنول اس طرح پھیل گئے ہیں کہ پانی کا وجود ہی معدوم ہو گیا ہے۔ کسی بھی شے کی اصلیت کا اس طرح چھپ جانا انسانی زندگی کے المئے کی طرح ہے۔ کیا ہم کنول کے ان پھولوں پر، ان پتوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ سکتے ہیں؟

میں بنچ پر سوئے ہوئے جس آدمی میں دلچسپی لے رہا تھا وہ اب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا ہے۔ بچوں، مردوں اور عورتوں کی یہ ٹولی خوش گپیاں کرتی ہوئی آگے نکل گئی ہے ــ ایک بچہ میرے قریب آکر رک گیا ہے۔ وہ بڑی حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے فونٹن کی نب سفید کاغذ پر جو نقوش چھوڑ رہی ہے۔ وہ ایک ایسے مسافر کے نقش قدم ہیں جو ریت پر چل رہا ہو اور سراب کو سمندر جان کر اپنی تشنگی مٹانے بڑھ رہا ہو۔

میں جب نظریں اٹھاتا ہوں تو وہ سہم جاتا ہے۔ میں مسکراتا ہوں کہ آدمی کے دل سے آدمی کا خوف دور ہو سکے، وہ بھی جواب میں مسکراتا ہے اور اپنی بہن کو پکار کر کہتا ہے ــ دیکھو نینی یہ شاعر ہے۔ نینی یہ بات سن کر میرے اور اس کے قریب آتی ہے، کاغذوں پر ایک نظر ڈالتی ہے جو میرے سامنے دھرے ہیں اور جن پر میں نے "پیپر ویٹ" کے طور پر سگریٹ اور رکاڑی کی ڈبیاں رکھ دی ہیں، پھر وہ کہتی ہے یہ شارٹ ہینڈ ہے جو وہ لکھ رہا ہے اور پھر دونوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ــ میں سوچتا ہوں اس معاشرے میں جس میں میں سانس لے رہا ہوں شاعری اور شارٹ ہینڈ میں کتنا فرق ہے۔ شاید اتنا ہی جتنا میرے دل میں اور انگلیوں کی پوروں میں ہے۔ کیونکہ کسب معاش کے وقت مجھے ان دونوں میں کوئی ایسا خاص فرق بھی تو نظر نہیں آتا۔

بنچ پر بیٹھا وہ آدمی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے جو ابھی کچھ ہی دیر پہلے گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے بھی اس پر ایک نظر ڈال لی ہے۔ چھدری چھدری سی بو کڑ کی داڑھی جس چہرے پر مجھے اب نظر آئی ہے۔ وہ چہرہ اس بیماری سے بہت جلد مسخ ہو جانے والا ہے جس کے آثار مجھے اس چہرے پر صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ چہرہ اس آدمی کا چہرہ ہے جو ابھی ابھی بنچ پر سو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میری طرف بغور دیکھتا ہے لیکن میں اس کی طرف نظریں نہیں اٹھاتا ــ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف توجہ کروں لیکن میں جانتا ہوں کہ میری ذرا سی توجہ سے وہ میرے قریب آ جائے گا اور پھر مجھ سے پیسہ مانگے گا، کم سے کم سگریٹ تو مانگ ہی لے گا ــ لیکن میری بے توجہی کے باوجود وہ میری طرف آ رہا ہے۔ میں کن انکھیوں سے اس کو دیکھ چکا ہوں اور نظریں جھکا لی ہیں۔ جیسے اس کی آمد سے بے نیاز ہوں ــ وہ قریب آ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ نظریں اٹھا کر اس کا مکروہ چہرہ دیکھوں۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اس طرح اپنے کاغذوں پر جھکا ہوا بھی نہیں رہ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے الجھن سی ہو رہی ہے اور مجھے اس کے گندے وجود کے قرب کا احساس ستا رہا ہے۔ آخر میں میں اس کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ میری

بیزار نگاہوں سے وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں رعونت سے کہتا ہوں۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ لوٹ جاتا ہے۔

میری جانب پشت کیا، جھیل میں جھومتے ہوئے کنول کے پھولوں کو وہ دیکھ رہا ہے۔ میں بھی انہیں پھولوں کو دیکھ رہا ہوں — میری نظریں بھی اسی مقام کا طواف کر رہی ہیں، جہاں اس کی نظریں بھٹک رہی ہیں۔ میری آنکھوں کی بینائی کو اس کی بینائی سے کوئی گھن نہیں آئی ہوگی ورنہ کنول کے ان پھولوں پر جنہیں میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کی نگاہوں کے دھبے سے ابھرتے — مجھے تو صرف اس کے وجود سے گھن آتی ہے — ایک انسان کو ایک انسان کے وجود سے گھن آتی ہے — میں سوچتا ہوں کہ وہ بچہ جو ابھی ابھی میری نظریں اس سے چار ہونے پر کچھ خوف زدہ سا ہو گیا تھا اس نے مجھ میں بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا جو میں اس چگی داڑھی والے مسخ چہرے کے آدمی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

پل پر کوئی سرخ و سفید بوڑھا سفید سوٹ پہنے گزر رہا ہے۔ اپنے سفید بالوں کو اس نے مہندی چڑھا کر سرخ بنا رکھا ہے جو سفید فلٹ کے پیچھے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے بغل میں کچھ کتابیں دبا رکھی ہیں۔ پل پر اپنی سوچوں میں گم سم، خراماں خراماں چلتا ہوا یہ سفید پوش بوڑھا میری نظروں کو بھلا لگتا ہے۔ میں اس بوڑھے کو میلے چکٹ کپڑوں میں سامنے خالی پڑی ہوئی بنچ پر سوتا ہوا دیکھتا ہوں اور اس چھدری داڑھی کے مسخ چہرے والے شخص کو سوٹ اور فلٹ میں پل پر چہل قدمی کرتا ہوا — میری انسان دوستی کے تصورات میلی دھجیوں اور نکھرے ستھرے سوٹ کے درمیان ابھی الجھے ہوئے ہیں کہ وہ آدمی پھر میری طرف بڑھتا ہے جو بنچ پر سو کر اٹھا ہے اور جس کو میں اپنے اصلی لباس میں اپنے قریب آتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے پھر الجھن سی ہونے لگی ہے۔

وہ میرے برابر سے گزرتے ہوئے مجھ سے کہتا ہے — "بنچ میں نے تمہارے لئے چھوڑ دی ہے، آرام سے وہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہوں۔ اور وہ چپ چاپ سا چلا جاتا ہے۔ میں مناظر کے اس حسن میں، نظاروں کی اس خوبصورتی میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہوں۔

سطح آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتوں پر کوئی خوبصورت سا ننھا پرندہ کیڑوں کے تعاقب میں چل رہا ہے۔

درختوں کے جھنڈ میں سے سڑک پر بھاگتی ہوئی ڈبل ڈک کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں — ان بسوں میں سوار ہو کر کتنے ہی لوگ اپنے اپنے روزگار کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے۔

سطح آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتوں پر خوبصورت سا ننھا پرندہ بھی تو اسی کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے جس کے تعاقب میں، سیکلوں پر، رکشاؤں، بسوں اور موٹروں میں لوگ بھاگ رہے ہیں۔ پھر میں زندگی سے بھاگ کر اس گوشۂ تنہائی میں کیوں چلا آیا ہوں — صرف اسی لئے کہ مجھے کہانی کی تلاش ہے۔ صرف اسی لئے کہ میرے بیدار ذہن کو، میرے زندہ فن کو میں زندگی سے دور لے جا کر بہلا سکوں۔ تھپک کر آسودہ کر سکوں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اسے سلا سکوں — اگر کہانی کی تلاش مجھے یہاں لے آئی ہے تو میں وقت سے کٹ کر وقت کی کونسی کہانی لکھوں گا۔ زندگی سے بھاگ کر زندگی کا کون سا افسانہ تحریر کروں گا۔

چڑھتے ہوئے سورج نے مختلف زاویوں سے اپنی کرنیں مجھ پر پھینکی ہیں تو دھوپ کی حدت سے بچنے کے لئے میں نے وقتاً فوقتاً اپنا مقام بدلا ہے — اب میں جھیل سے بالکل قریب چلا آیا ہوں۔ میری داہنی جانب باغ کا وہ ٹریل ہے جس پر سے سواریاں دوڑتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ سر شام یہاں بھی بڑی گہما گہمی ہوگی جھیل میں بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کی طرح انسان سارے باغ میں بکھر جائیں گے۔ یہ گوشۂ عافیت جہاں اب میں بیٹھا ہوں آئس فروش کی گاڑیوں اور خوانچے اور ٹھیلے والوں کی آماجگاہ ہوگا۔

میری توجہ یکایک بٹ جاتی ہے۔ کوئی شخص جھیل میں اکڑوں بیٹھا ہوا سطح آب پر ڈول رہا ہے۔ میں اٹھ کر دیکھتا ہوں۔ ایک چھوٹی سی ٹین کی ہلکی پھلکی ناؤ کے سرے پر اکڑوں بیٹھا ہوا ایک آدمی جھک کر اپنے ہاتھوں سے پانی کو اپنی جانب سمیٹتا ہے اور ناؤ ہولے ہولے آگے بڑھتی ہے۔ یہ باغ کا مالی ہے۔ مرجھائے ہوئے کنول کے پھولوں کی اور سڑے ہوئے کنول کے پتوں کو وہ یا تو نکال لیتا ہے یا انہیں پھر سے تازگی حاصل کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس کی ناؤ آگے بڑھ رہی ہے۔ اور پانی کی پگڈنڈی سی پیچھے چھوٹ رہی ہے۔

سامنے والے چھوٹے پل پر جو جھیل کے بیچوں بیچ ہے۔ کوئی ٹولی پلاسٹک کے رنگ برنگے بیسکٹوں سے آم نکال نکال کر کھا رہی ہے۔ اطراف میں ادھر ادھر لوگ سایہ دار درختوں کے نیچے سستا رہے ہیں۔ بائیں جانب ٹین کی بڑی سی خوبصورت چھتری کے نیچے جس کی جالیاں در تھم ہرے ہیں اور حاشیہ سفید، دو لڑکے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ دراصل ان میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں سے وہ آم جھپٹ لینے کی کوشش میں ہے جو ایک کی بیسکٹ سے دوسرا لے بھاگا ہے۔ وہ شخص جو بنچ پر سو کر اٹھا تھا اور جس کے قریب سے مجھے گھن آ رہی تھی ان بچوں کے قریب ہی کھڑا ہے اور انہیں جھگڑتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ پل پر مگن ٹولی سے ایک لڑکی نکل کر ان گتھم گتھا لڑکوں کے قریب بھاگ رہی ہے۔ بچے نے آم ہوا میں اچھال دیا ہے تاکہ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے بچ کر لڑکی کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ لیکن درمیان ہی سے اس مسخ چہرے والے آدمی نے آم اچک لیا ہے۔ اور ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دوسری سمت بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ بچوں نے شور مچایا ہے۔ پل پر مگن ٹولی متوجہ ہوئی ہے لیکن وہ بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔ مجھے اس کی تھیلی کا خیال آ رہا ہے جس کا رنگ انسانی پسینے کی کھار کا رنگ ہے اور جس میں جھانک کر میں اشرفیاں دیکھنا چاہتا تھا۔

میں جس کہانی کی تلاش میں پھولوں کی اس نگری میں آ پہنچا تھا۔ یہ نگری بھی میرے اس شہر سے کچھ مختلف نہیں ہے جہاں میونسپلٹی کے کچرے کے ڈبوں سے انسانوں کا غول اپنے لئے غذا مہیا کرتا ہے۔

اپنی دری کو میں ابھی ابھی گھسیٹ کر املی کے گھنے پیڑ کے نیچے لے آیا ہوں۔ میری تھرموس اس دری پر لڑھک گئی ہے اور ٹھنڈا میٹھا پانی بہہ نکلا ہے۔ کیونکہ تھرموس کو کاگ نہیں ہے۔ پھر بھی ڈھکن کی وجہ سے میرے لئے بہت سا پانی بچ رہا ہے۔ پانی کے گرنے سے بے شمار چیونٹیاں جو دری سے چمٹی ہوئی ایک سوکھی میٹھی روٹی کے ٹکڑے کو مرکز توجہ بنائے تھیں، منتشر ہو گئی ہیں۔ اور اس انتشار کے سبب میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کب سے میری اس دری کے ساتھ ساتھ باغ میں نقل مقام کرتی رہی ہیں۔ چیونٹی کی ننھی سی جان کے لئے یہ مسافت جو اس قافلے نے میری دری پر طے کی ہے، میلوں کی مسافت ہو سکتی ہے — چیونٹی کی ہمت اور استقلال کا سبق میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔ تیمور لنگ نے چیونٹی سے سبق حاصل کیا تھا۔ لیکن میں نے اس قافلے کو اپنی دری سے الگ کر دینا ضروری سمجھا ہے۔ میرے لئے یہ چیونٹیاں شاید کسی نصیحت کا باعث نہ بن سکیں۔ اس لئے کہ میرے سامنے کوئی ایسی دیوار ہی نہیں ہے جس پر چڑھنے کی کوشش میں یہ چیونٹیاں بار بار گریں۔ اور بالآخر کامیاب ہو جائیں۔ میری نظروں کے آگے جو دیواریں کھڑی ہیں وہ تو کچھ ایسی ہیں جن پر یہ ننھی ننھی چیونٹیاں تو کیا دیو ہیکل آدمی بھی نہیں چڑھ سکتا۔ حالانکہ اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کر لیا ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ کے فتح ہو جانے اور چاند کے زمین بن کر آدمی کے پاؤں تلے آ جانے سے نہ اس مسخ چہرے کا کوئی تعلق ہے جس نے بچوں سے آم جھپٹ لیا ہے۔ نہ اس غول سے کچھ واسطہ جو میونسپلٹی کے ڈبوں سے اپنے لئے غذا مہیا کرتا ہے نہ اس کہانی سے کوئی ربط جس کی تلاش میں، میں سرگرداں ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے انسانی برادری میں پھوٹ پڑ گئی ہے، جدھر سینگ سمائے قافلے نکل پڑے ہیں — کوئی زمین کا سینہ چیر کر آپ ہی اپنی قبر میں اتر رہا ہے کوئی چاند پر کمند پھینک کر ہانپ رہا ہے۔

میں نے پاس ہی پڑا ہوا ایک ڈنٹھل اٹھا لیا ہے اور دری سے چپکے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو الگ کر دیا ہے — لمحہ بھر بعد یہ منتشر چیونٹیاں پھر متحد ہو کر روٹی کے ٹکڑے پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ ان کے اس اتحاد سے بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں کوئی سبق حاصل کروں — اس لئے

کہ میں انسان ہوں۔ میں عظیم ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے لفظوں کے خطوط میں بیٹھ کے اس کنج کی ایک تصویر مکمل کرلی ہے۔ جہاں میں کہانی کی تلاش میں اپنی روزمرہ کی زندگی سے بھاگ کر چلا آیا تھا ـــــ اس تصویر میں زندگی کے کچھ اور رنگ بھرنے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ـــ پوسٹ آفس پہونچتا ہوں اور ایک رسالے کے ایڈیٹر کے نام اس کہانی کو پوسٹ کر دیتا ہوں ـــــ انہیں لکھتا ہوں۔

"معاوضہ فوری بھیجئے/ مجھے شدید ضرورت ہے"۔

پھر یہ جملہ بڑا کھلتا ہے ـــ میں اسے کاٹ دیتا ہوں۔

پھر کچھ سوچ کر کٹے ہوئے جملے پر مجھے ساٹ بار صاد کر دیتا ہوں۔

پھر میں سوچتا ہوں ـــ کاٹنے اور بنانے کے اس عمل نے جو دھبے تصویر پر ابھارے ہیں کیا یہی اس تصویر کا اصلی روپ نہیں ہیں!!؟

کیا یہ تصویر ابھی نامکمل ہے؟

شرون کمار ورما

اندھا کنواں

روشن بستر پر لیٹا کمرے کی خالی دیواروں کو دیکھ رہا تھا — سفید، بے داغ، کفن کی طرح دیواریں۔

دروازہ چرچرا کے کھلا اور بے بے آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ میز کے قریب آکر رک گئی اور اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ روشن کو بے بے کا اس طرح ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنا عجیب سا لگا۔ اس نے بے بے کی طرف دیکھا اور پھر دیوار پر نظریں جما دیں۔ دروازے میں سے رانو کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں کو آخر ہو کیا گیا ہے — کرایہ تو وہ بے بے کو پہلی تاریخ کو دے چکا ہے۔ آج کتنی تاریخ ہے۔ ہوگی کچھ، اسے کیا لینا، پہلی تو آج ہرگز نہیں، پہلی کو بے بے کے چہرے پر رونق ہوتی ہے۔ بے بے کا لڑکا پہلی کو تنخواہ لاتا ہے، سرلا تنخواہ لاتی ہے اور وہ کرایہ دیتا ہے۔ بے بے کا چہرہ بجھا بجھا سا ہے۔ اس لئے آج پہلی تو ہو نہیں سکتی۔

"پہلی تاریخ پھر آئے گی، ضرور آئے گی۔" اُس نے کہا

بے بے کا چہرہ اور بھی زرد ہو گیا۔ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ وہ کچھ بولی نہیں، گم سی کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی اندر چلی گئی۔ دروازہ چرچرا کر بند ہو گیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا ہو گیا ہے، اچھا بھلا تھا۔" بے بے شاید دروازے کے پیچھے رانو سے کہہ رہی تھی۔

کیسے کیا ہو گیا ہے۔ روشن نے سوچا، کون اچھا بھلا تھا۔ یہ ماں بیٹی کس کی بات کر رہی ہیں۔ رانو اُس کا نام لے کر کچھ کہہ رہی ہے۔ یہ لوگ اس کے بارے میں کیوں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ آخر انہیں حق کیا ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ اپنی بات نہیں کرتے۔ دوسروں کا چرچا لے بیٹھتے ہیں۔ ہر آدمی ایک ہی بات دہرا رہا ہے، جیسے سب ایک سانچے میں ڈھلے ہوں، یہ سب بھیڑیں ہیں — وہ بے بے سے کہہ دے گا کہ اسے صرف کرایہ لینے کا حق ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کا نہیں۔ لیکن وہ کیوں جھگڑا کرے۔

وہ اٹھ کر کمرے کے وسط میں آ گیا، پھر ٹہلنے لگا۔ دیوار کو چھو کر اُس نے سوچا، یہ دیواریں کیوں کھڑی ہیں۔ دیوار انسان کو جرم کرنے پر ابھارتی ہے۔ یہ سب لوگ جرم کے خلاف ہیں۔ اور یہی لوگ دیواریں کھڑی کرتے ہیں، نامعقول — وہ میز پر آ جھکا۔ اس نے میز کی ایک ایک چیز اٹھا کر غور سے دیکھی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے شیلف میں رکھی کتابوں کے ٹائٹل دیکھے، کچھ کتابیں کھول کر دیکھیں۔ اُن پر اس کا نام لکھا تھا۔ کتابیں رکھ کر وہ اندر چلا گیا۔ ماں بیٹی دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر لپک کر رسوئی میں چلی گئیں۔ وہ نل پر گیا اور ٹونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کی جالی کے پیچھے سے بے بے اور رانو کے زرد چہرے اسے دیکھ رہے تھے، اُسے نہ ہنسی آئی، نہ غصہ، دراصل اسے کچھ بھی محسوس

نہیں ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ نل پر کیوں آیا تھا۔ تبھی بے بے نے جالی کے پیچھے سے پوچھا۔

"پیاس لگی ہے۔؟"

اُس نے بے بے کی طرف دیکھا، کچھ کہا نہیں، ہو سکتا ہے وہ پانی ہی پینے آیا ہو۔ بے بے لمبے کٹے والے گلاس میں تازہ پانی لے آئی۔ اس نے گلاس لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا، پھر وہ منہ پونچھتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

دروازہ کھلا۔ بے بے اس مرتبہ اپنے خاوند کے ساتھ کمرے میں آئی۔ وہ دونوں چند لمحے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کئے۔ بے بے نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

"روشن جی ۔۔" اُس نے جملہ مکمل کئے بغیر امداد طلب نظروں سے خاوند کی طرف دیکھا۔

اس مرتبہ اُس کا خاوند آگے آکر بولا۔

"آپ کے گھر خط لکھنا ہے، پتہ بتا دیجئے۔"

وہ خاموش لیٹا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ آخر کیا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ اُس نے بے بے کے چہرے پر نظریں ٹکا کر کہا۔

"میں اس ماہ کا کرایہ پیشگی دے چکا ہوں۔"

"آپ کی طبیعت خراب ہے۔" بے بے کا خاوند بولا۔

طبیعت خراب ہے! میری! کب خراب ہو گئی طبیعت؟ وہ سوچنے لگا۔ وہ اس کمرے میں لیٹا ہے۔ ان کی باتیں سن اور سمجھ رہا ہے۔ یہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ اس نے بے بے کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور خالی دیوار کو دیکھنے لگا۔

"سارا قصور ان دیواروں کا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر دیوار نہ ہو تو دنیا کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔"

میاں بیوی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ روشن نے قہقہہ لگایا اور یہ قہقہہ شاید بے بے اور اُس کے خاوند نے نہیں سنا تھا۔ کیونکہ وہ ویسے ہی کھڑے تھے، پھر وہ دونوں چلے گئے۔ روشن اٹھ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ کاغذوں ـــــ پر اُس کا نیلا پارکر ففٹی ون کھلا پڑا تھا۔ کاغذ کورا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کرسی پر آ کر بیٹھا تھا کیا اسے یاد آ گیا۔ وہ ایک کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ کس کی یہ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ سامنے والی للتا کی، جس کی آواز مردوں کی سی تھی۔ اور جو باہر بیٹھ کر ہمارے لال آوارہ کے ناول پڑھا کرتی تھی۔ یا پرکاش کور کی، جس کی دیوار پھلانگتے اس نے ہربھجن سنگھ مستری کو کئی بار دیکھا ہے۔ جب دوسری مرتبہ آدھی رات کے بعد اُس نے ہربھجن سنگھ کو دیوار پھلانگتے دیکھا تھا تو ہربھجن سنگھ اس کے قریب آ گیا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ روشن سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ ہربھجن سنگھ نے ٹھاٹھے میں سے کہا۔

"گل یہ ہے کہ اپنی پرکاشو سے یاری ہو گئی ہے، تُسی کسے کو دسنا مت۔"

روشن نے خاموشی سے اُس کی بات سن لی اور آگے بڑھ گیا، اسے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ کسی کو جا کر یہ سب کچھ بتائے گا۔ اس میں بتلانے کی بات بھی کیا ہے۔ پرکاشو ایک جوان عورت ہے اور اُس کا خاوند کئی برسوں سے بیمار ہے، جس کی صحت کے لئے دعا کرنے وہ روز صبح گوردوارے جاتی ہے۔ ہربھجن سنگھ سے پہلے دیپا رات کو یہ دیوار پھلانگتا تھا، اسے شہر چھوڑ کر جانا پڑا۔ پرکاش کور عورت ہے اور ہربھجن سنگھ اور دیپا مرد ـــ وہ تو اپنے آپ کو بھی نہیں بتاتا کہ کون کس کی دیوار پھلانگتا ہے ـــ جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں، اگر وہ خود کو بتانے لگے تو پاگل ہو جائے، یوں بھی اُس کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے ـــ شاید اس لئے کاغذ کورا ہے اور قلم کھلا ہوا ـــ کہانی لکھنے سے ہو گا بھی کیا ـــ ہربھجن سنگھ ٹھاٹھا باندھ کر رات کو پرکاشو کی دیوار پھاندتا رہے گا ـــ اُس نے قلم اٹھا لیا اور انگلیوں میں گھمانے لگا ـــ اسے وہ لمس اجنبی سا لگا۔ جیسے پہلی مرتبہ اُس قلم کو چھو رہا ہو ـــ (وہ کئی برسوں سے اس قلم کو استعمال کر رہا تھا)۔ اس نے پھر قلم رکھ دیا۔ جب تک یہ دیواریں نہیں گرتیں، وہ نہیں لکھ سکتا۔

وہ اٹھکر باہر نکل گیا۔ للتا نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اسے غور سے دیکھا، وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے سڑک کی طرف بڑھ گیا۔
ہربھجن سنگھ نے اپنے کاؤنٹر کے پیچھے سے دیکھا اور اشارہ کیا، روشن نے ہربھجن سنگھ کی طرف دیکھا، اُسے وہاں پرانے ہیٹر، ریڈیو اور بجلی کا دوسرا سامان نظر آیا، اُس نے سوچا ہربھجن سنگھ کی ہی دکان ہوسکتی ہے، اس علاقے میں وہی ایک بجلی کا مستری ہے۔۔۔ اس نے پرکاش کے تمام پیچ کس دیئے ہیں اور سرکٹ مکمل کر دیا ہے۔۔۔ ہربھجن سنگھ اُسے آگے بڑھتے دیکھ کر پیچ کس سے داڑھی کھجانے لگا اور پھر ایک ریڈیو کے پیچھے ڈوب گیا۔

اپنی چار فٹ کی دیوار کے پیچھے کھڑی پھری، ملنے پہ پہلی گھوڑی کی طرح پرکاش کو رکھڑی ایک عورت کو گردبانی سے کچھ سنا رہی تھی۔۔۔ روشن نے پرکاش کو رکو نہیں، اس ایک اینٹ کی دیوار کو دیکھا جو رات کو ایک نہایت پراسرار اور خطرناک چیز بن جاتی ہے۔ اگر یہ دیوار نہ ہو تو پرکاش کو راس عورت کو بانی سنانے کی بجائے ہربھجن سنگھ کو ماہیا سنا رہی ہو۔۔۔ سارا جھگڑا دیوار اور دل کا ہے۔

سڑک پار سے چاچے چائے والے نے آواز دے لی۔ وہ دکان میں جا بیٹھا۔ چاچا حسب معمول بیڑی سلگا کر اس کے پاس آبیٹھا۔

"اتنے دن نظر نہیں آئے؟"

وہ خاموش بیٹھا چاچے کو دیکھتا رہا۔ چاچا اپنی بات ایک منٹ کو بھول گیا۔ اور اُس نے روشن کی نظر بچا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، اسے جب یقین ہوگیا کہ اس کا چہرہ بدلا نہیں ہے تو وہ پھر بولا۔

"میں روز شام کو تمہارا انتظار کرتا رہا۔"

انتظار، اُس کا انتظار، کیوں؟ چاچا، کیوں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ کون کس کا انتظار کرتا ہے۔ سب موت کا انتظار کر رہے ہیں، کسی کو فرصت نہیں کہ دوسرے کا انتظار کرے۔۔۔ سب بکواس ہے، جھوٹ ہے۔ وہ بیٹھا سڑک پر سے گزرتے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔

چاچا چائے اور چار مینار کا سگریٹ لے آیا۔ پیالی سے بھاپ اٹھتی دیکھ کر روشن نے سوچا۔۔۔ وہ چائے پینا چاہتا تھا، پھر اُس نے چاچے سے کہا کیوں نہیں۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"گوری کل بس کے نیچے آکر کچلی گئی۔ پہچانی نہیں جاتی تھی۔" چاچے نے بتایا۔ "بڑی اچھی تھی بے چاری۔"

وہ سگریٹ کے کش لیتا رہا۔۔۔ کون گوری؟ چاچا کس کی بات کر رہا ہے؟ کچلی گئی۔ پہچانی نہیں جاتی تھی۔۔۔ یہاں کون پہچانا جاتا ہے۔ سب ایک سے تو ہیں۔ اُس نے چائے سپ کی اور سگریٹ کے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

"بے چاری کا بچہ رُل گیا۔" چاچا کہہ رہا تھا۔

تو وہ کیا کرے۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں، یا بڑے نہیں ہوتے۔ تیسری صورت ہی نہیں۔ چائے ختم ہوگئی تھی۔ اُس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسے چائے کی پیالی میں ڈبو دیا۔ کاؤنٹر پر جا کر اُس نے چند سکے چاچے کے سامنے رکھے اور سڑک پر ہو لیا۔ چاچا حیران سا اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے منہ اچکا کر پڑوسی تنور والے سے کہا۔

"نہ جانے اسے کیا ہوگیا ہے۔"

تنور والے نے روشن کی طرف دیکھا اور تنور پر جھک گیا۔

روشن دیر تک چلتا رہا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، کیوں جا رہا ہے۔ وہ کمرے سے نکل آیا تھا اور اب اسے چلنا تھا، چلتا رہا۔ پھر ایک موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ کسی نے سامنے سے آکر اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کچھ کہتا رہا، روشن کو اس کی باتوں میں کوئی معنی نظر نہیں آئے، لیکن وہ کہتا رہا۔ اس کا لہجہ سست ہوتا گیا اور اس نے ہاتھ روشن کے شانوں سے ہٹا کر اس کی طرح جیبوں میں ڈال لئے، پھر اس نے دو چار نام گنوائے، یہ بھی بتایا کہ وہ سب شاعر اور افسانہ نگار ہیں، وہ خود بھی شعر کہتا ہے۔ روشن جیبوں میں ہاتھ ڈالے سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سب ہی یہاں کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔

سیپ کراچی

کوئی شعر کہہ رہا ہے۔ کوئی گنڈیریاں بیچ رہا ہے، اگر ایک شخص اسے آکر بتائے کہ وہ گنڈیریاں بیچتا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔

"وہ سب تمہارے دوست ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

روشن کے کانوں میں گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ آواز اُس نے پہلے بھی کبھی سنی ہے، کہاں؟ یہی اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

تم بتا سکتے ہو یہ کیسی گھنٹی ہے؟"

اس کے سامنے کھڑے نوجوان نے حیرت سے روشن کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ کالج کی گھنٹی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے، کالج میں ہر تیس منٹ کے بعد گھنٹی بجتی ہے۔" اس نے کہا۔ اور بغیر اس نوجوان سے ہاتھ ملائے آگے بڑھ گیا۔ وہ نوجوان فٹ پاتھ پر کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر اپنی راہ پر ہو لیا۔

روشن کے سامنے اب ایک گیٹ تھا جس میں سے لڑکے لڑکیاں آ جا رہے تھے اور باہر ایک شخص سائیکلوں پر نمبر لگا رہا تھا۔ ٹین کے گول ٹکڑے جن پر سفید سے نمبر لکھے تھے۔ اس شخص نے اُسے سلام کیا۔ پھر سامنے سے آتے ایک لڑکے نے سلام کیا۔ دو لڑکیوں نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک نے دوسری سے کچھ کہا اور وہ چلی گئیں۔ وہ کالج کا بورڈ پڑھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اِس کالج میں پڑھاتا ہے اور اسے کلاس لینی ہے۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ سامنے سیڑھیاں تھیں، وہ اوپر چلا گیا — ایک۔ دو — تین — پانچ — ہاں وہ پانچ نمبر میں ہی ایف، اے کی لڑکیوں کو پڑھاتا ہے — لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ اندر کوئی ہندی میں شیکسپیئر کا مرچنٹ آف وینس پڑھا رہا ہے — لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہیں۔ ہندی میں انگریزی پڑھانے والے کی آواز بند ہو گئی ہے۔ ان لڑکیوں کو تو وہ پڑھاتا تھا — وہ باہر ہے۔ پھر یہ آواز کس کی ہے؟

"کیا چاہیئے؟" — ایک نوجوان، کتاب میں انگلی دیئے دروازے میں آیا۔

روشن نے اُسے دیکھا اور اس نے روشن کو۔ لڑکیاں سرگوشیاں کرنے لگی تھیں — وہ بغیر جواب دیئے اتر آیا۔ کیا چاہیئے اُسے، وہ نوجوان اسے دے بھی کیا سکتا ہے۔ لوگ کتنے پاگل ہوتے ہیں، پوچھتے ہیں کیا چاہیئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کچھ نہیں دے سکتے۔

وہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ پرنسپل کے دفتر کے باہر چپراسی اسٹول پر اونگھ رہا تھا۔ دروازے پر چق لٹکی تھی۔ درمیان میں پردہ کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہم ہر وقت پردے کے پیچھے رہتے ہیں۔ چپراسی کا سر جو کمٹ سے لٹکا ہوا تھا اور اُس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پرنسپل بھی اونگھ رہا ہوگا۔ تبھی تو بی۔ اے پاس یہاں پروفیسر کہلاتے ہیں اور ہندی میں انگریزی پڑھاتے ہیں — اس نے سوچا دفتر میں جا کر پرنسپل سے کہئے، اے، ایم، اے، ایم اے ایم، ایڈ! تم پکوڑے کیوں نہیں بیچتے — نہیں وہ اونگھ رہا ہوگا، اگر بیدار ہو گیا تو یہ دوکان بند ہو جائے گی — جو اونگھتے رہتے ہیں، وہی خود کو زندہ بھی سمجھتے ہیں۔ اونگھنے والے سے وہ کیا کہہ سکتا ہے۔

وہ سڑک پر آ گیا۔ چوراہے پر پھر کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"چار دن کہاں رہے؟"

— چار دن، لوگ دنوں کا حساب رکھتے ہیں —

"تم کالج بھی نہیں آئے، غیر حاضری کی اطلاع بھی نہیں دی، پرنسپل نے اور آدمی رکھ لیا ہے۔ کم از کم تم مجھے تو مطلع کر دیتے۔ پرنسپل سے ملے ہو؟"

"وہ اونگھ رہا ہے۔"

" اونگھ رہا ہے!" اُس کا دوست سمجھا نہیں۔

" ہاں، وہ سب اونگھ رہے ہیں۔ اسی لئے تو زندہ ہیں، جاگ رہے ہوتے تو خودکشی کر لیتے۔ یہاں جو بیدار ہے، وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اُس کا دوست اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

" عجیب بات ہے۔" روشن اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا ۔ " تم سب ایک سے کیوں ہو رہے ہو، ہر بھجن سنگھ، چاچا، چپراسی، پرنسپل۔"

" آؤ چائے پئیں۔"

" اس سے کیا ہوگا؟" روشن نے کہا۔ اور سڑک پار اُس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جس کے ہاتھ میں لکڑی کی صلیب پر پیتل کا عیسیٰ مصلوب تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔

" پانچ روپئے۔" وہ شخص اسے دیکھ کر بولا۔

وہ کھڑا صلیب کو دیکھتا رہا۔

" چار لے لوں گا۔"

" مت بیچو اسے، خدا کے لئے عیسیٰ کو مت بیچو۔" وہ چیخا۔ اور صلیب پر سر رکھ کر رو دیا۔

سیپ کراچی
قیصر تمکین

ہنی مون

میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ کمرے کے برآمدے میں کچھ آہٹ ہوئی پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا نسیمہ غالباً بہت سویرے اٹھ چکی تھی اور اب غسل خانے میں تھی مجبوراً مجھی کو اٹھنا پڑا۔ دروازے پر ایک کم عمر نوجوان بلکہ لڑکا کھڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ کون ہے پھر بھی میں نے اس کو اندر بلایا اور سگریٹ پیش کر کے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

وہ کچھ پس و پیش میں تھا اور سگریٹ قبول کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ سے مجھ کو یہ موقع مل گیا کہ پوری طرح اس کا جائزہ لے سکوں اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس اکیس برس کی رہی ہوگی چہرہ بہت ہی دلکش بلکہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کے کوٹ پر ٹائی نہیں لگی ہوئی تھی۔ بلکہ گردن میں اونی مفلر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی کھیل کے میدان سے لوٹا تھا۔

"میرا نام شنکر ہے۔ ـ ـ شنکر!" وہ کچھ کچھ شرمندہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ چائے پئیں گے یا کافی۔؟"

مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی بچے کو مٹھائی چراتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ نسیمہ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا میں نے جب نسیمہ کو دیکھا تو چند ساعتوں کے لئے سب کچھ بھول گیا وہ بہت ہی خوبصورت تھی مگر اس وقت نہانے کے بعد ہلکا میک اپ کر کے بیڈی چسٹر کوٹ میں ملبوس وہ بالکل سامان آرائش کی دکانوں کا ماڈل ـ ـ م ہو رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے غصہ آ گیا تھا خاص طور پر اس وجہ سے کہ سارے کمرے میں تمام سامان انتہائی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔ پھر آپ سے ملوں گا ـــــ" وہ انگریزی میں بہت ہی گڑبڑ میں یہ کہکر چلتا بنا اور میں صرف دروازے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ کون تھا۔ کیوں آیا تھا۔" اپنی خفگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نسیمہ نے پوچھا مگر میں نے اپنی لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔

"بدمعاش ہے۔ کل رات کو ڈائننگ ہال میں برابر مجھ کو گھورے جا رہا تھا اور صبح بھی اس نے گالف کلب سے ہوٹل تک میرا پیچھا کیا ـــــ"

"مبارک ہو۔ آپ کے عشاق یہاں بھی آ پہونچے۔ مگر بھئی میں کسی سے خواہ مخواہ کی ڈوئل لڑنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"میں خود ہی صورت حال سے نپٹ لوں گی۔" وہ بدستور خفگی سے بولی۔

جب ہم اپنے کمرے سے نیچے آئے اور ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تو نسیمہ قدرے شگفتگی پر مائل ہو چکی تھی میں بھی بظاہر لاپروائی

سے سگریٹ پینے میں مشغول تھا مگر میرا خیال برابر اس خوبصورت لڑکے کی طرف ہی تھا. اگر نسیمہ کا کہنا ٹھیک تھا کہ وہ بدمعاش تھا تو وہ استاجری کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے کمرے میں مجھ سے ملاقات کرنے آپہونچتا دیسے اس کے چہرے سے شرافت برستی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے تھا.

جب ہم خچروں پر سوار ہو کر کھلن مرگ کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مجھ کو اس کی ایک جھلک اور دکھائی دی وہ نیچے گالف کورس کی طرف سے مڑکر بازار جانے والی سڑک کی طرف دھیرے دھیرے جا رہا تھا.

دن بھر کی تفریحات اور برفپوش پہاڑوں کے دامن میں گھومتے ہوئے اور نسیمہ کے ساتھ شادی سے پہلے کی باتیں کرتے ہوئے مجھ کو اس کا بالکل خیال نہ آیا. دن بھر کی تفریح سے نسیمہ بہت تھک گئی اور ہوٹل کے کمرے میں پہونچتے ہی وہ بستر پر آرام کے لئے ایسی لیٹی کہ فوراً ہی گہری نیند سو گئی. میں نے اس کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور کھانے کے لئے اکیلا ہی ڈائننگ روم چل دیا. وہاں دو تین جاننے والے سیاح مل گئے اور میں ان سے دیر تک دنیا زمانے کی باتیں پوچھتا رہا. جب ہجوم کچھ کم ہوا اور میں اکیلا کافی پینے کو رہ گیا کہ نجانے کہاں سے شنکر میرے پاس آگیا اور بغیر میری اجازت لئے میری ہی میز پر بیٹھ گیا میں نے چاہا کہ کچھ بد دماغی اور ترش روئی سے کام لوں مگر اس کا دلکش چہرہ دیکھکر یہ خواہش ہوئی کہ اس سے باتیں کی جائیں.

"آپ کی وائف کھانے پر نہیں آئیں" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا.

"کیا آپ ان کو جانتے ہیں" بہت ہی بے اختیارانہ طور پر میرا لہجہ کچھ تیز ہو گیا.

"نہیں. مگر میں ان کو بہت پسند کرتا ہوں ——" یہ جملہ بہت ہی بیباکی کے ساتھ اس نے انگریزی میں کہا.

میں کچھ عجیب سناٹے میں آگیا. اگر وہ اتنا دلکش اتنا معصوم اور اتنا بے باک نہ ہوتا تو شاید اس وقت ڈائننگ ہال میں کوئی غیر خوشگوار واقعہ ہو جاتا مگر میں اس کو خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا. وہ میرے ذہنی و اعصابی خم و پیچ کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا "اس کے لئے ہی میں صبح آپ سے معافی مانگنے آیا تھا".

میں اب بھی کچھ نہ بولا. مجھے شا کے ڈرامے اور موپاساں کی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں کم عمر لڑکے بیاہتا عورتوں سے معاشقے کرتے ہیں. یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے مجھ کو بڑا مزہ آتا تھا اور خود میں بھی تو مسز بخشی کے بارے میں عجیب عجیب سے اینڈے بینڈے تصورات رکھتا تھا. مگر بھی وہ سب انگلینڈ اور فرانس کی باتیں ہیں. اور میں نے تو مسز بخشی پر کبھی کبھی کچھ نہ ظاہر ہونے دیا یہ ان صاحبزادے کو کیا سوجھی کہ نہ صرف میری نئی نویلی بیوی کا پیچھا کریں بلکہ اس کے شوہر سے یعنی یہ کہ اس خاکسار سے اپنے عشق کا اعتراف کرنے آپہونچیں "شوہر بیوی". یہ الفاظ ذہن میں آتے ہی مجھ کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا. ابھی چار پانچ مہینے قبل میں خود ایک طالب علم تھا اور شادی ہی کے سلسلے میں قانون کا فائنل ایر کا امتحان چھوڑ کر گیا تھا اور نسیمہ — نسیمہ تو اب بھی کسی اسکول کی کوئی طالبہ ہی معلوم ہوتی تھی. اس کو بیوی کہنا تو بڑا ظلم تھا. یہ سب باتیں میرے ذہن میں چند منٹوں کے اندر آتی رہیں اور وہ لڑکا میز پر رکھے ہوئے کافی کے سٹ سے کھیلتا رہا.

"آپ کیا کرتے ہیں. کہیں پڑھتے ہیں" میں نے موضوع بدلنا چاہا.

"میں نے سینئر کیمبرج کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا. نیوی جوائن کر رہا ہوں. جلد ہی ٹریننگ پر چلا جاؤں گا" اب وہ بڑے اطمینان سے باتیں کرنے لگا. جیسے ہم دونوں دوست ہو گئے ہوں اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے مشتاق ہوں.

"یہاں کیسے آنا ہوا"

وہ کچھ خاموش ہوا پھر بڑی پھیکی مسکراہٹ سے بولا "یوں ہی گھومنے ——"

"یا عشق لڑانے اور دل بہلانے ——" نجانے کیوں یہ گھٹیا الفاظ میرے منہ سے پھسل پڑے. اصل میں ہر انسان کے ذہن کے

کسی گوشے میں کینہ اور سفلہ جذبات کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ رہتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا بھونڈے پن سے مظاہرہ ہو جاتا ہے اس دلکش اور کم عمر لڑکے نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ باوجود سردی کے مجھے پسینہ آگیا اور میں اپنے گھٹیا پن پر تاسف کرنے لگا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا ــــ "آپ نے غلط سمجھا ــــــ"

تھوڑی دیر تک تو میں نے اپنے کو ملامت کی مگر پھر اپنی کمینگی کا جواز بڑی عقلیت پسندی سے دینے لگا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر وہ بھی تو بد معاش ہے، بتلائیے بھلا آپ کو پہاڑ کی سیر کے لئے آنا تھا تو صرف اس خاکسار ہی کی بیوی پر عاشق ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اور ہو بھی جائے تو کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا۔ ارے آپ کیا ساری دنیا عشق کرنے لگے تو بھی میں کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ کسی کو بھی عشق سے نہیں روکا جا سکتا۔ مگر ان صاحبزادے کو مجھ سے آکر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ صریحاً حرمزدگی ہے ــــ" اتنی موٹی سی گالی اس خوبصورت لڑکے کے بارے میں سوچتے ہی میں پھر نادم ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہونچتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور صوفے پر پڑا ہوا نہ معلوم کیا کیا فضول سی باتیں سوچتا رہا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی اس لئے کمرے میں بڑی خوشگوار گرمی تھی ورنہ باہر سے پورا ہوٹل گہرے بادلوں کی دبیز ردا میں ملبوس تھا اور شاید ہلکا ترشح بھی ہو رہا تھا۔ آتش دان میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالتے ہوئے میرا خیال اچانک بنارس کی گرمی کی طرف گیا جہاں فدا عباس گورچرن سنگھ، جلیسہا اور برو اگری سے بوکھلائے ہوئے شام ہی سے رکشوں پر لد کر سارناتھ جاتے ہوں گے اور وہاں کھلی ہوا میں ہندوستان کی آزادی اور گاندھی جی کی تحریکات کے موضوعات پر گرما گرم بحثیں کرتے ہوں گے۔ ان کو کیا معلوم کہ یہاں سردی سے دانت بج رہے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے میں ہنس پڑا۔ نسیمہ شاید مجھ کو دیکھ رہی تھی اس لئے حیرانی سے بولی "کیوں ہنسے ــــ"

"تم جاگ رہی ہو ــــ"

"میں بڑی دیر سے آپ کو یونہی سوچتے دیکھ رہی ہوں۔"

"مجھے ان صاحبزادے پر ہنسی آ رہی ہے۔ وہ ابھی ڈائننگ ہال میں ملے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے آپ کی بیوی سے لو ہو گیا ہے ــــ"

یہ بات میں نے یونہی بڑھا کر کہی۔

نسیمہ ہنسی اور کچھ غصے میں بولی۔ "آپ نے کچھ تواضع بھی کی ان کی ــــــ!"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی آدمی اگر آپ کے عشق میں مبتلا ہے تو دنیا کے کس قانون کی رو سے میں اس کو روک سکتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں اس لڑکے میں کچھ اپنی پرچھائیں دیکھتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جری ہے اور میں ہمیشہ سے بزدل رہا ہوں۔ تیسری بات یہ کہ آپ کے ماضی سے مجھے اچھی طرح واقفیت نہیں ہے اس لئے بھی کچھ کہتے ڈرتا ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ وہ آپ کو چاہتا ہے اور میں آپ کو چاہتا ہوں اس لئے میں آپ کے چاہنے والے کو بھی چاہتا ہوں۔"

تیسری بات تو میں نے نسیمہ کو چڑھانے کے لئے کہی تھی مگر اس کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے ذرا چھوٹی بات کہی۔ یہ اس کو خوش کرنے اور بڑی مہارت کے ساتھ اس کو مسکرانے پر مجبور کرنے کے لئے کہی تھی۔

"ہونہہ آپ کی باتیں بھی انوکھی ہوتی ہیں کوئی آدمی آپ سے آپ کی بیوی کی تعریف کرے تو کیا آپ کو برا نہیں لگے گا؟"

"کیا ضرورت ــــ ہاں اگر وہ آپ کے بارے میں الزام تراشیوں سے کام لے تو شاید میں Law of [illegible] کی کسی ضمنی دفعہ کے تحت کچھ کاروائی کر سکوں۔" میں نے عرض کیا تاکہ میں نے قانون کا امتحان ادھورا چھوڑ دیا تھا اسی وجہ سے قانون سے اپنی اٹکل پچو واقفیت کا ذکر کرنا میں نے بہت ہی برموقع اور مناسب خیال کیا۔

"بہرحال اب اگر وہ صاحبزادے تشریف لائے تو ایسے میں خود ان کے مزاج پوچھوں گی۔" نسیمہ نے جھک کر کہا۔

" نہیں نہیں بھئی۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا کہ خواہ مخواہ کا کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جائے ۔۔۔" تب مجھے خیال آیا کہ متوسط درجے کی عورتیں اکثر اوقات اپنی پاکدامنی کے اظہار کے لئے ایسے غیر شریفانہ افعال پر اتر آتی ہیں کہ اور بھی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوتی ہے ـــــ

نسیمہ سے اور مجھ سے اس مسئلے پر کئی بار تیز و ترش گفتگو بھی ہوئی جس نے ہماری رخصت کی دلچسپی میں خاصی کبیدگی پیدا کر دی۔ میں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے سے انکار کر دیا جبکہ نسیمہ چاہتی تھی کہ میں شنکر کے ساتھ سختی سے پیش آؤں۔ وہ تمام دن بلا کسی خاص شگفتگی یا تفریح اور مسرت کے گزرے ایسا لگتا تھا جیسے ایک کانٹا تھا جو رہ رہ کر ہم سب کو چبھو رہا تھا۔ نسیمہ کو زیادہ الجھن اور کوفت اس بات کی تھی اس کا شوق سے پہاڑوں کی تفریح کا بنایا ہوا پروگرام چوپٹ ہو گیا تھا۔ مجھ کو اس سے اس سلسلے میں ہمدردی تھی۔ مگر میر سے بھی ہمدردی محسوس کر رہا تھا کہ میرا سارا پیسہ مفت ہی میں برباد ہو رہا تھا۔ کاش ہم کسی اور چھوٹی پہاڑی جگہ پر چلا جاتا۔ یہ خیال مجھ کو بار بار آتا۔ اس کے علاوہ مجھ کو شنکر سے بھی ہمدردی تھی جو معلوم نہیں بیٹھے بٹھائے کس خبط کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو تقریباً ہر جگہ دیکھا۔ جہاں کہیں میں نسیمہ کے ساتھ نکلتا پاس یا دور کہیں نہ کہیں شنکر ضرور مل جاتا گو اب وہ مجھ سے ملتا نہیں تھا۔ تھک ہار کر یا یوں کہئے کہ بور ہو کر ہم نے وقت سے پہلے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔

جس دن ہم چلنے والے تھے وہ سارا دن تمام سامان سمیٹنے کچھ خریداری کرنے اور واپسی کا انتظام کرنے میں گزرا۔ سہ پہر کے وقت کافی ہاؤس میں مجھ کو شنکر مل گیا میں خود اس سے ملا غالباً وہ بھی ملنا چاہتا تھا اس لئے اس کو اپنے ساتھ لے کر میں ایک نسبتاً غیر آباد ریسٹوران میں چلا گیا۔ گرم کافی پیتے پیتے میں نے اس کو اپنے روانگی کے پروگرام سے مطلع کیا اور باتوں باتوں میں میں نے کہا "اچھا یہ سب ڈرامہ کرنے سے آپ کا مقصد کیا تھا"

اس نے مجھ کو ایک عجیب انداز سے دیکھا بالکل ایسے ہی کوئی سمجھدار شخص کسی بچے کو دیکھ کر کہے "بچے تم نہیں سمجھتے ـــــ" مگر درحقیقت وہ چپ رہا۔ میں نے پھر کہا "آج ہم لوگ جا رہے ہیں اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی بیوی سے متعارف کرا دوں۔ آپ خود ان سے بات کر لیجئے اور آپ دونوں جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا ـــــ"

وہ پھر بھی کچھ نہ بولا بلکہ گرم کافی پیتا ہوا نہ معلوم کیا سوچتا رہا۔ آخر میں جب میں نے اس سے ہوٹل چلنے کو کہا تو وہ نہ مانا اور اکیلا ہی کسی طرف چل دیا۔

اس روز ہم ایک ذاتی موٹر گاڑی سے واپس میدانوں کی طرف چل دیئے۔ جس دوست کی گاڑی تھی اس کا ملازم ڈرائیور پہاڑوں کی سیاحت اور سیاحوں کے بارے میں نہ معلوم کیا کیا قصے سناتا رہا اور نسیمہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔ مگر میرا دھیان صرف ایک ہی طرف تھا۔ شنکر کی طرف۔ ایک نامعلوم سا مغموم گہرا وہ میرے دل کو کچھ اس طرح ٹھنڈے اور گہرے بادلوں میں ڈھکے ہوئے تھا جس میں سے چھن کر سورج کی کوئی سنہری خوشگوار کرن آتی معلوم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

رات کو ہم لوگ ایک نسبتاً غیر آباد اور گمنام گاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ میں تھکا ہوا تھا گرم بستر بچھنے کا انتظار کئے بغیر صوفے پر ہی کمبل تان کر سو گیا۔ نسیمہ دیر تک کچھ لکھتی رہی۔

کوئی دس گیارہ بجے کے قریب آہستہ آہستہ باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا طاری تھا۔ میرے کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی۔ مگر ڈرائنگ روم میں جہاں نسیمہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ بڑی پرانی وضع کا ایک فانوس جل رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ نسیمہ چوکیدار سے باتیں کر رہی ہے یا ڈرائیور اپنی نہ ختم ہونے والی کہانیاں سنا رہا ہے۔ مگر نسیمہ کا لہجہ کچھ درشت تھا جس سے مجبور ہو کر میں نے کمرے کے پردے کی آڑ میں ہو کر ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ شنکر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لڑکپن اور لاپروائی کے انداز سے جس میں کہ وہ پہلی بار میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کے سارے تار ایک ساتھ جیسے جھن جھنا اٹھے "کیا نسیمہ اس سے متاثر تو نہیں ہو گئی ہے؟" یہ خیال آتے ہی میرے پورے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑتی معلوم ہوئی۔ اور اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میں غصہ میں پاگل سا ہو اٹھا۔ مگر

ں وقت صرف خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شنکر بہت ہی آہستگی سے نسیمہ کو اپنی دماغی کیفیت کا حال بتا رہا تھا۔ وہ معذرت ں کر رہا تھا۔ معافی بھی مانگ رہا تھا اور نسیمہ خاموشی سے بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

"تو تم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو ــــــ" نسیمہ نے بڑی درشتی سے پوچھا "تم کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ دوسری شادی نہیں یکتی۔ میرا شوہر میرا خود پسند کیا ہوا ہے کوئی جبر و ظلم کی بات بھی نہیں ہے کہ میں اس کو چھوڑ دوں اور پھر یہ کہ تمہارا صرف دماغ خراب ہے۔ جاؤ کوئی ھنگ کا کام کرو ــــــ"

نسیمہ کے الفاظ سے مجھ میں قدرے سکون کے آثار نمودار ہوئے اور میں نے سارے منظر میں بڑی ڈرامائی دلچسپی محسوس کی۔

"آپ میری ایک خواہش پوری کر دیں ــــــ"

نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر بولی "بولو۔ جو کچھ بھی منظور ہے۔ مگر پھر تم کو بھی میری ایک خواہش پوری کرنا ہوگی ــــــ"

"شوق سے آپ جو کہئے گا مجھے منظور ہوگا ــــــ" شنکر نے بشاشت سے کہا۔ پھر اس نے جیب سے ایک انگوٹھی نکالی اور بولا "یہ میں آپکے یہ میں دیکھنا چاہتا ہوں ــــــ" یہ کہکر وہ بچوں کی طرح شرم سے سرخ بھی ہو گیا۔

نسیمہ نے بڑے میکانکی انداز میں انگوٹھی الٹے ہاتھ کی چوتھی انگلی میں پہنی۔ شنکر نے کہا کہ وہ ہاتھ کو روشنی کے رخ پر کرے۔ نسیمہ کوئی منٹ تک ما ہاتھ اٹھائے ہوئے روشنی کے رخ پر کئے رہی اور شنکر غور سے اس کی گوری گوری انگلی میں انگوٹھی کی خوبصورتی دیکھنے لگا۔

ایک دم وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں وہ بولا "بس جی۔ میں جاؤں گا۔ تھینک یو۔ ہاں آپ کیا کہہ رہی تھیں ــــــ"

"میں ــــ میں ــــ" نسیمہ نے کچھ سوچا اور پھر شاید جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بولی "اب تم ڈاک بنگلے کی روش سے چپ چاپ نیچے گھاٹی بن پھاند پڑو ــــــ"

"آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں ــــــ" شنکر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ــــ پوری سنجیدگی سے اب کبھی تمہارا منحوس چہرہ میں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی ــــــ"

شنکر نے ایک منٹ غور سے نسیمہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے شاید وہ اتنے سخت الفاظ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ رے سے باہر نکل گیا باہر اس نے روش کی فصیل پر کھڑے ہو کر ایک دفعہ خوفناک اندھیاری گھاٹی کی طرف دیکھا اور پھر اس کمرے کی طرف جس میں سے انوس کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ اپنے کمرے سے میں دیکھ رہا تھا اور ڈرائنگ روم سے نسیمہ۔ اس نے صرف نسیمہ کے کمرے کی طرف دیکھا اور چپ چاپ یچے کو دپڑا ــــــ اس نے صرف ایک ہی لفظ کہا "اینا ــــــ"

"ارے ــــــ" بیساختہ میرے منہ سے نکلا میں دوڑ کر باہر نکلا مگر چاروں طرف اندھیرا تھا گھٹا ٹوپ ــــ گھور اندھیرا۔

نسیمہ خاموش بت بنی ہوئی ایک ہی انداز میں ــــــ باہر کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ مجھے اس وقت اتنی ذلیل اور اتنی کمین معلوم ہو رہی تھی کہ میں نے اس سے بات بھی نہ کی اور چپ چاپ صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ معلوم نہیں کب اس حالت میں صبح ہو گئی۔

ان باتوں کو ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ ہم میں ــــــ کبھی اس بارے میں کوئی ذکر بھی نہ ہوا۔ دونوں کے دلوں میں جیسے چور تھا۔ اس لئے ہم ہاڑوں پر جانے کا ذکر ہمیشہ کسی نہ کسی طرح ٹال دیتے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں میں کوئی غیر تحریری قسم کا معاہدہ ہو چکا ہو کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی اس بارے میں نہیں چھیڑیں گے۔

برس بیتتے چلے گئے۔

درمیانی مدت میں ہزاروں دلچسپ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ بہت سے ایسے مواقع بھی آئے جب ہم میں ــــــ کسی معمولی سی

بات پر خاصی کشیدگی ہوگئی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ اس نے میری بے رخی کی شکایت کی۔ متعدد بار اس نے اپنی قسمت کا گلہ کیا کہ کیسے نا قدرے انسان سے اس کا پالا پڑا۔ لیکن تمام مشکلوں، طعنوں، اشتعال انگیزیوں یا محبتوں کے باوجود ہم میں کبھی ان دنوں کا ذکر نہ آیا۔ میری تو رائے بھی کہ ایک عام خود غرض عورت کی طرح نسیمہ بھی شنکر کے واقعے کو ذہن کی ہر سطح سے فراموش کر چکی ہے۔ تاہم میں نے ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار بڑے جذباتی موقعوں پر اس کو یاد کیا۔ وہ کون تھا۔ کس گھرانے کا تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس کے گھر والوں پر اس کی پراسرار گمشدگی سے کیا گزری ہوگی۔" یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں اس کی خوبصورت اور جیتی جاگتی شبیہہ آجاتی۔ اور اپنے تصور ہی تصور میں میں اس شبیہہ پر آنسوؤں کی بے مال چڑھاتا۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ مرد کا قربانی کا جذبہ عورت سے زیادہ وسیع اور بھرپور ہوتا ہے صرف کسی ایک عورت کے عارضی حسن کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے اور اس کی لاتعداد مثالیں فنون لطیفہ کے شہپاروں کی شکل میں آج بھی تہذیب انسانی کا انمول ترین خزینہ ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ملتا ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر رنگ و نسل میں محض اپنے عارضی حسن کو زیادہ سے زیادہ آرام وہ ماحول میں رکھنے کی کوشش میں لطیف ترین جذبات کو ٹھکراتی ہیں یہ فن کاروں کی حماقتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے باکمال اور عدیم النظیر شہپاروں کو عورتوں کے فانی حسن کے نام پر معنون کر دیتے ہیں۔ گویا یہ جفا پیشہ عورتیں ہر طرح فائدہ میں رہتی ہیں۔ زندگی میں ہر شبستاں کے دروازے ان کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ اور تمام ممکن آرام اور آسائشیں ان کے لئے فراہم کی جاتی ہیں اور مرنے کے بعد یہ فنکاروں کے تخیلات اور فن پاروں کے ذریعے زندہ جاوید ہو جاتی ہیں۔ وہ گمنام اور پچھڑے حالوں رہنے والے شاعر و صورتگر و افسانہ نویس جن کا یہ معزز عورتیں نوٹس بھی نہیں لیتیں، اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کو امر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہر دور کا المیہ ہے کہ شیریں ہر زمانے میں پرویز کے عشرت کدوں میں محو طرب رہتی ہے۔ جبکہ اس کو بقائے دوام دلانے والا کوہکن ہر عہد اور ہر ملک و قوم میں تیشہ زنی پر مجبور رہتا ہے۔

میں ان باتوں کے بارے میں حال ہی میں ذرا شدت سے سوچنے لگا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ کو حال ہی میں خالد کے کئی خط ملے ہیں جن میں اس نے مختلف طریقوں سے مجھ سے دنیا میں محبت کی ضرورت پر بحث کی ہے۔ اس نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "محبت ایک اہم سماجی ضرورت ہے" میں نے سنجیدگی سے اس کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اکثر اوقات ہم دونوں میں اختلاف رائے بھی رہا ہے۔

دفتر سے آتے ہی معلوم ہوا کہ خالد یہاں آگیا ہے اور ابھی نہا کر سویا ہے۔ میں نے نسیمہ سے کچھ تفصیل پوچھنا چاہی مگر اس نے تشویش سے صرف اتنا ہی کہا کہ "کہہ رہا تھا کہ دو دن کی چھٹی لے کر آگیا ہوں۔ کچھ بہت پریشان لگتا ہے ــــــ"

نسیمہ کا خیال تھا کہ کالج میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے یا کوئی پیسے کی ایسی فوری ضرورت آپڑی ہے کہ وہ خود مانگنے آگیا ہے۔ میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا "صاحبزادے کو عشق ہو گیا ہے کسی سے معلوم ہوتا ہے ــــــ"

وہ ایکدم برامان کر بولی "ہٹئے۔ آپ کو تو ایسی ہی سوجھتی ہے ــــــ"

میں خالد کے کمرے میں گیا وہ آنکھیں کھولے برابر چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ "آگئے آپ ــــــ" وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سا بھی تھا۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں اور وہ باقاعدگی سے میرے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

باتوں باتوں میں خود خالد ہی اصل موضوع کی طرف آگیا اور اس نے بہت ہی باغی اور سرپھرے انداز میں کہا کہ وہ بغیر سحاب کے زندہ نہیں رہ سکتا ــــــ

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم سحاب میں دلچسپی رکھتے ہو اور وہ بھی تم سے متاثر ہے تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم دونوں مل کر جو فیصلہ کرو گے وہ مجھ کو بھی منظور ہوگا ــــــ" مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نسیمہ دروازے سے لگی ہوئی ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"بات اتنی آسان نہیں ہے ــــــ" خالد نے اصل مشکل کی طرف مجھ کو متوجہ کرایا ـــ "اصل میں سحاب کا رویہ کچھ واضح نہیں ہے۔ میرے خیال میں

وہ اپنے گھر والوں کے خلاف شاید نہ جا سکے۔ اور اس کے گھر والوں سے بات چیت کی نوعیت ذرا مختلف ہوگی ـــــــ"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس سلسلے میں میرا دلچسپی لینا قطعی مناسب نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری تمہاری بے تکلفی کچھ دوستوں کی قسم کی ہے اور دنیا والے دو باپ بیٹوں میں اس طرح کی مفاہمت اور بے تکلفی کو شاید کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہ دیکھیں ـــــــ"

"مگر ڈیڈی آپ ہی تو دنیا والوں کو گولی مارنے کی تلقین کرتے ہیں ـــــــ"

"ہاں جہاں تک میری سوچ سمجھی رائے کا تعلق ہوتا ہے دنیا والوں کے بارے میں میرا رویہ یقیناً ایسا ہی رہتا ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف میری رائے کچھ زیادہ دور تک نہیں جا سکتی۔ خیر چھوڑو ـــــ ہاں سحاب کے گھر والوں سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے۔ جو حال تم نے بتایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ خاصے پیسے والے اور اس کی بنا پر کچھ بددماغ لوگ ہیں۔ بہرحال اگر میں کسی ذریعے سے بات چیت کا کوئی سلسلہ نکالوں تو اس کی نوعیت بڑی باضابطہ اور باقاعدہ ہوگی۔ اس صورت میں دو سوال اٹھیں گے جن کے جواب فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔ اول یہ کہ لڑکے کی یعنی تمہاری عمر صرف بیس برس ہے۔ اس قدر کم عمری میں شادی کی عجلت کا کیا جواز ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ اٹھے گی کہ تم ابھی پڑھ رہے ہو۔ تعلیم مکمل کیے بغیر شادی کا کیا تک دوسرے یہ کہ لڑکے کا مستقبل کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ میں لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دوں کہ گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ یہاں اللہ کا دیا اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہو بھی تو لوگ آج کل لڑکی دیتے وقت لڑکے کے گھر والوں کی حیثیت نہیں بلکہ خود لڑکے کا مستقبل دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا خیال فارن سروس میں جانے کا ہے جس کے لئے تم شروع ہی سے کہہ رہے ہو تو تم کو کچھ ضرورت سے زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ اگر تم نے شادی کر بھی لی تو ایسی صورت میں تمہارا فارن سروس کا خیال تشنۂ تکمیل رہے گا۔ کیونکہ شادی اور اس کی ذمہ داریاں تم کو مقابلے کی تیاری کی مہلت ہی نہ دیں گی۔ یہ بات میں صاف صاف نہ صرف ایک دوست اور ایک باپ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں بلکہ ایسا کہتے وقت میرے سامنے خود سحاب کی خوشی و مسرت کا بھی سوال ہے۔ تم یہ فرض کر سکتے ہو کہ یہی باتیں کسی لڑکی کا باپ بھی کہہ سکتا ہے ـــــــ"

خالد چپ رہا۔ جس سے مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ میری رائے سے اتفاق کر رہا ہے یا اختلاف۔

"مگر پھر بھی جذبات کی منزل پر میں تمہارا رفیق ہوں ـــــــ" میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ان معنوں میں کہ تم سحاب کو گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر رضامند کر لو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں آ جائے تو میں بصد شوق تم دونوں کا استقبال کروں گا۔ اور ایسی صورت میں وہ تمام مشکلیں جو میں نے دلائل کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کی ہیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔"

خالد "بھگانے" کے لفظ پر چونکا اور حیرت سے بولا ـــــــ "ڈیڈی ـــــ آپ ـــــــ"

"ہاں ہاں میں ـــــــ" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تم کو اکسا رہا ہوں کہ تم سحاب کو بھگا لاؤ۔ پھر میں باقاعدہ کچہری میں مقدمے کے لئے تیار رہوں گا ـــــــ"

خالد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور اس نے معنی خیز نظروں سے مجھ کو تولا۔ میں نے پھر سنجیدگی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ محبت اور جنگ میں سب روا ہے ـــــــ"

خالد میری باتوں سے خوش ہو گیا۔ اسے کامیابی کا کچھ کچھ یقین پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے پوری دلچسپی سے رات کا کھانا کھایا اور صبح سویرے ہی کی گاڑی سے واپس یونیورسٹی کے لئے چل دیا۔

نسیمہ بظاہر میری باتوں سے ناراض تھی۔ لیکن خالد کو خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ صرف میرے دل میں چور تھا۔ نہ معلوم کیوں دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔

درمیانی مدت میں وہی سب کچھ ہوا جو ہر دور اور ہر زمانے میں اور ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتی آئی ہے۔ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر

خالد کے لئے ضرور جیسے ذہن آسمانی کے نظام میں زبردست فرق پڑ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک متوسط درجے کے نوکری پیشہ باپ کے لڑکے خالد میں سحاب کو کچھ زیادہ کشش نظر نہیں آئی وہ کسی اور متمول ہم جماعت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "شہریار ــــ یہ مجھے شہریار ہے..... ریاست کی مفرور رانی کا لڑکا ہے۔ یہ رانی یہاں سیاسی پناہ گزیں ہے۔ رانی صاحبہ کے پاس اتنے قیمتی جواہرات اور نایاب پتھر ہیں کہ ان سے میرے ایسے کتنوں کو خرید کر غلاموں کی ایک پوری فوج تیار کی جاسکتی ہے"۔ خالد نے نہ معلوم کن جذبات کے تحت مجھ کو خط لکھا۔

میں امتحان کے دنوں میں وہ دل شکنی کے احساس کے ساتھ بہت ہی تھکا تھکا سا واپس گھر آگیا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ امتحان میں شرکت کے لئے بھی زور نہیں دیا بلکہ رات کو اپنے ساتھ ہی اس کو ایک پرانی تاریخی فلم دکھانے لے گیا۔ رات گئے تک دنیا زمانے کی بات کرتے ہوئے میں نے اس کو اپنی مخصوص فلاسفی پڑھائی۔ "یہ عورتیں فانی ہیں ان کا حسن فانی ہے۔ چند سالوں کے بعد تم سحاب کی طرف نظر اٹھانا بھی گوارا نہ کرو گے اور تم کو یقین ہو گا کہ ایک زندگی جو تم کو صرف ایک ہی بار اپنے طور پر گذارنے کے لئے دی گئی تھی۔ تم نے کس غلط فہمی کی نذر کر دی۔" اور پھر میں نے باتوں باتوں میں اس کو پہاڑوں پر بنی موں کا ایک پرانا کم و بیش بیس برس پرانا قصہ بھی سنایا۔ مجھ کو اس کی فکر نہیں تھی کہ نسیمہ حسب دستور کمرے کے دروازے سے لگی ہماری باتیں سن رہی ہے۔

"وہ عورت کون تھی ــــ" خالد نے انتہائی حقارت اور غصے سے پوچھا۔

"نسیمہ ــــ تمہاری ماں ــــ" میں نے کہا۔

خالد دنگ رہ گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کو یقین نہ آرہا ہو۔

اور اس وقت نسیمہ اندر آگئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے آتے ہی خالد کو گلے لگا لیا "میرے لعل۔ میرے بیٹے ــــ" نسیمہ جیسے اس کو اپنی گودی میں چھپائے لے رہی تھی جیسے کوئی ابھی خالد کو اس کی گود سے چھین لے جائے گا ــــ مگر خالد صرف ایک ہی بات پوچھ رہا تھا۔ کیوں ممی کیا یہ سچ ہے ــــ"

"ہاں ــــ" روتے ہوئے ہچکیوں کے بیچ میں نسیمہ نے کہا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی خالد ماں سے ملے بغیر واپس الہ آباد چلا گیا۔

نسیمہ خاموش خاموش ہر کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے۔ ہر دروازے اور ہر دریچے سے باہر خالی خالی نگاہوں سے نہ معلوم کیا گھورا کرتی ہے۔ ہماری بات چیت بند ہے۔ جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے مجرم ہیں۔ اس کو خیال ہے کہ میں نے خالد کو ہمیشہ کے لئے اس سے برگشتہ کر دیا ہے۔ مگر مجھے صرف ایک ہی اطمینان ہے میں نے دیے شنکر کو ایک بار پھر کسی گہری خوفناک گھاٹی میں پھاندنے سے بچا لیا ہے۔

یونس رمزی

محرما

وہ محرم کی پہلی تاریخ کو پیدا ہوا تھا اور اس لئے اس کا نام محرما تھا۔ حالانکہ وہ محرم میں نہ بھی پیدا ہوتا تو بھی اس کا نام محرما ہی ہو سکتا تھا۔ کالی اماوس کی رات اور محرما کی آبنوسی رنگت میں ذرہ برابر فرق نہ تھا اور شاید یہی کچھ وجہ تھی کہ محرما کو رات کا سیاہ آنچل بہت بھلا لگتا تھا۔ دن کا رشیمی اجالا اس کے لئے خط تنسیخ تھا جو گوروں کو کالوں اور کالوں کو گوروں سے علیحدہ کرتا ہے، جو گناہ اور ثواب کے درمیان حدِ فاصل کھڑی کر دیتا ہے، جو امیر اور غریب کو خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لیکن رات میں یہ خط تنسیخ مٹ جاتی ہے حد فاصل کی دیوار منہ کے بل آ جاتی ہے۔ اور امیر و غریب کی تقسیم مٹ جاتی ہے۔ نیند کی غیر مرئی چادر کے نیچے تمام چہرے ایک ہو جاتے ہیں۔ تمام رنگ ایک ہو جاتے ہیں، تمام انسان ایک ہو جاتے ہیں۔ اور پھر محرما مغرب کی اذان پر اللہ اکبر کی آواز پر جذبۂ عبودیت کے تحت آنکھیں جھکا لیتا ہے۔ اللہ بڑا ہے، بیشک بڑا ہے۔ لیکن دن کے اجالے میں پتہ نہیں کیوں یہ بڑائی یہ برتری انسان آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ شام [illegible] کے ساتھ ہی محرما کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ننھے ننھے دیپ اپنے ملائم روشنی کے ساتھ جل اٹھتے۔ مسکراہٹ کی وہ نور آریخ دینے لگتی جو کسی کو جلا نہیں سکتی جو کسی کو جلس نہیں سکتی جو کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ یہ مسکراہٹ تو گُل دیپ کی وہ روشنی ہے جو خدا نے تمام انسانوں کو دی ہے۔ لیکن یہی مسکراہٹ کئی جگہ مہنگے داموں میں بکتی ہے۔ جو سرخ لبوں کے بالوں پر برس کر ایک جگ کو نہال کر دیتی ہے اور کہیں میلین ڈالر اسمائل بن جاتی ہے اور جو کہیں زبردستی لبوں سے نوچ لی جاتی ہے۔

محرما کے لئے سیاہ رات بہ یک وقت ماں ہے، بیوی کا سہاگ ہے اور بیٹے کے لئے روٹی، وہ واقعی کتنی بے چینی سے رات کا انتظار کرتا ہے۔ اور جب رات آ جاتی ہے تو وہ اپنی بھوکی آنکھیں گاڑ کر پوچھتا ہے "... تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی۔ میں کتنی دیر سے بھوکا ہوں۔ تم ہی نے مجھے جنم دیا ہے۔ تیری ہی سیاہی سے میری قسمت کی تحریر اجالی گئی ہے اور تیرے ہی جسم کا میں ایک حصہ ہوں۔

محرما کی ماں بچپن ہی میں سدھار گئی تھی۔ اور ابھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ کی ہڈیوں میں گودے بھی نہیں بھرے تھے کہ اچھو بابو کے یہاں مسالہ رگڑنے لگا۔ اور مرچوں کی لہر سے اس کی ہتھیلی اس طرح جل اٹھتی جیسے اچھو بابو کے حقہ کا آفتابہ جل رہا ہو۔ وہ بلبلا کر رونے لگتا۔ لیکن اس کے آنسو بڑے منحوس قرار دیئے جاتے۔ وہ بار بار لپٹے ہوئے ہاتھ پاجامہ میں پونچھتا ہوا ہتھیلیں صاف کرنے لگتا۔ زیادہ تر لوگ اسے کالیہ کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک بار گورے چٹے ربّی میاں کو گود میں اٹھائے دیکھ کر رتبہ کے خالو نے ایسا زوردار قہقہہ لگایا تھا کہ اس کی روح حلق میں اٹک گئی تھی۔ انہوں نے پھر کہا تھا "بھائی اچھن دیکھنا دن اور رات گلے مل رہے ہیں" اور ایک بار بڑی بی نے اسے تنہا کمرہ میں دیکھ کر ایک دم سے چیخ ماری تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے اس کا تمام دن مذاق اڑاتے۔ اسے مستقل کلو کے نام سے پکارتے اور وہ سبھوں سے کہتا پھرتا "میرا رنگ کالا ہے اس لئے میں اللہ میاں کو بھی پیارا ہوں"۔ اس پر لڑکے اسے اور بھی چڑاتے۔ راہ چلتے لونڈے اس پر پھبتیاں کستے۔ اور محرما کو اپنی بیچارگی پر ایکدم سے رونا آ جاتا۔ پورے گھر میں بس ایک چھوٹی بی تھی جو اسے نہ کبھی چڑاتی اور نہ ہی کبھی اس کی رنگت کا مذاق اڑاتی۔

*

صبح سویرے سعید کی بانگ کے ساتھ بیگم صاحبہ اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیتیں اور اس طرح جھنجوڑنے پر اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اسے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی معلوم ہوتی، لیکن نیند کی چادر میں لپٹا ہوا بوجھل دماغ بیگم صاحبہ کے بار بار جھنجوڑنے پر اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے بام پر کے پیڑ میں لگے ہوئے جھولے پر بٹھا کر کسی نے زوردار پینگ لگا کر اسے فضا میں معلق چھوڑ دیا ہو۔ اس کا دل اور دماغ دونوں پرواز کی آخری سرحد پر پہنچ جاتے۔ اور وہ کھردری ہتھیلیوں سے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں ملتا ہوا باورچی خانہ میں پہنچ جاتا۔ لیکن اس کے باوجود نیند کے جھونکے میں جھومتا رہتا۔ اس کی پوری آنکھیں تو اس وقت کھلتیں جب گیلی لکڑیوں سے اٹھتا ہوا گاڑھا دھواں اس کی آنکھوں میں گھسنے لگتا اور تب اسی لمحہ نیند کا غیر مرئی احساس دھوئیں کی لکیروں میں تحلیل ہو جاتا۔ یا پھر آنکھوں سے رستے ہوئے پانی میں گھل مل کر باطن کے بیکار آخری تنکے کی طرح بہہ پڑتا تھا۔ "ارے محرما۔ پانی گرم کر دے بڑے بابو کے لئے۔" جمراتن خالہ اپنی کھاٹ پر پڑی پڑی ہانک لگاتی اور پھر کھانسی کے جھٹکوں میں اپنی آواز تلاش کرتی ہوئی دوسرے ہی لمحہ دوسرا فرمان صادر کر دیتی۔ "مسالہ بھی پیس لے مردار۔"

اور محرما سردیوں کی کڑکڑاتی صبح میں پانی گرم کرتے ہوئے سوچتا۔ بس اسی پانی میں ڈبکی لگا لے۔ پتہ نہیں کیوں بڑے بابو روز صبح صبح نہاتے ہیں۔ محرما گنگناتے پانی میں اپنی سیاہ انگلی ڈال کر دیکھتا تو سردی سے کانپتے ہوئے جسم میں ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ "جمراتن خالہ پانی گرم ہو گیا ہے۔" وہ باورچی خانے سے زوردار آواز میں خبر دیتا اور یہ رپورٹ بڑے بابو کے بند دروازے پر دستک بن کر گونجنے لگتی۔ "پانی گرم ہو گیا ہے۔" کبھی کبھی بڑے بابو ہزار دستک پر بھی نہ جاگتے اور پانی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ البتہ محرما کے جسم میں دھوپ نکلنے پر گرمی کی جو حرارت آنے لگتی تھی دوبارہ پانی گرم کرنے پر یہ حرارت دھیرے دھیرے پھر پانی میں سما جاتی۔ جب سے بڑے بابو کی کالی کالی آنکھوں والی دولہن آئی تھی محرما کو روز صبح پانی گرم کرنا پڑتا تھا۔ بڑے بابو کی دولہن محرما کو بہت پسند تھی۔ بالکل ننھی منی فاختہ کی طرح۔ دولہن کا کمرہ اس کے جسم کی خوشبو، بستر پر مسلے ہوئے چنبیلی کے پھول سبھوں سے اسے ایک گونہ لگاؤ تھا۔ صبح صبح کمرہ میں داخل ہو کر وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بڑی فرحت محسوس کرتا تھا۔ وہ سب سے پہلے دولہن بی کا ہی کمرہ درست کرتا تھا۔ اور سوچتا تھا جو کبھی اس کی شادی ہوئی تو اسے بھی شاید روز روز نہانا پڑے گا۔ مگر اس روز روز کے نہانے سے بڑے بابو کی رنگت کتنی نکھر آئی تھی۔ جیسے دمکتا ہوا سورج؟ لیکن وہ نہا کر بھی کیا کرے گا۔ کالی رات ہزار بارش سے دھل جائے کالی رات ہی رہتی ہے۔

دن بھر کام کرتے کرتے وہ تھک سا جاتا تھا۔ بنے، صفدر، اصغر پتنگ اڑاتے رہتے اور وہ جو ذرا حسرت بھری نظروں سے پتنگ کی طرف دیکھ بھی لیتا تو قیامت آ جاتی۔ "ارے او کمینے رُوسیاہ پتنگ کے ساتھ کہاں اڑ رہا ہے۔" اور اس کی نگاہیں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح پاتال میں ڈوبنے جاتیں اور وہ پیاز چھیلنے لگتا۔ دوپہر کے وقت ایک ذرا فرصت بھی ملتی تو ننھی کو کھلاتے کھلاتے اس کے کولہے تڑخنے لگتے۔ لیکن ننھی کو کھلاتے وقت بسکٹ یا چاکلیٹ کا ذائقہ اس کے درد پر بڑی میٹھی سی چادر ڈال دیتا تھا۔ اور ننھی کو وہ خواہ مخواہ بھی رلا کر بڑی بیگم سے بسکٹ دلوانے کے بہانے پیسے اینٹھ لیتا تھا۔ انہیں پیسوں سے اس نے جو مہینہ بھر بعد ایک لٹو خریدا تو گھر میں آفت آ گئی۔ صفدر نے اس کا لٹو چھین لیا۔ "میرا ہے میرا۔ کمبخت بڑا چور ہے۔" اور جب اس نے غلطی سے کہہ دیا کہ اس نے خریدا ہے تو بیگم نے لکڑی اٹھا کر بری طرح مرمت کر دی۔ "چوری کرتا ہے مردود۔ رانڈ کے دنگا، کمبخت، کمینہ، بدذات۔" گالیوں کی فہرست اتنی طویل ہوتی تھی کہ وہ انہیں اکثر ذہن میں دہرا دہرا کر مسکرانے لگتا۔ صفدر اور بنے جب بی۔ اے۔ کی کتاب پڑھتے تو وہ دل ہی دل میں دہرانے لگتا۔ محرما معنی حرامی، محرما معنی بدذات، چور، کمینہ کی اولاد اور جانے کیا کیا۔ جب بھی وہ کوئی قصور کرتا تو گالیوں کی طویل فہرست میں ایک آدھ کا اضافہ اور ہو جاتا تھا۔ کھانے میں اسے سب سے روکھا سوکھا ملتا تھا زیادہ تر لڑکوں کے جھوٹے کھانے اس کے حوالہ کر دیئے جاتے تھے اور وہ کتے کی بھوکی جلتی ہوئی آنکھوں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر جاتا۔ لیکن کہیں نہ ملتا۔ بس وہ سالن کی خوشبو ہی سونگھ سونگھ کر دل بھر لیتا تھا۔ اور جو کبھی جی چاہتا تو بڑے بابو کی دسترخوان پر چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو خوان سمیٹتے وقت منہ میں ڈال لیتا۔ البتہ ایک دن اتفاق سے اس نے بڑے بابو کے اندھیرے کمرہ میں قدم رکھتے وقت دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔ لیکن اچانک اس کے دل میں ایسا ہول اٹھا کہ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اور بیگم صاحبہ نے شیشہ کے گلاس کی طرح اس کا خوب چورا کیا تھا۔ اور وہ رات بھر درد سے کراہتا رہا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے اسے دودھ سے جیسے نفرت سی ہو گئی تھی۔

اور یہ چودہ برس کی عمر میں اس کا قد ایک دم سے کھنچ گیا۔ اور اس کا احساس اسے دو ہاتھ آگے کھینچ کر اسے اپنی راہ پر لگانے لگا۔ سبزی ترکاری خریدتے وقت وہ آنہ دو آنہ بچا کر جیب میں ڈال لیتا۔ اور جمراتن خالہ کی کوٹھری میں پڑے کڑوی کے بکسوں کے درمیان ایک ٹین کے ڈبہ میں محفوظ کر دیتا۔

اچھو بابو نے بھی اسے دو روپیہ ماہانہ دینا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ اچھو بابو کے پڑوسی گارڈ صاحب اسے پانچ روپیہ مہینہ دینے کا لالچ دلا چکے تھے۔ اور محرا کی سمجھ آتنی بالیدہ ہو چکی تھی کہ وہ دو اور پانچ کا فرق سمجھنے لگا تھا۔ بڑی بیگم نے بھی گالیوں کی فہرست مختصر کر دی تھی۔ بات بات پر لکڑی اٹھانا کم کر دیا تھا۔ اس لئے کہ محرا کی کالی رنگت پر آنکھوں میں دہکتی ہوئی سرخی بغاوت کا جھنڈا لہرانے لگی تھی۔ بس بیگم صاحبہ کے پاس ایک ہی حربہ رہ گیا تھا۔ اور وہ تھا اسے پال پوس کر بڑا کرنے کا احسان۔ اور محرا واقعی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اگر بیگم صاحبہ کا کوئی احسان نہ بھی ہو تو کم سے کم ان کی چھت اور ان کے چند نوالوں کا تو یقیناً اسے زندگی بھر احسان مند رہنا پڑے گا۔

اور چھوٹی بی کے یہ کہنے کے باوجود کہ محرا انسان اپنی زندگی آپ بناتا ہے۔ اب بھی مار کھانے کے بعد کوئی چیز اس کے پیروں میں بیڑی ڈال دیتی تھی۔ اور وہ اچھو بابو کی ڈیوڑھی میں واپس آ جاتا تھا۔ کوئی انجان طاقت تھی جو اسے شاید اس کی ماں نے مرتے وقت واحد شے اسے ورثہ میں دے گئی تھی۔ اب جو وہ سودا سلف کرنے بازار نکلتا تو اپنے ارد گرد ایک نئی دنیا آباد دیکھ کر سوچنے لگتا وہ بھی اس کا حصہ بن سکتا ہے۔

بچپن کی اکثر دیرینہ خواہشات وہ پوری کرنے لگا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک لٹو خریدا۔ گھنٹہ بھر خوب نچایا اور پھر گارڈ صاحب کے باغ میں کچنار کے درخت کے نیچے دبا کر چلا آیا۔ اور جب بھی موقعہ ملتا گھنٹہ آدھ گھنٹہ لٹو نچا کر خوش ہو لیتا۔ پھر اس نے سجو سے مل کر پتنگ خریدی۔ ایک دن خوب خوب اڑایا اور جب سجو کی حفاظت میں پتنگ دے کر آیا تو بیگم صاحبہ نے پچھلی تمام گالیوں کی بیاض کھول لی اور بری طرح پیٹا۔ اس روز اسے پٹنے پر کوئی زیادہ غم نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا اسے نے بھاری جرم کیا ہے اور کوئی دس روپے ماہوار دے کر بھی اسے ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہونے دے سکتا۔

کچھ دنوں بعد وہ گولیاں بھی کھیلنے لگا۔ اور جیت ہار کا یہ سلسلہ اسے سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوا۔ اسے اب معلوم ہوا کہ اچھو بابو جس دن ریس میں جیت جاتے ہیں تو بیڑیں اور مرغ پلاؤ کیوں پکتا ہے اور جب ہار جاتے ہیں تو سب کو کاٹنے کو کیوں دوڑتے ہیں۔ ایک دن سجو نے اس کی تمام گولیاں جیت لیں تو اسے بڑا بھاری صدمہ ہوا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر آیا اور ٹن کے ڈبہ سے چار آنے کی گولیاں خرید کر پھر سجو کے گھر پہونچ گیا۔ "سجو سالے کھیلو گولی" اور سجو گلی میں آکر جم گیا۔

اور کوئی دو سال بعد سجو کے ذریعہ اس کی ملاقات الی سے ہو گئی۔ جو دریا پور کی گلی میں تاش کھیلتا تھا۔ یہ گولیوں سے بھی زیادہ مزیدار کھیل تھا۔ ایک دن اس نے ڈیڑھ روپے جیت لئے۔ دوسرے دن ڈیڑھ روپے چلے گئے تو وہ ٹن کے ڈبہ سے اپنی کل کائنات نکال لایا۔ اور کل کائنات میں جب دس روپوں کا اضافہ کر کے گھر لوٹا تو اس کا سینہ خوشی سے پھولا ہوا تھا۔

اسی دن اتفاق سے بڑے بابو چور بازاری میں پکڑے لئے گئے تھے۔ اور سارا گھر ماتم کناں تھا۔ اچھو بابو وکیل صاحب کے پاس گئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ گھر سے پھر نکل پڑا۔ اور رات گئے تک تاش کھیلتا رہا۔ حتیٰ کہ کب صبح ہو گئی اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اچھو بابو کی حویلی میں قدم رکھا تو اس کی جیب میں چار آنے پڑے تھے۔ وہ بھی سجو نے رحم کھا کر بیڑی پینے کو دے دیئے تھے۔ وہ گھر میں جاتے ہوئے کانپ رہا تھا لیکن خلاف توقع اچھو بابو نے اسے کچھ بھی نہ کہا بلکہ پاس بلا کر کہنے لگے۔

"محرا دیکھ آج تجھ سے ایک کام لینا ہے بیٹے۔"

اور لفظ بیٹے پر محرا جھوم اٹھا۔ وہ غلاموں کی طرح آنکھیں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

اچھو بابو اسے خاص کمرہ میں لے آئے اور کہا "یہ ایک بکس ہے بیٹے اسے اس پتہ پر پہونچا دو۔" اور وہ ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی بکس رات کے سناٹے میں شہر کے مختلف حصوں میں پہونچانے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان بکسوں میں کیا ہوتا ہے۔ ملے تو بس اچھو بابو کے دو میٹھے بول اور دس روپوں نے خرید لیا تھا جو ہر ہفتہ اس کی مٹھی میں آ جاتے تھے۔ اور وہ ہر ہفتہ تاش کے پتوں کے ذریعہ سجو، الی، امر یا کسی اور کی جیب میں ڈال آتا تھا۔ اسے روپوں کی ضرورت تھی اور اچھو بابو کو بکس پہونچانے کی ضرورت تھی۔

بس یہ کچھ اتفاق تھا کہ ایک دن جب وہ ڈاکٹر   کے گھر بکس پہونچا کر لوٹ رہا تھا کہ ان کے نوکر نے اسے روک لیا۔ "تو جانتا ہے کہ یہ تو کیا کر رہا ہے؟"

"کیا۔" وہ احمقوں کی طرح بولا۔

سیپ کراچی

"چھپا ماری ــــ تو نایاب دواؤں کا بکس مختلف ڈاکٹروں کے پاس پہونچا کے ہے۔ اچھو بابو اس شہر کے ایک ہی بیوپاری ہیں جن کے پاس دواؤں کے باہر سے منگانے کا لائسنس ہے۔"

اس انکشاف پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور ایک دن جب وہ چالیس روپے ہار کر اٹھ رہا تھا کہ سجو بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

"کل کہاں سے جیتے یار؟"

"یہی تو فکر ہے" محرما نے کہا۔

"یار آج تو میں بھی ہار گیا۔"

اور برسبیل تذکرہ جب اس نے اپنی آمدنی کا ذریعہ بتایا تو سجو نے بڑے زور سے چٹکی بجائی۔ محرما چونک پڑا۔

"سالے تو رہ گیا کا ریگا کا ریہ ــــ تو اچھو بابو کو بلیک میل کر دے۔"

"ارے بلیک میل کیا ہوتا ہے؟"

"یار محرما تو بھی نرا بدھو ہے۔ ارے یار وہ فلم دیکھی تھی نا وہ سالا ایکٹر ایک راز والی ڈائری دکھا کر ایک امیر لڑکی سے ہزاروں اینٹھ لیتا تھا۔"

"ارے ہاں یاد تو آرہا ہے۔"

"بس تو بھی یہی کر۔"

"کیا ــــ ؟ سمجھا نہیں۔"

"اتنی سی بات نہیں سمجھتا۔ ارے بگو اچھو بابو سے جاکر ایک ہزار روپے مانگ اور اگر وہ انکار کریں تو دھمکی دیے کہ سارے راز پولیس کو اگل دوں گا۔ ہاں دنیا میں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے بیٹا۔ جیسا ہو تو ایسا کام کر۔ اور اب سے دوا پہونچانے پر بچاس سے کم نہ لینا۔"

محرما تھوڑی دیر سوچتا رہا ــ اور جب پیسے کے حصول کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ اچھو بابو کے کمرہ میں جی کڑا کر کے داخل ہو گیا۔ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ اچھو بابو جو اخبار پڑھ رہے تھے قدرے چونک کر بولے "کیا بات ہے محرما"

"کچھ نہیں ــ کچھ نہیں۔"

"ہم سے کوئی ضرورت ہے۔"

"جی۔"

"کہو کہو کیا بات ہے۔"

"جی مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔"

"تجھے اور پیسوں کی ضرورت ــــ آخر تو کیا کرتا ہے پیسوں کا میں نے تو سمجھا تھا تو جمع کرتا ہوگا اور کچھ اچھے کام کرے گا۔

"ہاں جی ــ وہ تو ہے ــ لیکن میں ایک گھر بنوانا چاہتا ہوں۔"

"تو وہ بھی بن جائے گا۔ جلدی کیا ہے ــ صبر سے کام کر۔"

"مگر ــ"

"مگر کیا ــ بتا نہ صاف صاف کہتا کیوں نہیں۔"

"مگر مجھے تو آج ہی ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

اور اس کے اس جملہ پر اچھو بابو کبل پر سے ڈال اٹھ بیٹھے۔

"کیا کہا ایک ہزار ــــ بلاؤں بڑی بیگم کو ــــ؟"

"ہٹکا بیگم سے جی میں اب نہیں ڈرتا۔ مجھ سے آپ ایسے کام کراتے ہیں۔"

"چپ رہ حرمزادہ ــــ"

"چپ ہوں جی ــ لیکن ــــ"

"لیکن کیا ــــ تیرے باپ کا قرض کھایا ہے ــــ؟"

"اور باپ کے طعنہ پر محرما پھر گیا۔ "اچھی بات ہے جی۔ پھر میں صدر کو توالی جاتا ہوں۔

"نمک حرام ــــ یہ تو کہہ رہا ہے۔ میرے گھر کا پروردہ غلام ــــ

"کچھ کہہ لو۔ مگر روپیہ دیدو۔"

اچھا ــــ

وہ اپنی جگہ سے اٹھے تجوری کھولی اور ہزار روپے کے نوٹ اس کے سامنے پھینک دیئے ــــ "لے کتے یہاں سے نکل جا ہمیشہ کے لئے"۔ اور محرما بمشکل تمام تھرتھراتی ہوئی انگلیوں سے نوٹ گنتا ہوا باہر آرہا تھا کہ چھوٹی بی نے اسے راستہ میں روک لیا۔

"کیا بات ہے محرم ــ بہت گھبرائے ہوئے ہو"

"نہیں تو ــــ بابو کے کام سے باہر جا رہا ہوں"۔

اور وہ نوٹوں کی گڈی جو وہ چپکے چپکے صدری کی اندرونی جیب میں رکھ رہا تھا اچانک جیب میں پہنچنے کی بجائے نیچے آگری۔

"اتنے روپے ــــ کہاں سے لائے محرم ــ ؟

"اچھو بابو نے دیئے ہیں۔"

"کس کے ہیں ــــ؟"

"میرا انعام ــــ" اس کے منہ سے جلدی سے نکل گیا۔

"کس بات پر ــــ؟"

چھوٹی بی روپیہ اٹھا کر اپنے کمرہ میں آگئیں۔ اس نے بہت بہانے بنائے۔ لیکن کوئی بہانہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ آخر اسے بتانا پڑا کہ اچھو بابو داؤں کی چور بازاری کرتے ہیں۔

"اور تم ان کے حصے دار بن گئے ہو۔" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ اس کے اس انداز پر محرما کو محسوس ہوا جیسے وہ زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ وہ چھوٹی بی کی بے پناہ عزت کرتا تھا۔ وہ پورے گھر میں صرف چھوٹی بی سے ڈرتا تھا۔ جو دن بھر موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر آنکھیں خراب کر چکی تھیں اور اب چشمہ لگایا کرتی تھیں۔

"چھوٹی بی یہ روپے آپ رکھ لیجئے۔ جب ضرورت ہوگی تو لے لوں گا۔"

"محرم شریف بننے کی کوشش کرو۔" چھوٹی بی نے بڑی اداسی سے کہا۔ شریف بننے کی کوشش کرو۔ اور وہ خاموش مجرم کی طرح سر جھکائے رہا۔ پسینہ اس کی گردن سے چھوٹ کر سینہ کو بھگونے لگا۔

"اچھو بابو بھی چور ہیں۔ لیکن وہ، اچھو بابو ہیں ــــ اور تمہارا نام محرما ہے ــــ صرف محرما۔" اور محرما کا جی چاہا کہ وہ ان نوٹوں کے پرزے کر دے۔

"میں اب جاؤں ــــ" وہ گھبرا کر بولا۔

"کہاں ــــ؟"

"مجھے اچھو بابو نے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیوں۔ اس لئے کہ تم نے ان سے اپنا حصہ مانگا تھا۔؟"

"ہاں۔"

"تو لو یہ روپے ان کو واپس کر دو۔"

"آپ ہی کر دیں؟ وہ بڑی بے نیازی سے بولا۔

اور ایکبار محرا نے کوشش کی کہ وہ واقعی شریف بن جائے۔ اس دن کے بعد اچھو بابو نے اسے پھر کوئی ایکس پہونچانے کو نہیں کہا۔ بلکہ وہ اس سے کچھ کھنچے کھنچے سے نظر آتے تھے۔

اور ایکدن جب وہ چھوٹی بی کے سونے کے کنگن صاف کروانے جا رہا تھا کہ اچھو بابو نے اسے روک لیا۔

"کہاں جا رہا ہے۔؟"

"چھوٹی بی کے کنگن صاف کروانے۔"

"اچھا۔۔ ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

اور وہ پہلی گلی پار کر کے سڑک پر آنے والا ہی تھا کہ لال خان جمعدار نے اس کی پیٹھ پر ایک دھول جما کر اسے چونکا دیا۔

"چوری کرتا ہے۔۔ سالے حرامی۔۔ لاؤ کنگن۔۔"

اور وہ ہکا بکا لال خان کا منہ دیکھنے لگا۔ لال خان نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔

اور اسے بڑا تعجب ہوا کہ چھوٹی بی بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہوئی کہہ رہی تھیں۔" مجرم نے یہ کنگن میری الماری سے چرائے تھے۔" اور محرا نے اپنے سیاہ ہاتھوں میں آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ چھپا لیا۔ اور چھ ماہ کی قید با مشقت کے دوران اس نے وہ تمام تربیت حاصل کر لی جو انسان کو شریف بن کر بھوکا نہیں مارتی۔ اور جب وہ قید سے باہر ہوا تو۔۔ اس کا یار لالی استقبال کو کھڑا تھا۔

"آ میرے یار۔۔ بڑی راہ دکھائی تو نے سالے پیٹری پا۔ بھوک لگی ہو تو چل ہوٹل میں گرما گرم کباب اور پراٹھے کھلاتا ہوں۔"

محرا جیل سے باہر آ کر بہت دیر چپ رہنے کے بعد اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ارے بھائی کس نے کہا تھا کہ تو شریف بن جا۔ شریف آدمی سالا ہمیشہ بھوکا مرتا ہے۔ جلدی کھا پی کر ذرا سیر کر آئیں۔"

اور جب کھا پی کر وہ لالی کے ساتھ سیر کو باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں بھی ایک آنے والا فوری بلیڈ تھا۔

اسٹیشن کے احاطہ میں لالی نے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا دکھا کر اسے حیران کر دیا اور پہلی بار جب وہ ٹھرا پی کر لالی کے ساتھ سینما دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو لالی کی اندھیری گلی میں اس نے بڑی صفائی سے ایک کوٹ پتلون والے صاحب کے گلے میں رومال ڈال اس کا گلا دبوچ لیا۔ اور لالی نے جلدی جلدی جیبوں کا صفایا کر کے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

کوٹ پتلون والا مخنی سا آدمی۔ تلملا کر گھبراہٹ میں نیچے آ گرا۔

"ارے سالے کہیں تو نے اس کا گلا تو نہیں گھونٹ دیا۔۔؟"

"نہیں تو۔" محرا نے حیرت سے کہا۔

وہ دونوں دوسری گلی میں چھپ کر اسے دیکھتے رہے۔ کوئی دس منٹ بعد اسے ہوش آ چکا تھا۔ وہ چور چور پکارنے لگا۔۔ اور اس کے ساتھ ہی محرا اور لالی بھاگ کھڑے ہوئے۔

"ڈھائی سو روپے ــــ لالی نے میونسپل لیمپ میں نوٹوں کو گن کر اعلان کیا۔

"واہ بیٹا کیا ہاتھ مارا ہے ــــ مسٹر لالی کو بھی شکست دیدی۔ ہفتہ بھر کی کمائی تو ایک رات میں ہاتھ آگئی ــــ شاباش بیٹے ـــ"

اور جب لالی اسے عیش کرانے کے لئے شہزدیا کے کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا تو وہ نشہ میں دھت شہزدیا کے سینہ سے لگا ہوا رو رو کر کہہ رہا تھا تم میری ماں ہو ــــ تم بڑی بیگم نہیں ہو ــــ تم چھوٹی بی بی نہیں ہو، اللہ قسم تم میری ماں ہو ــــ اور شہزدیا بڑی حیران نظروں سے دُبے کی مدھم روشنی میں اس کے سیاہ چہرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور دوسرے دن جب اس نے اعلان کیا کہ وہ چھوٹی بی بی سے انتقام لے گا تو لالی بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا "بیٹا اب تم واقعی آدمی بنتے جا رہے ہو"

وہ کئی بار رات کی سیاہی کا لبادہ اوڑھ کر اچھو بابو کے گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ وہ چھوٹی بی بی کے دریچہ تک پہونچا اور واپس لوٹ آیا۔ وہ موقعہ کی تلاش میں تھا۔ شاید کسی دن چھوٹی بی بی باغ میں کھلنے والا دریچہ بند کرنا بھول جائیں۔ اور یہ نادر موقعہ اسے ایک رات ہاتھ آگیا۔ اور وہ دیوار سے لگے ہوئے پائپ کے سہارے چڑھتا ہوا چھوٹی بی بی کے کھلے ہوئے دریچہ تک پہونچ گیا۔ چھوٹی بی بی بے خبر سو رہی تھیں۔ اتنی مدت کے بعد اسے دیکھ کر پرانی باتوں کو یاد کر کے وہ یکدم سہم گیا۔ چھوٹی بی جس نے اسے کبھی کالیہ نہیں کہا تھا ــــ چھوٹی بی بی جو کہتی تھیں محترم شریف بن جاؤ ــــ اور اسی چھوٹی بی نے اسے شریف بنانے کے بہانے لوٹ لیا تھا۔ اس نے عدالت میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہا تھا کہ محترا چور ہے۔ اس کی نفرت عود کر آئی۔ اس نے اپنی جیب میں چاقو کو ٹٹولا۔ اور چھوٹی بی کے سرہانے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کتنی معصومیت تھی اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں چہرہ پر ملت کا سیاہ داغ بن کر جل رہی تھیں۔ سیاہ پلکوں کا سویا ہوا سایہ ــــ بند آنکھوں کا پھیلاؤ۔ محترا کے ذہن میں شہزدیا گشت کرنے لگی۔ اور اس نے پہلی بار شہزدیا کا مقابلہ چھوٹی بی بی سے کیا تو اس کے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ چھوٹی بی کا سابقہ احترام اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا اس نے چاقو کا پھل کمرہ کی سبز ڈم لائٹ میں دیکھا اور اپنی سیاہ انگلیوں کو اس کے بالوں میں پھنسا کر دھیرے سے ہلایا۔ چھوٹی بی نے آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ اس نے چیخ نکلنے دی اور بڑی پھرتی سے اپنا سیاہ ہاتھ اس کی مرمریں گردن پر ڈال دیا ــــ اور پھر سرگوشی کے لہجہ میں بولا ــــ میں محترا ہوں ــــ چیخنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ میں چاقو کا پھل تمہارے سیاہ دل میں اتار دوں گا"

اور اس نے اس کے گلے کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ چھوٹی بی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے اسے لٹائے رکھا۔ اور خود اس کی بغل میں آ بیٹھا۔

"مجھے پہچانتی ہیں آپ ؟"

"ہوں ــــ اس نے مختصراً کہا۔

"تم کتنی ذلیل ہو ــــ تم اور تمہارا پورا خاندان۔

"ہاں ٹھیک ہے"

"تم چھوٹی، کمینی اور بدذات ہو۔

"ہاں"

"تم شیطان ہو"

"ہاں"

"تم انسان نہیں جانور ہو"

"ہاں"

اور اس مختصر جواب سے وہ اکتا گیا تھا اس نے جھنجھلا کر کہا۔ تم نے میرے بھروسے کو ختم کر دیا۔ اب بولو تم سے کیسا سلوک کروں ــــ؟"

"جیسا تم چاہو" اس نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا فی الحال مجھے روپیہ چاہئے۔ بولو کتنے دے سکتی ہو ؟"

"اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

"اور یہ نکلس ۔۔ یہ کنگن" اس نے اپنے چاقو کی نوک سے گلے کو چھیڑتے ہوئے کہا

"یہ تم لے سکتے ہو ۔۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ نکلس اور کنگن اتار کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے دونوں چیزیں بڑی ہوشیاری سے جیب میں رکھ لیں۔

"چیخنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ پلٹ کر جان سے مار ڈالوں گا۔" اس نے دھمکاتے ہوئے کہا۔

"پاگل ۔۔ محرما میں تم سے پھر کہوں گی شریف بننے کی کوشش کرو" اور اس کے اس جملہ پہ محرما نے اس کے بائیں رخسار پر کھینچ کر تھپڑ مار دیا۔

"شریف ۔۔ آخ تھو۔ اس نے فرش پر تھوک دیا۔"

چھوٹی بی بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔"

"شاید تم گر پڑو۔ آؤ سیدھے راستے سے میں تم کو پہونچا دوں۔"

"نہیں ۔۔ مجھے چالبازی نہ سکھاؤ۔"

"مجھ پہ یقین کرو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں سے گذار کر باغ میں چھوڑ آئی ۔۔ اور جب وہ اسے چھوڑ کر خاموش قدموں سے لوٹ رہی تھی تو محرما کا یکبارگی جی چاہا کہ اسے روک کر اس کے زیورات واپس کر دے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اور باغ سے نکل کر گلی کو پار کر کے کونتار والی سڑک پر آ گیا۔ اسی جگہ جہاں لال خاں جمعدار نے اسے پکڑا تھا۔ اور آج اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے لال خاں اس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہہ رہا ہے ۔۔ چور ۔۔ کمینے۔ زردہ کنگن ۔۔ لیکن وہاں لال خاں کا سایہ بھی نہ تھا۔

بہت دنوں تک وہ نکلس اور کنگن کو سینہ سے لگائے رہا تاکہ لالی کی آنکھیں نہ دیکھ پائیں۔ لیکن یہ کنگن یہ نکلس اس کے دل کی پھانس بن گیا تھا۔ ان کی اندرونی جیب میں پڑے ہوئے بی بی کے زیورات اس سے سرگوشی میں کہتے۔ محرم تم اب بھی شریف بن سکتے ہو"۔ اور وہ ہر بار جھنجھلا جاتا۔ اور اس جھنجھلاہٹ کو آخر کار اس نے ایک دن تاش کھیلتے وقت ختم کر دیا۔ اور وہ نکلس اور کنگن چھ سو کے نوٹوں میں بدل کر اس کی جیب میں آ گئے۔ اور اس نے ہفتہ میں شہزدیا کی آغوش، شراب اور جوا پر ساری رقم اڑا دی۔ ادھر لالی نے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

لالی کی یاری میں فرق آنے پر محرما کو قدرے افسوس ہوا اور اس نے ہزار تگ و دو کے بعد دو چار جیبوں کا صفایا بھی کیا تو کوئی خاص رقم ہاتھ نہ آئی۔ دنوں تک شہزدیا کی آغوش۔ لالی کی یاری اور تاش کی محفل سبھی کچھ اس سے روٹھ گئی تھی۔ لالی نے اسے بار بار کہا کہ وہ پھر چھوٹی بی بی کے پاس جائے لیکن اب وہ اس کے پاس جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے کہ شرافت کا کانٹا اس کے دل میں چبھ گیا تھا۔ ایک بار نکال پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ اس زخم کی خلش کو تازہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور اسی بنا پر لالی کچھ اور بھی اس سے خفا ہو گیا تھا۔ اس کے بار بار شرافت کا چولا پہننے پر بڑی نفرت معلوم ہوتی تھی۔

اور آخر ایک شام وہ فاقوں سے آ لگا۔ شہر کی گہما گہمی میں بظاہر وہ سانس لے رہا تھا۔ لیکن بھوک نے اس کی حالت اس نوزائیدہ بچہ کی طرح کر دی تھی جو خود اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو سڑکوں پر گھسیٹ رہا تھا۔ وہ شرافت کے نمونوں کو ٹٹول رہا تھا۔ لیکن ہاتھ میں سکت نہ تھی کہ وہ سیفٹی بلیڈ چلا سکے۔ وہ بڑی بیزاری سے بس اسٹینڈ کے پاس لیمپ پوسٹ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں شام کے جھٹپٹے میں اسے دور سے چھوٹی بی بی کے معصوم لبوں پر مسکراہٹ کی جھلملاتی ہوئی قندیل دکھائی دی۔ اس کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے اور خاکستری پتلون اب سلوٹوں سے پائجامہ بنی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک مسکراہٹ کی قندیل اس کے سامنے آ گئی۔

"محرم تم اس حال میں ۔۔؟" مسکراہٹ کی قندیل بجھ گئی۔ اور محرما ایک وفادار نوکر کی طرح اس کا تھیلا لے کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تم پھر نہیں آئے۔ تمہارے چاقو کے پھل کا کیا حال ہے۔ ؟"
لیکن وہ خاموش رہا۔
"تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔؟"
"غریب آدمی زندگی کیا کسی بارے میں بھی کچھ نہیں سوچ سکتا۔ اور چاہے بھی تو نہیں سوچ سکتا۔"
"تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔؟"
"بنائی نہیں آپ ہی بن گئی ہے۔"
"تم روپیہ لینے نہیں آئے۔؟"
"ہاں۔ چاہا بہت لیکن کوئی چیز قدم روک لیتی ہے۔"
"وہ کیا ہے۔؟"
"تمہارا انسان بننے والا سبق۔ اس سے میں بہت گھبراتا ہوں۔"
"اچھا تو پھر۔؟"
"تو پھر کیا۔ رات کی سیاہی کبھی پیٹ کے لئے روٹی مہیا کر دیتی ہے اور کبھی فاقہ سے گذر جاتا ہے۔"
"تم بزدل کیوں بن گئے۔؟"
"میں نے وجہ تو بتا دی۔"

اور جب وہ اسے مارکٹنگ کرانے کے بعد بس اسٹینڈ پر چھوڑنے آیا تو چھوٹی بی نے اپنا پرس زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیا تھا۔ اس نے بنئے کی طرح آنکھ گڑا کر نوٹوں کو گنا۔ ایک سو پچیس روپے۔

کیا وہ اس رقم سے شریف نہیں بن سکتا۔ شاید نہیں۔ اس نے سوچا اور شرافت کے تصور کو سڑک پر پڑے پتھر کی طرح ٹھوکر لگا دی۔ چاند اونچا اٹھ چکا تھا۔ اس نے ایک ہوٹل میں جی بھر کے کھانا کھایا اور سالی کے کلب میں آکر بیٹھ گیا۔
"کہو یار آج تو جیب گرم دکھائی پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس لونڈیا کے پاس سے آ رہے ہو۔؟"
"زبان سنبھال کر بات کیا کر۔"
"بڑا آیا حمائتی، اس سالی نے تجھے جیل کی ہوا کھلوا دی اور اب بڑا پیار آنے لگا ہے اس پر۔ بیٹا چاند کو چھونے چلے ہیں۔"
"میں کہتا ہوں زبان سنبھال ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ وہ غرّایا اور اس کی سیاہ رنگت جل کر کوئلہ ہو گئی۔ اور آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے میں بدل گئیں۔ وہ تو بیچ میں ہجرا آگیا۔ ورنہ وہ اس کا خون پی جاتا۔

اور کچھ ہی دنوں بعد وہی فاقہ مستی تھی اور وہی محرّم تھا۔ گرچہ اس نے دریا پور میں ایک کوٹھری کرایہ پر لیکر اس میں ایک چارپائی ڈال رکھی تھی اور سوچتا تھا کہ جو کبھی کوئی موٹی مرغی ہاتھ آگئی تو شادی بیاہ کر کے گھر بسا لے گا۔ اور محنت مزدوری کر کے چھوٹی بی کو دکھا دے گا کہ وہ پیدا شریف ہی ہوا تھا۔

اور ایک دن اتفاق سے جب چھوٹی بی ملیں تو وہ بے حد پریشان تھیں۔ وہ ایک دواخانہ سے چوروں کی طرح نکل رہی تھیں۔ محرّم کو دیکھ کر وہ کھل سی گئیں۔
"بھائی محرّم تم مجھ پر ایک احسان کرو گے۔ ؟"
"کیوں کیوں کیا بات ہے۔"

"مجھے کہیں سے زہر لادو۔"

"کیوں زہر۔ ؟ آخر بات کیا ہے۔ ؟ کس نے تمہیں نقصان پہونچایا ہے۔ میں اسے ایک لمحہ میں فنا کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔" محرما جذبات سے کانپ اٹھا۔ "دیکھو محرم تم مجھ سے آج رات کے دو بجے بلا میرے کمرہ میں سیدھے چلے آنا۔ میں سب انتظام ٹھیک کر رکھوں گی۔ بولو آسکو گے۔

"بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ گی بھی۔ ؟"

"تم آجاؤ۔ پھر بتاؤں گی۔۔ وہ بس اسٹینڈ پا سکتا ہے۔" وہ روانہ ہوگئی اور محرما بڑی بے قراری سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے چھوٹی بی اس سے کون سا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ اسے اپنی زندگی دے سکتا ہے۔ آخر اس کی زندگی کی قیمت ہی کیا ہے۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک زر خرید غلام کی طرح رات کے دو بجے اس کے کمرے میں آگیا۔ چھوٹی بی بی زار و قطار رو رہی تھیں۔ محرما کا دل موم کی طرح پگھل کر بہنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ایک خون آلود کپڑے پر پڑی۔ اور وہ سہم گیا۔

"کیا تم اسے دریا میں پھینک دو گے۔ ؟"

"کیا چیز ہے۔ ؟"

"تم خود دیکھ لو۔" چھوٹی بی نے چہرہ پھیر لیا۔

اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے کپڑا ہٹا کر دیکھا اس میں ایک نوزائیدہ بچے کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش تھی۔۔ محرما کے دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ اس کی سیاہ پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

"یہ سب کیونکر ہوا بی بی۔ ؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔"

"اچھا میں اس سے نپٹ لوں گا۔ اس کام سے فراغت پالوں پھر تمہیں اس منحوس انسان کا نام بتانا ہوگا۔ جس کے سینے میں آج ہی میں چاقو پیوست کر دوں گا۔ تم بھی ہو نا شرافت کا نام لینے والی شریف بننے کا سبق دینے والی۔ شرافت۔۔ انسانیت۔ آخ تھو۔۔ اس نے دوسری مرتبہ فرش پر تھوک دیا۔ اور بچہ کو بغل میں سمیٹ کر کوٹھی سے نکل گیا۔

اسے کوئی فکر نہ تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔۔ اور عین اس وقت جب وہ بچہ کو سپرد دریا کر رہا تھا وہ پولیس کی گرفت میں تھا۔

"کس کا بچہ ہے بتاؤ۔۔؟" عدالت نے اس سے سوال کیا۔

"میں نہیں بتا سکتا۔"

اور اسے تھرڈ ڈگری سزا ملی۔ اس کے سینہ کو سپاہیوں نے بوٹوں سے کچل دیا۔ بید سے مار مار کر کھال ادھیڑ دی۔ لیکن اس کی زبان گنگ رہی۔۔ اور آخر کار اسے تین سال قید با مشقت کی سزا مل گئی۔۔ کوئی اسے جیل رہائی دلانے نہیں آیا۔۔ اس نے جیل ہی میں سنا کہ چھوٹی بی کا بیاہ ہو چکا ہے۔ اور اس دن اس نے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ "بی بی کا سہاگ سدا قائم رہے۔ وہ ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہیں۔ وہ سوچتا کاش چھوٹی بی بی ایک بار اس سے آکر مل جاتی تو وہ تین برس کیا تیس سال بھی جیل میں رہ کر کڑی مشقتوں کے ساتھ گذار دیتا۔ لیکن بی بی کبھی نہیں آئی۔

اور اسی جیل میں اس کی ملاقات چمن دادا سے ہوئی۔ اس نے محرما کو منہ بولا بیٹا بنا لیا اور اس سے کہا کہ وہ جیل سے رہا ہو کر سیدھے اس کے گھر جائے اس کی ایک بیٹی ہے جس کی ماں اس دنیا میں نہیں۔ سماج کی نظروں میں چور اچکوں کی بیٹی کسی چور اچکے ہی سے بیاہی جا سکتی ہے۔ اگر اسے لڑکی پسند آجائے تو وہ اس سے شادی کرلے۔ اس نے جہیز کا سامان پہلے ہی سے مہیا کر رکھا ہے۔ اور ایک گھر لڑکی کے نام لکھ رکھا ہے۔۔ محرما روز دادا کے پاؤں دباتا۔ جذبۂ ممنونیت

ایکدم سے عبودیت کی طرف مائل تھا۔ اس احساس ہی سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ اس کا اپنا ایک گھر ہوگا۔ بیوی ہوگی۔ جیسے جیسے رہائی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اتفاق سے رہائی کے آخری ہفتہ میں ہی جمن دادا کی لڑکی اس سے ملنے آگئی۔ اس نے بین کر کر کے سارے حالات سنائے۔ محلہ والوں کے طعن تشنیع۔ اور غنڈوں کا آئے دن اس کی عزت پر حملہ۔ بوڑھے دادا نے محرما کا تعارف بیٹی سے کرادیا۔ لڑکی نے محرما کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگئی۔ بوڑھے نے حکم دیا کہ وہ محرما سے نکاح کرلے۔

"بیٹی! اطاعت تیرا فرض ہے۔ میں تیرا باپ ہوں۔ تو اس لڑکے کو بھلا پائے گی۔" اور لڑکی نے سر جھکا لیا۔

محرما جب جیل سے رہا ہو تو لڑکی وعدے کے مطابق پیپل کے درخت کے نیچے روٹی لئے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ محرما نے وہیں بیٹھ کر روٹی کھائی۔ اور اس کے ساتھ دو کمروں والے ذاتی مکان میں آگیا۔ اور دوسرے دن ان کی شادی ہوگئی۔

اب محرما کے آگے سب سے بڑا سوال شرافت کی زندگی کا تھا۔ لیکن اس دنیا میں کوئی اسے شریف ماننے کو تیار نہ تھا۔ کہیں جاتا نوکری نہ ملتی۔ کچھ دنوں قلی کا کام کرتا رہا لیکن پیٹ نہ بھرتا۔ محنت مزدوری کرتا۔ لیکن پھر بھی دنیا اسے چور ہی کہتی۔ محلہ میں کوئی بھی چوری ہوتی وہ پکڑا جاتا۔ ہزار پوچھ گچھ کے بعد رہائی ہوتی۔ اور اس روز روز کی جھک جھک اور فاقہ سے تنگ آکر اس کی بیوی نے بھی کہدیا تھا کہ وہ چوری کرے گی۔ چوری ان کی قسمت . . . ہے۔ اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اس دن اس نے پہلی بار بیوی کو تھپڑ مار دیا۔

"شرافت بڑی چیز ہے کمبخت ۔۔۔ چور کی اولاد ۔۔۔"

اور اس کی سانولی سلونی بیوی رو دھو کر چپ ہو رہی۔ روز روز کے فاقہ نے محرما کے جسم کو توڑ دیا ۔۔۔ اور رہی سہی طاقت کچھ دن اسے رکشا کھینچنے پر چل بسی۔ تین سال تک وہ شرافت کی لاش کو کندھے پر اٹھائے پھرا لیکن کسی نے اسے نہیں پہچانا ۔۔۔ وہ دنیا کی نگاہ میں چور ہی تھا۔ اور آخرکار ایسا سخت بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ اس عرصہ میں اس کے دو بچے بھی ہو گئے تھے۔ جو دن بھر بھوک سے ریں ریں کرتے رہتے۔

پہلی بار اس نے اپنی بیوی کو مزدوری کرنے کی اجازت دی۔ اور وہ سڑک پر سرخی کوٹتے وقت ہوس کار نظروں کا سامنا کرتی۔

۔۔ محرما کی شرافت اور بھوک میں بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور اسے محسوس ہوتا کسی لمحہ بھی یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ رشتہ دس روپے کے انجکشن لگوانے کے لئے اس کی بیوی نے آخر توڑ دیا۔ محرما کو انجکشن لگے ۔۔۔ اور وہ تین ماہ بعد اس لائق ہو گیا کہ لاٹھی کے سہارے چل پھر سکے۔ انہیں دنوں تیسرے بچے کے جنم کی وجہ سے اس کی بیوی اس لائق نہیں رہی کہ وہ مزدوری کر سکے ۔۔۔ بچے کے جنم کے ساتھ فاقہ کے کئی دن گذر گئے۔ گھر کا بچا ہوا اسباب محرما نے بیچ دیا۔ اس نے مکان پہلے ہی رہن کر رکھا تھا جو جمن دادا کی دی ہوئی امانت تھی۔

محرما کو وہ شام اب بھی یاد ہے جب اس کے بچے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ اور اسی دن پیر صاحب کے مزار پہ بڑا بھاری عرس تھا۔ دور ہی سے ہری نیلی پیلی جھنڈیاں اور علم نظر آ رہے تھے۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے محلہ گلزار تھا۔ چادر چڑھانے کی رسم ختم ہو چکی تھی۔ اور قوالی کی آواز سے سارا محلہ گونج رہا تھا۔ طوائفیں مجرا بجا کر جا چکی تھیں۔ محرما نے ضد کرتے ہوئے بچوں کو پیٹ پیٹ کر آدھ موا کر دیا۔ اور آخر انہیں نیند آگئی۔ اس کی بیوی تقریباً فاقہ سے نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی تھی اس نے سوچا آج داتا کے مزار سے کھانا مل جائے گا۔ کیوں نہ وہاں سے کھانا لے آیا جائے۔

وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا رات کے گیارہ بجے مزار پر پہونچا تو سارا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ وہ وہیں املی کے پیڑ کے نیچے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دیر تک اپنی سیاہ بختی پر روتا رہا۔ حتیٰ کہ عود اور لوبان کی خوشبو مدھم پڑ گئی۔ حجرہ کے چراغ گل ہو گئے۔ اور مجاور صاحب گیس لائٹ سنبھالے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا ۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے مزار کی طرف بڑھنے لگا ۔۔۔ اور کوئی دس بجے دن میں سارے محلے میں طوفان مچ گیا۔" داتا کے مزار سے کسی نے چادر چرالی۔ نجانے کون ہے کمبخت۔ محرما پر کسی کو شک نہیں ہوا۔ اس لئے کہ وہ عرصے سے بیمار تھا۔

اور کوئی تین دنوں بعد صبح ہی صبح متولی صاحب نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ محرما کانپ گیا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے سراغ پالیا ہو۔

وہ کانپتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

سلامتی ہو تم پر محترم! جاؤ اور اپنی داتا کے مزار پر فاتحہ پڑھو۔ تم مبارک انسان ہو۔ رات پیر مرشد کا خواب میں دیدار ہوا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں اس محلے کے ایک انسان سے بےحد خوش ہوا۔ اس کا نام محترم ہے!" خواب کا بیان سنکر محترم تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے جلدی جلدی بیوی کو اٹھایا۔ اور نہا دھو کر تیار ہوا کہ مزار تک ہو آئے۔ لیکن کوئی دھلا ہوا کپڑا گھر میں نہ تھا۔ بیوی نے اس لمحہ اس کی مشکل کشائی کی۔ اپنی سفید ساری دے دی کہ وہ دو ہر کر کے باندھ لے۔

محترم نے ایسا ہی کیا۔ وہ بھاری قدموں اور لرزتے ہوئے دل سے مزار پر پہونچا اور مزار کی جالی سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر وہ گڑگڑا کر کہنے لگا "یا پیر و مرشد میں بڑا گنہگار ہوں۔ آپ کی مجھ پر اتنی عنایت ہے اور میں ایسا روسیاہ ہوں کہ فاقہ سے بے حال ہو کر آپ کے مزار کی چادر چرا کر بیچ ڈالی۔ مجھ جیسا کون بدبخت اور گنہگار ہوگا۔ مگر پیر و مرشد میرے بچے چار دن سے فاقہ سے تھے۔ بیوی بھوک سے بیہوش ہو چکی تھی۔ اور تب ہی مجھ نابکار کے سامنے اور کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ وہ زار زار رو رہا تھا۔ اس کا سارا چہرہ اور قمیص کی آستین آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔

اور محلہ والوں نے جو اس کی داستان سنی تو اسے اسی لمحہ پولیس کے حوالہ کر دیا۔ "سالا چور — بدمعاش — بڑا شریف بنا پھرتا تھا" متولی نے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا اور محترم شرافت کی پاداش میں تیسری بار جیل بھیج دیا گیا۔

بلراج مینرا

کمپوزیشن دسمبر ۶۴

تم کہتے تھے کافی ہاؤس کھچا کھچ بھرا ہوگا، اور یہاں تو

قصہ یہ ہے کہ اس دور میں
جینا اتنا آسان نہیں ہے،
میں کہتا ہوں، اتنی شدید
سردی ہے، میاں گھر جاؤ،
آرام کرو، لیکن گھر؟

آج یہ میری زندگی، دیکھو نئے
میں سوچتی، جانے چلی کہاں،
جا اس لے چلی کہ ا اس
سالاں.... ویٹر! ایک
بلیک کافی، اور ہیں ایک
سینڈوچ.... آج یہ میری
زندگی، دیکھو نئے.....

"سویرا" میں افسانہ آرہا ہے

یہ کون لوگ ہیں؟
افسانہ نگار!
یہ لڑکیوں رہے ہیں؟
جلن!
وہ شیلاٹا بل ڈال بھی
افسانہ نگار ہے!

تم گریٹ ہو یار ...... کے ٹھابے میں کوکا کولا اور رم

[illegible]

لیکن گھر، گھر تو کاٹ تب! گھر
کہاں ہے! جہنم ہے! گھر کا
انیسویں صدی زدا تصور
اب گیا! اب کافی ہاؤس،
پھر ہوسٹل، پھر مور چیری اور
آخری سفر میونسپل کمیٹی کے
ٹھیلے پر .... بیسویں
صدی کا اعجاز!

میرے دل میں، ہلکی سی،
وہ خلش ہے، جو نہیں
تھی، کہیں پیار ہو نہ جائے
کہیں پیاااار ہو نا نا
..... ویٹرا ایک بلیک
کافی، دو ایس ایگ
سینڈوچز... میرے دل میں...

ہاں! وہ بل ڈاگ بھی
افسانہ نگار ہے!
اور اسے سب افسانہ نگار
مانتے ہیں؟
ہاں! سب کی ہڈیاں کمزور
ہیں....
کمال ہے یار!
چلو چلیں

آج کی سردی نے بھی احساس دلایا ہے کہ شادی جلد کر لو —

ویسے میں یہ سمجھتا ہوں کہ گھر سے
باہر لاوارث کی حیثیت سے
مرنا اعزاز ہے اور وہ جو
پردیس میں پانی خراب ہونے والی
بات ہے، ہزار لذتیں لئے ہوئے
ہے .....

آنکھوں سے جو اتری ہے دل میں،
تصویر ہے اک مستانے کی،
خود ڈھونڈ رہی ہے شمع جسے،
کیا بات ہے اس پروانے کی،
... ویٹر، ایک بلیک
کافی، دو میں ایک سینڈوچ
..... آنکھوں سے .....

ایڈیٹ، الہروہ کے وقت لذت
کے بارے میں سوچتے تھے ... اب
لذت ہے ... ملک پیلہ پر ...

میں آرہا ہے "پیرس ریویو" میں تو نہیں آرہا تا...

ارے کون مرگیا... ؟ کوئی پردیسی
ہے.... ! ہائے ! اپنی موت
پر میں ہی مکالمہ سننا پسند
کروں گا...... آج میں خوش
ہوں.... موت ہو تو ایسی ہو
..... چلو..... چلو کناٹ
پیلس کے سونے سونے برآمدوں
میں گھومیں گے

میرا افسانہ "سویرا" میں آرہا ہے

دماغ خراب ہوگیا ہے "سویرا" ہی

آئی تو ہم.... آئی تو ہم....
میں جارہی ہوں......

تم اداس ہو کہ خاموش
ہو ، آؤ چلیں !

آج دنیا بڑی سہانی ہے ،
کتنی رنگین زندگانی ہے آج
دنیا بڑی سہانی ہے ....
... ویٹر ! ایک بلیک کافی ،
دو پیس ایک سینڈوچز ...
.... آج دنیا بڑی سہانی...

... میں اب کبھی افسانہ نہیں
لکھوں گا.... اس فن میں ذلتیں ہی
ذلتیں ہیں ، جیب کاٹ
کہیں بہتر پیشہ ہے
جیب کاٹ کے موج اڑائیے ،
موج...

بیوقوفوں نے تلنگانہ میں
بندوقیں اٹھالی
تھیں اور نہرو کی زندگی میں
.... اب وقت ہے
انقلاب آنے رہا... چلو چلیں...

بہت بڑی کرسی ہونا ! خاصہ بڑا
آدمی بھی اُس کے قابل نہیں
ہوتا اور یہ تو ..... چلیں
یار ! بور ہو گئے ....

انہیں فلم بنانا تو آتا نہیں اور
یہ کیا کریں گے ... لیکن یہ
لوگ باہر کی فلم آدھی سے
زیادہ کیوں کاٹ دیتے
ہیں ..... زبان کسیلی
ہوگئی ہے ... ذلیل لوگ
ذلیل ملک .. ماں زیادہ
دن نہیں جئے گی ... یورپ
....

لو ہم ہایا ....

.... آئی لو ہر

آئی لو ہم .... آئی لو ہم

آئی لو ہر .... آئی لو ہر

میں نے عمر اُس کے
لئے تیاگ دی ہے
میں کچھ کرنا چاہتا ہوں
کچھ...... کچھ...... میں
ایک کے لئے ایک
ہو جانا چاہتا ہوں....

اے دل بیقرار جھوم اے دل
بیقرار جھوم..... فصلِ بہار
آگیا، دورِ خزاں چلا گیا،
عشق مراد پا گیا...... ویٹرا
ایک بلیک کافی، دو بیس ایگ
سینڈوچز... حسن کی چھڑ رہی
ہے دھوم... اے دل اے دل بیقرار...

اپنے ہاں فن کی قدر نہیں ہے، اپنے
یہاں فن کی قدر ہے لیکن فن کے
معنی کچھ اور ہیں......
چلو!

روم... دبلی پتلی نرم و نازک
لڑکیاں.... ہائے! کہاں
پھنس گیا.... اچھا بھلا نکل
گیا تھا..... ماں... ماں
یہ میری آخری کوشش/کمٹمنٹ ہے،
میں یہاں نہیں رہوں گا... سالے
آدمی سے زیادہ فلم کاٹ دیتے
ہیں....

اچھا بھئی شب ..... بخیر

سہانی رات ڈھل چکی، نہ جانے
تم کب آؤ گے، نہ جانے تم کب
آؤ گے.... ویٹر! ایک بلیک
کافی، دو ہیں ایک سینڈوچز
.... سہانی رات ڈھل چکی،
نہ جانے تم کب ... تم کب .. کب،
.... میں انتظار نہیں کر سکتا،

میں اس ایک لمحے کے انتظار
میں عمر بھر مرا ہوں، میں ایک
لمحے کے لئے جینا چاہتا ہوں،
وہ لمحہ کب آئے گا، کب
آئے گا .... کب
.... کب
میں انتظار نہیں
کر سکتا۔

ماں کب مرے گی، ذلیل لوگ
آدمی سے زیادہ فلم کاٹ دیتے
ہیں ... یورپ ... میں کب
اس جہنم سے نکلوں گا .....
میں ... میں ... کب کب
...... میں انتظار نہیں
کر سکتا۔

بلقیس جہاں

مقراضی بیگم کی سرگزشت

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ سلام مسنون۔

آپ کے رسالے ادب پایاب کا وفاتِ اردو نمبر بابت ماہ محرم الحرام انیس سو ننانوے ہجری آج ملا۔ ترسیل کا شکریہ۔ ماشاءاللہ رسالہ تو بہت بلند پایہ نکالا ہے ں۔ بہن جن بخش بانو کے مضامین دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ محترمی کرم ناش صاحب کی کہانی باجرے کی روٹی مکھن کا دھگڑا میری ماما نصیبن کو اس قدر بھائی ہے کہ بیسوں مرتبہ پڑھوا کر سن چکی مگر پھر بھی اس کا دل نہیں بھرتا۔ یہی کہتی ہے، بیوی جی چاہتا ہے سنے جاؤں۔ ہمارا یہ مائی ملا مردوا کہا ہے جس کو میری کہانی معلوم ہوگی۔ ویسے جناب چھل بل کے دونوں افسانے "سرخ انگیا" اور "زینخے کی جوتی" بی ہمسائی کی جواں سالہ بیٹیوں کو بہت پسند آئے۔ حضرت کاہ میلیہ کی سائنٹ ۔ زنخ کے زینے جہنم کے جزیرے" اور شفقی صاحب کی واسوخت "ہوس موج" خوب ہیں۔ اگر ان حضرات کے شرم انگیز قلم میں یہی زور رہا تو اچھے اچھے انشو رکھنے والوں کو بٹھا دیں گے۔ اور انشاءاللہ بجائے ادب اوراق میں ان کے مشٹنڈے مشٹنڈے ڈیل چھپے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور ان کی کثیف ردیں دب پر حاوی ہوں گی۔ یہ سب لکھنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا پرچہ کس قدر ہر دلعزیز ہے اور آپ کی ادبی کاوشیں ئیگاں نہیں جا رہی ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے آپ کے پرچہ کا کس بیقراری سے انتظار کھینچا جاتا ہے۔ مہینہ ختم بھی نہیں ہوتا کہ نگوڑا شبراتو قصائی اور چھجو حلال خور پوچھ چھ کر دم ناک میں کر دیتے ہیں کہ رسالہ کب آئے گا؟

پرسوں ہی کا تو ذکر ہے کہ ہمارے محلے کا حلوائی جس کے ہاں کے موہن بھوگ آپ کو بھی ادب پایاب کے سالگرہ نمبر کی خوشی میں بھجوائے تھے، میرے س آیا اور آپ کو جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگا کہ بس دن ایڈیٹر صاحب کی کتاب نے تو میری لاج رکھ لی۔ پاک پروردگار انہیں دسوں انگلیاں پورلید ہر کی دولت دے۔ اب کی شب برات پر آپ کو دس امرتیاں اور بیس سیر خستے اور پھلجھڑیاں بھیجے گا۔ میں نے اس سے پوچھا، نگوڑے کچھ بتا تو سہی۔ اس پر لا کہ بیگم صاحب تم جانو دس اللہ مارے مینا کو مولوی صاحب کتنے سپارے پڑھنے بٹھایا تھا۔ مگر دس مٹھے پر اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیا عرض کروں سارے سارے ہ کبڈی اور کنکوے بازی کرتے تھا۔ دس سے فرصت پائی تو دھنا دھن کے ساتھ بھنگ گھونٹ کر چڑھالی۔ اور وہ بے نامراد ہی کی لنڈیا گلا تو دس سے موخیال اور ہوتی تھیں۔ پوری ذات برادری میں میری تھڑی تھڑی ہو گئی۔ کہیں مجھے منہ دکھلانے کے قابل نہ رکھا۔ آپ یقین کرنا بھلا اس بڑھاپے میں اولاد جب غیند اٹھی کو کلپ لگا دے تو بے عزتی کے کٹورے سے سینہ پھٹ جاتا ہے۔ وہ تو ایک روز آپ کی ہو نصیبن ادب پایاب کا پرچہ لئے دروازے میں کھڑی تھیں ٹے کی نظر پڑ گئی۔ جھٹ نصیبن کے ہاتھ سے کتاب لے کر ورق پلٹے، تصویریں دیکھیں، بس پھر تو جب سے اس کی کایا پلٹ گئی۔ رات دن کڑھاؤ کی کالک لی اور یواروں پر لکھنا شروع کر دیا۔ جب چولہے کا نلا ٹھنڈا پڑا دس میں گھس کر بیٹھ گیا۔ نہ سر پیر کی خبر، کس کی بھوک کیسی پیاس، سب بھول گیا۔ بس مجنوں کی طرح ترنگ

سیپ کراچی

میں گنگنائے جاتا ہے۔ اور خدا تمہارا بھلا کرے وہ کس کا کیا نام گجل پہ گجل اور امیر حمزہ کے قصے پہ قصے کہے جاتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بھی ذرا تعجب ہوا۔ میں نے اس کی غزلیں اور کہانیاں منگا کر پڑھیں تو واقعی بڑی اعلیٰ تھیں۔ اللہ کی دین نیاری ہے جو مارتے گدھوں کو علم دے دے۔

آپ کو آئندہ اشاعت کے لئے اس کی سب کہانیاں اور تازہ غزلیں بھیج رہی ہوں۔ ان لکھنے والوں کی ہمت افزائی آپ نہ کریں گے تو بھلا کون کرے گا۔ اور میر امن اور سودا کہاں اور کیسے پیدا ہوں گے۔ پھر فائدہ یہ ہے بلکہ لگے نہ پھٹکری رسالے کے لئے اچھا خاصا مسالہ مل گیا۔ نہ شاعروں کو روپے دینے سے کلیجہ مسوسنے کی ضرورت نہ ادیبوں کو معاوضہ دینے کا دھڑکا۔ میں جانتی ہوں کہ گرہ سے روپے نکلنے میں دل کیسا کڑھتا ہے۔

بس یہ سمجھئے کہ ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتی ہوں کہ حلوائی کے پُت جیسے شاعر اور ادیب روز پیدا ہوں اور خدا آپ کو ایمان و سلامتی کے ساتھ کم عقلی اور جہالت میں ترقی دے۔ تاکہ آپ بے حسی اور بے غیرتی سے زبان و ادب کی خدمت کر سکیں۔ اور بالآخر بے زبان اور بے ادب ہو جائیں۔ لو میں اوروں کی باتوں میں یہ تو پوچھنا بھول ہی گئی کہ یہ قبلہ ازلی مقتا برکت ذات شریف ہیں جنہوں نے میری شاعری، نثر اور زبان پر حشر البلاد للادب کے سالانہ اجلاس میں پچاس صفحہ کا مقالہ پڑھ کر دُر فشانی کی ہے۔ جن کی تصویر بھی آپ کے رسالے میں چھپی ہے۔ نہ ان کی زبان درست، نہ چال، نہ چت، نظر وہ پوچ، خیال وہ سوقیانہ اور بازاری، نہ مضمون میں تسلسل، تشبیہیں تو ماشاء اللہ نہ حقیقی نہ مجازی، موئی اندھی اور لنگی۔

اے بھیا ایڈیٹر صاحب یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ آپ تو اب بالکل دودھ پیتا بچہ بن گئے کہ کچھ خبر ہی نہیں۔ او غضب خدا کا موئے جمعہ جمعہ آٹھ دن کے ادیب اٹھیں اور میری شاعری کو منہ، میری نثر کے بکھان کریں، زبان کی دھجیاں اڑائیں اور آپ گم سم ٹھنڈے دل سے یہ سب جاد بے جا بے ادبانہ نکتہ چینیاں برداشت کریں۔ خدا کی قسم آپ کی مجرمانہ معصومیت نے علم و ادب کی لٹیا ڈبو دی۔ میرا تو جی جلتا ہے کہے دیتی ہوں، آپ یوں ہی کانوں میں تیل ڈالے اور منہ پہ قفل لگائے مٹی کا مادھو بنے بیٹھے رہے تو دیکھ لینا یہ شانگ برابر کے چھوکرے چھوکریاں جو علوم و فنون کے افلاطون اور رلد و کے اہل زبان بنے پھرتے ہیں آپ کو کٹھ پتلی کی طرح انگلی کا ناچ نچا دیں گے۔ ارے میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ جب دل میں اتنا ندر نہیں تھا کہ سب کے سامنے سینہ سپر ہو کر ڈنکے کی چوٹ برے کو برا کہہ سکیں اور اچھے کو اچھا تو پھر کیوں یہ ادب لادب کا سوانگ رچایا اور کس بوتے پہ رسالے کی چودھراہٹ سنبھالی۔

اردو جو ہماسے دم قدم سے قائم ہے جب یہ برباد ہو کر مرا سے جہنم رسید ہو جائے گی۔ اگر اس وقت ہوش آیا بھی تو کیا جب یہ نیک بخت ہی نہ رہے گی تو پھر آپ کا رسالہ کہاں رہے گا۔ بیٹھے مکھیاں مارا کرنا اور نام فاضل خاں رکھ لینا۔

خدا کی سنوار ان لوگوں پر میر اطرز اور رنگ چرا چرا کر اپنی واہی تباہی غزلوں پر پیوند۔۔۔ پلوے کریں۔ افسانے پڑھیں تو ان کے ایجھتے ہیں پڑھنے کے پیچھے جُھلس کر رہ جائیں۔ زبان کے چٹخارے بھریں اور اپنی ناقص دستگاہ کو دیکھ کر حسد و جلن سے سینے پیٹ لیں کہ ہائے ہم ایسا کیوں نہیں لکھ سکتے۔ اور پھر موئے بھری جلسوں میں منہ پھاڑ کر کہیں کہ بی معترضی بیگم کی شاعری ایسی اور معترضی بیگم کی زبان ویسی۔ اب قرب قیامت میں کسر کیا رہ گئی۔ بس اللہ میاں مجھے اور بیچاری اردو کو عزت و آبرو سے اٹھا لے۔ جب جیتے جی یہ حال ہے تو مرے پر کیا گت بنائیں گے۔ اللہ جانتا ہے ایسی ایسی پوچ چیزیں پڑھ کر دل میں برچھی سی اُتر جاتی ہے۔ اور جی میں آتی ہے نگوڑے ماروں کی رہی سہی عقل ناقص بھی گُدّی سے کھینچ کر نکال لوں۔ اور داڑھی مونچھ کو آگ دے کر اس آگ میں اپنی تمام عمر کا عزیز سرمایۂ ادب جھونک دوں مگر وہ تو یہ کہو کہ مجھ اللہ ماری کو چھٹ پنے سے اردو سے ہزار جان سے عشق ہے جو ساری ذلت و خواری لب سی کر جھیل جاتی ہوں۔ آپ نے لگے ہاتھوں شمارے کے لئے جو میرے کلام اور سوانح عمری کی فرمائش کی ہے۔ تو بھیا ایڈیٹر صاحب سچ پوچھئے ازلی مقتا بہ صاحب کی تنقید پڑھ کر دل کھٹا ہو گیا چنانچہ کچھ لکھنے لکھانے کو جی قطعاً نہیں چاہتا۔ لیکن پھر وہی اردو کی محبت دامن گیر ہو جاتی ہے جو کس بے بسی سے تک تک کر مجھے ایسے دیکھتی ہے۔ گویا کہتی ہو، معترضی بیگم کیا تم بھی میرے برے وقت میں ساتھ چھوڑ دو گی۔ بس خدا کسی کی بنا کر نہ بگاڑے۔ ان ہی بوا اردو کا وہ زمانہ یاد ہے کیا نکھت تھی کیا شان۔ صورت ایسی موہنی کہ دیکھے سے آنکھوں میں نور دل میں سرور موجیں مارتا اور جی قربان ہوئے جاتے تھے۔ جاہیے تو قیامت اٹھتیں تو غضب ہاں کی ایک ایک دھج تھی کہ سو سو ادائیں دکھاتی، ندرت کے جادو جگاتی۔ درشن جھروکے میں آتی تو راجا مہاراجا سوامی سا جدید کے منتظر بیٹھے رہتے۔ تیکھی تیکھی ایک ایک پل گنتے، اے بادشاہ وقت تک بھکاریوں کی طرح دست بستہ کھڑے

طالب رہتے۔ پھر جس کی طرف انہوں نے ایک پیار بھری چیتون ڈال دی وہ اپنا سب کچھ تج کر ان ہی کا ہو گیا اور رہتی دنیا تک حیات ملام اور نام جاوید ان پا گیا۔ ناز برداریاں تھے نخرے کرتی تھیں۔ وہ سماں نہ رہا۔ اب تو یہ حال ہے کہ حقیقی دلی وارثوں سے بچھڑ کر یہ بے گھر و بار صورت سوگوار، پابرہنہ، زلف پریشاں، نم دیدہ اور مرجھائے رخسار، ذراسی عزت و عافیت کی خاطر ماری ماری پھرتی ہیں۔ موئے ادب خاں نے بھی اپنی مغلوجی کا بہانہ گھڑ کے طلاق کے دیے پھیلائے مگر وہ ٹکڑا ہمیشہ سے کچے کانوں کا ہے۔ پھر سونے پہ سہاگہ بری صحبت لگو نے اُدل جلُول بے علم و ہنر دوستوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ ان ہی کے کہنے سننے سے کچے پاتے کا تذکرہ کیا پاس کا کپڑا لتا بھی نوچ کھسوٹ لیا۔ سچ کہتی ہوں اس وقت کہیں امیر خسرو ان کو اس حلیہ میں در بدر و تباہ دیکھ لیں تو ہم سب کی وہ خبر لیں اور موئے ادب خاں کو تو ٹہوکے کا ایسا مزہ چکھا دیں کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ مومنوں کی پہلی ہجرت کا واقعہ نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ مکہ والوں نے اہل مدینہ کی زبان کو کیسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا، سر پر بٹھایا تھا، قدم چومے تھے۔ مگر ہماری عقل پر خدا معلوم کون سے پردے پڑ گئے کہ نہ وسعت نگاہ رہی نہ روشن دماغ بلندی خیال وہ پامال ہو چکی۔ رفعت علم وہ کھو بیٹھے۔ نہ برا سوچے نہ بھلا۔ قلب کینہ پرور کا مارا ہے اور ایسی بے حسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ بالفرض ادب خانے پر پنڈے نکال کر بے راہ روی اختیار کر لی تھی تو کیا اردو کے نام لیواؤں اور ادب کے حمایتوں کو لازم نہ تھا کہ اس موئے ادب کی گوش مالی کرتے۔ اور اس بے گناہ اردو کی پشت پناہی کر کے آنسو پونچھتے، دلاسا دیتے۔ مسائل بھی اپنی چوکھٹ پر آتا ہے تو پیار چمکار کر جو میسر آیا سامنے رکھ دیتے ہیں۔ مگر لوگوا ابتو دنیا جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہو گیا، نہ غریب کی داد رسی نہ تسلی۔ الٹی حق تلفی دیکھو اب یہی بچاری اردو کس بجت سے اپنا سمجھ کر امیدو آرزو میں ہمارے در پر چلی آئی تو کونسا سلوک کیا۔ کیا وہ ہماری ہی ہنڈی بوٹی اور ہمارا ہی خون نہ تھی۔ اگر وہ ادھ جلی عالموں کے بطن سے ہے تو شعرا اور ادیب بھی اسی کی کوکھ کے جنم دیئے ہوئے ہیں۔ نہ یہ ان سے الگ ہو سکتے ہیں نہ وہ ان سے جدا۔ جب ان ساری باتوں پر نظر رکھتی ہوں تو چپکے سے دل و دماغ عقل و ہوش کہتے ہیں معترضی بیگم ذرا ہمت سے کام لو۔ دل جلے ہزار چاند پر خاک ڈالیں کیا ہوتا ہے۔ پھر ایسے اٹھائی گیرے جاہل لکھنے پڑھنے والوں کی مخالفت کا کیا ڈر اور ان تنگ نظر تنقید نگاروں کا سہم کیسا۔ یہ تو اس قوم میں سے ہیں کہ جیتے نہ پھر جاہیے تو پھیلا اب کوئی چراغ علمی سے جلا پا ہو ہو کر ہم ہیں اور اردو میں ستر عیب گنوا رہے ہیں۔ کل دیکھ لینا یہی دونوں کے مزار پر سب سے پہلے مجاور بن کر بیٹھ جائیں گے۔ ادب کوئی جھوٹ تو نہیں۔ کہ انہوں نے مل کر ادب کو بنئے بقال کی دکان بنا لیا جہاں بھاؤ تاؤ ہوتے رہتے ہیں اور زبان کشتی کا اکھاڑہ بنی ہوئی ہے۔ مرے شوق سے یہ سخنور خود یا بیان لڑیں یا ریں جیتیں مگر اس بندی معترضی بیگم کی ذات پر کیوں حملے کریں۔ بس مجھے تو نا توں سے معاف رکھیں اور بوا اردو کو اپنے ہمراہ کانٹوں میں گھسیٹ کر بینوا و بے بادکیوں کرتے ہیں۔ رات کے بعد صبح ضرور ہوتی ہے۔ آج اگر یہ گرداب میں پھنسی ہوئی ہیں تو کوئی ساری عمر یہ وقت تھوڑی رہے گا۔

اس رات کے بعد جب اجالا ہوگا تو وقت کی روشنی سب کے تیور کج ادائی کم فہمی اور جہالت کا ایک ایک نقش ابھار دے گی۔ اور حقیقت کھول کر کھرا کھوٹا الگ کر دے گی۔

اللہ بخشے ابا کہا کرتے تھے۔ سچے عالم کی گردن علم کے بوجھ سے جھکی رہتی ہے اور حلم کی تاریوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ لیکن بھیا اب تو میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ جیسے بے مروتی بے حیائی جھوٹ چوری چکاری دغا فریب زنا اغوا حرام کاری رشوت خوبیاں بن گئی ہیں۔ اسی طرح خودستائی ذاتی تعریف و توصیف اوصاف ہو گئے۔ اپنے منہ میاں مٹھو جب تک نہ ہو یہ نئی روشنی کے ادب والے خاطر میں لا کر گردانتے ہی نہیں۔ حالانکہ اپنی ستائش آپ کچھ اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتی ہے۔

وہ بچارے لوگ تو سدھارے جو میری ادبی خوبیوں کے والا وشیدا تھے جو زبان کی عظمت و نزاکت کو پہچانتے تھے۔ اس کی ناداری اور مصیبتوں کو سمجھ کر مددگار بنتے تھے۔ جو محاورہ و استعارہ کے دلدادہ تھے۔ قصہ و حکایت کو سراہتے شاعری کو داد دیتے تھے۔ اس وقت تو وہی مثل ہے۔ ہنسا اڑ گئے کاگا بھئے چیان۔ کاگا کم از کم کائیں کائیں تو ڈھنگ سے کر لیتا ہے۔ مگر یہ چیان تو کائیں کائیں بھی مستقل مزاجی اور یکسوئی سے نہیں کرتے۔ ان میں کوے کی سی بھی تو انفرادیت ہے نہ شخصیت۔ ابھی کائیں کائیں کر رہے ہیں کہ عربی گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں سے مرعوب ہو گئے اور رینکنے لگے وہ پوری نہ ہوئی کہ چینی مرغی نظر آگئی

تو کٹ کٹانے لگے۔ اشتراکی بندر دیکھے تو خیں خیں شروع ہوگئی۔ نہیں تو میڈک بن کر ٹراتے ہیں۔ ارے یہ کون کہتا ہے کسی کی بولی نہ بولیں خوب بولیں مگر ذرا اپنی آواز کو سمو کر زبان کھولیں جو کچھ گہرائی تو ہو۔ اور مجھے ادب کے شہ پاروں میں محض زعم ہی زعم باطل ہی باطل یا احساس کمتری محسوس ہوتا ہے کسی نے بہت تیر مارا تو آپس میں ادیب کے عہدہ منصب ادب اور عقیدہ۔ مسلمان ادب اور جانماز۔ شاعری اور لباس کی بحث اور بیتے تلی چپقلش کی پھلجھڑی چھوڑ دی۔ ذرا ہنگامہ بڑھا تو کوئی قابل تنقید نگار بوڑھے گدھ کی طرح اٹھے اور پنجے پھیلا کر انھوں نے یا تو آسمان زمین کے قلابے ملائے یا ایسا چیر پھاڑ قلع قمع کیا کہ صورت سے بے صورت کر دیا۔ پتہ کھوج حقیقت سب غائب۔ ان سے میں پوچھتی ہوں کہ کون سی جامع کتابیں کسی بھی فن کے متعلق کسی نے لکھ کر ہم پر احسان کیا ہے۔ موئی گنوار عورتوں کی طرح محض لگائی بجھائی حرص و ہوس تو میں میں کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ خون بڑا فن پوش بڑا کھول کر دیکھا خالی ڈبا کوئی معقول بات ہو رہی ہے۔ عمر بھر زندگی کے پہلو یا دنیا کے بارے میں معلوم کرنی ہو تو مرے انہیں اخبار رسالوں کا سہارا لو ان کی تحریریں پڑھو۔ بس یہ زمین لق و دق چٹیل میدان ہے جہاں اور کچھ نہ ہوں وہاں ارنڈا۔ دکھ مگر آپ کے خلوص کا لحاظ اور کچھ رفتہ علم و ادب کے جاہ و جلال کی یاد غالب آگئی جو آپ کی فرمائش پوری کئے دیتی ہوں۔

شاعری تو میری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور قصہ و حکایت لکھنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے گھر کے تو پلے ہوئے جانور تک زبان داں تھے۔ طوطا مینا تک با محاورہ گفتگو کرتے تھے۔ روز رات کو چکو۔ اور چکوی جگ بیتی سے کر آپ بیتی یوں بیان کرتے تھے جیسے میر امن داستان سناتے ہیں۔ مور پپیہے ساونیاں اور ملہار کہنے کے ماہر کتے بلی تک ضلع جگت میں پوری اصناف و مراۃ النظیر سے لڑتے تھے۔ تو بہ کیجئے جو کبھی آپس کی جنگ میں بحر تغافل سے کام لیا ہو یا میری بلی موتی نے میاؤں میاؤں کہنے میں وزن کا خیال نہ رکھا ہو یا کالو کتے نے بحر طویل کے بجائے بحر رجز میں دبتے ہوئے حرف سے جواب دیا ہو۔ سامنے جان مظہر جان جاناں کا بندر تو اچھے اچھے ملاؤں کے کان کترتا تھا۔ مرے سے کوئی حدیث کوئی روایت کوئی مسئلہ پوچھ لو۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ایسا کہ جہاں چھوٹا اور ہمارے کتب خانے میں گھس آیا۔ الماریاں کھولیں، کتابیں نکالیں جو جیسے پسند آئے پھاڑے اور رگیدوں میں دبا لئے۔ گوشے نے علم سیکھا کیا تھا ہضم کر لیا تھا۔ میرے پاس ایک بربا بکا تھا۔ اسے قاعدہ پڑھانے ایک مولوی صاحب آتے تھے۔ خاصی کی عمر تھی۔ لیکن تھے ذرا رنگیلے۔ شعر گوئی کا انہیں بھی جنون تھا۔ ایک دفعہ یہ مصرعہ موزوں ہوگیا۔ ع بتوں کی مرجس نے تیلی بنائی تو وہ کمہار کنجوس تھا یا کمینہ۔ دوسرا مصرعہ اس وقت نہ سوجھا، لہذا اس کو لکھ کر پگڑی کے کونے میں باندھ لیا اور پھر یاد نہ رہا۔ پگڑی رنگنے کو دے دی۔ کپڑے رنگریز کی بیٹی رنگا کرتی تھی۔ جب پگڑی رنگنے کو بیٹھی تو گرہ کھولی، مصرعہ پڑھا۔ پگڑی رنگ رنگا کر خاشی سے جواب میں دوسرا مصرعہ لگایا اور کونے میں باندھ دیا۔

مگر سے جو مٹی بچی تھی لگادی کہ ان ظالموں کا ابھر آئے سینہ

بعد کو ان مولوی صاحب نے اسی رنگریزن سے نکاح کر لیا تھا۔ دراصل وہ زمانے ہی ایسے تھے امیر غریب جاہل عالم غور و فکر میں لگے رہتے تھے۔ اپنی کہتے تھے دوسروں کی سنتے تھے ہر بات کا ڈھنگ اور سلیقے کی حد متعین تھی۔ ہر آدمی کے شعور و خرد کے خانے بٹے ہوئے تھے اور علمیت بھی اپنی شعور اور رخصے کے خانوں کے طول و عرض کے مطابق پیمانوں سے ناپ تول کر دی جاتی تھی۔ اور پھر اس کا طرز و رنگ بندشوں اور پابندیوں کی وجہ سے خاص خاصیت، اور صلاحیت پیدا ہو کر پیدا کر دیتی تھیں۔ طرز و رنگ جدا جدا اور منفرد ہوتا تھا بلکہ بندشیں اور قیود علم میں ایک خاص صلاحیت خاصیت اور تنوع جن کی پختگی تا عمر دائم ہو جاتی تھی

اپنی سرگزشت کا آغاز کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اپنے خاندانی حالات کا بھی ذکر کردوں۔

میرا اصلی شجرہ اگر کسی کو دیکھنا ہو تو وہ توریت کے اس نسخہ کی پشت پر لکھا ہوا ہے جو حضرت سلیمان نے خود تصنیف کی تھی جو گمنام کے عجائب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔ لیکن ناظرین کی معلومات اور دلچسپی کے لئے جتنا مجھے یاد ہے وہ لکھ رہی ہوں۔

میری پردادی کا ماحوا تھیں۔ جن کا بیاہ میرے دادا حضور بابا آدم سے فردوس ہجری انسانی ماہ صفر میں بمقام نینوا ہوا تھا۔ جب دادا حضور کو جنت سے رسوا کر کے نکالا گیا تو نگوڑے مولوی مولاؤں نے سینکڑوں اپنے مطلب کی جھوٹی سچی کہانیاں گھڑ لیں۔ مگر آج میں اس قصے کا اصل راز بے نقاب کرتی ہوں۔

دراصل ہوا یوں تھا کہ دادا حضور خلد بریں میں رہا کرتے تھے۔ اور ساری حوریں بے عوض مہران کے نکاح میں تھیں۔ اس زمانے کے عیشوں کا کیا پوچھنا اور کیا ٹھکانا، دلدی بی (ماما حوا) کی زبانی سنا کرتے تھے کہ تمہارے دادا ابا ایک حور کے ساتھ ایک رات بسر کرتے تھے تو ستر ہزار نوری برس کے بعد کہیں جا کر اس کی دوبارہ باری آتی تھی۔ وہ حوریں بڑی تابعدار تھیں۔ ایک پاؤں دبا رہی ہے تو دوسری انجیر کے پتے توڑ کر مانگ کھے اور ٹوپیاں سی رہی ہے۔ تیسری نے انگور کی شاخ توڑی، انگوری بیل کا رس دی۔ کچھ مور چھل جھل رہی ہیں۔ ایک صراحی لئے منتظر تو کوئی ساغر تھامے ہے۔ ایک آئی اور مرجان پیس کر تلک لگا گئی۔ عجب بہار ہوتی تھی۔ حوروں کے پرے کے پرے چھم چھم کرتے نہروں میں چھپا چھپ چھینٹے اڑا رہی ہیں۔ کچھ یاقوت کے بیر توڑ کر کھا رہی ہیں۔ کچھ مونگے کے املی کے پیڑ پر بیٹھی کٹاروں سے جھولیاں بھر رہی ہیں۔ کسی من چلی نے جہنم سے دھواں اٹھتے دیکھا تو دوڑی دوڑی گئی، موتی کی سرمہ دانی میں کاجل پار لیا۔ اور دادا حضور ہیں کہ مست و بے خود بیٹھے مزے لے رہے ہیں۔ کبھی طبیعت چاہی تو حوروں کے ساتھ مل کر ان کے ڈوپٹہ چھوا لئے یا کوڑا جمال شاہی کھیل لیا۔ اگر چاندنی کھلی ہے تو ان کے ساتھ لڈی اور خٹک رقص میں شامل ہو گئے۔ اور رضوان کے ڈھول بجا بجا کر بھٹ شاہ کی کافیاں گا رہے ہیں۔ ہمارے دادا تھے ہمیشہ کے بڑے عاشق مزاج۔ حالانکہ ایسی ویسی باتیں سب منع تھیں۔ اسی لئے براق سوار پہرہ دیتے رہتے تھے۔ مگر جہاں پہرداروں کی آنکھ بچی موقع ملا اور کسی حور کو چٹارخے سے پیار کر لیا کسی کو سینے سے لگا لیا۔ جب بلتی سواروں نے ادھر کو منہ کیا اور حور قلقل مینا کی طرح ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ ماما حوا سیانی ہو گئی تھیں۔ لہذا ان کا پردہ کرا دیا گیا یہ خلد بریں کے بالاخانے کی سہ دری میں حضرت جبرئیل کی نگرانی میں رہتی تھیں۔ بس اسرافیل، ور پران کو بہشتی زیور اور علم کا پارہ پڑھانے جاتے تھے۔ سنا ہے یہ بھی ایک چنچل اور منچلی تھیں۔ ایک دن حضرت جبرئیل کے پیچھے پیچھے زبردستی نیچے آ گئیں کہ واہ ہم بھی کیلئے تُتے بلنگیوں کی طرح کیوں اوپر بیٹھے رہیں۔ ہم بھی حوروں کے ساتھ مل کر بیر توڑیں گے۔ جبرئیل نے بہتیری کوشش کی کہ نیچے نہ آئیں، بے پردگی ہوگی۔ بھلا یہ ایک ضدن کہاں ماننے والی تھیں اور اتر آئیں۔ دادا حضور نے اسی وقت شراب طہورہ کا ایک جام نوش فرمایا تھا سرور میں بیٹھے تھے۔ پازیب کے گھنگھروں کی آواز سنی تو یہ چھن چھن نئی معلوم ہوئی مڑ کر دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور عشق کا دیوتا اپنا تیر ان پر چلا گیا۔ عورت تھی یا حسن کی تیلی بس اسی وقت دل تمام وارفتہ و فریفتہ ہو بیٹھے۔ حسن حوری ماند پڑ گیا۔ نگوڑی برف کی قاشیں اور سنگ مرمر کی ٹھنڈی ٹھنڈی سلیں نظر آنے لگیں۔ بھلا عورت کے جسم کا گداز لچک نرمی اور گرمی ان میں کہاں۔ اب تو آنکھ اٹھا کر بھی کسی چھیل چھبیلی حور کو نہ دیکھتے۔ بچاری ہماری دادی بھولی بھالی انہیں کیا خبر کہ ایک ذرا کی ذرا خلد میں آ جانے سے کوئی حشر کو بلا لیا۔ وہ تو بیر توڑ تاڑ واپس چلی گئیں۔ مگر دادا حضور کا تو یہ عالم کہ جدھر نگاہ ٹھہر گئی ٹھہر گئی۔ نہ وہ پہلا سا ہنسی مذاق نہ شوخی طراری گم گم دل کی دھڑکن پر بھی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تھی اور بے قرار ہو ہو جاتے۔ دو ہی سدھ میں صورت کچھ اور ہو گئی نہ دل کو حوریں بھائیں نہ جنت کی فضائیں من میں سمائیں۔ تن ایسا تپ رہا گویا جہنم کی ساری آتش انہیں میں بھر دی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ حوریں بچاریاں بھی اس ایکا ایکی تغیر حال پر پریشان ہو گئیں۔ آخر آدم سے پہلے تو انہیں کو گئے تھے بڑا تردد تھا۔ لاکھ ناؤ بناؤ کر کے اپنی سی بھلانے رجھانے کی بہتیرے جتن کرتیں۔ یہ برا ہو اس عشق کا جس دل میں آباد ہوا۔ اس کو برباد کیا۔ دادا ابا کو تو گوشت پوست کی نرم گرم جیتی جاگتی موہنی صورت یاد آتی تھی۔ حسن سادہ میں بیکاری تھی۔ اک اک ادا میں سو سو بناؤ انکھیلیوں کی معصومیت ایسی کہ بہشت کے سارے حور و قصور نثار کئے گئے تھے۔ جب دادی بی کی دوبارہ دید میسر نہ آئی تو تمنا و جستجو تیز ہو گئے۔ ان کے ساتھ جنون بھی سوا ہوا اور چپ کی بجائے نالہ و فریاد نے اسیر کر لیا۔ جنت کے ایک ایک گل پھول کے پاس جاتے۔ پتے پتے سے محبوب کا پتہ پوچھتے۔ بلبلوں کے سامنے آہ و بکا کرتے۔ کبھی حسن کی توصیف میں قصیدہ بیانی ہوتی۔ کبھی معشوق کا ستم بے پروائی جتاتے۔ اور زبان پر اشعار کا ایک سرچشمہ رواں ہو گیا۔ عشق و شوق نے مہمیز لگائی۔ شاعری گداز ہوئی۔ جلاپے کر آگے بڑھایا۔ پھر تو یہ ہوا کہ حضرت جبرئیل سے بھی الٹ سلٹ باتیں کرنے لگے۔ جبرئیل حیران کہ اب اللہ میاں نے جو پیغام بھیجا ہے۔ اس کا جواب کیا لے جا کر دوں گا۔ یہ شخص تو اپنی سدھ بدھ گنوا بیٹھا۔ کیونکہ دادا حضور پر جو عالم عشق ہوتا اسی انداز طبع میں شعر موزوں ہو کر زبان سے نکلتے۔ جو غریب جبرئیل کے خاک بھی پلے نہ پڑتے۔ مگر ان کی سمجھ کا بھی کیا قصور تھا۔ سیدھے سادے صوم و صلوٰۃ کے پابند مومن قسم کے فرشتے تھے۔ عشق و شوق وہ کیا جانیں اور شاعری کیا بلا ہے کیا سمجھیں۔ سپاہی کی طرح حکم بجا لاتا آتا تھا۔ خیر ادھر تو حوروں نے حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبا دبا کر افسوس کیا۔ پھر جلی کٹی باتیں کہنے لگیں کہ بڑا عشق سوار ہوا ہے۔ آدم زادی کو ہم پر سوت بنا کر بٹھانا چاہتے ہیں۔ جب بالا پڑے گا اور تریا چلتر کی قلعی کھلے گی تو پھر میاں صاحب کو ہمارا

قدر معلوم ہوکر ہمیں یاد آئیں گے اور ہماری تمنائیں عمر بھر سجدے میں ناک رگڑا کریں گے۔ ادلی سوکن کا جلاپہ تو مول ناگن کے بس سے برا۔ سبھوں نے ایکا کر آدم حوا دونوں کی طرف سے جبرئیل کے کان بھرے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بارگاہِ الٰہی میں دادا حضور کے وحشتِ عشق اور خبطِ شاعری کا ذکر پہنچا بس اتنی سی خطا پر اسی دم جلال نازل ہوا۔ انہیں خلد سے بطرف کر قرطبہ میں پھینکا اور ہماری دادی بی کو بابل میں۔ میرے دادا شعر ولی کے کارن مصیبتوں میں گرفتار ہوئے نہ شاعری کا سودا ہوتا نہ دنیا کے جنجال معلوم ہوتے۔ مگر انسان ہو تو ایسا ارادے اور ہمت میں اٹل ہو کہ اپنے عشق علم کے پیچھے آسائش دعوت کا بھی خیال نہ کیا۔

بس صاحب یہ فراق میں آہیں بھرتے صحرا بہ صحرا پھرتے اشعار پڑھتے جاتے تھے۔ جی کی جلن [illegible] سو ذرا مٹتا تو دھاڑیں دھار دھار ایسا روتے کہ جل تھل بھر گئے۔ وہی خاک [illegible] نے جنگل بن میں بہار ہی بہار ہو کر گلشن تیز ہو گیا۔ جدھر دیکھو آب [illegible] ہر ے رہا ہے بیل بوٹے لہلہا رہے ہیں۔ آہ بھرتے تو [illegible] ایک جو [illegible] آجاتا۔ کہیں ہوا دیاں بن جاتیں کہیں پہاڑ ابھر آتے [illegible] انہیں سے سینچے ہیں۔ عرصہ دراز تک ان کی آہ و زاری نے کائنات نگاری کی اور جہاں [illegible] میں گل کاریاں ہوتی رہیں۔ اور رعنائیاں ہی رعنائیاں جلوہ نما ہو گئیں۔ آخر تھک ہار کر عرب کی سرزمین پر بیٹھ رہے۔ مدتوں کی اشک باری سے آنسو جمع ہو کر بحرِ عرب بنا ہی چکے تھے۔ ایک دن جی میں آئی کہ قرطبہ کو [illegible] گئے۔ مگر اس دلبر کی صورت پھر نظر نہ آئی تصور حوا باندھا اور خودکشی کرنے [illegible] میں چھلانگ لگا دی۔ اعجازِ عشق کی کرشمہ سازی تھی کہ لہریں اپنی آغوش میں ان کو ساحل ساحل لئے پھریں۔ دوسا ایک دن ایک موج نے [illegible] دلگداز پر ترس کھا کر بابل کے کنارے ریت پر لا ڈالا۔ اس وقت حسن اتفاق سے ماما حوا وہیں کھڑی ہوئی آفتاب کو غروب ہوتا دیکھ [illegible] جونہی بابا آدم کو دیکھا نیچے دیکھا ٹھٹک گئیں۔ سمجھیں کوئی جنات دیو آگیا۔ اور انہیں اٹھا کر لے جائے گا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے دادا [illegible] ہیبت تھی ہی ایسی۔ کہاں وہ خوش تر و تازہ دمکتا چہرہ بھرا بھرا ڈیل کہاں یہ ہڈی چمڑا۔ غیر دادی بی ڈر کے سیمی سکڑی کھڑی رہیں۔ [illegible] جی ہی جی میں کوستی تھیں جن کے چلاپے نے یہ دن دکھائے

مگر دادا حضور تو انہیں کا نام لے لے کر عزلیں پڑھ پڑھ کر سر دھن رہے تھے۔ چنانچہ ماما حوا کا خوف جاتا رہا سمجھ گئیں یہ وہی احمق آدم ہے جو ہمارے عشق میں دیوانہ ہو کر راندۂ درگاہ ہوا اور اس درگت کو پہنچا۔ تب محبت کے جوش میں رحم اور تاسف سے کٹنے لگا۔ فوراً بڑھ کر انہوں نے آدم کو سنبھالا اور بولیں ہوش میں آئیے۔ یہ کیا حال کر لیا۔ خواہ مخواہ خود بھی ویران ہوئے [illegible] ہمارے تئیں بھی عذاب میں ڈالا۔ سچ ہی کہتے تھے جبرئیل مردے [illegible] بھلائی نہیں ہوتی۔ اول اگر شعر نہ پڑھتے تو تمہارا کون ساحرج تھا۔ ذرا چہرہ تو دکھاؤ [illegible] ہو گیا۔

آدم نے سن کر جواب دیا۔ ارے نیک بخت پھر تیرے عشق میں آخر کیا کرتا۔ تو عورت کی عورت ہی رہے گی۔

تو یہ بھی خوب کہی۔ لے کرتے کیا ہماری طرح چپ سادھ لیتے نہ شاعری کرتے نہ مول حوروں کے کان میں محبت کی بات پڑتی۔ ہمیں دیکھو ہیں چھپکے چھپکے عرفہ سے جھانکا کرتے تھے۔ جبرئیل کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ خیر اللہ کو ان کا ملاپ یوں ہی منظور تھا۔ اور شعر و ادب کی لازوال دولت یونہی دنیا میں اتارنی مقصود تھی۔ اتنے عرصہ میں عتاب خداوندی بھی کم ہو گیا تھا۔ فردوس میں واپس تو اس واسطے نہ بلایا کہ خدا خوب سمجھتا تھا کہ اس آدم کو سارے عیش و مسرت بخش کر جس لذت سے بچایا تھا۔ اس عشق کا مزہ چکھ لیا اب ہمارے کام کا نہیں رہا۔ لہذا حکم ہوا کہ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ چنانچہ میکائیل روزانہ کرپوچھ جاتے کیا پکوا کر بھیجوں جس چیز کی ضرورت ہو بتا دیجئے۔

پھر تو دونوں مزے مزے سے من و سلوا کھاتے۔ بے فکری سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرا کرتے۔ پیار و محبت کی باتیں ہوا کرتیں۔ کلموہی حوریں اب بھی فلک پر سے دیکھتیں اور حسد سے کڑھتیں۔ دونوں بچاروں پر بے حیائی کی تہمتیں دھرتیں بدستر عیب لگاتیں۔ ہائے ہائے لا خدا معلوم پھر کیا کانا پھوسی ہوئی کہ پھر آدم کے نام فرمان جاری ہو گیا کہ جو حوروں کو نہ چاہے وہ کافر۔ روزہ نماز کی سزا و جزا کی خبر الگ بھیجی۔ لیکن شاباش اس مرد خدا پر عشق کا جا ایسا پہنا کہ سب کلفتیں اور مصیبتیں سہنے پر بہ خوشی راضی ہو گیا۔ حوروں نے سنا کے فرمان کے خوشی میں اپنے سیاہ بال کھولے جھولوں میں پینگیں چڑھتی ہیں کہ۔

دیکھا حضرت عشق کیا ہوتا ہے۔ اور ایسی سزا دلوائی۔ بہرحال دادی بی نے وہ سارے اشعار جمع کر رکھے تھے جو دادا حضور نے حوا کی جدائی میں کہے تھے وہ بابا آدم کو دکھائے۔ انہیں بڑا تعجب ہوا۔ اور پوچھا تمہارے پاس کیونکر پہنچے تو دادی بی اٹھلا کر بڑے ناز سے بولیں ہو ہمیں لا کر سناتی تھیں آخر ہمارے دل کو بھی تو تم سے کچھ نہادتھی۔ اور ہدہد آکر کہتے تھے۔ بلبلیں پڑھتی تھیں اور کلیاں اپنے سینوں میں چھپا لیتی تھیں۔ پھر غنچہ غنچہ ہم کو حفظ کراتا تھا۔ اے بھی سچے دن تھے۔ اللہ نے چرند پرند حیوان انسان جن پری سب کو ہماری تمہاری طرح بولنے کو زبان دے رکھی تھی۔ تو شاعری کی ابتدا یوں میرے خاندان میں ہوئی۔ میرے ابا کے کتب خانے میں مثنوی کا ایک حصہ اب تک موجود تھا جس میں جنت سے نکلنے کی بپتا اور سنجوگ تک کی کل رام کہانی تھی۔ مگر اس کٹاچھنی میں کافروں نے جب گھر کو آگ لگا دی تو وہ اوراق بھی تلف ہو گئے۔

ہماری دادی بی کے ہاں یوں تو بے گنتی اولادیں ہوئیں مگر مجھکو وہی چچا پھوپھیاں یاد ہیں جنھوں نے میری علمی تربیت میں حصہ لیا۔ یا یوں کہئے کہ مجھے ادبی فیض پہنچایا۔

میری بڑی پھوپی کلوپیٹرا ہو بہو دادی بی کی بنی بنائی دوسری تصویر تھیں۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جولیس سیزر سے شادی ہوئی اور بیوہ ہونے کے بعد ملک ہند کے شاہ نصیر سے ان کا عقد ثانی ہوا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی میراجی اور دو بیٹے بھگت کبیر اور تلسی داس ہوئے۔ چونکہ یہ لاولد تھے مجھے گود لے لیا۔ لہذا ترکے میں ساری کتابوں کا وارث مجھے قرار دیا۔

میری والدہ کوہستان کی تھیں۔ ان کے والد کنفوشیس تھے۔ اس طرح نہ صرف ددھیال بلکہ ننھیال سے بھی علمی ذوق فلسفہ و معرفت کا شوق میرے ہیں آیا۔ میری خالہ زیب النساء اورنگ زیب کی بیٹی تھیں۔ اور ان کے خلیرے بھائی طوسی و رازی تھے۔ جن کی تصنیف و تالیف جسے اگر راون لنکا میں روپوش ہو گیا تھا۔ اور جس کی شکر گنتی کو فردوسی نے جو میرے سنجھلے خالو کے گیلڑ تھے۔ رام چندر جی کو شاہنامہ دے کر بھیجا تھا۔ ادھر سیفو شاعرہ نے گریست سکندر اعظم کو جو اس کا پہلا معشوق تھا لنکا پر چڑھائی کے لئے روانہ کیا۔ سچی کے زمانے تھے۔ دل میں خوف و ایمان تھا۔ روحیں منور اور ذہن پاک تھے۔ چوری جیسی نہ بات تھی۔ ساری دنیا راون کے خلاف جنگ آزما ہو گئی۔ لیکن سکندر اعظم ہند پہنچا تو گوتم بدھ کا چیلا بن گیا اور بھگوت گیتا تحریر کی۔ جو اس کی موت کے بعد میرے ابا کو دے دی گئی۔ کیونکہ دادا حضور کی بڑی اولاد تھے۔ رام چندر جی ہند کے گھنے جنگلوں میں مع فوج کے راستہ بھول گئے۔ اسی اثنا میں مہاکوی کالیداس سے ملاقات ہوئی۔ اور کالی داس نے اپنی نواسی سیتا جی کو پورے تزک و احتشام سے رام سے بیاہ دیا۔ اور جہیز میں اپنی کویتا دی۔ بوا بتاتی تھیں کہ وہ کویتا شاعری کی اتنی موٹی کتاب تھی کہ بیس گھوڑوں کے رتھ میں رکھی جاتی تھی۔ رام چندر جی کے بعد سیتا جی تنہا رہ گئیں تو میرے ابا کی راکھی بند بہن بن گئیں اور انہوں نے وہ کتاب میری شعر رکھائی کے موقعہ پر تحفے میں دے دی۔ مگر افسوس اس کتاب کا ایک ورق بھی میرے پاس نہیں۔ کیونکہ گنگا میں ایک مرتبہ شب نددرون کا سیلاب آیا۔ آدھا شہر ڈوب گیا اور وہ کتاب بھی لہروں کی نذر ہو گئی۔

میرے چار چچا بچپن ہی سے سیاحی کے شوقین تھے۔ ایک تو کوہ طور پر جا بیٹھے اور ضرب الیم لکھی۔ اس کے چاروں طرف ابھی تک عقاب اور شاہین پہرہ دیتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کی اس کتاب تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کے لئے دیدہ بینا چاہئے۔ اور جو دیدہ بینا رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم کو چاروں طرف اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ پھر کیا ڈر ہے کہ شاہین اور عقاب کے پنجوں سے لہو لہان ہو کر کوہ طور پر پہنچیں۔ مگر میں تو سال میں تین دفعہ اس کتاب کی زیارت شبنم سے وضو کر کے کر لیتی ہوں۔ باقی کے تین چچا نطشے، گوئٹے اور چچا شکر پیر براستہ خشکی سمندر پار چلے گئے۔ چچا شکر پیر کا نام ان کی فرنگی بیوی نے پیار میں بگاڑ کر شیکسپیر کر دیا تھا۔ اور انہیں تینوں چچاؤں کی زبانی دادا حضور کی داستان عشق سن سن کر اس ملٹن نے بہشت گم شدہ تصنیف کی تھی۔ اسی کتاب کی بدولت وہ آج تک مشہور ہے۔ اصلاح کے واسطے اپنے مسودے اس نے ابا کو بھی بھیجے تھے۔ میرے تایا جان پیدائشی اللہ والے تھے۔ ان کا نام الہجویری تھا اور کشف المحجوب ابا کے حوالے کی۔ ہمارے ابا جان کو شاعری اور قصہ گوئی کا عارضہ تھا تو لڑکپن سے۔ مگر جوانی میں فاسخت

کی سوزش ترکیب بند اور مخمس کا فالج گرپڑا اور عربستان کی آب و ہوا موافق نہ آتی تھی۔ چنانچہ دادی بی کی رحلت کے بعد یہ اپنے اہل و عیال کو لے کر نجد اور بخارا کے برفستانوں میں سے ہوتے ہوئے تبت کے منجمد شمالی کے جنوبی ریگستان میں ایک قصبہ بنام سندربن تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے چلے گئے۔ مگر ملک روس نے جدید فلکی طیارے کا تجربہ چاند پر کیا اور دریائی شیر اور دریائی گھوڑے پانی میں سے نکل نکل کر خشکی پہ آگئے۔ لہٰذا وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ اسی زمانے میں حضرت امیر خسرو جو ابا کے ہم زمانہ تھے انہوں نے خط لکھا کہ ہند آ جاؤ۔ اکیلے میں میں بھی گھبراتا ہوں۔ یہ سرزمین بڑی مہمان نواز ہے۔ اور ہر زبان بڑی خوش اسلوبی سے یہاں کی زبان میں سمو جاتی ہے۔ چنانچہ ابا نے رختِ سفر باندھ لیا اور کوہ ہمالہ عبور کر کے ہند آ گئے۔ یہاں آریائی اور ترکوں کے حملے ختم ہو چکے تھے۔ جمنا کے کنارے قلعہ معلیٰ خالی ڈھنڈار پڑا تھا۔ اس میں انہوں نے پھر قلعہ کو آراستہ پیراستہ کیا اور مستقل سکونت اس ملک گرم کی اختیار کر لی۔

یہ تو نہیں کہ یہاں آ کر ابا تندرست و توانا رہنے لگے ہوں۔ مگر ہاں اتنا ہوا کہ اس مرض کے اور بھی بیمار مل گئے جو بلا ناغہ مغرب کے وقت سے گجر دم تک سب اکٹھے ہو کر اپنے اپنے امراض کی کل کیفیت بے چینیوں و کھ درد کا ذکر کرتے۔ قدیم نسخوں میں رد و بدل کمی بیشی کی باتی نئی نئی دوائیاں ٹھنڈائیاں معجونات او رمقویات کے اضافے ہوتے۔ ان آنے والوں میں میر تقی میر، جنت مکانی چچا غالب، چکبست، درد، سودا، آتش سب ہی ہوتے تھے۔ ابھی میں نے دنیا میں قدم نہ رکھا تھا۔ میرے انتالیس بھائی تھے۔ ابا کو ایک بیٹی کی بڑی آرزو تھی۔ بہت منتیں مرادیں مان رکھی تھیں۔ آخر خدا نے ان کی سن لی۔ جب ہماری اماں کا پیر بھاری ہوا تو وہ پیڑوں پر چڑھ چڑھ کر املیاں بہت کھاتی تھیں۔ ابا کو سخت تردد ہوا کیونکہ وہ اماں کو چاہتے بہت تھے، اکلوتی بیوی تھیں۔ فوراً حکیم ارسطو کو بلوایا جو بلاقی بیگم کے کوچہ میں رہتے تھے اور جن کا مطب بڑھ شاہ بولا پر تھا۔ یہ ہمارے خاندانی حکیم تھے۔ ابا کے اصرار پر یونان سے آ گئے تھے۔ ان کی حکمت کے کمال کا کیا کہنا۔ اپنے وقت کے مسیحا تھے۔ بس مریض کے پرنانا کے نام کا آخری حرف پوچھا اور کل مرض پہچان لیا۔ موئے آج کل کے طبیبوں کی طرح تھوڑی کہ اپنے کانوں میں رسیاں ٹھونسیں اور مریض کے کلیجے پر ترازو کے پلڑے رکھ رکھ کر دل ٹٹولیں۔ جب بھی بیماری خاک سمجھ میں نہ آئے۔ حکیم ارسطو خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ فلسفہ رمل جفر میں نے انہیں سے سیکھا۔ علم ہندسہ ان کو مچھلیوں کی ایک بڑی پرانی راہبہ نے سکھایا تھا۔ ارسطو علم طب کی کھوج میں جنگلوں، بنوں، پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کی خاصیت معلوم کرنے سرگرداں پھرا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں برسوں ندیا اور سمندروں کی پاتال میں رہے۔ وہیں ان کی ملاقات اس راہبہ مچھلی سے ہوئی۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں وہ مچھلی مجوسہ تھی اور جادو ٹونا کرتی تھی۔ اس دریا کے کنارے جو بھولا بھٹکا مسافر آ جاتا اس کو مچھلی بنا لیا کرتی۔ ایک بار حضرت سلیمان کے ایک جنات کا چار برس کا بچہ کھو گیا۔ نہ معلوم کس نے اغوا کیا۔ چاروں سمت ڈھونڈیا پڑی تو وہ بچہ اس مجوسہ مچھلی کے گھر سے برے حال برے احوال ملا۔ حضرت سلیمان کو طیش آیا فوراً مچھلی کو اپنی خدمت میں طلب کیا اور حکم تھے بیٹروں سے اڑانے کا حکم صادر فرمایا۔ زندگی تو چاہے مچھلی ہو ہر جاندار کو پیاری ہوتی ہے۔ اس نے فوراً جرم کا اقرار کر کے توبہ کی۔ اور حضرت سلیمان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایمان لے آئی۔ پھر حضرت سلیمان نے اس کو اپنی مجلس نجوم کا ناظم اعلیٰ مقرر فرما دیا تھا۔ اور یہ علم خود سکھایا کہ جانوروں کو قسمت کا حال بتا کر راہ راست پر لایا کرے۔ مگر اب تو آئے دن یہی سن لو فلاں بچہ کھو گیا۔ اس کا بچہ کھو گیا۔ میں سوچتی ہوں وہ کمبخت مچھلی کہیں پھر ایمان سے تو نہیں پھر گئی۔ جن مہینوں میں تاروں بھری راتیں ہوتیں۔ موتی مسجد میں اپنے ہمراہ مجھے بھی لے کر جاتے۔ پھر یا تو مینار پر چڑھتے یا سنگ مرمر کے ٹھنڈے ٹھنڈے صحن میں چہل قدمی کرتے جاتے۔ اور اپنی انگلی سے آسمان پہ نقشے کھینچ کھینچ کر ایک ایک پل ساعت کی اہمیت اور ستاروں کے برج مقام غرض سب چٹکیوں میں یوں سمجھا دیتے کہ معلوم ہوتا گھول کر پلا دیا۔ اے اب نہ ویسے حکمت والے استاد رہے۔ نہ ویسے شاگرد۔ خیر تو میں کہہ رہی تھی۔ جب اماں کی کیفیت ارسطو نے سنی تو ان کے ہونٹوں پر دلفریب تبسم آ گیا اور کہنے لگے۔ قبلہ مبارک ہو ملیاں کھانے کا شگون نہایت نیک ہے۔ بیٹی ہو گی جو شاعری میں شہرۂ آفاق اور علم و فضل میں طاق۔ اس کا نام ڈال ڈال اور پات پات لکھا جائے گا۔ ابا کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میرے ہونے سے پہلے ہی چاروں کھونٹ سانڈنی سوار قاصد اس زمانے کے سارے عالموں فاضلوں کے پاس دعوتی رقعے دے دے کر

روانہ کردیئے۔ جہاں خبر لگتی کہ کوئی ہنرمند ہے۔ خلعت بھجواتے۔ منت سماجت توقیر و تکریم سے اس کو بلواتے۔ اس کی ظاہری ہیئت سے کوئی سروکار نہ ہوتا چاہے۔ درویش صورت ہو یا امیرانہ ٹھاٹ باٹ والا۔ اور ابا نے حکم دے دیا کہ میری بیٹی کے واسطے کاغذ قلم کتاب کا پورا انتظام ابھی سے ہو جائے۔ یہ جمنا کا پل بھی اسی لئے تعمیر ہوا کہ تب سے آکا کلیس دو خانی جہاز بھر بھر کر امریکہ سے کتابیں لے کر آتے تھے۔ ان کا جہاز جمنا میں لنگر انداز ہوتا تھا پھر پل پر سے میانے میں بیٹھ کر ساری کتابوں کا ذخیرہ اپنی نگرانی میں محلسرا میں منگوا دیتے۔ میر انیس اور دبیر نے صندل اور ریلوے کے قلم تراش تراش کر قلمدان کے قلمدان بھر دیئے۔ قلعے کے طاقوں میں چاندی سونے کے ورق اور کلابتو اور منقش کی کامدار جلدوں والی کتابیں سجا دی گئیں۔ دودھ پلانے کو انا کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک بہت پارسا بیوی روشن چراغ دلی کی درگاہ پر بیٹھی ہوئی مل گئیں۔ یہ بھی اپنے زمانے کی عالم و فاضل ہستی مانی جاتی تھیں۔ غالبؔ تک فارسی کلام کی اصلاح انہیں سے لیتے تھے۔ یہ تھیں تو کسی مالن کی لڑکی اور پھول بیچنے محلوں میں جایا کرتی تھیں ایک روز واجد علی شاہ کے دربار میں ایک ایرانی بیٹھا تھا وہ ان کے حسن ہندی سے ایسا متاثر ہوا کہ لکھنؤ سے جاتے وقت ان کو بھی اپنے ساتھ ایران لیتا گیا۔ فارسی انہوں نے وہیں سیکھی تھی۔ جب وہ مر گیا تو اپنے وطن واپس آگئیں۔

اللہ اللہ کر کے وہ نیک گھڑی آگئی جس کا ابا کو برسوں سے انتظار تھا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور ہوا۔ ابا نے نہال ہو کر مجھے گود میں لیا۔ چچا غالب نے اذان کہی۔ خالو ابا امیر خسرو نے شہد چٹایا۔ حاتم اور قائم نے تاریخیں کہیں۔

مجھے تین برس پہلے کی باتیں تو یاد نہیں۔ مگر اس کے بعد کی تو ایک ایک تصویر ذہن میں جوں کی توں محفوظ ہے۔ جب بزم ادب و سخن کے وہ عروج و اوج یاد آتے ہیں تو سینہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے اور میں ماری پور میں کسی ناگ پھنی کی جھاڑی کی چھاؤں میں ریت کے ٹیلے پر بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر ماضی کے پٹ کھول کر اردو اور اردو والوں سے دو دو باتیں کر لیتی ہوں۔ بغیر سہارے آخر کوئی کیونکر جی سکتا ہے۔ اور میرا بس یہی سہارا ہے کہ کبھی میر کے بیت پڑھے سر دھنا۔ کبھی انشاء اللہ خاں کو یاد کیا۔ یا بابائے اردو کے دیرینہ عاشقوں کو درود تسبیح پڑھ کر بخش دیا۔

میری تعلیم و تربیت ان لوگوں کی آغوش میں ہوئی جن کے نام کی تختیاں یہ سارے ادیب و شاعر اپنے گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔ اور پھر بھی موئے کورے کے کورے۔ جب چار برس دس دن کی ہوئی تو ابا نے بڑے دھوم دھام سے میری شعر رکھائی کی تقریب منائی۔ اس ہی رسم کے موقع پر میرا جی نے اپنے بھجنوں کا مجموعہ مجھے نیگ میں دیا تھا۔ اور مولانا روم نے جو میرے بڑے پھوپھا تھے اپنی مثنوی بھیجی تھی۔

اس کے بعد میری تعلیم باقاعدگی سے شروع ہوئی۔ ایک برہمن اشلوک چند شاستری ویدی ہندی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ دراصل وہ اصل نسل برہمن تو نہ تھے۔ ان کے پتا گوجر تھے اور قلعہ میں دودھ لاتے تھے۔ سنتے ہیں ان کی گائے نے تین جڑواں بچھیاں جنم دیں۔

تین ماتاؤں کا گاؤں میں یک وقت جنم لینا دیوتاؤں کی خوشنودی کی علامت تھی۔ لہٰذا سارے گاؤں والوں نے اس عقیدت مندی جنیؤ پہنا کر مندر کا پنڈت بنا کر شدھ برہمن مان لیا۔ یہ پوچھنے سے پہلے آکر ہندی پڑھاتے تھے۔ اور کوئی چھ ماہ میں مجھے اس قابل کر دیا کہ میں تمام رگ وید، سوم وید سے لے کر رامائن اور شکنتلا کا پاٹ فرفر سنانے لگی۔ ہندو دیومالا اور مذہبی عقائد کا فلسفہ سکھانے کے بعد سے مجھے کچھ روز کو اپنے ساتھ سری ناتھ گنگوتری کے مقام پر لے گئے۔ یہیں لوک پرلوک اکھنڈ بیکنٹھ جیون مرن کے طلسم اور رنیا غمازبنیں۔ میری تعلیم کا یہ کٹھن زمانہ تھا۔ آتما کی شکتی اور جیون کی نرملتا کے بھاگ کا پہلا عملی درس اسی جگہ شروع ہوا۔ گو دن کٹھن بہت سنکٹ کے تھے۔ پر دور اگر مجھ پر نہ گزرتا تو نہ میرا دل گداز ہوتا نہ حس کو ٹھیس لگتی اور یہ دور جواب آئینہ کی طرح ہر کثافت سے پاک ہو کر صاف و شفاف ہو گئی۔ اور مجھے زندگی کی مٹھاس تلخی و ترشی کے لطف و ستم، مسرت و غم کے باریک رازوں سے آشنا کر دیا۔

عمر چھوٹی تھی اور جی یہی چاہتا تھا کہ دوڑوں بھاگوں، کھیلوں کودوں۔ خصوصاً کئی کئی دن کے فاقے سے آنکھوں تلے اندھیرا آجاتا۔ پنڈت جی دن بھر میں ایک سمے دودھیا بوٹی اور ٹاک دھتورے کا بھوجن دیتے۔ اور رات دن گنگا کی بہتی دھارا میں آسن جما کر یوگ کی مشق کراتے تھے۔ جب مجھے زیادہ

ہلکان اور بیزار پاتے تو بہت میٹھے لہجہ میں نصیحتیں کرتے۔ ان کی آواز مستقل مزاجی صبر اور علم کی حقیقی گہرائی سے کڑی اور خشک ہو گئی تھی۔ اور آج بھی ان کی آواز ان کے جملے کانوں میں گونج جاتے ہیں۔ کہتے تھے۔ بیٹی یہ دھرتی آکاش پربت پاتال سب مایا ہے۔ جس میں دکھ اور سکھ کے بھنور ہیں اور پرش ان میں پھنس کر بیاکل رہتا ہے۔ مگر آتما کو ساجن پیتم کی ہمیشہ کھوج رہتی ہے۔ پر اس جوتی سروپ اور ساجن کے اتی مدھ بھرا پریم کا پیالہ پینے کے لئے من کا کپٹ سردے کا سب کھوٹ اور کلپنا دور کرنی ہوگی۔ اس پاپی آگ کی ممتا بھلاؤ۔ اس کو گور مکھ میں ڈالو۔ مورکھ من کی جب سب آشائیں نراس ہو جائیں گی۔ تب آتما کو نرمل شانتی پراپت ہوگی اور پرانوں میں نروان نشچے ملے گا۔ یہی بلوان وید یا ہے یہی اتم شکتی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ آغاز میں تو مجھے وہ سب کچھ درحقیقت ظلم و ستم ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسا مزہ دینے لگا۔ جو شاید پھر کبھی نصیب نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا میں ہوا سے زیادہ سبک اور شبنم سے زیادہ مقطر ہوں وہ لمحے بھی آتے تھے جب کل کائنات مجھ میں سما جاتی تھی اور وہ لمحے بھی ہوتے تھے جب ساری کائنات میں میں ہی میں سمائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چاند کے منور چہرے میں بھی اپنی صورت نظر آتی تھی اور ایک نور کا ہالہ تھا جس نے مجھے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور میں کبھی اس روشنی میں فلک کی بلندیوں پر اڑتی کبھی تحت الثرا کے کمین کونوں میں چھپ جاتی تھی۔ اور اس وقت دل میں کیف و مستی اور عشق و محبت کا سمندر موجیں مارتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ذرہ ذرہ کسی کا جلوہ بن جاتا۔ اور زباں خموشی سے داستان راز کہتا۔ میرے سامنے کلی کلی بند قبا چاک کر دیتی جس کے ہر بخیہ میں ایک دل ہوتا جو د زندگی کے سینکڑوں بھید دکھا و نمایاں کرتا۔ اور عارضی زندگی کی عارضی تکلیفیں ہیچ ہو جاتی تھیں۔ پھر مجھے نہ کسی سے نفرت باقی رہتی نہ رغبت نہ کوئی اپنا ہوتا نہ بیگانہ سنسار کی ساری چنتا کے بھار دور ہو جاتے۔

پنڈت جی کے امتحان میں جب میں کامیاب ہو گئی تو ہم واپس آ گئے۔ الٰہ آباد ایسے بگڑ کہتی تھیں۔ میری ارمانوں کا اور اللہ آمین پھول سی ایک بچی اور تم نے اس مرتیبیتوں کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ بھاڑ میں جائے ایسا علم و لم۔ لیکن پڑھنے کا چسکا مجھے کچھ پڑ گیا تھا اور میں اماں کی باتوں پر کان نہ دھرتی۔ سارا وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف گزر جاتا۔ کبھی اگر طبیعت اچاٹ ہوتی اور میں دل بہلانے چھت پر چلی گئی تو ایرانی، حیرانی، نصرانی تھما تھما تیں، ادھر اجیالی چاندنی کے خولوں میں کچے شیشے کی کنی نیلم کی روشنائی، یاقوت کے قلم لیے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ آگے آگے شیخ سعدی عروض کی تعلیم فرماتے جا رہے ہیں۔ جب ذرا ہشاش بشاش ہوئی کوٹھے سے اتری۔ شیخ سعدی ہمراہ ہیں۔ چپ چاپ بیٹھ گئے۔ وہاں شعر تولنے کا کانٹا لگا رکھا تھا۔ فوراً مجھ سے ایک شعر کہلوایا۔ اور کانٹے کے پلڑے میں ڈال دیا۔ رائی کے باٹ لے کر حرف تولے۔ اللہ بخشے ان کے پاس ایک مقراض ہمیشہ چوغے کی جیب میں رہتی تھی۔ وہ نکالی جو حرف نامناسب نا ہموار یا جھول پایا فی الفور قطع کر دیئے۔ پھر زبانی شعر کی حقیقی اور مجازی شرح کروا کر سنی۔ ہر لفظ کی وجہ پوچھی کہ فلانے لفظ کی جگہ دلاں لفظ کیوں استعمال نہیں کیا۔ ترکیب کے رمز و کنائے کے متعلق گفتگو کی۔ اضافت محاسن سمجھائے۔ پھر حدیث اور فقہ کے سبق دیئے۔ خوش خطی کی باری آئی۔ ایک رکوع قرآن شریف کا لکھوایا۔ پورے رکوع کے معنی پوچھے۔ ہر آیت کی تفسیر سنی۔ سورتوں کے عدد اور موکل یاد کرائے۔ اتنے میں ریت گھڑی نے ظہر کا وقت بتایا۔ اور ہماری چھٹی ہوئی۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حجرہ میں وظیفہ و وظائف کے لئے چلے گئے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر میں میر تقی کی طرف چلی گئی۔ ان کو میرے سے خاص انسیت تھی۔ لیکن میں ڈرتی بھی سب سے زیادہ انہیں سے تھی۔ ان کے آگے لب ہلانا تک جان پر آتا تھا۔ گھنٹوں جملوں کی مشق کرتی۔ اگر غلطی سے کسی لفظ کی صحیح آواز نہ نکلی یا جملے کی بندش میں ادنیٰ پیچ ہو گئی تو میر صاحب ہفتوں برہم اور خفا رہتے تھے۔ بلکہ میری صورت تک دیکھنی گوارا نہ ہوتی۔ اور آج کل اوٹ پٹانگ کلام کی اگر ان کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی ہوتی تو سچ مچ وہ اپنی کلیات کو اپنے ساتھ ملک عدم لے جاتے۔

ظفر شاہ ظفر تو ان کی زبان کے ایسے قائل تھے کہ کلیات سامنے آئی۔ اور وہ باادب کھڑے ہو کر تعظیم بجا لائے۔ جب آخری عمر میں رنگون میں صاحب فراش تھے تو اس زمانے میں میر کا ایک شعر زعفران سے لکھوا کر روز دھو کر پیتے تھے۔ یہ اسی کلام کی برکت تھی کہ ظفر شاہ کی زبان مرض الموت تک نہ بگڑی۔

زبان کے معاملے میں میر تقی سے زیادہ محکم محتاط اور حرف گیر نہ دیکھا نہ سنا۔ معمولی معمولی لفظوں پر آٹھواروں غور و خوض ہوتا تھا۔ اللہ مارے یہ فرنگی جج کبھی مقابلہ حسن میں کھڑی ہونے والی لڑکیوں کو اس باریک بینی سے نہ تاڑتے ہوں گے۔ جس طرح میر ایک ایک حرف کے قد و قامت، سینہ، کمر کولھے، ابرو، چتون کو ناپ تول کر جانچتے تھے۔ کبھی لفظ کو ہوا میں اچھالا بلندی و پرواز معلوم کی۔ زمین پر ڈالا اور اس کی خاموشی ضبط و تحمل، شور و شر ملاحظہ ہوا۔ ہفتوں مٹھی میں بند کئے بیٹھے ہیں۔ اور اس کی گھٹن پھڑک بوجھی جا رہی ہے۔ اگر ٹیڑھا میڑھا یا کانا کھدرا ہوا تو ریتی سے گھس گھس کر ناک نقشہ درست کر رہے ہیں۔ ان کی طرف سے اکثر ٹھوکنے بجانے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ جب ان کے حسب دلخواہ اس کی شکل و شباہت، رفتار و گفتار، رفتہ و روانی آگہی اور نشیب و فراز، لوچ و لچک۔ فراخ و تنگی نے مل ملا کر بانکپن ملاحت و صباحت مٹھاس اور نمکینی پیدا کر دی۔ چال ڈھال سبطر ہمت سجل ہو گئے تو کسوٹی پر آخری بار کسا۔ پھر کہیں جا کر اپنے استعمال میں لائے۔ ایسے ایسے کڑیل ڈنڈ پیلنے والے الفاظ ان کے آگے بے بسی سے سر جھکائے کھڑے رہتے کہ بعض اوقات بے اختیار ہنسی بھی آتی تھی کہ ذرا ان لفظوں کی جسامت اور ڈیل ڈول تو دیکھو۔ پہنچے اچھوں کے قابو میں نہ آئیں ایک ہی چیتر میں شعراء کی قلعی کھول کر سٹی گم کر دیں۔ مگر اس وقت کیسے مسکین بنے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس نظیر اکبر آبادی کا رنگ ہی نرالا تھا۔ انہوں نے جہاں کوئی نیا لفظ دیکھا۔ اس کی سج دھج چھل بل نگاہ میں سمائی یا بنکیلے پن اور بانکپن کی ادا بھائی نہ اس کا نام پوچھا نہ وطن فوراً ہاتھ پکڑا اور سینے سے لپٹا لیا۔ جس طرح چاہا سجایا جس زمین پر چاہا بٹھایا۔ نئے لفظ کو پرانی روایتوں میں اس ہنرمندی اور چابکدستی سے جڑ دیتے تھے کہ مجال ہے، دیکھنے والوں کو یہ سان و گمان گزر تو جائے کہ بے جگہ ہے یا نیا۔ ادھر سے اُدھر جاول برابر بھی کسی کو کھسکانے کی جرأت نہ تھی۔ واقعی عجیب پرکار لوگ تھے جئے تو اپنی زبان کی عزت کے لئے اور مرے تو علم و ادب ہی کے نام پر۔ مگر شتابانی ہے اس نئی پود کی ڈھٹائی پر کہ خود جیتی ہے اس لئے کہ رہا سہا علم ادب مٹ جائے اور زبان کو ابدی نیند سلا دیں۔

ہاں تو میر صاحب بڑے پیارے اور جنتی آدمی تھے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ نہ دنیا سے غرض نہ بندوں سے ناطہ۔ کچھ سروکار تھا وہ اپنی غم پسندی سے۔ خوابوں کی دنیا تھی بے خودی کے منڈل عشق ان کا دیوتا تھا اور شاعری ان کی آرتی۔ من کا دیپ جلا کر درد و الم کی سمرن کرتے رہتے۔ ہمہ وقت اک سوز میں سرگرداں اک فکر میں غرق رہتے۔ گل کی لچک گل کی مہک بلبل کا نالہ شبنم کے آنسو یہی ان کا مذہب تھا۔ باہر جھمیلیں دھوموں سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابا نے فصیلوں کے پاس والا پائیں باغ ان کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ جہاں دنیا کے ہنگاموں کی ہماہمی کی رسائی تھی نہ شور و شر کا چرچا۔ طبیعت نزاکت بھری تھی کھانے پینے میں نفاست اس قدر کہ روز جوہی کے تین شگوفے گوندھ کر کٹورہ بنایا جاتا جس میں حنا کے پھولوں پر سے ڈھلکی ہوئی شبنم کے معطر قطرے ان کے واسطے جمع کئے جاتے جو وہ پانی کی بجائے پیتے تھے۔ گنے گنائے چار ببول کے کانٹوں پر طوطی کا جگر سینکا جاتا اور زندگی کی شوخی جب ذرا اکساتی تو یہ برگ تاک کے نیچے جا بیٹھتے۔ خمار میں مست و مخمور اور ہوا کی گلابی میں طوطی کے کباب نوش کرتے۔ محبوب کی جگہ شعروں کی پتنگوں سے بغل بھری رہتی۔ گلاب کے خاروں سے سینہ کو چھید چھید کر لہو بہا رہے ہیں۔ جب درد کا مزہ خوب پالیا تو اس قدر حزیں و پر ملال غزل کہہ دی کہ لوگ آج تک بھی سن کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ سرخ گلاب کی بیل پر ہزار ہا بلبلیں پھدکتیں پھرتیں۔ دم ساز تھیں تو یہ ہمراز تھیں تو یہ۔ ان ہی بلبلیں سے بات چیت کرتے تھے کبھی کوئی عندلیب گستاخ زبان درازی کر کے غم انگیز بات کہہ دیتی تو میر صاحب پہروں سر کو دھنا کرتے اور سبک سبک آنسوؤں کے موتی پرویا کرتے۔

استعداد کلام ایسی کہ استاد الملک ان کے آگے پانی بھرتے۔ کتیا کا پلا کوں کوں کرے تو یہ بتا دیں کہ اس کے آقا کے سگھڑ دادا ہجو گو تھے۔ کسی گھر سے مسالہ بھننے کی خوشبو آ جائے تو پیشین گوئی ہو جاتی کہ اس عورت کی بارہویں پشت میں آخری لڑکا شاعر ہو کر محض سہرے کہا کرے گا۔

آفتاب غروب ہونے کا مجھے بڑا انتظار رہتا تھا۔ سر شام سے صحن میں چاندنی بچھا کر قالینوں کا فرش ہو جاتا۔ مسند اور گاؤ تکیہ لگا دیئے جاتے۔ جھالردار نم گیریوں میں جھاڑ فانوس اور کنول روشن ہو جاتے۔ مغرب کی اذان ہونے کے کچھ لحظہ بعد لوگ آنے شروع ہوتے۔ ان میں ہر قسم کا بندہ و بشر شامل ہوتا۔ فنون لطیفہ کی دلدادہ شخصیتیں ہوتیں، جو خود تو ماہر نہ ہوتے مگر ماہروں کے فن و کمال کو داد دینا اور پرکھنا خوب آتا تھا۔

آج کل کی طرح عظیم فن کار تو نہ تھے مگر فن کے استاد ضرور ہوتے تھے۔ کوئی ان میں مصور ہے تو کوئی سارنگی اور بین نواز شاعر بھی جمع ہیں۔ داستان گو بھی بیٹھے ہیں۔ ایک تاریخ داں دوسرا سیاح اور جغرافیہ کا عالم۔ جب سے نظیر اکبر آبادی سے ابا کی رسم و راہ بڑھی تھی محفلیں زیادہ دلچسپ ہو گئیں۔ یہ زندہ دل اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے آدمی تھے۔ ہرجائی اور ہمہ دم کا آدمی ان کا دوست تھا۔ چنانچہ کبھی جوگی بیراگی ساتھ میں دھونی رمائے بھبوت ملے جا رہے ہیں اور سنکھ پھنک رہی اور کیتھا ہو رہی ہے کسی دن لونڈے لاری کا لشکر لئے چلا آ رہا ہے اور کنکوے بازی، بٹیر بازی ہو رہی ہے۔ ایک دن ریچھ والے اور بازی گر ہیں تو بندر یا کا ناچ ریچھ کا تماشا دکھا لیا۔ بٹیر بازی، مرغ بازی کے مقابلوں کے علاوہ کھانے کے بھی شوقین تھے۔ تل کے لڈو لے آئے اور سب کی دعوت کر دی۔ قلفی اور کباب والے بلائے ہیں تو خود اچار کا خوانچہ سجا کر بیٹھ گئے اور چہرہ نکال کر ذوق کو تھما دیا۔ ہنسی مذاق ٹھٹھے ٹھٹھول ہو رہے ہیں۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو بڑھاپا ان پر اپنا سایہ کر چکا تھا۔ لہذا جب جوانی کی یاد آئی اور شب مہتاب منانے کا اہتمام کیا۔ طائفے آئے، مجرے ہو رہے ہیں۔ خدا جانتا ہے اس زمانے کی موئی بیسوائیں بھی ایک علامہ دھر ہوتی تھیں۔ فقروں فقروں میں ایسے ویسے ادیب اور شاعر کو چٹکیوں میں اڑا دیتیں۔ خود بھی علم کا ملکہ رکھتیں۔ شاعری کا سلیقہ تھا اور اپنی غزلیں کہہ کر خود گاتی تھیں۔ نظیر اکبر آبادی جہاں آپ سرمہ کی گھلاوٹ بندوں کی کساوٹ" سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ وہاں داغ کو بھی ابھار ابھار کر چٹخارہ بھرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی میں چٹکلے بازی فقرہ بازی ہو رہی ہے۔ مولوی ملاؤں سے مناظرہ بحث و مباحثہ جاری ہے۔ غالب بذلہ سنجی سے منطق ہی منطق میں سارے عقیدے عقائد پر چوٹ کر گئے۔ اور بزرگوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جس روز خالو ابا امیر خسرو محل میں آ گئے تو لطف دوبالا ہو گیا۔ کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں بوجھوا بوجھوا کر ساری علمیت کا جائزہ لے ڈالا۔

شاہ نصیر اور محمد شاہ رنگیلے سلونوں پر بولیاں لکھ لکھ کر طوائفوں کو دے رہے ہیں۔ وہاں بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں عقل کے ایک ایک خانے کو کھنگال ڈالا اور . . . شعر کے سارے کونے چھان مارے کہ کہیں سے وہ ندرت پیدا ہو جو دوسرے کو مات ہو جائے۔

بسنت ہولی دیوالی لے وہ کونسا ایسا تیج تہوار تھا جو بغیر ادبی سرگرمیوں کے روکھا پھیکا چلا گیا ہو۔ خواجہ صاحب اور نظام الدین اولیا کے عرس آئے تو قوالوں کی ٹولیاں جمی بیٹھی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نعتیہ چیزیں لکھی جا رہی ہیں۔ قوالی لہک لہک کر گا رہے ہیں۔ احباب سے داد مل رہی ہے اور دل خوشی میں بلیوں اچھل رہا ہے اور ادب کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔

محرم آئے تو اپنے ساتھ دبیر اور انیس کو بھی لیتے آئے۔ اچھی خاصی ہنستی کھیلتی بزم ماتم کدہ بن گئی۔ لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ سوز خوانی کر کے خود بھی روئے اور دوں کو بھی رلایا۔ وہ جانے والے اپنی تہذیب و ماحول کی عکاسی رسم و بزم لاجواب کر گئے خدا لگتی تو یہ ہے کہ اب نہ غم کا سوز رہا نہ خوشی کی مسرتیں۔ ہر چیز بے جان سی معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال ان دانا و بینا ہستیوں سے بہت فیض پہنچا۔ بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ سیکھنے سے باقی رہ گیا جس کا ملال اب تک ہے۔ مگر علم دریا ہے جس کے لئے نہ زماں کی قید نہ مکاں کی۔ بہتی گنگا میں جب اور جس کا جی چاہے اشنان کرے۔ ڈوبے، پیرے یا تہ کی خبر لائے۔ اپنی اپنی ہمت اپنی اپنی قسمت۔ عروج و زوال انسان کے دم کے ساتھ لگے ہیں۔ فلک کج رفتار مہروں کی چالیں بدلتا رہتا ہے۔ پرانی بساط الٹتا اور نئی بچھاتا ہے۔ وہ روشن دور اس قدر جلدی یوں اوجھل ہو گیا گویا کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ لیکن چلے جانے والے کارواں اپنے نقش پا کو چھوڑ گئے۔ ان کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ زمانہ جو دیکھا وہ خواب نہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو بساط اب بچھی ہے اس پر ہم کون سی چال چلیں گے۔ ابا کا وصال ہوا۔ میرا مائی ہندرابن چلی گئیں۔ شیخ سعدی بیت اللہ کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ اور میر تقی نے صحرا کی راہ لی۔ پھر کون پڑھتا کون پڑھاتا۔ علم و ادب طاق نسیاں ہوئے۔ اماں کو اچھے بر کی تلاش تھی کہ لڑکی اپنے گھر بار کی ہو جائے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

مرزا وہب عالم اماں کے دور پرے کے بھانجے تھے۔ مگر ہمیشہ ابا کے پاس رہے۔ یہ بہت خوبرو بھی تھے اور ذہین بھی بظاہر علم حاصل کرنے کا

بھی شوق و ذوق تھا۔ ایک آدھ مثنویاں خود بھی کہہ رکھی تھیں۔ لہٰذا جاننے بوجھنے اور پڑھنے والے تھے۔ خالو ابا کے مشورے سے میرا عقد ان سے کر دیا گیا۔ دو چار برس تو بڑے سکھ چین کے کٹے۔ کبھی کوئی کلمہ میرے واسطے نازیبا و ناشائستہ نہ نکلا۔ میری ایک ایک ادا پر ہر آن جان دیتے اور فدا ہوتے تھے۔ جو خوبی تھی وہ مجھ میں۔ میرے آگے کسی کو نگاہ بھر کر نہ دیکھا۔ مگر پھر خدا جانے کیا ہوا کہ مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ میں سمجھی زیادہ پڑھنے لکھنے سے دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ بادام کے حریرے گھول گھول کر پلاتی۔ لیکن جوں جوں ناز برداری زیادہ کرتی وہ دوں دوں زیادہ روٹھے رہتے۔ نصیبن نے میرے سے اکثر کہا کہ بیوی اللہ رکھے ہمارے ادیب میاں کو خدا نہ کرے، کوئی روگ نہیں۔ آپ تو پڑ کر سو جاتی ہیں۔ رات کو ان کے پاس نہ جانے کون کون آتی ہیں۔ اللہ سے ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ اری چل ہٹ ڈھیٹ، فضول بہتان باندھتی ہے۔ مشاطہ گیری کب سے کرنے لگی۔ نہیں سرکار میری ناک چوٹی کاٹ ڈالنا جو میں جھوٹ بولوں۔ خدا قسم کسی دن وہ آئیں گی تو آپ کو دکھا دوں گی۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی بند بھی ہوتے ہیں۔

مگر جب وہ روز بروز میری ہر بات کے شاکی ہو گئے تو مجھے بھی نصیبن کی بات پر یقین آنے لگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ادیب عالم کو بگاڑنے میں ہمارے سنجھلے دیور حالی اور منجھلے جیٹھ محمد حسین آزاد کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ دونوں بھائی بچپن سے مغرب پرست تھے۔ موئے فرنگیوں پہ مٹے جاتے تھے۔ خاندان والوں سے تو ملنا جلنا رکھا نہیں۔ ہمیشہ ان کو جاہل دقیانوسی غیر فطری کہہ کر حقیر بنایا۔ چنانچہ مجھے بھی اسی قدامت کے زمرے کا حلقہ بگوش سمجھ کر آئے دن کوئی نہ کوئی نت نئی بات میرے خلاف گڑھ کر اپنے بھیا مرزا ادیب عالم سے سرک دیتے۔ یہ ایسے بھولے اور عقل کے پورے کہ اپنی گرہ کا کچھ رکھتے ہی نہیں۔ جو جس نے کہا، آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے۔ پھر نہ پوچھیں نہ گچھیں، نہ نہ کی ٹٹولیں بس میرے سر ہو جائیں۔ آئے دن کی عیب جوئی سے کلیجہ پک گیا۔ نہ کھانا اچھا لگے نہ پہننا اوڑھنا، جینا حرام ہو گیا۔ ذرا کبھی جی کی پٹیاں بنا کر چوٹی گوندھ لی یا مسی سرمہ لگا لیا بس دیکھتے ہی شوہر نامدار کے تیور چڑھ گئے۔ منہ پھول گیا اور لگے جا و بیجا سنانے۔ کیا دقیانوسی رنگ ہے ذرا تو زمانے کی ہوا دیکھو۔ وہ وقت نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں تم کیا چاہتی ہو آخیر، تمہاری طرز دیکھ دیکھ کر لوگوں نے مجھے بھی گنوار اور جاہل سمجھ کر مجھ سے ملنا ملانا چھوڑ دیا ہے۔ یوں ساری دنیا سے رشتہ توڑ کر تمہارے ساتھ کہاں تک بسر ہو سکتی ہے۔ میں ان سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر غصہ مجھے بھی آ رہا تھا۔ جب میرے وارث زندہ تھے تب کیسے سنجیدہ اور فرمانبردار بنے رہے۔ اور میں نے جل کر سب چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ سنہری سنجاف کا دوپٹہ چھیر چھیر کر دیا۔ یہ تو اٹھ کر چلے گئے اور اس کے بعد میں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اپنے حال پر افسوس اور تاسف ہو رہا تھا کہ نہ معلوم میرا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے ٹونا ٹوٹکا کر دیا۔ جاب یہ ایسے فرنٹ ہو گئے۔ اس کے بعد سے تو ہم دونوں کے درمیان قدیم اور جدید کی خلیج حائل ہو گئی۔ اور آپس میں خاصی بدمزگی چوٹم چاٹ اور ان بن رہنے لگی۔ آکا بھائی محمد حسین آزاد اور حالی آتے تو باہر کے باہر مرزا ادیب عالم سے دنیا بھر کی آئیں بائیں شائیں کر کرا کے سیاست بگھار کر چلے جاتے۔ میں بھی خاطر و مدارات نہ کرتی تو ج مجھے کیا پڑی تھی اور کون سی کمی مجھ میں تھی جو ان کی ملو چنو لگی رہتی۔ خود ہی نصیبن کے ہاتھ کہلواتے۔ بھابی کی خدمت میں ہمارا سلام کہنا۔ میں بھی خوب جانتی تھی کہ بغیر میرے ان کی بھی دنیا میں کہیں قدر و قیمت نہ ہو گی۔ دونوں بھائیوں کا حال منافقوں کا سا تھا۔ در پردہ خود تو ایسے لکیر کے فقیر بنے پرانی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہے اور دوسروں کو جدت کے مرغزار دکھا کر ورغلا گئے۔ اے یہ سلاست، بلاغت ان میں آئی کہاں سے؟ روزمرہ اور اصطلاح کا دامن نہ پکڑتے تو حالی کیا آج مولانا حالی ہوتے۔

خیر ایک دفعہ کیا ہوا۔ برسات کا موسم تھا۔ خوب امنڈ گھمنڈ کر گھٹائیں آ رہی تھیں۔ پھوئیں پھوئیں کبھی پھوار بھی پڑ جاتی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی تو نہ جانے دل میں کیا لہر اٹھی کہ میں نے ہمسائی کو آواز دے کر بلایا۔ اور تام میں جھولا ڈال کر ترنگ میں ملہار اور ساونیاں گائیں۔ اے اب تک یاد ہے کہ کیا گایا تھا۔ ایسی پیاری چیز تھی کہ ملے محل کے رومی خاندان کے قوال کبھی دف بجا بجا کر حضرت بختیار کاکی کے مزار اقدس پر گاتے تھے۔

گھر آئے بدروا جھوم کے — سکھی آئے بدروا جھوم کے
میرے کوٹھے ہی اندر سیڑھیاں — میں تو چڑھتے چڑھتے ہار گئیاں
مولا رین اندھیری کالیاں — مجھے ساس بھی دیتی گالیاں

بالی ننّدیہ بھی طعنے دیتاں　　تجھ پیا بن سیجاں سونیاں
مورے سنگ کی سہیلیاں ہنچیاں　　اللہ میں بھی تو پہنچوں لاج سے
سیاں ایسی اندھیری رت میں　　مولا ایسی اندھیری رت میں
میرے سرپہ گاگر بھاریاں　　گھر آئے بدروا جھوم کے

یہ ختم کر کے ہمسائی۔ دوسری چیزیں گانے لگیں۔

گھر آئی رے بدریا ساون کی　　ساون کی من بھاون کی
پون چلت سوم سناناً　　جھینگر بولت جھوم جھناناً
بادر گرجے بجری چمکے　　کوئی کہیو رے پیا آون کی

نفیسن تلن کر رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھونشا دے جاتی یا کبھی گرم گرم پھلکیاں اور کیری کی چٹنی دے گئی کبھی اندرسے کی گولیاں منہ میں بھر گئی۔ اس نے گلابی ڈوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جو اس کے سانولے سلونے رنگ پر اور دی اودی گھٹاؤں میں دلفریب لگ رہا تھا اس کو دیکھ ہمسائی بولیں۔ اے مقراضی بیگم وہ گاؤ اس وقت تو جو تم اپنے بالے پن میں بہت گاتی تھیں۔ وہ نگوڑا گلابی ڈوپٹے کا گانا۔ اور میں نے ان کے کہے پر یہ شروع کیا۔

ہم پہ گلابی ڈوپٹہ ہیں لگ جائے گی نجریا رے
جاہے سیاں مارو چاہے للکارو
ہم سے نہ پلسے بے جھڑیا ہماری دکھ جائے گی کلیاں رے
نہ گوری مارو نہ للکارو
دو دو لگا دوں نوکریا رے۔
تمہاری بچ جائے گی کلیاں رے
ہم سے نہ پکے بے جھڑیا
ہماری جل جائے گی چھنگلیا رے
ہم سے نہ سویا جائے سیج اٹریا
ہماری پتلی سی کمریا رے ہماری بالی سی عمریا رے
نہ گوری ماروں نہ گوری للکاروں
دو دو لگا دوں سوکنیا رے

اور ہم آخری بند گا کر خوب بچپن کو یاد کر کے ہنستے رہے مگر پھر یکایک جانے کیا ہوا کہ ان کی بے رخی کا خود بخود کیسے خیال آگیا۔ اور دل سے ہوک اٹھی۔ ا[illegible] جھولے پر سے اتر کر آگئی تو مومن کی یہ غزل گانے لگی۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ابھی ۔ ۔ چار شعر ہی گائے تھے کہ کیا دیکھتی ہوں۔ مرزا ادیب عالم طیش میں منہ سرخ دندناتے بیٹھک سے چلے آرہے ہیں اور آتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ یہی وقت رہ گیا تھا واہیات چیزیں گانے کا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ مردانے میں میرے پاس ملاقاتی بیٹھے ہیں۔ پرسوں ہی کہہ دیا تھا کہ بھائی حالی اور ابا محمد حسین آزاد کے ہمراہ ورڈ سورتھ ہومر بنیاسن بھی آئیں گے۔ خدا کی قسم اس قدر خفت ہوئی ہے مجھے گردن

اٹھانے نہ دیتی تھی۔ کیا کہتے ہوں گے یہ لوگ کہ ان کے ہاں کیسی ان نیچرل باتیں ہوتی ہیں۔ کوئی تک بھی ہے اس کلام میں۔ بیہودہ، لچر، بکواس۔ ہمسائی تو ان کو گرم دیکھ کر چپکے سے کھسک گئیں۔

میں نے بھی دل میں ٹھان لی تھی کہ چپ نہ رہوں گی۔ انجام جو ہو سو ہو۔ کہاں تک کوئی برداشت کرے۔ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور میں نے بھی تنے ہوئے لہجہ میں تڑخ کر جواب دیا

اے ذرا بتاؤ تو سہی۔ میں نے کیا گناہ اور خطا کی توبہ کونسا خراب کام تھا۔ جو تمہاری خفت ہو۔ غزل اور گیت ہی گائے تھے۔ ساون میں میگھ ملہار نہیں گائیں گے تو کیا سوز پڑھیں گے۔ یہ کونسی نیچر کے خلاف ہیں۔ جیسا سماں ہے۔ وہی چیزیں تھیں۔ کیا ان کی جوروئیں نہیں گاتیں۔

گاتی کیوں نہیں۔ مگر ایسی مہمل خرافات سے بھری ہوئی نہیں۔ اس ہی واسطے سینکڑوں کتابیں لاکر دی تھیں بیگم صاحب کو کہ ذرا پڑھو اور اپنے کو بدلو۔ مگر تم تو آدمی بننا ہی نہیں چاہتیں۔ طوطے کی طرح جو صنائع بدائع سجع بسجع مسجع تم کو ناہنجاروں نے یاد کرادیئے انہیں کو رٹے جاتی ہو۔

خیر مجھے کچھ ہی کہہ لیجئے۔ مگر آپ میرے میکہ والوں کو ایک لفظ نہیں کہہ سکتے۔ انہیں کا طفیل ہے جو آپ اس قابل بھی ہوئے۔ ورنہ میاں ادیب کو جانتا کون تھا کہ کس کھیت کی مولی ہیں۔ وہ لوگ جیسے بھی تھے اپنی نبیڑ کر چلے گئے۔ جو ان کی تہذیب جو ان کا ماحول اور جذبات تھے اس کی عکاسی کی اور خوب کی۔ اب ان کو قبروں میں تو چین سے رہنے دو۔ آپ کی اور ہمارے دیور جیٹھوں کی تو وہ مثل ہے پلٹے برستے پر کھیلا جو آج نہ ہوا کل ہوا۔

مفروضی بیگم میں بھی اپنے عزیزوں کے بارے میں کچھ نہیں سن سکتا۔ میں تو نہیں سناتی مگر دنیا اور وقت سنائے گا۔ اور اگر آپ کو میری ہر بات بری لگنے لگی ہے تو میری اجازت ہے شوق سے اپنے من پسند کی دوسری لے آؤ۔ جو تمہارے مطلب کی ہو جس کی باتوں سے تم کو غیرت آئے نہ دوسروں کے سامنے تمہاری سبکی اور تحقیر ہو۔ تم کو تارہ اور تمہارے بھائیوں کو بدر کامل بنا کر آسمان پر بٹھا دیں گی۔

ان ترکی بہ ترکی جوابوں کی شاید ان کو مجھ سے امید نہ تھی یا شاید وہ فیصلہ کن جواب میرے سے کہلوانا ہی چاہتے تھے۔ بہرحال وہ تو بڑبڑاتے پاؤں پٹختے باہر چلے گئے۔ پہلے تو میں خوب روئی۔ محبت کی ساری پہلی ناز برداریاں تڑپا رہی تھیں۔ کیسے عیش کے دن تھے وہ اور کتنا خیال رکھتے تھے میرا۔ ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تحفے تحائف لاتے۔ جو بات مرغوب نہ ہوتی کبھی اس کو منوانے کے لئے زور ظلم نہ کیا۔ اب تو وہ اوب گئی اور بیزار ہو گئی۔ جب رو دھو کر دل کا بخار ہلکا ہوا تو میں نے غور کرنا شروع کیا کہ کیوں خواہ مخواہ اپنا بسا بسایا گھر اسی ضد کے پیچھے برباد کیا۔ اور جب اسی شخص سے نباہ کرنا ٹھہرا جو مقدر نے لکھ دیا تو کیوں ان کی مرضی کے خلاف کیا۔ ان کا کیا مرد آدمی سوت سر پر لا کے بٹھاتے کیا دیر لگتی ہے۔ بوا اردو ہی کا حشر دیکھو لوک ادب خالہ نے امریکی روسی عربی سات سمندر پار سے لا لا کر سینکڑوں سوکنیں ان کے سینے پہ مونگ دلنے کو بٹھا رکھی ہیں۔ اب تو کوئی آسرا ہی نہیں۔ جیسا خسرو، داغ رہے نہ پوچھو پیا سر سے۔ امیر مینائی لے دے کر ایک بڑے ابا سائل اور بے دم کے دم رہ گئے تھے تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا مرنے والے مر گئے مگر حق تو یہ ہے کہ اپنی جیتی زندگی ان دونوں نے ہمیشہ میری طرف داری کی۔ ادیب عالم ایسے بچے تو نہ تھے کہ لاگ ڈانٹ کرتے یا پاؤں میں بیڑی ڈال کر بٹھا لیتے۔ زبان سے البتہ بہتیری روک ٹوک رکھی۔ مگر وہ کہتے ہیں نا بتھوے کا ساگ کن ساگوں میں اور رمیا ساس کن ساسوں میں۔ بڑھے بوڑھوں کی باتوں کو کان دھر کے سننے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ بزرگوں کے ہمراہ ان کی عقلوں کو بھی کھوسٹ سمجھ کر جھلنگے پر ڈال دیا تھا۔ لہٰذا میں نے جی ہی جی میں عہد کر لیا کہ بس اب تو جو ادیب عالم کہیں گے وہی کروں گی۔

اردو تو خیر میرے گھر کی لونڈی تھی۔ اور اب تو سب کے گھر کی باندی ہے۔ جس طرح حکم چلاتی اسی طرح چلتی۔ اس نیک بخت نے تو کسی کے سامنے کبھی سرتابی کی نہ عذر جس نے جس راہ ڈال دیا۔ خاموشی سے اسی ڈگر کی ہو گئی۔ محض زمانوں اور خیالات کا فرق تھا کہ پہلے آقا اس کی ہر مشکل اور ضرورت کا خیال سگے باپ کی طرح رکھتے تھے۔ اور اب اس کی ضرورت تو گئی چولہے بھاڑ میں۔ اپنا کام بھی اس سے پوری طرح نہیں لے سکتے۔ اور الٹی نکمی و ناکارہ ہونے کے طعنے مہنے الگ دیتے ہیں۔ غریب ایک آہ کھینچ کر اتنا ضرور کہہ دیتی ہیں۔ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔ مفروضی بیگم اس زمانے میں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹتا ہے۔

میں انہیں ہجوم افکار کی ادھیڑ بن میں مبتلا تھی میں پڑی تھی کہ نفیسن میرے پاس بھاگی بھاگی آئی اور ایک ہی سانس میں بولی لے بیوی اچھی اٹھئے تو سہی. آپ کو میری جان کی قسم ذرا اوپر چلی چلئے. خدا قسم دیکھئے تو کون کم بخت اپنے میاں کے پاس بیٹھا ہے.

اوپر جاکر اب جو چلمن کی اوٹ سے جھانکا تو بس دیکھتے ہی میرے تو تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی. موئی ایک قلندری سرنا ادیب عالم کا پلو دبائے بیٹھی ہے میں تو بھک رہ گئی. کبھی موئی طوائفیں بھی اس بے غیرتی سے سب کے سامنے نہ بیٹھتی تھیں. وہ کہتے ہیں نا خدا غلام بنائے. غلام صورت نہ بنائے رنگ نہ روپ اللہ ماری اس کی کیا چیز پسند آئی تھی — نگوڑی ماری کالی بھجنگ جیسے توے کی سیاہی. نہ آنکھ نہ ناک کانوں سے بوچی ہونٹ ہی پناہ موٹے موٹے دیگوں کی کورین ایسے تیسدیوں کے بھی کیا ہوں گے. ادیب عالم کے واسطے سگریٹ لینے اٹھیں تو دیکھا کہ خیر سے لنگڑی ہیں ایک ٹانگ چھوٹی ایک بڑی. نقادوں کو پتلی کمر سے نفرت رہی. صد مذاق اڑایا. چنانچہ شاعروں نے عاجز آکر پتلی کمر پر دست الفت پھیر پھیر کر وہ مالش کیں کہ خوب گھیر دار بنادیا. اور ناف کا خوبصورت ساگول گڑھا پھیل کر چاہ کنعاں کی بجائے خندق کی خندق ہوگیا جس میں بلا شبہ یہ جینگر مینگر شاعروں کی پوری ریزگاری اور ادیب صاحبان کی ساری برادری غڑپ سے گر کر ایسی لاپتہ ہو کہ نقاد نام سے لے کر نقارے پیٹ پیٹ کر بھی تلاش کریں تو پتہ و نشان نہ ملے.

لے دے کر ایک سینہ کا ابھار ہی ابھار تھا. جو لال پیلے گوندھ کے چھوٹے ستاروں کی فرنگی انگیا کا مرہون منت تھا. خیر اس وقت تو چمک رہا تھا. مگر اس کی بہار کے دن تھے پھر خیال آیا اے صورت نہیں نا سہی. آخر کچھ تو ایسی بات ہوگی جو ہمارے میاں کی نگاہ پر چڑھ گئی. ممکن ہے سیرت اچھی ہو اور ادیب عالم ان کے گنوں پر لٹو ہو گئے ہوں. مگر اے ہے توبہ اللہ وہ تو کوئی باتیں بھی تو سلیقہ کی نہ تھیں. اوٹ پٹانگ بکے جاتی تھی. میں نے بڑے کان لگا لگا کر اور دم سادھ کر ایک ایک فقرہ سنا. مگر نہ نفس مضمون پلے پڑا نہ مفہوم اور معنی سمجھ میں آئے. مگر چپڑ چپڑ برابر بولے جارہی تھی اور مجھے وہ جامع مسجد کی فتحو فقیرنی یاد آگئی جو میل کچیل میں تھوڑی سنی بکواس کرتی تھی. اور لوگ اس کو کامل اور مجذوب سمجھتے تھے. اور عقیدت مند مریدوں کا ایک ہجوم اس کے چاروں طرف جمع رہتا تھا. اسی نوع کی بڑ کچھ اس وقت یہ قلندری کر رہی تھیں. بے مقصد و بے کار.

شبنمستان. حسن جلتا ہے. عشق کی آنچ مسکراتی ہے. وجاہت حسین سونی پتی.

رنگ اڑے جیسے گلابوں میں دھوپ. ڈھنگ سے چلے جیسے ہولے جنون. صہبا اختر.

اور کوئی آواز ہماری تاریخ کی حکایت سے ماورا ہے دماغ پتھرا گئے ہیں. احمد ہمیش. دل دھڑکتا تھا. سانس رکتی تھی. چپ چپ گھور رہا تھا چندا بجھی بجھی ہے چنبیلی. الطاف پرویز.

ذرا آکاش گنگا میں بلا کر. تو مجھ بھومی کے والے کو فدا کر. بشیر افضل جعفری.

دکھی چپ کو چہکتی سندریاں دے. جنہیں گمبھیر تا کو نیا ر " " "

بر ن کے جلتے پھولوں کا نینہ بنا کر نینوں میں سجاؤں گی. آکاش کے جہنم کے کواڑ کھولوں گی. نفیس نے اتنے میں کھسر پھسر کرنی شروع کر دی.

بیوی کون ہیں؟

اری ہو تیں کون. تیری بیگم کی سوکن ہیں. مس جدید شاعری.

اوئی ناس پیٹی کو دو گھڑی کی آئے. نگوڑی نالی کی بچھلی پیری. چڑیل صورت ہماری بیگم کا اور اس کا کیا مقابلہ.

اری چپ رہ باتیں سننے دے.

مگر اس کو تو ہر بات معلوم کرنے کی بے قراری تھی. تھوڑی دیر تو خاموش رہی پھر بولی.

ہیں تو کہتی ہوں بیوی اس نے ہمارے میاں کو الو کا گوشت کھلا دیا ہے. ارے وہ زمانہ گیا. جب الو کے گوشت کھلا کر الو بناتی تھیں. اب تو چوئنگم چاکلیٹ کھلاتی اور ٹوسٹ کرواتی ہیں تو نہیں سمجھتی. میرا اس وقت باتیں کرنے کی بالکل خواہش نہیں تھی. اس کم بے باکی سے اپنے میاں کے پاس بیٹھا دیکھ کر یہی جی چاہتا تھا کہ

ساری شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اس کے جھونٹے پکڑ کر کھینچ لاؤں اور مار جوتیوں کے بھس بھر دوں اور جہنمی کوڑی پیسہ پھری ناک میں ڈال کر کوڑے کی کراچی پہ بٹھا دوں۔

نعیمن کی پھر آواز آئی۔ او رہیوی وہ کون ہیں جو کونے میں بیٹھے ہیں۔ جن کے گدھ جیسے لمبے لمبے ناخون ہیں۔ اوئی کیا کسی کا خون پئیں گے نعیمن کے کہنے پر میری توجہ ان لقندروں سے ہٹی۔ تو سچ تو ہے۔ اور بھی بہت سے بیٹھے تھے۔ لیکن میں نے اپنے غصہ کے آگے کسی اور کو دیکھا ہی نہیں۔ اس وقت بیٹھک کیا تھی۔ اچھا خاصا چڑیا گھر معلوم ہوتی تھی۔ سارے کمرے میں نظر دوڑائی تو ایک بھی چہرہ ایسا نظر نہ آیا جس پر نظر ٹھہر جائے۔ اسی موئی کے حالی موالی تھے۔ بد ہیئت مردوئے۔ بد زیب عورتیں چہرے مہرے سے ہی کراہیت آتی تھی۔

اچھی ہیوی مجھے بتاؤ نا کون ہیں۔

ارے تیری نئی بیگم صاحب کے بھائی بند وہ جو لمبے لمبے ناخون والے ہیں نا ان کے بڑے بھائی ہیں۔ یہ تنقید کی تمثیل کرتے ہیں۔ اور وہ جو مخنی سے ہیں ناسٹر بلے سے وہ ان کے بہنوئی ہیں۔ طویل مختصر مسلسل مقطع افسانہ۔ وہ مثیالی محرم کرتی اور سندھی شلوار میں جو بیٹھی ہیں۔ وہ بھی شاعرہ کی تکنیک ہیں۔ اتنے میں کسی نے ریڈیو کھول دیا۔ اور کھٹی کڑھی میں مکھی پڑی ہائے میری اماں کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ سب میزوں کے طبلے بنا کر دھنا دھن پیٹنے لگے۔

اس ریکارڈ کے بعد اناونسر صاحب کی آواز آئی۔ اب آپ جھنگاری بھٹنانی کر کی آواز میں ایک غزل کے انداز میں چیز سنیں گے۔ جو قوالی کے انداز میں لکھی گئی اور راک اینڈ رول کی طرز میں ترتیب دی گئی۔ اور ڈھک ڈھیا کا ایسا شور و غل سنائی دینے لگا کہ مجھے وہ چماریاں یاد آگئیں جو اپنے مردوں کے جنازہ کے ساتھ ڈھول پیٹ کر رویا کرتی تھیں۔ جب گانے والی کی صور اسرافیل سے زیادہ بے ہنگم بھی اور دہشت انگیز گانے کی آواز ابھری تو حاضرین اچھل اچھل کر رقص کرنے لگے۔

ہیلو ہیلو میرے سپاہی
میں نے تو محبت سنا ہی
ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا
مائی ہنی مائی ڈیر۔ ہم بھیگا بھیگا

رنگ رلیاں ہوئیں۔ یہ گل جھڑی کھلتی نہ تھی کہ درحقیقت یہ شاعر ان کو بنا رہے ہیں یا یہ اپنے چاہنے والوں کو بنا رہی ہیں۔ بھائی حالی نے فخر سے سر اونچا کیا اور وڈسورتھ سے پوچھا۔

صاحب بہادر کیا خیال ہے۔

خوب خوب بہت نیچرل۔

میرے تو پتنگے لگ رہے تھے اور مارے طیش کے نیچے اتر آئی۔ جب تک تکلیف قابل برداشت ہو، آدمی رو تا دھوتا، کوستا پیٹتا اور واویلا کرتا ہے۔ مگر جب درد بڑھ جائے تو بے حسی اور بے ثباتی دامنگیر ہو جاتی ہے۔ اور میرا بھی یہی حال تھا۔ میرا گھر اور اثاثہ میرے سامنے پھنک رہا تھا۔ اور میں خاموش تھی۔ میرزا ادیب عالم کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ کہاں میں ان کی وموں دیوانی تھی۔ مستقبل کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ مگر زیب خاں نے اردو اور ادیب خاں نے میرے پر سراسر قیامت ڈھائی۔ مگر بندھن باندھتے وقت اس بات کا کس کو علم تھا۔ اور اب جبکہ اس موئی نشارہ کو چوڑے دھلٹے گھر میں ڈال لیا۔ تو کیا محلے کے پہچاننے والوں میں رسوائی نہ ہوئی۔ اور میں ان سے ایسی بے تعلق ہو گئی۔ جیسے میرا کوئی حق ان پر تھا نہ واسطہ۔

ان کے عزیز رشتہ دار دو آتے دن بھر رات بھر گھر میں طوفان بے تمیزی بپا رہتا۔ زینہ سے دھپ دھپ کرتی اتریں۔ کبھی ہوا خوری کو بریلی کے پاگل خانے جا رہی ہیں۔ کبھی لندن کے کتا گھروں کے معائنے کر کے لوٹ رہی ہیں۔ آج یہاں دعوت ہے کل وہاں تقریب ہے۔ دن کو تمغہ جیت کر ملتے پر لٹکا کر لائیں تو

شام کو چاندی کا پیالہ۔ اور وہ لفظ سب ساتھ ہیں۔ کسی نے بازو تھاما۔ کسی نے چٹکی بھر کر چولی مسکائی۔ مگر تو ایسی نہ تھی کہ ہاتھ ڈھلتے۔ زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں البتہ پیاڈگی ہوتی تو کھیلتے کھیلتے ان زلفوں پہ بھی خزاں چھا گئی۔ اور لمبی لمبی زلفیں جھڑ جھڑ کر ذرا ذرا سی گھاس رہ گئی جس کی دوب پہ بیٹھ کر تنقید نگار تعریف و توصیف کی مشین چلاتے رہتے اور یہ خوشی سے پھول پھول کر اور موٹی کپہ ہوئی جاتیں لیکن مجھے ان کے نعلوں سے کیا۔ مگر ان کے ول سونڈول اور طور طریقوں کو دیکھ دیکھ کر میرا غنچہ سا دل مرجھا کر رہ گیا تھا جس کے پنپنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں نے اپنے چوتھی چالے اور ملبجے میجے جوڑے بھی بند کر کے رکھ دیئے۔ ایک دن بیزار اپنے دالان میں لیٹی تھی۔ اور اس کے قریب میری ایک دلہناپے کی تصویر لٹک رہی تھی۔ آنکھیں کیسی کٹورہ سی تھیں، زلفیں ریشم کے لچھے تھے جسم کیا سڈول اور جوبن بھرا تھا کہ اپنی ہی صورت پر اپنی ہی نظر لگ جائے۔ مگر اب یہی حسن پھیکا اور ماند پڑ گیا۔ سیم ایسی چمک دمک رخصت ہو گئی۔ قلب افراط غم اور قلق سے بے روح معلوم ہوتا تھا اور ایک دبیز غبار میں سے تن من کر رکھا تھا کہ کیا دیکھتی ہوں سامنے والی طاق کی ایک کتاب کو حرکت ہوئی۔ اور آن کی آن میں ایک قلعہ بن گئی۔ پھر ایک پھاٹک دکھائی دیا اور اس میں سے ایک فرشتہ صورت بزرگ نکل کر اترے اور میرے پاس آئے۔ جو غفرے سے ایک بیش بہا موتیوں کا ہار نکال کر میرے گلے میں ڈال دیا۔ اور بولے بیٹی لو یہ ہار انمول ہے ادیب عالم بگڑ گیا ہے راہ راست پر آ جائے گا

ارے یہ آداز تو خالو ابا امیر خسرو کی تھی میں ان سے لپٹنے کو اٹھی۔ مگر وہ غائب ہو چکے تھے۔ کتابیں اسی طرح خاک دھول میں اٹی ہوئی رکھی تھیں لیکن سینکڑوں حوادث وقت گزر جانے کے باوجود ان کی آواز میں اب بھی وہ کون سا جادو تھا۔ اور ان کے بول میں وہ کون سے سحر کا منتر کہ میری ساری یاس اور ناامیدی مٹ گئی۔ اور دل کو بہت دنوں بعد عجب طرح کی فرحت اور تقویت ہوئی۔ کسی نے کہا ہو ہے کو لوہا کاٹتا ہے جرأت و ہمت کر دو۔ میں اٹھی ہاتھ منہ دھو دھلا کما بنا آپہ درست کیا۔ اور نعیبن کو آواز دی۔

یہ کہہ ہی چکی ہوں کہ نئی طرز سخن کی مجھے فکر تھی کہ کہاں سے سیکھوں۔ وہ مشکل آج گھر بیٹھے اللہ نے حل کر دی۔ ہمارے مکان کے مقابل ایک بنگلہ تھا۔ اس میں سے اکثر ہو ہا کا غلغلہ ہوا کرتا۔ اور اسی بنگلے کی دیوار سے ملا ہوا ایک ہوا چھوٹا سا سرائے خانہ تھا۔ جہاں قہوہ پاپے اور پاکولا بکتا تھا۔ یہاں شام کو خاصی دھا چوکڑی لڑائی بھڑائی ہوتی رہتی تھی۔

نعیبن آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

اری اس سامنے والے بنگلے میں کون رہتے ہیں۔ وہ بولی۔ ادئی۔ مائی لے بہت سے مردوئے ہیں۔ ان کے ساتھ جوان جوان لونڈیاں بھی ہیں۔ وقت بے وقت دھما دھم ناچتے کودتے رہتے ہیں۔ توبہ توبہ۔ مر کر تو اسی میں جائیں گے۔ پھر زمین اپنا بدلہ لے گی۔ فضول تو باتیں نہ بنا۔ یہ ہیں کون۔ انہوں نے اسلام علیکم سلام کیا اور مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اور میں اپنی جگہ سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگی۔

کیا ہوا۔ . . .

بھونچال تو نہیں آ رہا۔

جی نہیں میں سلام کیا تھا۔

توبہ کیا آندھی کا ساز ور تھا ان کے سلام کے زناٹے میں۔

اے لو بیوی اس کی مجھے کیا خبر۔ دھنا دھوبی کہتا ہے بڑے لوگ ہیں مگر رئیسوں کے سے ٹھاٹ باٹ تو بیچاروں کے نہیں ہیں۔ ہاں وہ مینا اپنے حلوائی کا بیٹا وہاں بہت جاتا ہے۔ اس کا سب سے یارانہ ہے۔ وہ کہتا تھا۔ جیسے کیا نام آپ قصہ کہانیاں اور گیت لکھتی ہیں نا اسی طرح ان کا بھی یہی کاروبار ہے۔ وہ چائے خانہ بھی انہیں کا ہے۔ شام کو سایہ پہنے بہت سی میمیں موٹروں میں آتی ہیں۔ تو اللہ کی بندی سیدھی سی بات کہہ نا کہ افسانہ نگار شاعر ادیب رہتے ہیں۔

پھر وہ بولی۔ لے بیوی کوئی ہوں، اہیں کیا! موئی ان عورتوں کو دیکھ کر تو میرا جی برا ہو جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے ابکائی روکتی ہوں۔ سر دیکھو تو کسی کے جھاڑو کا کنڈ بندھا ہے۔ کرتے کی جگہ سارنگی کا غلاف چڑھا رکھا ہے۔ وہ بھی اتنا تنگ کہ نہ سیدھے بیٹھا جا سکیں نہ پھر سکیں۔ اور پیٹ سے مٹ گئی آج کل کی عورتوں پر انگیا بھر جوڑی ازار بند کی رسی گلے میں پڑی ہے۔ اوئی بیوی میں پوچھتی ہوں یہ بھی نہ ڈالیں تو کوئی ان کی چیز چھینتا تو نہیں ہے۔ مردوے یا تو ریچھ کے ریچھ یا سوکھے تاق کے تاق۔ عورتوں کی طرح گہرے گہرے رنگوں کی بشرٹیں پہنے دھوئیں اڑایا کرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے تو میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ ویسے دیکھنے میں بھی کوئی عالم آدمیوں کا قرینہ مجھے نظر نہیں آتا۔

مگر جی بتائیے آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔

بھئی تجھے کیا تو جا کر اپنا کام کاج نبیڑ

دوسرے روز میں اس بنگلے میں گئی خالی پڑا تھا۔ شاید سب کہیں گئے ہوئے تھے۔ صرف پٹھان چوکیدار دروازے پر تھا۔ مجھے اس نے روکا نہ ٹوکا۔ میں بڑے ہال میں پہنچی تو بغل والے برآمدہ میں سے ایک معقول صورت انگریزی وضع قطع کی صاحبہ آئیں۔ اور پوچھنے لگیں کہئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔

اوئی بوا تم میرے لئے کیا کرو گی۔ خدانخواستہ میں کوئی حاجت لے کر تھوڑی تمہارے پاس آئی ہوں۔ ذرا دل گھبرایا تھا۔ اس طرف نکل آئی۔

I AM SORRY اوہ

آئیے بیٹھئے۔ اور انہوں نے مجھے ایک گدگدے صوفے پر بڑے تپاک سے لے جا کر بٹھایا۔

اے بیٹی اپنا نام تو بتاؤ۔

جی PET تو جبیں ہے۔ مگر ویسے میرا نام نسرین پروین ناہید شاہین اقبال الدین ہے۔ اور تخلص شتّارہ۔

NAME تم نے خود تجویز کیا ہے یا تمہارے استاد نے۔

جی نہیں تخلص تو ہم TOSS کر کے نکالتے ہیں۔

وہ کیسے بیٹی میں سمجھی نہیں۔

بس بہت سارے الفاظ کاغذ پر لکھ کر پڑیاں بنائیں اور ایک ڈبے میں ڈال دیں۔ پھر باری باری اپنی اپنی پسند کے شاعر کا نام تین بار پڑھا اور ایک ایک پرچی اٹھائی۔ جس کے ہاتھ میں جس لفظ کی پرچی آگئی وہی تخلص رکھ لیا۔

سبحان اللہ طریقہ بہت عمدہ ہے۔

شتّارہ تخلص سن کر مجھے میاں عالم کی کہانی کیسی یاد آئی کبھی دادی بی سناتی تھیں۔ کہ ایک میاں کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام چکارہ ایک شتارہ۔ نگوریاں ہنڈیاں پر سے سارا تار تار نتھار کر خود ہپ کر لیتیں۔ اور میاں عالم کو سالن کے نام موا چھوچھا نیلا پانی کھانے کو دے دیتیں۔ تنگ آکر انہوں نے جادو کی گڑیا لا کر باورچی خانے کے چاروں کونوں میں دبا دیں۔ اب جو سب خبیثیاں مل کر گھی اتاریں۔ بیٹھی تو آواز آئی۔ لے بی مکارہ ہاں بی شتارا سارا گھی نتھارا کیا کھائے گا عالم بچارا۔ بس اس دن سے ڈر کر انہوں نے چرانا چھوڑ دیا۔

اے جیتی رہو نام اور تخلص سب بہت پیارے ہیں۔ ذرا یہ تو بتاؤ سنا تھا کہ یہاں ادیب صاحبان اور شاعر حضرات رہتے ہیں۔

جی آپ کو ٹھیک معلوم ہوا۔ اس بنگلہ کا نام جب ہی تو ہم نے ادب خانہ رکھا ہے۔ شاید آپ کو ENGLISH نہیں آتی۔ سائن بورڈ پر بڑا بڑا لکھا ہوا ہے۔ اے بیٹی اب مجھے تو یقین کرنا انگریزی سیکھنے کی آرزو اب تلک ہے۔ مگر ہمارے زمانے میں فرنگیوں سے اتنی خلا ملا کہاں تھی۔ نہ موئی یہ چھک چھک پھک پھک کرتی ریلیں تھیں نہ یہ جناتی اڑن کھٹولے گڑ گڑ گرجتے ہوئے ہوائی جہاز۔ توبہ ان کی آواز سے میرا تو دل دہل جاتا ہے اور میں پڑھ پڑھ کر دم

کرتی رہتی ہوں جہینوں میں سمندر پار کے دو خانی جہاز تجارتی مال لے کر آجایا کرتے تھے۔ زبان تو آدمی کا اگر بس ہو تو حیوانوں کی بھی سیکھ لے۔ خیر میری بات چھوڑو۔ وہ کیا خوب نظیر اکبر آبادی نے کہا ہے۔

بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغ مزار — ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے
ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ — مثال قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

ہماری تو گزر گئی بیٹی۔ اب تو تمہارے دموں کی رونق ہیں۔

شتارہ بولیں۔ آپ باتیں بہت INTERESTING کرتی ہیں۔

اے بچی ہیں بھی تو کوئی اپنی چیز سناؤ۔ اس وقت کیسا جی باغ باغ ہوا یہ سنکر کہ تم بھی شاعرہ ہو۔

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر ادھر ادھر کی اور رسمی باتیں ہوئیں۔ جب ان کی عزت میں میں نے کچھ کمی پائی تو میں نے پوچھا۔

خیر سے اس زمین میں کب سے قدم رکھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں نہیں پیدا ہوئی ہوں۔

نہیں بوا میرا مطلب تھا تمہیں ذوق سخن کب سے ہوا۔

اس پر وہ یوں گویا ہوئیں۔ ہمارے پاپا بہت موڈرن ہیں۔ ان کو شوق تھا کہ بیٹی کو لڑکوں کی طرح پڑھا لکھا کر لندن بھیجیں گے۔ لہٰذا جب بڑی ہوئی تو مجھے کونوینٹ جیسس اینڈ میری میں داخل کر دیا۔ وہاں کے وقت ہیم مجھے گانے بہت اچھے لگتے تھے۔ کبھی کبھی ڈنگ ڈانگ بیل پوسی ان دی ویل DING DONG BELL PUSSY IN THE WELL لکھکر میں سسٹر کو دکھایا کرتی تھی۔ وہ بہت چارمنگ تھیں۔

تمہاری اردو تو ماشاءاللہ نرالی ہے۔

وہ فخر سے بولیں۔ شکریہ۔ دیکھئے نا ہماری آیا تو لکھنؤ کی تھی۔ اس سے سیکھا ہے۔

خیر بیٹی اس وقت تو مجھے یہ بتاؤ کہ باقاعدہ شعر کہنے کا آغاز کیونکر ہوا۔ پہلے شتارہ صاحبہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر کہنے لگیں۔ ارے یہ نہ پوچھئے میری زندگی کی بڑی ٹریجڈی ہے اتنی SAD STORY کہ میں اس کے غم سے فرار حاصل نہیں کر سکی۔ جب میں اسکول میں تھی تو مجھے ایک کرکٹ کے چیمپئن مسٹر بادل سے TRUE LOVE ہو گیا وہ بہت HANDSOME تھا۔ سب لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ کرش تھا کرش۔ اس کے بال LEMON COLOUR کے تھے۔ آنکھیں شفتالو جن پر فیروزی رنگ کی پلکیں بالکل دیئے کی طرح روشن رہتی تھیں۔ ہونٹ آبنوسی رنگ کے تھے۔ مگر اسے ایک اور ڈیٹ مل گئی۔ وہ ہمارے آرٹ کونسل کی ڈرامہ انچارج تھی۔ پھر شادی کر لی۔ یہ واقعہ اس قدر SUDDENLY ہوا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اور اسی دوران میں میں نے شاعری شروع کر دی۔ ادھر میری ایک فرینڈ جو جوش صاحب کی بہت گرویدہ تھیں۔ اور ان کے دیوان کی ہر وقت READING کرتی تھیں۔ اس نے مجھے ان کی ایک نظم مہترانی سنائی۔ جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ وہ مجھے سب میں زیادہ پسند آئی اس کے بعد ہماری آرٹ کونسل نے جشن آزادی منایا اور ایک بزم کلاسیکی ریڈیو والوں نے منعقد کی۔ جس میں گوشہ گوشہ کے عظیم فن کار بلائے گئے تھے۔ رکشہ والوں کا مارچ پاسٹ ہوا تھا اور بس والوں نے اسٹیج پر مظاہرے کئے تھے کہ کس طرح ایک ماہر ڈرائیور دن میں ایک ایکسیڈنٹ کر کے چالیس پچاس آدمیوں کو مار کر بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کا سدباب کر سکتا ہے۔ اونٹ کا ناچ بھی ہوا تھا۔ اور نزاکت علی سلامت علی خاص طور سے بلائے گئے تھے دونوں نے مل کر کلاسیکی گانے کی گدھا گاڑی دوڑائی تھی۔ کبھی ایک بھائی پنچ بن جاتا تھا۔ اور کبھی دوسرا واقعی گانے کا کمال ان پر ختم ہو گیا ہے کیسے موسیقی میں پنچ کا صحیح استعمال رائج کر دیا۔ اسی جشن میں میں ن۔ م۔ راشد۔ عبدالحمید عدم اور ساحر لدھیانوی سے INTRODUCE ہوئی۔ اور مجھے ان سب نے اتنا IMPRESS کیا کہ میں آپ کو ایکسپریس نہیں کر سکتی۔ ان کا کلام بڑا شاندار ہے اور اتنا MASCULANE کہ ہم لڑکیاں تو ان کے شعروں پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ آپ نے تو یقیناً پڑھا ہوگا۔

نہیں بوا میں کوان کے نام بھی آج تمہارے منہ سے سن رہی ہوں۔

اف اف یہ سنکر افسوس ہوا۔ اچھا آپ ایسا کیجئے۔ اپنا پتہ اور فون نمبر ڈائری میں نوٹ کرا دیجئے۔ میں ضرور آپ کو ان کے دیوان بھیجونگی ٹرولی آپ قطعاً بور نہیں ہوں گی۔ کوئی یہ درد، ذوق، آشفتہ جیسے پوس لیس شاعر تھوڑی ہیں۔ انہوں نے ہماری شاعری کو پاک کر دیا ہے۔ آپ پڑھیں گا جب مزہ آئے گا سارے کلام کی تیکنیک ورکی چال کی ہے۔ ایا معلوم ہوتا ہے کھلی فضا میں بیٹھے ٹک ٹک ٹک چلے جا رہے ہیں۔ اور جب لسانی کلاسیکی کی اختراعیت استعمال کرتے ہیں تو غزل کی غزل واللہ رسائی کسمکسائی ماہ عسل مناتی مریخ کے گلستانوں میں چلی جاتی ہے۔ ترکیب تشبیہی، استعارہ کے کنایہ اوصاف اشارے بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ اور شوخ لفظوں کی سبک رفتاری جوڈمائی پیٹ کی انگلیوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہمیں اپنی آواز پر متوجہ کرتی ہیں۔ غنائیت میں میر کے رنگ سے کئی ہورس پاور پتی قوت زیادہ ہے۔ مثالاً اسی کو سنئے۔

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی ڈوب گیا   روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے کہا۔ ماشاءاللہ لفظوں کی نشست و برخاست خوب ہے۔ اگر آس لیلخ ہوتی تو مناسب رہتا۔ پھر ڈوبنے کا امکان نہ تھا۔ کچھ ابھی باندھ سکتے ہیں۔ اے بی ان کا تو دیوان اللہ رکھے تمہیں جب بھیجو گی ضرور پڑھوں گی۔ فی الحال تو تم اپنی کہی ہوئی تازہ غزلیں سناؤ۔ اور شاعرہ خانم بی شتارہ نے کچھ پس و پیش کے بعد اپنی چھوٹی سی نظم ترنم سے سنائی۔ آواز کسی قدر دلکش اور رسیلی تھی۔

ایک گھونگھر والی لٹ
پیشانی پر کلپ کے حصار میں سے
فرار ہو کر چوڑی پیشانی پر آپڑی
جس کو وہ بار بار پیچھے کر رہی تھیں
اور بے خیالی میں ہاتھ نے
بھوؤں کے پنسل کے بنے ہوئے
مصنوعی نوک پھیلا دی تھی۔
خم بہ خم خوشناک خوشناک
بیچاک پیچاک ہستی
بے باک بے باک خطرناک نگاہ

نہ مبتدیانہ انتہا
راہ مستقیم پاک سر پاک سودا
پاک عبادت لولاک سجدہ
نوک [illegible] قلم خبطی
پہ سینے کی ریت دیوانی
پر بھات کی گھمبیرتا میں
اے کتیا مجھے کاٹ لے
جناح اسپتال میں ڈلوا دے
وہ ڈاکٹر بن کر آئے
اپنی بیراگن بھولی جوگن کو پیار کرے۔

جب پڑھ چکیں تو اپنے سرخ رنگے ہوئے ناخون دانتوں سے کاٹنے لگیں اور میرے سے پوچھا۔ پسند آئی آپ نے سمجھ میں تو آگئی ہوگی۔ اے کیسی طبیعت خوش ہوئی ہے۔ ہزار بعل بہاریں دیکھو پھولو پھلو۔ تمہاری یہ کم عمری مضمون میں یہ پختگی۔ ہر شعر مرصع سونے کے مولوں کا ہے لفظوں کی متانت و رعایت، نازک خیالی اے واہ واہ، خوب کہتی ہو۔ اور میں نے یہ شعر منہ ہی منہ میں پڑھا۔

کیا وہ کام کیوں تم نے بہ وقت عمر نادانی   چرا کار کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اے شتارہ بیٹی تم نے یہ نہ بتایا۔ اور کون کون لوگ ہیں۔ شتارہ بی بولیں۔ جی آپ کی دعا سے سب ارباب ذوق ہیں۔ کوئی ریڈیو پر کہانی بولتے ہیں۔ کوئی پکچر کے ڈائیلاگ لکھتے ہیں۔ سب کوئی آرٹسٹ اور فن کار ہیں۔ کچھ فن کار نہیں ہیں۔ ہم باری باری فن کار ہونے کا اعزازی عہدہ دے دیتے ہیں اور وہ ادب خانے کو چلاتے ہیں۔ ان کو ہم ادب پبلک ریلیشن اینڈ پبلسٹی شاعر یا افسانہ نگار کہتے ہیں۔

چندا میں نے نہ اسکول کی صورت دیکھی نہ کالج جھانکے اور میری ناقص تعلیم بھی بہت محدود ہے۔ ابھی ذرا اپنا نامعلوم سائنس کے

نظریہ سے آگ ٹھنڈی ہوتی ہے یا گرم۔

میرے اس سوال پر انہیں بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ شاید اس لئے کہ دل میں سوچا ہوگا۔ بڑی بی عمر کے تجاوز سے سٹھیا بھی گئیں۔ احمقانہ باتوں پر اتر آئی۔ مگر خیر اس کا کچھ اظہار نہ کیا۔ بلکہ بڑی ہمدردی سے کہنے لگیں۔ پہلے کی عورتیں واقعی کتنی بھولی ہوتی تھیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ آگ گرم ہے یا ٹھنڈی۔ حقیقتاً ان کو کنج قفس میں گھونٹ کر رکھنے کا یہی نتیجہ ہے۔ لیجئے میں آپ کو بتاتی ہوں۔ آگ گرم ہے۔ اس کی مادیت، فعلیت سائنٹفک نظریات سے بھی گرم رہے گی۔ تو دیکھنا میری لال میں تو جاہل مطلق ہوں۔ ان شعروں کی سائنس تو میری موٹی عقل میں نہیں آتی۔ چاند تم ہی مجھے ذرا ذہن نشین کرا دو۔

دیکھئے میں ضرور آپ کی مدد کرتی۔ آپ کی مشکل اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ مگر شعروں کے متعلق معلومات ہمارے دوسرے اسپشلسٹ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک شعبہ ایکسپرٹ آف پراکرت نظارا شاعری موجود ہے جو انٹرنیشنل مسلم اینڈ فارین آئیڈیاز میں ڈیل کرتا ہے۔

اچھا ٹھہریئے ایک منٹ۔ میں دیکھتی ہوں اگر قصابی صاحب اس وقت موجود ہوئے تو وہ آپ کے سب شک و شبہات کے پرابلم دور کر دیں گے۔ وہ اٹھیں اور عقبی کمرے میں چلی گئیں۔ مگر ان کی آواز آ رہی تھی۔ ہیلو قصابی ایک خاتون کو تمہاری ضرورت ہے؟ ذرا ادھر آؤ۔ اور میں دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ ناحق شعروں کو سمجھانا چاہا۔ موا یہ قصابی کیا نام ہوا۔ نوج کیا چھرا لے کر آئے گا اور مجھے ذبح کر دے گا لاحول ولاقوت۔ بڑی پشیمانی ہو رہی تھی۔ مگر اب کیا ہوتا۔ تھوڑی دیر میں نیچے تلے قدم رکھتی ہوئی کھٹ پٹ آ گئیں۔

محترمہ ان سے ملئے۔ یہ ہیں قصابی صاحب ان سے معلوم کر لیجئے۔ ہائے خدا کی مار اس موئے قصابی پر یہ نگوڑا تو وہی مرد وا تھا جو اس ڈھنڈ ولعقندری کے ساتھ ہمارے ہاں رہتا تھا۔ لمبے لمبے گدھے کے سے ناخون دیکھ کر کراہیت آ رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور گول گول بے رونق آنکھیں بھینچ بھینچ کر جلدی جلدی جھپکنے لگا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے سچ مچ کوئی الّو دن کی تیز روشنی میں درخت کے کھوکھلے تنے سے نکل کر ٹھنٹھ پر بیٹھ گیا ہو۔ صورت تو سب کی اللہ نے بنائی ہے۔ مگر کیا تحریک باطن کا اثر چہروں پر ہو جاتا ہے؟ میں یہی غور کر رہی تھی کہ وہ بولے۔ معاف کیجئے میں وقت زیادہ نہیں دے سکتا۔ اپنی مجبوری بتلائیے۔

اسے کہتے ہیں جیسی روح ویسے فرشتے موئے کا حلیہ اور صورت جیسی ناپاک تھیں ویسے ہی باتیں لعنت ہو موئے پر۔ کیا کوئی دست سوال پھیلایا ہے جو مجھے مجبور سمجھا۔ اے میاں یہ شعر اس قدر بلند ہیں کہ میرا دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ ذرا سمجھا دو۔ اور میں نے اشعار پڑھ دیئے۔

نلق پلکوں پہ شرر ہو تو غزل ہوتی ہے   آستیں آگ سے تر ہو تو غزل ہوتی ہے   (رشید افضل جعفری)

مہک رہا ہے مگر میرے واسطے ہی نہیں   کسی کا حسن ہے کہ جاڑے کی چاندنی   (شاہد عشقی)

لطف سے ترے سواد ر دہک جاتا ہے   یہ وہ شعلہ ہے بجھاؤ تو بھڑک جاتا ہے

اور انہوں نے زور سے کھنکھار کر اس طرح کلام کا آغاز کیا۔

تعجب ہے آپ کی سمجھ میں یہ شعر کیوں نہیں آئے۔ بہت سہل ہیں۔ لیجئے میں شرح کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو ان کا پورا حظ و لطف آئے گا۔

ایک بڑا شاعر جب میٹافزکی حالت میں پہنچ جاتا ہے تو دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت آمد کے بجائے آورد اور جوش تصنع و اردات باطل کا زیادہ زور ہو جاتا ہے۔ اور شاعر کی عقل و ہوش تقریباً سلب ہو جاتے ہیں۔ قویٰ و اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور رگ پٹھے روزمرہ کے معمول کا کام قطعاً چھوڑ کر اس کی ذہنی قوت کو طاقت پہنچانے میں برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ خلیہ بدن کو راحن بنا بنا کر پلا رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مخدوش حالت آورد میں جو جانور مثلاً بھینس جو عام حالتوں میں سب کو بھینس نظر آتی ہے۔ شاعر کو بھینس نہ معلوم ہوتی ہو نہ

ے سامنے کھڑی ہوئی کالی بھینس میٹافر کی قوت تخیلہ سے وہ اپنی ہیئت تبدیل کرلے۔ اور شاعر کو عورت معلوم ہو۔ مثلاً معلوم ہو۔ کچھ بھی تصور سکتی ہے۔ مثلاً پاندان، اگالدان، چغد، یہ شاعر کے ایسے خیالات پر منحصر ہے۔ وہ اس وقت نہ اپنا ہی ہوتا ہے نہ دنیا کا محض اپنے ہی خیالات کے خوف و وہم کا تابع اور قیدی۔

پہلے شعر میں بڑی سادگی ہے کہ آنسو پہلے شرابِ پھر زبان، اور اندر کی آگ سے تپ تپ کر آگ بن کر آستین پر گرے۔ ظاہر بات ہے ۔جب آستین جلنے لگی تو آگ بجھانے والے انجن کو بلایا جائے گا جو فوراً آکر پائپ لگا کر پانی سے آگ بجھا دیں گے۔ اب آپ بتائیے۔ چلیے آگ گرم ہی۔ اس کا کام جلانا ہی۔ آخر کار اس کا انجام تری پر ختم ہے۔ جہنم کی آگ بے گناہ کے آنسو سے تر ہو جائے گی۔ آگ اپنی خاصیت کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔

دوسرے شعر تو اتنے رسا و بلند ہیں کہ ہزار صفحات کی کتاب بھی ان کا تجزیہ کرنے میں ناکام ثابت ہو ۔ شاعر بڑا کامیاب رہا ہے۔ اور ینے ساتھ ہم کو بھی مجبور کرتا ہے۔ اور دعوت دیتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ مل کر حسن کی دنیا میں جائیں۔ وہ حسن جو شعلہ کی طرح بھسم کرنے والا ہے وہ سن جو رات کو مہکتا ہے۔ رات کو مہکتا ہے تو اس کی نکہت پھیلتی ہے۔ اس کی بو میں ہپناٹیزم کی تاثیر ہے۔ لوگ اندھیرے میں بو کی سمت کشاں شاں کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ جب وہاں پہنچتے ہیں تو ایک ناگن بیٹھی ہے۔ اور یہ خوشبو اسی کے بس کی ہے جو متوالا بنا کر سب کو ناگن کے پاس شکار بنا کر مالش کرواتا ہے۔ وہ ناگن پہلے تو لگا وٹ کرتی ہے۔ لبھاتی ریجھاتی ہے۔ اور پھر کاٹ کر ایک زخم لگا دیتی ہے۔ جب زخم ہرا ہو کر پھوٹتا پھلتا ہے۔ درد کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اور زخم پر گندھک، گندہ بیروزہ، ہڑتال وغیرہ جیسی بدبودار دوائیں لگانی پڑتی ہیں۔ اب درد کا یہ مہکنا نہ ہوا تو کیا ہوا۔ لہٰذا ساری عمر درد کی مہک کی جلن میں گزر جاتی ہے۔ ان شعروں پر

عشق بشریت کا مجرد رنگ غالب ہے۔ اس میں ترغیب تلذذ بھی ہے اور نصیحت و عبرت بھی۔ اور اس میں ضم کوئی خیالی پیکر نہیں ہے۔ بلکہ جیتی جاگتی ایک رنڈی ہے۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری حکومت اسلامی ہے۔ مسلمان اگر رنڈی کے کوٹھے پر رہ جائے تو مسلم نصف رہ جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ اس ہمت و جرأت پر شک کرنے لگتے ہیں۔ بغیر ہمت و جرأت کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ خصوصاً مسلم کیونکہ اس کو جہاد کے لئے ہمیشہ مستعد رہنا پڑتا ہے اور اگر قاضی اس کی مردانیت میں کمی دیکھ کر فتور ایمان کا فتویٰ دے دے تو وہ شہادت اور غازیت کے منصب سے محروم رہے گا۔ چنانچہ اس عقیدے کے تحت مسلم حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کوٹھوں پر جاتے ہیں کہ زخم کھا کھا کر تیغ و تلوار کے گھاؤ کھانے کی عادت رہے۔ چونکہ سائنس نہ صرف معقولات بلکہ عفونیات بھی ایجاد کر رہی ہے۔ ہمارا ادب بھی سائنس کی ایجاد کردہ معنوی ناک لگا کر زیادہ حساس ہو گیا ہے، چنانچہ خوشبو اور بدبو پرستی کی ذریعہ دب میں ثانوی سطح پر آگئی ہے۔

مندروں میں طرح طرح کی جڑی بوٹیاں جلا کر بد روحوں کو دفع کیا جاتا تھا۔ یا عود و عنبر کی دھونی سے دیوداسیاں اپنے دیوتاؤں کو منایا کرتی تھیں ردوں کے کافور ملنا میت کے قریب لوبان سلگاتا۔ دلہنوں کو عطر میں بسانا ظاہر کرتا ہے کہ نہ صرف مذہب بلکہ رسم و رواج میں بو باس کا بڑا دخل اور اہم مدار رہا ہے۔ خوشبویات اور بدبویات سدا سے انسان کا پیچھا کر رہی ہیں۔ مگر ان کی علمی حقیقت اور ادبی حقیقت ہمارے فکر مند شعراء نے اب آشکار کی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ آپ کو وہی مہک جو شعراء کو پسند ہے، مرغوب نہ ہو۔ لیکن اس کی مہک سے انکار کسی نوع نہیں کیا جا سکتا۔ حقیر چیزیں ہی لے لیجئے۔ اپلے میں سے پول و براز میں بو ہے پسینہ، بغل سب میں مہک ہے۔ جب اس قدر معمولی چیزیں شامہ پیدا کر سکتی ہیں تو حسن کا مقام ارفع و اعلیٰ ہے۔ رات کو کاربن ائی آکسائڈ کی زیادتی ہوتی تجس میں ایک ناگوار بو ہے۔ لہٰذا حسن رات کو ہی مہکا۔ رنڈی کا کوٹھا دن کو کبھی نہیں کھلتا۔ رنڈی ہے گویا رات کی رانی کہہ دیجئے۔ پھر یہن کا سینہ جب گوبر اور گھاد سے سڑ گل کر زخم کی صورت پھٹ جاتا ہے تب اس میں سے پھول نکلتے ہیں جن کی مہک سے آپ اور ہم سب فرحت محسوس کرتے ہیں۔

وہ جوش اور مجھے قائل کرنے کے جنون میں یکساں دلیلیں اور تاویلیں دیتے چلے جا رہے تھے۔ اور میری اس وقت یہ کیفیت تھی جیسے کوئی

مچھلی تالاب کی چار دیواری میں بند ہو کر پانی کی سطح کو کم ہوتا ہوا دیکھ رہی ہو اور یہ ڈر د خوف اس کو ستا رہے ہوں کہ اگر تالاب کا پانی بالکل خشک ہو گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ لو بوا باتوں میں بہت دیر ہو گئی۔

دونوں وقت ملنے والے ہیں۔ مجھے تو اب جانا چاہئے۔ آج قصابی صاحب کی باتوں سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ بہت بہت شکریہ ویسے ابھی میری پوری طبیعت آپ پر ظاہر نہیں ہوئی۔ بہت شاندار باتیں جاننا چاہ رہی تھی مگر گھڑی دیکھی اور وقت دینے کی گنجائش نہ تھی لہذا اسلام علیکم قصابی صاحب نے کہا۔ اللہ اپنے حبیب کے صدقہ سے حقیقی علم و فضل کی روشنی عطا فرمائے۔ میں نے دعا دی اور وہ چلے گئے۔ ستارہ نے مجھے زبردستی روک لیا۔ اے تمہارے ہم جولی آتے ہوں گے۔

نہیں نہیں۔ وہ سب تو آج دو ڈھائی بجے رات کو آئیں گے۔ فراق صاحب بھارت سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے اعزاز میں عصرانہ اور مشاعرہ ہے میں اور میری پارٹی کے دوست نہیں گئے۔ اوئی خیر تو ہے وہ کیوں۔ میں بس بور ہوتی ہوں۔ دیکھئے نا ٹائم کی ایج ہے۔ ضروریات۔ روایات۔ نظریات مابعد الطبیعیات۔ حیوانیات سب ہی بدل چکے۔ یہ دونوں حضرات ابھی تک زبان کا قاعدہ حفظ کرتے ہیں۔ بھوکے کا پیٹ جب تک نہیں بھرتا جب تک اناج کا دانہ نہیں جائے اور ننگے کا بدن بغیر کپڑے کے نہیں ڈھکتا۔ ہمارا ملک ابھی پیدا ہوا ہے۔ چھوٹا ہے اور غریب اور اسی کی طرح ہماری زبان مفلس نادار اور ننگی ہے۔ اب یہ پرانے لوگ اس حقیقت کو تو سمجھتے نہیں چاہتے ہیں۔ ان کی طرح ہم بھی زبان داں بن کر قدیم حرف کے کیڑوں کو چاٹتے رہیں بھلا یوں کوئی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اسی لئے نیو این اور میں ہم اپنے سب نصب العین ہارے تے ہیں۔ زبان کو دوسروں سے امداد لینی پڑے گی۔ بغیر امداد نہ ہم جی سکتے ہیں نہ زبان ورنہ یونہی مفلوک الحالی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر T.B ہو جائے گی۔ ضروریات بڑھ گئیں۔ نئے آلات اور مشینوں کا دور ہے بھی مسئلہ ہم ادیبوں شاعروں کو پریشان کئے ہوئے ہے کہ اس زبان میں کیونکر دنیا کے کام چلائیں کس طرح اظہار کریں۔ یہ پرابلم موت و حیات کا معاملہ ہے ہمارے واسطے۔ اے بیٹی اب تم کہہ رہی ہو تو زبان کھولنی پڑتی ہے۔ کیا پوچھتی ہو میں نے بہتیرا میاں جوش اور فراق سے کہا سنا کہ اپنے یہ پرانے دھڑے چھوڑ دو۔ اس چلن کی اب قدر نہیں رہی۔ مگر تم جانو بیٹی بچہ اور بوڑھا برابر ہوتے ہیں۔ بس بالک ہٹ ہے۔ جب کہتی ہوں۔ لو الٹا مجھ ہی سے کہتے ہیں۔ ممانی جان آپ بھی کسی بچیوں کی سی باتیں کرتی ہیں کہیں بڈھے طوطے پڑھے ہیں۔ میں نے تو جل کر ایک بار صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میاں فراق اور جوش اپنی عزت اپنے ہاتھ۔ پہلے لوگ دوشالے میں لپیٹ کر جوتیاں مارتے تھے مگر اب کا یا پلٹ گئی کھلم کھلا ڈنڈے برسائیں گے۔ تو دونوں قہقہہ مار کر بولے۔ ممانی جان ادب سے سرخم کر دیں گے۔ آپ کیوں ہولتی ہیں۔ کیا اتنا بودا کم ظرف سمجھ لیا۔ آخر کو آپ ہی کی گود میں پروان چڑھے ہیں۔ بوی جب میں نے دیکھ لیا کہ چکنا گھڑا ہیں چپ ہو گئی اور ستارہ بے حد جوش سے میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولیں۔

آپ جیسی خواتین کی تو ہم لوگوں کو ضرورت ہے جو ہماری پیچیدگیوں کو سمجھ کر معاملات سے دلچسپی لیتی ہیں۔ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ آپ سے کہنا ہے کہ زمانے وہ نہیں رہے۔ ایسے شاعر بھی زیادہ نہیں چلیں گے۔ ان کی باتیں دقیق ہیں بے محل ہیں۔ فی زمانہ شخص فری ہے خیال فری ہے۔ پھر کیا مصیبت ہے کہ شعر فری نہ ہوں۔ یہ اولڈ مین خود بیڑی ہتھکڑی پہن کر بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں ہم بھی ان کے قید بھگتیں۔ لو دیکھو۔ سات سلام اس شعر و ادب کو۔ ہم شاعری کرنے کے بجائے کیماڑی کے سمندر میں گر کر سوسائڈ کر لیں گے۔ فری جان دیں گے فری۔ قید میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ فری اسٹائل ہوئے گا اور لازمی آئے گا۔ یہ قدامت پرست سمجھنے کو چاہیے نہ سمجھیں۔

ہاں بی بیچ کہتی ہو۔ تمہارے کلام میں حرف بہ حرف صداقت ہے۔ دور کیوں جاؤ سامنے ہی مثالیں موجود ہیں۔ جو چراغ خانہ تھیں نہ زلفوں کی اسیر رہیں۔ نہ دوپٹے کی کمند میں محصور رہے بیچ کہتی ہوں موا زمانہ بھی سب کی فری فری سنگر فری ہو گیا کہ اب تو ماؤں کے گربھ میں بچے بھی قید ہونا نہیں چاہتے یہ ننھی ارواحیں ننھی بوتلوں میں اپنی آزادی ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ میرے جملے پر بے اختیار ہنس پڑیں۔ اور کہا آپ بھی دلی ہیں۔

اے تمہارے دولہا خیر سے کیا کرتے ہیں؟ نہ معلوم کیا خیال آگیا۔ جو میں نے یہ سوال کر دیا۔ اے معترضی بیگم ہوش کی لو۔ ساری کتھا تو سن لی۔ اب بھی

پوچھتی ہو زلیخا مرد تھی یا عورت۔ جب یہ کسی قید و پابندی کی سرے سے قائل ہی نہیں تو خصم کا روگ کیا پالیں گی جسے مرنا اور بھرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے ذرا دیر لبد جواب دیا۔ ابھی کوئی آئیڈیل نہیں ملا۔ میں جانے کے لئے کھڑی ہوگئی تو انہوں نے کہا۔ اپنا نام پتہ بتاتی جائیے ایک جومذاکرہ ہمنے والا ہے۔ ہم آپ کو صدر بنائیں گے۔ مگر ہماری نظریاتی، ذاتی شہرتی پہلوؤں کو نیو رکریں گی۔ خیر میں وعدہ کرکے گھر چلی گئی۔

جب صحن میں پہنچی تو نعیمن بے تحاشا دوڑتی ہوئی آکر بھرے زور سے چمٹ گئی۔ بیوی بیوی مبارک ہو۔ خوشی کے مارے اس کے منہ سے جملے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ پوچھ اپنا نام تو بڑہ اٹھا کر چلتی بنی۔ میں نے ذرا حیرت سے پوچھا اور ادیب عالم کہاں ہیں انہیں بھی خبر ہے کہ نہیں۔ بیوی مجھے میاں کی تو نہیں معلوم کدھر ہیں۔ مگر چلی کیوں گئیں۔ اوئی بیوی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ان کی چتون میں بھانت ہوتی تو کوئی گلے کا ہار بنائے رکھتا۔ گن بھی ستی ساوتری کے نہ تھے۔ بس تو جانوں میاں نے بیزار ہو کر آپ ہی جوٹیا پکڑ کر نکال باہر کیا۔

اوئی جوٹیا تھی کہاں جو میاں پکڑتے۔ اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جب کوئی مستحق محبت ہو اور مہر و الفت کا طالب اور اس پر مشق ستم کی جائے تو ظلم و تغافل کے گھاؤ اتنی جلدی تو نہیں بھر سکتے۔ اور میں نے یہ معلوم کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی کہ میرے جانے کے بعد کیا قصہ ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت میں کیا کروں۔ لہٰذا سوچا کہ لاؤ خطبۂ صدارت ابھی سے لکھ رکھوں۔ اور میں نے اس طرح تحریر کی ابتدا کی۔

اردو جو غریب کی جورو اور سب کی بھابی تھی۔ آج وہ سب سے خلع لیتی ہے۔ اس مسرت میں دشمنان ارباب ذوق کی طرف سے ادب خانہ میں یہ مجلس منعقد ہوئی ہے۔ یہ ناقابل فراموش لمحہ ہے۔ اس عظیم الشان موقعہ پر میں اپنے عزیز مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اس حقیر و فقیر مقراضی بیگم کو اس قابل سمجھا کہ کرسیٔ صدارت سے سرفراز فرمائی۔ اور عزت و توقیر سے نواز کر اس رو سیاہ کو اپنی خدمت کرنے کا شرف بخش کر دنیا میں سرخ رو کیا۔

عزیز حضرات آج چونکہ بوا اردو شرعاً و قانوناً اپنی مختار آپ ہیں۔ اور میں بھی ان کی مسرت میں پورے خلوص دل سے شامل ہوں۔ چنانچہ ادب و شعر میں ایک انداز نو کی داغ بیل ڈالنے کا بیڑا اٹھاتی ہوں۔ اس نئے طرز سخن کا عنوان ہے۔

فراسندان قدیم مطلقہ تشبیہہ و استعارہ بیوہ ردیف و قافیہ تغزل آزاد بہ شکل نثر بہ لباس مغرب در خیال جاہلاں۔۔۔ میں یہیں تک لکھنے پائی تھی کہ مرزا ادیب عالم نے مجھے پکارا۔ مقراضی بیگم مقراضی بیگم کہاں ہو کب سے تمہارا منتظر بیٹھا ہوں پہلے تو میں بے حرکت بیٹھی رہی۔ لیکن پرانی چاہت کہیں مٹی ہے اور جب کوئی خود ہی اپنی ہار مان لے تو گلے شکوے کی بھی کیا ضرورت اور میں اٹھ کر ادھر گئی۔ دیکھا تو تکیہ پر سر رکھے پڑے ہیں کہئے کیا حکم ہے؟ دیکھو میں تم سے پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ اب مجھے اور مشتعل نہ کرو۔ بس رہنے دو۔ شرمندہ ہونے والوں کی یہی تو صورت ہوتی ہے جب وہ لعنت بھیج کر چلی گئی تو۔ دیکھو میں اللہ کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہوں۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ رہنے دیجئے یہ جھوٹی باتیں تو کسی اور سے بنائیے گا۔

خیر کیوں بلایا تھا۔

طبیعت خراب ہے۔ دیکھا تو بدن کچھ گرم تھا۔۔

جلدی سے ساری پرانی بیاضیں کھول کر دیکھیں اور ایک نسخہ بڑی تلاش کے بعد ملا۔ اور میں نے جلدی سے خمیرہ مومن خاں شربت بے دل میں حل کرکے چٹایا جس سے کچھ طبیعت سنبھلی۔۔۔

مگر ایڈیٹر صاحب یہ سب جوانی کی باتیں تھیں۔ اب تو ہم دونوں گوشہ نشین ہو کر اللہ اللہ کیا کرتے ہیں۔ امید ہے آپ بہ خیر و عافیت ہوں گے۔ رسالہ جب تک نہ پہنچے گا۔ سوئے در نگاہیں لگی رہیں گی۔ کہا سنا معاف کرنا۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔۔ فقط۔ مقراضی بیگم۔

عفت موہانی
حبیب کراچی

کچھ خواب ہے کچھ اصل

اور میں اسے تکتی ہی رہ گئی۔

جتنی کہانیاں میں نے خالہ بی سے سنی تھیں۔ وہ سب سچ لگ رہی تھیں۔

"اے! اس کلموہی نے سارے گھر کو نچا رکھا ہے"۔ خالہ بی راستے بھر کنیز کی داستان سناتی رہیں۔ "ایک تو بے چارے بھیا کا بڑھاپا، اوپر سے آپا کی تنک طبیعت۔ اور دوسرے ولایت سے لوٹے ہوئے صاحبزادے۔ گھر میں قیامت بھی ہو گی"۔

"وہ کیا کرتی ہے۔ خالہ بی"۔ جب انہوں نے مجھے بُلیٹن نہ پڑھنے دیا تو میں نے جھنجھلا کر پوچھ لیا۔ "یہ پوچھو کہ کیا کیا نہیں کرتی"۔ خالہ بی چڑ گئیں۔

"اُسے تو بھیا نے لاوارث سمجھ کر اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ سنپولیا پال رہے ہیں۔ شروع ہی سے اٹھان غضب کی تھی۔ اور اب تو۔ عروسہ نے تصویر بھیجی تھی۔ بالکل گجر یا سی ہو گئی ہے۔ نافذ کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے"۔

"نافذ بھائی ناچ رہے ہیں۔ یہ کونسا ناچ ہوتا ہے بھلا؟" میں نے یونہی کہدیا تھا لیکن خالہ بی نے ایسا موڈرن جواب دیا کہ میں ہکا بکا رہ گئی۔۔

"عشق بازی کا ناچ۔۔۔ اور کیا"۔ وہ سچے کوئلے کی طرح چٹخ گئیں۔ "اسی لئے منع کر رہی تھی کہ ہو کے کے مارے لڑکے کو ولایت نہ بھیجو!"

"نافذ بھائی کیوں ننھے مُنے بچے بن جاتے ہیں"۔ میں چِڑ گئی۔

"ایسے معاملوں میں موئے مرد ویسے ہی چغد ہو جاتے ہیں۔ اور پھر نافذ، وہ تو ولایت میں کیا کیا نہ دیکھ آئے ہوں گے۔ عورتوں پر کچھ بند ہیں وہ۔۔۔ خدا بُرا کرے مُنہ سے نہ نکلوائے۔ ایک سے ایک موئی حرافائیں لٹو ہوتی پھرتی ہیں۔ بہت کچھ آ جاتا ہے۔ یہی تو میں کہتی تھی کہ نافذ منہ سے بولتا نہ جانے۔ یہ یکایک اُسے کیا ہو گیا"۔

"خالہ بی۔ نافذ بھائی نے کیا کیا؟" میری دلچسپی بڑھنے لگی۔

"عروسہ نے لکھا تھا کہ وہ دیوانہ بنا پھرتا ہے۔ کنیز کا۔ ایک سے ایک اونچے گھرانے میں پیغام بھیجے جا رہے ہیں۔ مگر نافذ نے کہہ رکھا ہے شادی کریں گے تو کنیز سے۔ ورنہ کسی سے بھی نہیں!"

"اچھا؟!"

"اور کیا۔ اسی سے تو میرے آگ لگ گئی تھی۔ منتوں مرادوں کا ایک بچہ۔ وہ یوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے"۔

"یہ سب ہنگامی باتیں ہیں۔ خالہ بی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا"۔ بھلا چچی جان کب گوارا کریں گی۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ نافذ بھائی کی شادی

ہو جائے گی۔ وہ سب بھول بھال کے برابر کریں گے!"

"دیکھ لیجیو۔ وہ نہ بولیں گے۔ ایسے ہی ضدی ہٹیلے ہیں کہ بس۔ اودھم جوت دیں گے۔ ہاں!"

"کنیز کی صورت کیسی ہے؟!"

"ہزاروں میں ایک ہے!" ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیا وہ نیچ ذات ہے؟!"

"ذات پات کس نے چھانی۔ گھر کی انا کی لڑکی ہے! تمہیں یاد نہیں۔ تمہارے ہی برابر ہوگی۔" کتنے ہی سال بیت چکے تھے۔ میں نے نہ نافذ بھائی کو دیکھا تھا نہ کنیز کو... جب وہ ولایت جا رہے تھے۔ میں دہلی میں تھی۔ ان دنوں امی اور چچی جان میں ان بن تھی۔ نافذ بھائی نے مجھے اپنے جانے کی خبر دی تھی! میرا دل بہت چاہ رہا تھا! لیکن امی نے منع کر دیا۔! امی اس کے بھی خلاف تھیں۔ وہ مجھے خط کیوں لکھتے ہیں۔ امی کی تو عجیب باتیں تھیں۔ کلکتہ سے انہوں نے مجھے بہت سے تحفے بھیجے تھے! امی کو وہ بھی ناگوار ہوا تھا! نافذ بھائی مجھ سے آٹھ دس سال بڑے تھے۔ پسندیدہ اطوار سنجیدگی اور متانت سے بھرپور۔ چھچھورے، لڑکوں کی طرح میں نے انہیں بے محل ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ہر وقت خاموش خاموش سے نہ جانے کیا کچھ سوچتے رہتے! مدتوں ہم میں باتیں نہ ہوتیں۔ وہ تھے اور ماں کی لائبریری! میں ان سے انگریزی پڑھا کرتی۔ اور اس وقت امی کسی نہ کسی کو میرے سر پر مسلط کر دیتیں! یا تو عرد سہ چلی آتی۔ کبھی کبھار امی آ جاتیں۔ شرم کے مارے میرے کان جلنے لگتے۔ وہ بھی بھانپ گئے تھے۔

"عشرت۔ امی کو یہ پسند نہیں ہے کہ میں تمہیں پڑھا دیا کروں؟!"

"نہیں تو۔ نافذ بھائی!" میں محجوب ہو گئی۔

"تمہارے ساتھ باڈی گارڈ ز بھی آتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگے۔

"جی وہ۔" میں شرم کے مارے ہکلانے لگی۔ "میں تو نہیں لاتی۔"

اور پھر جب میں اکیلی پڑھنے کے لئے گئی تو انہوں نے خود ہی عرد سہ کو آواز دے دی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ "آج کل کی مائیں مارے عاقبت اندیشی کے بھائی بہن کو بھی مشکوک دیکھ رہی ہیں۔ مامی سے کہنا... ٹیوٹر رکھئے۔ اچھا۔ وہ تو میری فیس بھی نہیں دیں گی۔" وہ جلدی سے ہنس پڑے۔ "خیر، چلو۔ تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ تمہیں پڑھا دیں۔ پھر تم کہاں، اور ہم کہاں۔"

جب میں تعلیم کے سلسلے میں خالہ بی کے ہاں چلی گئی۔ وہ مجھے برابر خط لکھتے رہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں بھائی کو ترسی ہوئی تھی۔ میرے لئے وہ بھائی سے بڑھ کر تھے۔ کتنا پیار ہوتا تھا ان کی تحریر میں۔ جیسے دل کے خون میں قلم ڈبو کر لکھتے ہوں! ان کی محبت میری زندگی میں سما چکی تھی۔ ایک دیوتا کی طرح میں ان کی پرستش کرتی۔ یورپ سے بھی ان کے خط برابر مجھے ملتے رہے! لیکن پھر دفعتاً خط آنے بند ہو گئے۔ اور جیسے ہی وہ یورپ سے آئے چند ہی ہفتوں بعد کنیز سے ان کی محبت کی داستان جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

خالہ بی کنیز پر لعنت بھیج کر سو چکی تھیں۔ میں بچپن کی دھند میں جھانکنے لگی۔ بڑی دیر بعد مٹا مٹا سا ایک دبلا پتلا سیفد ہیولیٰ دکھائی دیا۔ سر پر پھٹی اوڑھنی... کرتے میں جا بجا پیوند چپکے ہوئے۔ گالوں پہ بہے ہوئے آنسوؤں کے بجھے بجھے نشان واضح تھے! وہ ہمارے ساتھ کھیلتی تھی۔ گھر بھر کے کام کرتی تھی۔ اور جب رات کو تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو اپنی ماں کو یاد کر کے ضرور رو دیتی تھی!!

بچپن کی یادیں کربناک بھی تھیں۔ اور طربناک بھی۔ میں ماضی میں گم ہو گئی۔

"کنیز کہاں ہے؟!" نافذ بھائی جب بھی کھیلنے آتے۔ سب سے پہلے اسی کو پوچھتے۔

"امی کا سر دبا رہی ہے!" کوئی کہتا۔

"امی کا سر تم دباؤ، اور کنیز کو ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے بھیج دو۔" وہ اپنی بہن کے سر پہ ایک ہلکی سی چپت لگا کر بھاگ دیتے۔

"کنیز تو نوکر ہے۔ بھائی جان!"

"کنیز اگر نوکر ہے تو تم سب بھی نوکر ہو۔" نافذ بھائی لڑنے پر آمادہ ہو جاتے۔ "اس کی بھی تو دو آنکھیں ہیں۔ ایک ناک ہے۔ منہ ہے۔ وہ تمہاری طرح بولتی ہے ہنستی ہے روتی ہے۔ پھر وہ نوکر کیوں ہے۔ اور تم نوکر کیوں نہیں ہو؟!"

اور امی گھبرا کر کنیز کو ساتھ کھیلنے کے لئے بھیج دیتیں۔ کھلی فضا میں پہونچ کر کنیز کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی!

"آؤ۔ کنیز۔" وہ دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے۔ اور پھر آنکھ مچولی شروع ہو جاتی۔ کنیز جہاں جا کے چھپتی۔ نافذ بھائی اسے ڈھونڈ لاتے۔ وہ بار بار اسی لئے چور بنتے تھے! کنیز کو کنجوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں میں ڈھونڈتے انہیں بہت لطف آتا۔ جب کبھی کنیز کام میں الجھی ہوتی۔ وہ کھیلنے سے انکار کر دیتے۔!

دھیرے دھیرے بچپن کے نقوش پر شباب کی تازگی چھا گئی تھی۔ سب کچھ نئے سرے سے انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا! میں نہ جانے کب تک یہ خواب دیکھتی رہی!!

مدتوں کے بچھڑے ملے! خالہ بی کی مدائی مشین تو ایسی چلی کہ چچی جان بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ پل بھر کے لئے ان کے چہرے پر اجلاہٹ نمودار ہوئی۔ چچا جان کو وہ کسی کام کے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ خود ہی گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ اور جب کبھی چچی جان انہیں آڑے ہاتھوں لیتیں بے چارے تھکی تھکی آواز میں کہتے "اب تو ہم چل چلاؤ پر ہیں۔ بیگم۔ جو کچھ کہنا سننا ہو۔ نافذ سے کہہ لو۔"

"عقل پر تو بالکل زنگ لگ گیا۔" چچی جان نقلی دانت پیستیں۔

"بھیا۔ یہ وطیرے کیا ہیں۔" خالہ بی دبنگ بن جاتیں۔

اور بوڑھوں میں چونچلے ہونے لگتے۔ لیکن اب کی بار زندگی جیسے کونے میں منہ دیئے سسک رہی تھی ماحول عجیب ساتھا! سب کے سب اداس تھے۔ سلوک میں نہ گرم جوشی تھی نہ گفتگو میں کوئی جان۔

میری نگاہیں نافذ بھائی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ مگر میں نے چچی جان سے نہیں پوچھا۔ وہ اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔ "ان کے ولایت سے آنے کے بعد لڑکیوں نے ایک چھوٹا موٹا جلسہ کیا تھا۔ ایسی ہی خوشی تھی سب کو۔ مجھے کیا پتہ۔ میں نے کہا بچیاں تھک کے چور ہو جائیں گی۔ خود میں تو کچھ کر نہ سکتی تھی۔ اسے اس جانہار خون کے بلڈ پریشر نے آدھا کر کے رکھ دیا ہے۔" چچی جان نے بھرّائے ہوئے گلے سے آواز نکالی۔ "کہاں کہاں علاج کروایا حکیم ڈاکٹر گنڈے تعویذ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ نمک چھوڑ دو۔ پرہیزی۔ ہم سے تو نمک نہ چھوٹا۔"

"تو پھر کنیز سے تم نے کیا کہا؟!" خالہ بی نے انہیں لقمہ دیا۔

"اے مجھے کیا پتہ تھا۔ یہ بہانہ غضب ہو جائے گا۔ موئی مالن کے ساتھ باغ میں کام کرتے کرتے گلاب کے پھول چوٹی میں لگا آئی تھی۔ دیکھنے میں جیسے ناگن بیٹھ پر پڑی ہو۔ خود سر دوائیاں کرتے کرتے تھک گئی۔ لیکن وہی میموں کے سے جھبڑے جھبڑے بال۔ ایک وہ ہے۔ آخر کی بھرتی بریوں تیل کنگھی نصیب نہیں ہوتا۔ مگر بال دیکھو کمر کے نیچے جا رہے ہیں!"

خالہ بی کا منہ بن گیا۔ مگر کچھ بولیں نہیں۔ چچی جان نے چھالیہ کا ایک پھنکا مارا۔ پھر رازداری سے بولیں۔ "لڑکیاں ادھر ادھر دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ اتنے میں یہ قطامہ چوٹی میں پھول لگائے نیلا دوپٹہ اوڑھے تمہارے بھیا کو چائے دینے گئی۔ وہیں نافذ میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بس غضب ہو گیا۔ اپنے بہنوئی سے پوچھ لو۔ کیا وہ سیدھے سبھاؤ باتیں کر رہے تھے۔ کیا تو اس صورت حرام کو دیکھتے ہی آپے سے جلتے رہے!"

"توبہ!" خالہ بی کے ہاتھ کانوں پر پہنچ گئے۔

"پھر رات کو جب میرے پاس آئے تو بار بار پوچھ رہے تھے۔ امّی وہ لڑکی کون ہے جس نے نیلا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے۔ امّی اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ امّی۔ اس کے بالوں میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ میں تو بڑی مشکل تھی اسی وقت۔ جب تک کوئی بہانہ بناتی۔ عروسہ بول اٹھی۔" بھائی جان۔ آپ کو کنیز یاد نہیں۔ وہ تو کنیز ہیں۔" جیسے بجلی کا الیکٹرک شاک لگا!" چچی جان آخر پر پلٹ بیٹے کی ماں تھیں۔ انگریزی بول گئیں۔

"پھر؟!" خالہ بی نے مرعوب ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا۔ اب میں اپنے منہ سے کیا پھوٹوں۔ قیامت کھڑی کر دی لڑکے نے۔ نہ میرا خیال۔ نہ باپ کا کچھ ڈر۔ جیسے ولایت میں ہوا ہی۔ کہتا ہے۔ بلو کنیز"

"ہائے اللہ!" خالہ بی اکی اچھل پڑیں۔" تو تم نے اسے اپنی چھاتی پہ کودوں دلنے کو رکھ چھوڑا ہے۔" اب تو وہ میرے ساتھ قبر میں جائے گی تمہیں اخر نہیں کیا کیا اُبرادری ہو چکی ہے۔ میرا خیال نہ کیا تھا نہ کرتے۔ مگر باپ سے کہہ گزرے کہ وہ آنا کی لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ مجھے تو وہی پسند ہے!"

"نافذ ہیں کہاں؟ بس" خالہ بی نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"باہر ہی ہوں گے۔" چچی اماں کا منہ ذرا سا نکل آیا۔" ہم سب سے خفا ہیں۔ بول چال بند ہے۔ میں ہی منہ پھوڑ کر کچھ کہتی ہوں تو اوندھا سیدھا جواب دے کر چل دیتے ہیں!"

خالہ بی نے انہیں بلوایا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ ذرا سی دیر بعد ہی نافذ بھائی آئے اور ہنستے ہوئے خالہ بی سے لپٹ گئے۔

"آپ کب آئیں خالہ امی؟!"

"تجھے خبر بھی ہو گئی لڑکے۔ اب بڑا آدمی ہو گیا ہے نا؟" خالہ بی نے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ دبا لیا۔" چشم بد دور۔ نظر بھر کر دیکھا نہیں جاتا۔"

وہ شرما گئے۔

"اچھلی جاتی تھی لڑکی۔" خالہ بی نے مجھ سے کہا۔" نافذ بھائی سے ملوں گی۔ اب کیوں چپکی سادھ لی۔" وہ میری طرف مڑے۔

"اُف فوہ۔ امی۔ یہ عشرت ہے۔۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے!" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میں گرتے گرتے سنبھل ہو لی ان کے سینے سے لگ گئی۔

"آپ مجھے بھول گئے۔" جب میں شرما گئی تو میں نے گلہ کر دیا۔

"کون تمہیں بھول سکے گا عشرت!" انہوں نے بزرگانہ انداز میں میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ ۔۔ اچھا۔ پھر تم سے کہوں گا۔ ابھی تو تم رہو گی نا؟!"

"جی ہاں۔ ابھی تو ہوں!"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ تم آئی ہوئی ہو ورنہ میں بھاگ آتا۔ دوستوں میں بیکار گپ شپ کر رہا تھا! میں تمہارے لئے بڑی اچھی اچھی کتابیں لایا ہوں۔ کیا کر رہی ہو آج کل؟!"

"جی۔ ایم اے تو کر چکی۔ اب جناب سب کی رائے ہو؟"

"بڑی جلدی ترقی کر لی۔ امی اس کی کیا عمر ہو گی۔ مجھے یاد ہے۔ میں اسے چاکلیٹ دیا کرتا تھا! ایک دفعہ اس نے میرے ہاتھ میں کاٹ کھایا تھا۔ خدا جانے وہ نشان کہاں گیا۔ ابھی تک خون جھلک رہا ہو گا۔"

وہ کتنے بڑے پن کی باتیں کر رہے تھے۔ مگر میں بناوٹ صاف پہچان گئی۔ ان کی آنکھوں میں کوئی دکھ چھپا ہوا تھا۔ ایسا انجانا سا دکھ... جو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بتایا نہیں جاتا۔ بار بار ہونٹ بدل رہے تھے۔ ہونٹوں پہ زبان پھیر رہے تھے۔ جیسے وہ محض ہمارے پاس ہوں۔ اور ذہن کہیں اور ہو۔

"مگر خالہ امی۔ میں نے اسے کبھی نہیں ستایا۔" وہ پھر بولے۔" میرے پاس پڑھنے بھی تو آتی تھی۔ اور ہاں۔ میری فیس ابھی تک قرض ہے...!"

میں ان کی غلطی پر ہنس پڑی۔

"آہ۔ عشرت وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ جیسے میں کچھ کھو کر گیا تھا۔ کچھ کھو کر آیا ہوں۔ نہ مجھے یہاں کوئی ملا نہ وہاں"۔ یکایک وہ انگریزی میں مجھ سے کہنے لگے "تم دیکھ لینا۔ تمہیں پتہ چلے گا۔ میری جاہل بہنوں اور ناسمجھ ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔ میں وہ نہیں ہوں، جو کبھی تھا۔" وہ خالہ بی کے بھونچال چہرے کی پرواہ کئے بغیر بولتے رہے۔" میں اب پچھتاتا ہوں، عشرت۔ میں یہاں کیوں آیا؟..."

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں بھائی جان۔ مگر آپ یہ کیوں سوچتے ہیں؟!"

"یہ کونسی بولی ہے؟" خالہ بی آخر نہ رہ سکیں۔ "کوئی راز کی بات ہو تو۔۔ ہم چلے جائیں۔"

"جی نہیں۔ خالہ امی۔۔۔ آپ بیٹھئے۔ میں ذرا عشرت۔ کتابیں دے دوں! چلو!"

میں ان کے پیچھے باہر نکل آئی۔ وہ اپنے سلوک میں ذرا بھی تو نہ بدلے تھے۔ یا یہ بات کم از کم میں نے ہی محسوس کی تھی۔ وہ ویسے ہی مخلص۔ اتنے ہی پر محبت اور متین تھے۔

"خالہ امی کا تم نے چہرہ دیکھا تھا؟" یہ کہہ کر وہ یکا یک کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔ اور پھر الماری سے کتابیں نکالتے ہوئے بولے۔ "تمہیں دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ جیسے مجھے میرے خیال اور میری زبان مل گئی ہو۔۔۔ تم ابھی جلدی تو نہ جاؤ گی؟"

"نہیں۔ بھائی جان! ابھی کہاں۔۔۔ میں آپ کی شادی میں شرکت کر کے جاؤں گی۔ ابھی چھٹیاں باقی ہیں۔"

"شادی۔" وہ رک گئے۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"چچی جان کو تو بڑا ارمان ہے! وہی کہہ رہی تھیں۔"

"امی چاہتی ہیں جلد از جلد مجھے زنجیریں پہنا دیں۔ جیسے میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ مگر بہن۔ وہ جو کچھ چاہتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا۔ امی کو کیا پتہ۔" تھوڑی دیر ٹھہر کر انہوں نے بڑی بےبسی سے کہا۔ "اگر میں اس مسئلہ میں اپنی پسند سے کام لوں تو کیا یہ کوئی گناہ ہے!"

"آپ کی مرضی اور پسند تو ہر لحاظ سے دیکھی جائے گی!" میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ "مگر میری پسند پر امی آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔" انہوں نے کہا۔ "عشرت۔۔۔۔ سچ سچ بتاؤ۔۔۔ اگر تمہارا کوئی بھائی ہوتا۔"

"واہ۔ بھائی جان۔ آپ نے میری محبت کی اچھی قدر کی۔ "میرا کوئی بھائی ہوتا؟" کیا اب میرا کوئی بھائی نہیں ہے!" میں نے شکوہ کیا۔

ایک لمحے کے لئے وہ شرمندہ ہو گئے۔ "ہاں۔۔۔۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔۔۔ کیا تم میری زندگی نہیں چاہو گی؟"

"دل و جان سے بھائی جان۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ کے لئے اگر میری جان بھی درکار ہو تو میں دے دوں گی۔"

ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "لڑکیوں کی طرح مجھے بیچنے اور خریدنے کے چرچے ہوتے ہیں۔ میرا کوئی ہم خیال نہیں ہے۔" وہ شاید کنیز کا نام لیتے ڈر رہے تھے۔ "صبح و شام مجھے یہی فکر رہتی ہے کہ میں جسے اپنے خیالوں میں بسائے پھر رہا ہوں۔ اس کا کیا ہوگا؟!۔۔۔۔ وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ عشرت!" اور وہ کتاب کی طرح کھل گئے!

کتنی دیر تک انہوں نے اپنے دل کی تمام باتیں مجھ سے کہی تھیں۔ ان دس برسوں کی ایک ایسی بات نہ تھی جو انہوں نے فراموش کی ہو۔۔۔۔ ہنسے اور ہنسایا۔۔۔۔ روئے اور مجھے بھی رلایا۔۔۔۔! شام کو میں چائے پر میں ان کے ساتھ اندر آئی۔ انہوں نے دھیرے سے مجھے اشارہ کیا۔ خالہ امی اور چچی جان کے چہروں پر بدستور خفگی کے غلاف منڈھے ہوئے تھے۔ بڑی فضول سی خاموشی کے ساتھ چائے ختم ہوئی۔ پھر وہ سیر کے لئے تیار ہو گئے۔

"چلتی ہو۔ عشرت!؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں۔ چچی جان؟!" میں ہچکچا گئی۔

"یوں کھلے بندوں؟!" خالہ امی کہیں روڑے اٹکانے

"آپ لوگ سیکڑوں سال پیچھے کی باتیں کرتی ہیں۔ اب میں تو ساتھ ہوں، دے دیجئے اجازت!"

"برقعہ لے جاؤ!" چچی جان نے کہا۔

"برقعہ؟!" انہوں نے قہقہہ لگایا۔ "آپ لوگ اگر یورپ کا ماحول دیکھئے تو پھر... آپ کو"

"یہ یورپ نہیں، ہندوستان ہے۔" اچانک خالہ بی پھٹ پڑیں۔ "یورپ کا نگوڑا ماحول میں کیا دیکھوں۔ تمہی کو مبارک رہے جو کچھ یہاں نہ آتا ہو تو وہ وہاں جاکر سیکھ آئے۔ بڈھے ماں باپ کو ڈگڈگی بجا بجا کر"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کیا تو بھائی جان کا چہرہ مسکراہٹ کے مارے کھلا پڑ رہا تھا۔ کیا مرجھا کر رہ گئے!

اُسی شام میں نے برآمدے کے سرے پر کنیز کو دیکھا جسے دیکھنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ پل بھر کے لئے میں دم بخود رہ گئی۔ نکھرے ستھرے آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ مگر میرے سامنے چاند سے کہیں زیادہ حسین چہرہ تھا۔ لمبی لمبی پلکوں کا عکس چاندنی میں رخساروں پر کانپ رہا تھا۔ پتلے پتلے مرجھائے ہوئے لب نیم وا تھے کھلے ہوئے بال کمر سے نیچے لہرا رہے تھے۔

"کنیز...!" میں گنگنائی۔ "مجھے نہیں پہچانا؟!"

"عشرت بی بی۔" وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ "آپ کب آئیں!"

"تم مجھے بھول گئیں۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کے گال پر تھپکی دی۔

"میں تو نہیں بھولی۔ مگر آپ سب بھول گئے۔"... وہ اداس ہو گئی۔

"تم اندر نہیں آتیں۔" میں رہ رہ کر اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی لڑکیاں میں نے دیکھی تھیں۔ مگر کنیز کا سا حسن زندگی بھر میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بولی۔ "بیگم صاحب آنے نہیں دیتیں۔ بی بی میں تو جنجال میں پھنس گئی ہوں۔ مجھے موت بھی تو نہیں آتی۔ مجبوروں اور بے کسوں سے موت بھی پناہ مانگ کر رہ جاتی ہے!"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"آپ کو کیا پتہ۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لب کانپ رہے تھے۔ مگر وہ کہہ نہ سکی۔ دفعتاً اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "آپ... مجھے بہت چاہتی ہیں نا۔ میرے مرنے کی دعائیں مانگا کیجئے!"

اور اس نے سب کچھ کہہ دیا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے درد چھلکا پڑتا تھا۔ نجانے کتنے دکھوں کو گلے سے لگائے جی رہی تھی۔

"میرا کوئی نہیں ہے۔ اکیلی ہنستی ہوں۔ اکیلی روتی ہوں... دنیا اتنا کیوں ستاتی ہے۔ عشرت بی بی۔ میرے آس پاس کتنا اندھیرا ہے۔ آپ اچھی طرح دیکھئے۔"

اور دوسری طرف نافذ بھائی تھے۔

"عشرت..." وہ چپکے چپکے کہا کرتے۔ "تم نے کنیز کو دیکھا... وہ کتنی خوبصورت ہے... میری برباد زندگی سے کہیں زیادہ حسین اور معصوم پہلے پہل جب اس نے مجھے دیکھا تھا۔ آہ... آتشی۔ میں وہ نگاہیں نہیں بھول سکتا۔ ان نظروں میں کوئی گہرا احساس تھا۔ جو میری روح میں اتر گیا۔ اگر میں اسے اپنا نہ سکا... اگر میں..." چچی جان جیسے خطرے کی بو پا چکی تھیں۔ خالہ بی نے ڈکٹیٹر جیسا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ بھائی جان مقابلہ پر تیار رہتے۔ چچی جان صوبیدار صاحب کی لڑکی کی بات کرتیں۔ اور وہ رسیاں تڑاتے۔

"اگر تم ہاں کہہ دو" خالہ بی گڑگڑا کر کہتیں۔

"میں قیامت تک نہ کہوں گا۔ میں کسی کا جبر سہہ نہ سکوں گا۔"

"کسی نے تم پر جادو کر دیا ہے... بہکا دیا ہے ایک کلموہی کے بچے نے۔"

"میرے گھر میں کوئی کلموہی نہیں ہے۔" دبے ہوئے غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

"خوب تم نے ولایت پاس کر کے باپ دادا کا نام اچھالا ہے۔ تم سے تو ایسی امید نہیں ہے!"

"آخر میں بھی تو کچھ سوچتا ہوں!"

"ماں باپ تمہارے بھلے کی کہاں سوچتے ہیں۔ وہ تو تم خود سوچ لو گے۔"

"بلاشبہ!"

"سن لیا بہن!" چچی جان کی گنگا جمنا بہہ نکلیں۔

"آپ نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ آپ دوسروں کی ہمدردیاں کیوں سمیٹ رہی ہیں!"

خالہ بی کے جل تھل ایک ہو گئے۔ "ہاں ہاں۔ میں کون ہوتی ہوں! جب تم چھوٹے تھے تب میں نے تمہیں گودی میں کہاں کھلایا۔ جب تمہاری اماں بیمار تھیں تو میں تمہارے ساتھ ساری ساری رات کہاں جاگی۔ جب تم بھوک سے روتے تھے تو میں نے تمہیں دودھ کب پلایا۔ وہ تو کوئی اور تھا۔ میں تو دوسری ہوں... تمہاری کوئی نہیں!"

"میری خالہ امی۔ آپ خفا نہ ہوں۔ یہ سب کچھ آپ نے کیا تھا۔ جسے آپ نے اپنی گودی میں کھلایا ہے۔ جس کے لئے آپ ساری ساری رات جاگی ہیں۔ پھر آپ اس کی ایک آرزو بھی پوری نہیں کرتیں؟! خدا کے لئے انصاف کیجئے۔ کیا آپ سے اپنے لئے میں کچھ نہ مانگوں؟!"

"ایک دو ٹکے کی چھوکری کے لئے۔ جو ہماری تمہاری جوتیاں سیدھی کرتی تھی!"

"زندگی اس کی بھی ہے۔ جو کچھ میں سوچتا ہوں۔ وہ بھی سوچتی ہے۔ نہیں! خالہ بی۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اگر شادی کروں گا تو اسی کنیز سے جو آپ کی اور میری جوتیاں سیدھی کرتی ہے۔ صمد یار صاحب کی لڑکی اس گھر کی بہو کبھی نہیں بن سکتی۔ کبھی نہیں!!"

"نافذ..." چچا جان بھی ایک بار تلملا گئے۔

"اگر وہ غریب ہے تو میں اس کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دوں گا۔ اگر اس کا کوئی مقام نہیں ہے تو میں اسے اس کا صحیح مقام دوں گا!"

"نافذ۔ تم پاگل ہو گئے ہو... تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم زبان لڑاتے ہو؟" چچا جان گرج برس گئے۔ "شرم اور غیرت...!" وہ زہریلے لہجہ میں ہنسے! "ایک مجبور اور بے بس کا ہاتھ تھامنا باعث شرم ہے۔ ایک بے سہارا زندگی کو سہارا دینا بے غیرتی ہے! ایک غریب لیکن شریف لڑکی کو اپنا لینا بے حیائی ہے۔ یہ سب کچھ دنیا کیوں سوچتی ہے۔ میں مر کیوں نہیں جاتا۔ خدا مجھے موت کیوں نہیں دیتا۔ میں گھر سے نکل جاؤں گا۔ میں دیواروں سے سر ٹکرا دوں گا۔"

"یہ کیا دیوانہ پن ہے..." خالہ بی نرمی اختیار کر لیتیں۔ "تم یہ نہیں سوچتے۔ ہمارا خاندان۔ ہمارا وقار۔ اور سچار لوگوں میں بنا بنایا نام۔"

"یہ اونچ نیچ ہم نے بنائی ہے۔ محبت دولت ہے۔ ہم جب چاہیں یہ فرق مٹا سکتے ہیں۔ مجھے اس کے ہر عیب سے پیار ہے... اس کی غربت سے۔ اس کی مجبوری سے۔ آپ چار لوگوں سے مت ڈریئے۔ میں انہیں بڑی آسانی سے منہ دکھا سکتا ہوں!"

دل کے قلعے حباب ہوتے ہیں۔ مگر نافذ بھائی کا قلعہ تو سنگین تھا۔ کسی کے آنسوؤں کا ان پہ اثر نہ ہوتا۔ عشرت... میں کہاں جاؤں... میں کیا کروں۔" وہ بچوں کی طرح مچلتے۔ "یہ سب کچھ کنیز بھی سنتی ہو گی۔ اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ کاش میں اسے تسلیاں دے سکتا۔ اس سے کہہ سکتا۔ وقت کے دھارے چاہے جس رخ پہ بہیں۔ مگر نافذ، تمہارا ہے۔ اور زندگی بھر تمہارا ہی رہے گا۔ عشرت بہن۔ اگر تم چاہو تو..." وہ التجائیہ انداز میں میرے ہاتھ پکڑ لیتے

میری طرف سے کہہ دینا۔۔ وہ غم نہ کھائے۔۔۔۔ آنسو نہ بہائے۔ موت کی دعائیں نہ مانگے! میں اسے چاہتا ہوں۔۔ وہ غریب ہے تو ہو۔ یہ جرم نہیں ہے، یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کنیز کے پاس بھی دل ہے!"

نافذ بھائی کا یہ انداز سوہانِ روح ہو گیا تھا۔ ان سے کچھ بس نہ چلتا! کنیز کو چچی بی قہر بھری نظروں سے اس طرح گھورتیں کہ وہ بھسم ہو جاتی۔ نافذ بھائی کی محبت میں وہ اپنے آپ کو بھول چکی تھی! یہ تو بعد کو اُسے پتہ چلا کہ وہ لاکھوں روپے کی جائیداد کا وارث ہو گیا۔ بہت کمینی ہے۔ بہت گری ہوئی ہے۔ بھلا انا کی لڑکی کی یہ مجال؟ اس کا احساس کامرانی فنا ہو گیا تھا! کتنے چاؤ سے وہ نافذ بھائی کی باتیں مجھ سے سنتی تھی! ان کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے وہ پہروں جاگا کرتی! میں دل و جان سے چاہتی تھی۔ نافذ بھائی اسے اپنا لیں۔ وہ سب سے جدا تھی۔ الگ تھلگ سا کمرے میں پڑی رہتی۔ جیسے کوئی گندی بیماری ہو۔۔۔ صرف میں ہی تھی۔ جو خالہ بی کے کڑے تیوروں کی پرواہ کئے بغیر اس کے پاس چلی جاتی تھی۔

"نافذ کو راضی ہونا پڑے گا۔ میں صوبیدار صاحب کو زبان دے چکی ہوں!" چچی جان نے الٹی میٹم دے دیا۔

"آپ کو پچھتانا پڑے گا۔" نافذ بھائی نے کہا۔ "شادی میری پسند کی ہوگی۔"

"نافذ۔ تم کچھ بھی کہو تمہارا بیاہ اس کلموہی سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ غضب خدا کا۔ کل کی چھوکری جس کی ماں میرے پاس پندرہ روپے ماہوار پر نوکر تھی۔ آج میری بہو بن جائے۔ جسے میں نے ناہدان کا کیڑا سمجھا۔ وہ میری برابری میں بٹھایا جائے۔ یہ دونوں سے بے پروردگار۔ میرا گھر غلیظ ہو گیا۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں۔ طاعونی چوہوں کو گھر سے نکال پھینکئے۔"

"ناخلف۔ اس سے تو اچھا تھا۔ تم یورپ میں رہ جاتے۔ مجھے تم پر فخر تھا! اگر تم ہماری پسند کو اپنا نہیں سکتے تو نہ سہی۔ مگر میں اتنا اور کہہ دوں کہ کنیز میرے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتی۔"

"مگر ڈیڈی۔" نافذ بھائی جھکنا نہیں چاہتے تھے "کنیز کی صرف یہی خطا ہے کہ وہ غریب ہے۔ اس کے سوا اور اس میں کیا عیب ہے!"

"غربت اور افلاس ہی اس کے عیب ہیں۔" خالہ بی نے بات اچک لی۔ "تمہارے لئے اونچے اونچے گھرانوں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت اور دولت مند لڑکی منہ پھیلائے بیٹھی ہے۔ کل کلاں کو کوئی کیا کہے گا۔ بیرسٹر صاحب کے صاحبزادے نے گھر کی چھوکری سے بیاہ کر لیا۔"

"میں کنیز کے نام ساٹھ ستر ہزار روپیہ جمع کرائے دیتا ہوں۔ پھر تو کوئی اُسے غریب نہ کہہ سکے گا۔" نافذ بھائی بولے۔

"قسم قرآن کی، میں سنکھیا پھانک لوں گی۔ اگر تو نے پھر کنیز کا نام لیا۔" چچی جان نے آخری حربہ استعمال کر ڈالا۔

"نہیں امی۔۔۔" نافذ بھائی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "آپ کی زندگی۔۔۔۔ آپ کی خواہش میری آرزو سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ آپ کی مرضی میری بھی مرضی ہے!"

وہ تھکے ہارے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔۔۔۔ میں پیچھے لپکی! مجھے ڈر لگتا تھا۔ کہیں وہ کچھ کر نہ لیں۔ مجھے دیکھ کر ان کا رہا سہا قرار جواب دے گیا۔ "زمانہ خواہ کتنا ہی آگے بڑھ جائے۔ مگر ہم ابھی اتنے بلند نہیں ہوئے کہ ایک مجبور اور بے بس لڑکی کو سہارا دے سکیں۔ ہمیں اپنی ناک اور دوسروں کے دانتوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔"

"یہ کیسا ظلم ہے۔ بھائی جان!" میں بھی ضبط نہ کر سکی۔

"اب میں کیا کروں؟!"

"بھائی جان، آپ اس سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔"

"نکاح؟!" وہ بھونچکا ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"پھر کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔"

لوگ کہتے ہیں کہ قیامت آسمان پر سے آتی ہے مگر وہ قیامت جو بند دروازے کے پیچھے سے آئی! خالہ بی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس کی گانٹھ۔"

"تم لوگ کیوں میرے گھر کا کھڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" چچی جان آگ بگولہ ہو گئیں۔ "یہ انگل بھر کی فتنی اپنے چہیتے بھائی جان کو سکھا رہی ہے۔ نکاح کر لیجئے۔ منہ توڑ دوں گی۔ کالج میں آشنائیاں کرانا سکھا ہے۔ بن جا قاضی ... نکاح کروا کے دیکھ ... ہائے! میں مر کیوں نہیں گئی!"

چچی جان کی دھاڑوں میں چچا جان کی گرج سنائی دی۔

"دور ہو جاؤ۔ میری آنکھوں کے آگے سے!"

"ضرور ڈیڈی ۔ مگر میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میرے ساتھ کنیز بھی جائے گی!"

"اس کا ڈولا نکلے گا۔ ابھی اور اسی وقت ۔" چچی جان اس کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اور جب تک ہم لوگ ان کے پیچھے دوڑتے۔ انہوں نے کنیز کے بال جکڑ کر اسے کئی ایک پٹخنیاں دے دی تھیں۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" نافذ بھائی نے کنیز کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

کنیز سسک رہی تھی! نافذ بھائی پھر بپھر گئے!

خالہ بی نے آخر ایسے غصیلے ناگ کے لئے ایک منتر یاد ہی کر لیا۔

"میرا ڈرائیور گاؤں میں رہتا ہے۔ کئی بار وہ مجھ سے کسی لڑکی کے لئے کہہ چکا ہے۔ اگر اس کے ساتھ راتوں رات کنیز کی شادی کر دی جائے۔"

"کسی کو خبر نہ لگے۔" چچی جان نے کہا۔

"تم مطمئن رہو۔"

ڈرائیور کی شکل میری نظروں میں گھوم گئی۔۔ کتنی ڈراؤنی صورت تھی۔ پیشانی پر کسی چوٹ کا نشان تھا جو اسے حد درجہ بھیانک بنا دیتا۔

نافذ بھائی اونچے خاندان کے بیٹے تھے۔ زندگی صرف انہی کی تھی۔ کنیز کی نہیں۔ دل صرف انہی کا دھڑکتا تھا۔ کنیز کے پہلو میں راکھ کا ڈھیر تھا! اور ایک امیر کبیر ماں باپ کے چہیتے بیٹے کی فلاح کی خاطر کنیز ڈرائیور کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔ اسے تاکید کر دی گئی تھی۔ وہ اسے لے کر گاؤں چلا گیا۔

"تمہیں قسم ہے اپنے ماں باپ کی۔ جو تم نے نافذ سے کچھ کہا!" چچی جان نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ اور میں ادھ مری پڑی ان کی سنگدلی پر۔ صبح کو منہ لٹکائے خالہ بی نے خبر سنائی "بھاگ گئی۔ موئی فاحشہ۔ اپنے کسی ہوتے سوتے کے ساتھ!"

"بھاگ گئی ۔" نافذ بھائی کا خون سوکھ گیا۔

"میاں، میں کہتی ہی تھی۔ وہ ٹکے کی اوقات کے منہ نہ لگو۔ مگر تم کہاں سننے والے تھے۔ یہ بھی تو تم نے نہ سوچا ہم سب تمہارے بھلے کی کہتے تھے۔"

نافذ بھائی کے دل پر بہت شدید چوٹ لگی تھی۔ انہیں تپ نے گھیر لیا۔ ہفتوں بستر پر پڑے ہذیان بکتے رہے۔ بخار کی شدت میں کنیز کو پکڑنے کے لئے اٹھتے۔ اسے رو رو کر پکارتے۔

"عشرت، بتاؤ۔ کنیز کہاں گئی۔" جیسے انہیں یقین ہو کنیز بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اور بدنصیب عشرت کے منہ پر ماں باپ کی قسم تالے ڈال دیتی۔

"میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ بتاؤ۔ کنیز کہاں گئی۔" وہ اب کسی بچے کی طرح رونے تھے۔

مجھے ان سب سے نفرت تھی۔ وہ ظالم اور نامہربان تھے۔ ایک کی زندگی بنانے کی خاطر دوسرے کی اجاڑ دیتے تھے۔ جو کسی کے لئے ایثار نہیں کر سکتے تھے۔ جو فقط تماشا زندگیوں سے کھیلتے تھے۔

میرے دل سے اس کی یاد نہ نکل سکی۔۔ وہ بھائی جان کو کتنا چاہتی تھی۔ ہنسنا رونا۔ آشنا نا آشنا ... اس کے پاس ان چیزوں کے سوا اور تھا ہی کیا۔

جسے یقین تھا۔ وہ بھائی جان کی ہو جائے گی۔۔۔ !مگر افلاس اور بے بسی کتنی ہولناک چیزیں ہوتی ہیں۔

بھائی جان رات کے سناٹے میں مجھے اپنے پاس بٹھائے آنسو بھری آواز میں کہتے "وہ بھاگ نہیں سکتی۔ اس نے اس زندگی سے گھبرا کر موت کے دامن میں پناہ لی ہوگی۔ وہ ڈرتی تھی۔ روتی تھی۔ اس کے ساتھ کسی نے اچھا سلوک نہیں کیا۔۔۔۔ میں بھی اسے کچھ نہ دے سکا عشرت۔۔۔ کیا اس نے تم سے بھی کچھ نہیں کہا؟!"

"نہیں بھائی جان" میں کہتی اور میرا دل چلّا چلّا کر رو پڑتا۔

چچی جان نے سکھ کی سانس لی۔۔ کیسی عجیب ماں تھی۔ جو اپنی محبت کے اسٹیج پر کسی دوسرے کی محبت کا وجود برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔

اور پھر جس سہ پہر کو بھائی جان کی بارات بڑی دھوم دھام سے صوبیدار صاحب کے گھر جا رہی تھی۔ میں الگ تھلگ کھڑی سوچ رہی تھی۔ ایک دیا جل رہا ہے۔ ایک بجھ گیا۔ مرد کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔۔ !میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خالہ بی مجھے اداس دیکھ کر چونک پڑیں۔

"تم ساتھ نہیں جا رہیں ؟!"

"مجھے کندھا دینا نہیں آتا۔"

"کیا بکتی ہے۔ لڑکی۔"

"یہ بارات نہیں ہے۔ کنیز کی محبت کا جنازہ ہے۔۔۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ خالہ بی۔ کنیز کی بربادی کی ذمہ دار آپ ہیں"!

"بڑھ بڑھ کے نہ بول لڑکی۔ یہ کیا سودا اُچھلا ہے! اسے بھگا نہ دیتی تو کیا اپنے خاندان میں میل کراتی۔ ہمارا گھرانہ ہے با وقار ہے۔ تمہاری بہنیں ہیں۔ تم ہو۔ کنیز اس گھر میں مل جاتی تو پھر کون سے راجے مہاراجے تمہارے لئے پیغام بھیجتے۔ انّا کی بیٹی بہو بن سکتی ہے مگر سودا سلف لانے والا گھر کا داماد نہیں بن سکتا۔ تم لوگوں نے عقل کہاں بیچ کھائی۔ خاندان کی آن بہت بڑی چیز ہے!"

"بہت بڑی چیز" میں نے جل کر کہا "اس کی خاطر ایک لڑکی کو آوارہ بنایا جاتا ہے۔ ایک ہستی کو جیتے جی دوزخ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ جیسی کنیز تباہ ہوئی ہے خدا کرے کہ سب تباہ ہو جائیں!"

"میں تھپڑ مار دوں گی۔"

"وہ میری بہن تھی" میرے آنسو چھلک آئے۔

بارات چلی گئی۔ رات کے اندھیرے دھندھ میں مجھے نور کی دھلی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ جس کی لمبی لمبی پلکوں پر ان گنت ستارے جھلملا رہے تھے۔ ننھے منے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جو ڈرائیور کی بھیانک آغوش سے نکلنے کے لئے زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

"عشرت بی بی۔ میں کیا کروں؟"

"عشرت بی بی۔ میں کدھر جاؤں۔"

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

دوسرے دن بڑی بھاری دعوت تھی !مگر اب میرا جی گھبرا رہا تھا۔ نانذ بھائی کی معصومیت اور بچپن سے چڑھ ہو رہی تھی !۔ ٹرنک میں کپڑے رکھتے دیکھ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہاں ۔۔۔ ؟!"

"مجھے جانے دیجئے۔ امی یاد آتی ہیں!"

اور وہ روکتے رہے۔ لیکن میں امی کے پاس چلی گئی۔

وقت کے تسلسل نے پچھلی یادیں خس و خاشاک کی طرح بہادیں۔ بالکل تھوڑے دنوں مجھے کنیز کا ملال رہا۔ پھر میں اپنی معروفیات میں اُسے بھی بھول گئی۔

شاید ایک آدھ سال بعد مجھے سروس کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا۔ خالہ بی سے ملنے کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن امی کی ہدایت تھی۔ میں انہی کے ہاں ٹھہروں۔ اسٹیشن پر میں نے ٹیکسی لی۔ دفعتہً مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ وہ چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا! ڈرائیور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"بی بی جی۔۔۔ آپ ؟!"

وہ خالہ بی کا ڈرائیور رحمٰن تھا۔

"کنیز کیسی ہے!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"بہت اچھی ہے۔" رحمٰن کی ہنسی تھکی پڑ رہی تھی۔ "بیگم صاحبہ نے خسرانہ دے دیا سرکار! ایسا بھاگوان قدم ہے کہ میرا گھر جنت بن گیا۔ اب میں بیگم صاحب کے یہاں نہیں ہوں! اپنی الگ کار خرید لی ہے۔ دہی چلتی ہے۔ آپ کو کہاں لے چلوں ؟!"

"اپنے گھر۔"

"اپنے گھر۔۔۔ ؟!" وہ متحیر رہ گیا۔

"ہاں۔" میں نے سوٹ کیس اندر رکھا۔ پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ "پہلے میں کنیز سے ملوں گی۔"

وہ مجھے گھر لے گیا! سامنے ہی کنیز کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر اس کے لبوں سے سوائے میرے نام کے اور آنکھوں سے سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہ نکلا۔

میری نگاہوں میں منہدم اور مسمار تاج محل گھومنے لگا۔ محبت کا کھنڈر بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پرانے دکھ کی ٹیسیں ابھی تک ابھری ہوئی تھیں۔ میرے دل پر کسی نے پتھر رکھ دیا۔

رحمٰن میری خاطر میں بچھا جا رہا تھا! "وہ ضیافت کا سامان لینے کے لئے باہر بھاگا۔" جب تک تم چائے بناؤ، میں سرکار کے لئے کچھ لے آؤں۔"

"کنیز بہن تم۔۔۔" میں اس سے کیا کہتی۔

"چائے پی لیجئے۔ بی بی۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "کہاں میرا جھونپڑا۔ کہاں آپ کے قدم۔ آج میں نے کس کا منہ دیکھا تھا۔ آپ کے درشن ہوئے، آپ کے یہاں سب اچھے تو ہیں۔ عشرت بی بی ؟!"

اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ کسی اور کا نام بھی لیتی۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے چولھا جلانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر نہ اپنی بربادی کا ماتم تھا۔ نہ ہمارے سلوک کا نوحہ۔ شاید تقدیر پر قانع ہو چکی تھی۔

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ محلوں میں روشنی پھیلانے والا حسین فانوس بے ہنگم سے جھونپڑے میں چپکے چپکے جل رہا تھا!!

دفعتاً پلنگ پر رکھا ہوا گوڈر کلبلایا۔ اور ننھے منے چار ہاتھ پاؤں باہر اُچھلے۔ اس نے اپنے بچے کو جھپٹ کر اٹھا لیا۔ اور شرمائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "بہت پیارا بچہ ہے۔ کیا نام رکھا اس کا ؟!" میں نے بچے کا نرم نرم گال چٹکی میں دبا لیا۔ یک بیک اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ ہنس بھی رہی تھی۔ رو بھی رہی تھی۔ پھر اس نے مدھم سے گھگھیائے لہجے میں کہا۔ "اس کا نام۔۔۔ اس کا نام نافذ حسین ہے عشرت بی بی!"

اور ننھے کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے!!!!

سلیم اختر

بکری

نیچے گلی میں سے بکری کی درد بھری کربناک آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ بڑی سی تھالی میں چاولوں میں دائرے بناتے اس کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اس کا بھی گلی کی دیگر عورتوں کی مانند نیچے جھانکنے کو دل چاہا۔ گو گلی میں جھانکنے والی عورتیں اسے نظر نہ آ رہی تھیں لیکن وہ پھر بھی یہ جانتی تھی کہ اس وقت گلی کی تمام عورتیں اپنے دروازوں، کھڑکیوں اور کوٹھوں سے جھانک رہی ہوں گی۔ شادی کے کھونٹے سے بندھی بکریوں کی مانند ان عورتوں کی زندگیاں اور دلچسپیاں خانگی حالات کی زنجیر کے دائرہ کے اندر محبوس تھیں۔ تواتر سے بچے پیدا کرنے والیوں کے لئے آج ایک اچھا خاصہ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔

گلی میں بکری وضع حمل کے درد سے چلا رہی تھی۔

سبھی جانتی تھیں کہ بیگاں کی بکری آج کل ہی میں "سونے" والی ہے۔ اس لئے اس کی پہلی آواز ہی پر زرینہ چاولوں کی تھالی رکھ کر کھڑکی کی طرف بھاگی تھی۔ مگر ساس کی کسی بکری ایسی کرخت اور کھردری آواز اس کے پاؤں میں گویا کانٹے کی طرح چبھی۔ "کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

"وہ ... وہ ..."

بکری دوبارہ چلائی اور اس نے کھٹ کھٹ کر کے دروازوں اور کھڑکیوں کے کھلنے اور ان کے ساتھ ہی کسی ریوڑ کی مانند عورتوں کی بھنبھناتی آوازیں سنیں۔ بکری کا درد اسے اپنے پیٹ سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ بکری ..." وہ بالآخر بولی۔

"تو کیا؟"

"وہ ... وہ بچہ ...!"

"تجھے کیا؟"

زرینہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی ساس کے بھدے اور بدرنگ ہونٹوں سے نکلے ان الفاظ نے چھری بن کر کسی بکری ہی کی مانند اسے ذبح کر دیا۔ اس نے ساس کی طرف ویسی ہی بے چارگی سے دیکھا جیسے ذبح ہوتے وقت بکری قصاب کو دیکھتی ہے۔ وہ بددلی سے آ کر بیٹھ گئی۔ گو اس کے ہاتھ اب بھی چاولوں سے کنکر چن رہے تھے۔ مگر کان بکری کی درد میں ڈوبی آوازوں کی طرف لگے تھے۔ اور ذہن ان تمام مناظر کو تصورات میں لا رہا تھا۔ اس نے تخت پوش پر جلدی جلدی تسبیح پھیرتی ساس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور نیچے کو لٹکتا جبڑا اور آگے بڑھی ٹھوڑی اسے

بکری سے مشابہ کر رہی تھی۔ آدھی کھلی آنکھیں اور مسلسل ہلتے ہونٹ دیکھ کر زرینہ کو دھوپ میں بیٹھی جگالی کرتی بکری یاد آگئی۔

بکری اب بھی تکلیف سے چلا رہی تھی۔ زرینہ نے سوچا ہائے اللہ! کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور پھر اس نے بکری کی تکلیف آسان ہو جانے کے لئے دعا مانگی ——یا مولا علی مشکل کشا! اس بے زبان کی تکلیف میں کمی کر دے!

بکری ایک لمحہ کو خاموش رہی۔ زرینہ خوش سی ہو گئی۔

ہاتھ چادروں سے کھیل رہے تھے اور ذہن بکری، اس کے گرد گھڑے بچوں اور گردوں میں بچے لئے دروازوں سے لگی عورتوں کو دیکھنے کی سعی میں مصروف تھا —— نیچے گلی سے کسی بچہ کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ لیکن وہ بکری کا نوزائیدہ بچہ نہ تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے تخت پوش پر بیٹھی بھدی سی بکری ابھی تک آنکھیں بند کئے جگالی میں مصروف تھی۔

بکری اس مرتبہ بہت زور سے چلائی۔

زرینہ بکری کی تکلیف سے بے چین ہوگئی۔ زرینہ کو جانوروں سے کسی قسم کی بھی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ اسے تو وقت بے وقت بکری کا بولنا برا ہی لگتا تھا۔ بیگان کا دروازہ بالمقابل تھا۔ اس لئے بعض اوقات تو اس کا شور ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ زنجیر کھلی رہ جاتی تو وہ ان کے صحن میں گھس کر گندگی پھیلا جاتی۔ ایسے میں تو وہ اسے اور بھی بری لگتی اور ایک مرتبہ تو اس نے جل کر اسے خوب ہی چپٹوں سے پیٹا تھا۔ لیکن جب سے بکری کا پیٹ پھولنے لگا تھا زرینہ اس کے لئے ایک عجیب قسم کی عزت سی محسوس کرتے ہوئے اس کی حالت پر رشک کرنے لگی تھی۔ وہ خود کو بکری سے اس بنا پر بدرجہا کمتر محسوس کرتی تھی کہ پانچ سالہ ازدواجی زندگی، خاوند کی سر توڑ کوششوں، ماں کے تعویذوں اور ساس کے طعنوں کے باوجود بھی وہ حاملہ نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے وہ بکری کے حمل سے بہت زیادہ دلچسپی لیتی رہی۔ سبزی کے پتے اور بچی ہوئی سوکھی روٹیاں اسے کھلاتی رہتی، کبھی کبھار وہ پیار سے اس کی پیٹھ سہلاتی تو اس کی آنکھیں جھپک جاتی۔ ایسے میں وہ محسوس کرتی گویا بکری اس کا دکھ سمجھتی ہے۔ بکری سے آنکھیں چار ہونے پر یہ احساس ہوتا گویا بکری اسے اپنی حالت پر نہ کڑھنے کا مشورہ دے رہی ہو۔

اس مرتبہ تو بکری بہت ہی بری طرح چلائی۔

—— اس کے خیالات گویا رسی تڑا کر نکل بھاگے۔

گلی میں بابو! بابو!! کے نام کی پکار سے۔ اسے معلوم ہوا کہ بابو کو بلوایا گیا ہے بلکہ پہاڑی بکرے ایسی پلی ہوئی گردن اور جسم سے پسینہ اور دودھ کی ملی جلی بو اس کی سب سے بڑی خصوصیات میں سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ لوگ تو دودھ میں پانی ملاتے ہیں۔ وہ پانی میں دودھ ملا کر بیچنے والوں میں سے تھا۔ بہرحال اسے "ایسے" کاموں کی بہت سمجھ تھی۔ جب دائی خود کو لاچار محسوس کرے تو لیڈی ڈاکٹر بلواتے ہیں۔ اسی طرح بابو بھی خاص اور پیچیدہ کیس میں بلوایا جاتا تھا۔

اللہ میرے! زرینہ نے سوچا کتنی شدید تکلیف ہوگی۔ جب جانور کا یہ حال ہے تو —————— اس کی نظریں اپنی ساس پر مرکوز ہو گئیں۔ جو پون درجن بچے پیدا کرنے کے بعد ——— بکری بن چکی تھی۔ اور جس سے خاوند اور آدھی درجن بچوں کی موت نے بکری ایسی نرمی اور علمی چھین لی تھی۔ دو بیٹوں نے شادی کے بعد اپنے اپنے گھر بسا لئے تھے۔ اور اب وہ زرینہ کے حق میں ناگن بنی اپنے بیٹے کی حفاظت کر رہی تھی۔

بکری کے درد سے زرینہ کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ پیٹ کے شدید درد سے اس کی چیخیں نکل نکل گئی تھیں

اور وہ اس درد کے تصور میں ڈوب گئی ——

درد —— درد —— اس نے سوچا ——

بکری پھر چلائی!

زرینہ کو درد سے چلاتی بکری پر رشک آرہا تھا۔ وہ تخلیق کے کرب میں مبتلا تھی۔ اور ایک نئے وجود کی تخلیق سے اپنے وجود کا مقصد پورا کر دے گی مگر وہ ۔۔ وہ تو کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس کی ساس اب ہر وقت بیٹے کے کان بھرتی ہے۔ وہ طلاق دلوا کر اولاد کے لئے نئی بہو لانے کی فکر میں ہے۔ کیا پتہ کل کو وہ کامیاب ہو ہی جائے اور یوں زرینہ طلاق لے کر اپنے گھر ۔۔ دودھ نہ دینے والی بکری کی مانند ۔۔ بے مصرف اور بغیر اہم زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ نماز کے بعد رو رو کر دعائیں مانگ چکی تھی مگر کوئی دعا کارگر نہ ہو سکی۔ وہ سوچ رہی تھی اے کاش! اس بکری کی طرح میں بھی درد سے چلا رہی ہوتی۔ آنکھوں میں بکری کا تصور اور کانوں میں اس کی آوازیں لئے اس سے چاول نہ چنے جا رہے تھے۔ ساس نے اپنا وظیفہ ختم کر لیا تھا اور وہ تخت پوش پر سے مصلیٰ لپیٹ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس مرتبہ تو بکری اس شدت سے چلائی کہ وہ مصلیٰ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

... بکری مسلسل چلائے جا رہی تھی!

اور پھر گلی میں بچوں کے شور اور عورتوں کی پر جوش آوازوں سے وہ سمجھ گئی کہ بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ زرینہ نے بے بسی سے سوچا اس نے اپنی ساس کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہونے پر زرینہ نے جلدی جلدی چاول صاف کرنے شروع کر دیئے۔ ساس کی نظریں گویا طعنہ دے رہی تھیں ۔۔ تم سے تو یہ بکری ہی اچھی ہے۔

بکری نے دوبارہ چلانا شروع کر دیا تو زرینہ نے اندازہ لگایا اب دوسرا بچہ ہو گا۔ وہ تصور ہی تصور میں بکری کی آنکھوں میں اطمینان، فخر اور ممتا کے ملے جلے جذبات کی جھلک دیکھ رہی تھی۔ ساس اب باورچی خانہ میں جا کر آگ جلانے لگی تھی۔ یہ کیسی عورت ہے؟ زرینہ نے جل کر سوچا نہ تو اسے خود ایسی باتوں سے دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اسے دیکھنے دیتی ہے۔

کان پھر بکری کے چلانے پر لگے تھے۔ جلد ہی بچوں کا شور بلند ہونے سے وہ یہ سمجھ گئی کہ دوسرا بھی ہو گیا ہے اس کے بعد بکری ایک آدھ مرتبہ پھر بولی مگر اب اس کی آواز میں نقاہت تو تھی، لیکن درد کی لرزش نہ تھی۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ زرینہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ وہ "چھیلے" ہیں کہ "چھیلیاں"۔ گلی میں سے بچوں اور عورتوں کی باتوں کا ملا جلا شور سا بلند ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

بیگاں بھاگی بھاگی آئی، اس کا چہرہ خوشی اور شدتِ جذبات سے یوں سرخ ہو رہا تھا گویا بکری اس کی بیٹی ہو یا بہو ہو۔

"بہن مبارک! چھیلیاں نے چھیلیاں!!"

وہ صحن میں کھڑی ہو کر چلائی اور زرینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اتنے میں زرینہ کا خاوند بھی باہر سے کھانا کھانے آ گیا۔ اس کی ساس بیٹے کو دیکھ کر بیگاں اور بکری کو بھول گئی اور باورچی خانہ سے چلائی۔

"زرینہ!"

"جی!"

"امجد آ گیا ہے اسے کھانا دے دو۔"

"اچھا جی!"

"میں سالن گرم کر رہی ہوں آ کر لے جانا!"

"جی اچھا جی!"

اور جب وہ کھانا لئے خاوند کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ کے ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں قصائی کی دکان پر رکھی "چھری" ایسی بے نور اور کمزور آنکھوں سے چار ہوئیں تو اس نے سوچا اے کاش! میرا خاوند بکرا ہی ہوتا اور اس نے کھانے کو گھاس کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

حمیدہ رضوی

سرپرائز

دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی رات کا ہولناک سناٹا کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کی دبیز چادر آکاش سے دھرتی تک تنی ہوئی تھی اُس کے وارڈ کے سامنے جامن، نیم، برگد، شہتوت اور شیشم کے گھنے درخت گہری کہر میں ڈوبے آسیب زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ اور پتوں میں سے گزرتی ہوئی بچھوا ہوا کی سرسراہٹ دکھی دکھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ آخری مہینہ کا بیمار زرد چاند کا چہرہ بھی سہما ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ہسپتال کی راتیں کیسی کربناک ہوتی ہیں کہ بیمار کے ساتھ تیمار دار بھی بے حد اُداس ہو جاتا ہے اور وہ تو تھی ہی بیمار۔ دکھی۔ مختلف وارڈوں سے مریضوں کے کراہنے کی آواز میں خود اس کی آواز دب گئی تھی۔ یوں بھی تو وہ بڑی مستقل مزاج اور ثابت قدم تھی اور پھر ابھی صرف ایک ماہ قبل اسی ہسپتال کی مائی گرامی ہر دلعزیز لیڈی سرجن تھی۔ اس لئے بھی مریضوں کے دکھ میں اپنا دکھ بھول جانے کی تو وہ عادی ہو چکی تھی۔ آج ہی اس کا تیسرا آپریشن ہوا تھا اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ذرا بھی غم اور فکر سے حالت نازک ہو سکتی ہے۔

لیکن مجھے اب کس کے لئے جینا ہے؟ — اُس نے سوچا۔ رات کے تین بج رہے تھے اور ابھی ابھی نرس اسے دوا پلا کر گئی تھی اور کوریڈار سے اس کی سینڈلوں کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی۔ سامنے پلنگ پر اس کی امّی لیٹی تھیں۔ کئی راتیں جاگنے کے بعد ابھی ذرا ان کی آنکھ لگی تھی۔ اور ان کے جھریوں دار حسین چہرے پر مصائب کی لکیریں دیکھ کر اس کا دل مسوس گیا — لیکن نرس اور ڈاکٹروں کے کہنے کے بالکل خلاف وہ آج سب کچھ سوچ گی۔ شاید یہ زندگی کی آخری رات ہو۔ اور کاروانِ ہستی کو الوداع کہنے کے لئے اسے بہت کچھ سوچنا تھا۔

اس نے بے حد نڈھال انداز میں چاروں طرف اپنی نیلی نیلی خوبصورت آنکھوں سے دیکھا — تو بات یہ تھی کہ میں جو کہ بے حد لائق فائق اور علی گڑھ یونیورسٹی کی تیز طرار لڑکی تھی اور جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے انتہا سنگدل ہے اور جس کو دیکھ کر بڑے بڑے شو بز ہائر ٹائپ کے لڑکے بھی دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ اور جو ہر محفل ہر تقریب میں۔ کلب میں۔ ہوٹلوں میں ہر گاہ میں ہر جگہ دوستوں میں مقبول تھی اور لوگوں کو سرپرائز دے کر کئی کئی دن موضوعِ سخن بنی رہتی تھی۔ اب کچھ نہیں۔ کیونکہ لوگوں کو سرپرائز دیتے دیتے قسمت نے اسے سرپرائز دینا شروع کر دیا۔ وہ دراصل دکھی ہے بہت دکھی ہے۔ کاش زندگی میں وہ لازوال سا لمحہ آیا ہی نہ ہوتا جب نینی تال کی پہاڑیوں میں بہت دو رنگ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے چلی گئی تھی اور پھر ایک دم رات کی دیوی نے ہمالہ کی چوٹیوں سے اترنا شروع کیا۔ اور وہ عجیب و غریب انسان اسے ملا اور پھر اسے گھر تک بڑے احترام اور بے حد اخلاق سے چھوڑ گیا۔ بس یہ لمحہ زندگی میں آیا ہی نہ ہوتا تو — کتنا اچھا تھا۔ میں کیسی بدنصیب ہوں — میں یعنی کہ زیبا علی کاظمی — اور اب میں نہیں رہوں گی۔ انسان کے

ہونے نہ ہونے میں فرق ہی کیا ہے جب عدم ہے تو وجود نہیں اور وجود ہے تو عدم نہیں، لیکن اس کا کیا ثبوت کہ وہ اب تک واقعی تھی۔ شاید اس لئے کہ چلتی پھرتی تھی، بولتی چالتی تھی۔ کانگریس کے جلسوں میں تقریریں کرتی تھی۔ مسلم لیگ کا مذاق اڑاتی تھی اور جلسوں، تقریبات اور کلب میں یہ بھول جاتی تھی کہ وہ لڑکی ہے اور جب کوئی صاحب عشق کا اظہار فرماتے تھے وہ چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی اور سہیلیوں میں بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتی تھی اور جیسے موسیقی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہ سب وجود کا ہی تو ثبوت ہے۔ الفاظ۔ صرف الفاظ ہماری زندگی کی سب سے اہم چیز ہیں۔ یہ بھی تو ایک لفظ ہے سرپرائز۔

اب اس کا کیا علاج ہو کہ وہ جنم جنم سے ایسی ہی تھی۔ سفید رنگت، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں، اماوس کی راتوں جیسے سیاہ بال، موٹے لیکن بے حد خوبصورت ہونٹ اور چہرے پر پھیلی ہوئی معصومیت اور شوخی کی ملی جلی کیفیت پہ ذہانت' اس کو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں زبردست سرپرائز کا شکار ہونا پڑتا۔ بچپن میں بھی اس کی حرکتیں عجیب ہوتیں۔ بہترین کھلونوں کو پھینک دیتی اور ٹوٹے پھوٹے کھلونے انتہائی احتیاط سے سنبھال کر رکھ لیتی۔ اسکول میں جو لڑکیاں لڑکے اس پر فدا ہوتے انہیں بالکل لفٹ نہ دیتی۔ اور جن لڑکیوں لڑکوں کو کوئی لفٹ نہ دیتا۔ ان سے انتہائی ہمدردی سے ملتی۔ اور جب وہ کالج تک پہنچی تو اس کی اول جلول حرکتوں سے گھر کے علاوہ باہر والوں کا بھی ناک میں دم رہتا۔ اکلوتی بچی ہونے کی وجہ سے ماں اسے دیکھ کر جیتی' باپ بھی بے حد چاہتے۔ لیکن وہ ماں کی طرح لاڈ کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ خاصے درشت مزاج اور سخت گیر تھے اور ان کا خیال تھا کہ بچوں کو ذمہ دار بنانے کے لئے ان سے زیادہ پیار ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ پھر کب جسے باپ تو اس کے آئیڈیل ہو کر رہ گئے تھے۔ کالج میں اسے اس وقت کتنا لطف آتا۔ جب کالج کے کسی ڈرامہ کی ہیروئن ہوتی ریہرسل میں اس کی ایکٹنگ پر تحسین و آفریں کے کلمے بلند ہو رہے ہوتے۔ اور وہ عین ڈرامے کے دن علی گڑھ کے بجائے آگرہ میں بیٹھی تار دے دیتی کہ ممی یاد آرہی تھیں۔ اس لئے آگئی۔ اس نے اسی طرح کی کئی تقریبات کا ستیاناس کیا تھا۔ اس طرح لوگوں کو پریشان کر کے اور بالواسطہ خود بھی پریشان ہو کر وہ کہتی ۔"کیسا مزے کا سرپرائز دیا"۔ اور جب اسے انتہائی بے ڈھنگی لڑکی سمجھ کر علیحدہ کر دیا جاتا تو وہ بغیر کچھ کہے سنے کسی تقریب کی فوری ذمہ داری لے کر اور بڑے اہتمام سے کام سرانجام دے کر پھر ایک بار لوگوں کو سرپرائز دیتی ۔ اور جب لڑکیاں اسے اس حرکت پہ برا بھلا کہتیں تو کہتی "یار کیا کروں مجھے تو اصل انداز میں کام کرنا بڑا بیہودہ معلوم ہوتا ہے ۔ جب دنیا کی ہر شے بے ڈھنگی ہے۔ ہر چیز تو ان سے خالی اور تضاد سے بھری ہے تو میرا بے ڈھنگا پن تم لوگوں کو کیوں کھلتا ہے اور پھر اس سرپرائز دینے میں خود مجھے بھی تو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن میں کروں کیا۔ دوسروں سے زیادہ مجھے اپنی ذات کو پریشان کر کے لطف آتا ہے ۔" اور لڑکیاں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتیں "۔ ایک اور سرپرائز ۔"

اسے یاد آرہا تھا کہ ایک دفعہ اشفاق نے کہا تھا کہ وہ تو خود ہی ایک چلتا پھرتا سرپرائز ہے اور اس دن جب وہ سب پکنک پر فتحپور سیکری گئی تھیں تو قلعہ کی ایک بہت ہی خطرناک دیوار پر بیٹھ کر کہا' سرپرائز والی بات کرتے اسے دیکھ کر اس کی پیاری سی کزن ثریا جمشید نے پیار بھرے غصہ میں لڑکیوں سے کہا تھا "ارے ننگو سویٹ اس کی تو پیدائش ہی سب سے بڑا سرپرائز ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے سے امی خطرناک حد تک کمزور اور بیمار ہو گئی تھیں اور ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ نہیں بچیں گی۔ لیکن اس کے باوجود یہ اس حالت میں پیدا ہو گئی اور نہ صرف پیدا ہوئی بلکہ پانچ بھائی بہنوں کے مرنے کے بعد زندہ بچ گئی اور یہی نہیں امی بھی قابل رشک حد تک صحت مند ہو گئیں۔ اس لئے یہ حیرت انگیز سے حیرت انگیز حرکتیں کر ڈالے تو بھی کم نہیں ۔" (کاش چھٹی وہ مر جاتی) ۔ اس نے کراہ کر سوچا۔

اور اس دن معاملہ کی سنگینی کو ذرا بھی نہ سوچتے ہوئے اس نے کیسے اطمینان سے ناظم رضا سے اپنی بچپن سے ہوئی منگنی اپنے خاندانی روایت کے خلاف یہ کہہ کر توڑ ڈالی تھی۔ کہ ناظم پائپ اور سگریٹ کیوں پیتا ہے۔ والٹز اور رمبا اتنا اچھا کیوں ناچتا ہے۔ دنیا بھر کی لڑکیوں کو اپنے گرد کیوں اکٹھے رکھتا اور رنگیلے ہونے نوابوں کی طرح ہفتوں شکار کے پیچھے کیوں مارا پھرتا ہے۔ کاؤبوائز کی طرح لباس کیوں

پہنتے ہے۔ لڑکیوں کی طرح اس کے ہاتھ نازک اور ہونٹ پتلے اور سرخ کیوں ہیں۔ اور پھر ان سب کے علاوہ اسے اس حد تک کیوں چاہتا ہے جیسے پجاری ہو۔ جبکہ میرا باپ جبر و جلال کا مجسمہ ہے۔ اور۔ اور۔ یہ اس کی ہر محبت ہر نفرت میں جانے اس کے باپ کا تصور کیوں لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اس فیصلہ سے سارے خاندان میں کہرام مچ گیا لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اڑی رہی خود کو اور دوسروں کو اذیت پہنچا کر اپنی آن پر اڑے رہنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ اور جب باپ نے بلا کر درشتگی سے ڈانٹا تو اسے بڑا اچھا لگا۔ چلو اس بہانے پاپا نے ڈانٹا تو۔ خاندانی روایتوں پر چلنے کے باوجود وہ آزاد خیال تھے اس لئے انہوں نے زبردستی مناسب نہیں سمجھی۔ پھر انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی بالکل ان کی طرح ضدی ہے جو بات اوندھی کھوپڑی میں آجائے مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ مگر یہ سب ہی گزر گیا۔ وقت کیسا گزر جاتا ہے اور بس اپنے گزرنے کا اذیت ناک احساس چھوڑ جاتا ہے۔

اس کے باپ خلعت بڑے علاقہ دار تھے جو گرمیاں شملہ اور نینی تال اور سردیاں آگرہ اور علی گڑھ میں گزارتے تھے۔ کئی برس آئی سی۔ ایس رہ چکے تھے اور کئی رفاہی تنظیموں کے ممبر تھے۔ اس لئے کانگریس میں بھی بڑی نمایاں شخصیت تھی۔ مسلم لیگ سے انہیں چڑھ تھی۔ کیونکہ ان دنوں یہ ایک کنگال بھوکی جماعت تھی اور قائداعظم تھے جو ایسی کنگال جماعت کی سرپرستی کے لئے چل پڑے تھے۔ اور اس لئے زیبا علی کاظمی کو بھی مسلم لیگ سے انتہا کی نفرت تھی۔ اس کے نظریوں کا مذاق اڑاتی۔ کانگریس کے لئے بڑی تندہی سے کام کرتی۔ تقاریر کرتی۔ سوشل ویلفیئر کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ آزادی کے لئے چندہ جمع کرتی۔ علی گڑھ میں پڑھنے کے باوجود اسے مسلمانوں اور غریبوں کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اعلیٰ طبقہ میں پیدا ہونے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ نام بڑے درشن تھوڑے۔ ورنہ حقیقت میں سوشل ویلفیئر کے لئے تو بڑی قربانی کی ضرورت ہے۔ وہ سب کچھ بہرحال گزر گیا۔ اور میں جس کی قسمت پر لڑکیاں رشک کرتی تھیں اور جس کے لئے ناظم رضا دکھی ہو کر جلاوطن ہو گیا تھا اور امریکہ کے جنگلوں میں شانتی کی تلاش میں سرگرداں تھا وہ حقیقت میں بہت دکھی ہے۔ تب ہی تو ایک دن یوں ہوا کہ اس نے ایک جگہ مسلم لیگ کے خلاف تقریر کی اور دوسرے دن قائداعظم کی آمد پر سب سے پہلے ان سے ملاقات کی اور ایک دن لکھنؤ کانگریس کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کے لئے گئی۔ اور ہفتہ بھر بعد بڑے وثوق سے یہ خبر ایک صاحبہ لے کر علی گڑھ پہنچیں کہ ایم۔ بی۔ ایس کی زیبا علی کاظمی نے اپنی مرضی سے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی ہے جو نہ صرف اس کے باپ دادا کی طرح شاہان مغلیہ سے لے کر انگریزی حکمرانوں تک سے حاصل کئے ہوئے خطاب نہیں رکھتا بلکہ پکا مسلم لیگی ہے۔ اس کی جائداد بھی ہندوستانی حکومت چھین لے گی۔ اور جو تین بچوں کا باپ بھی ہے اور پاکستان بننے پر فوراً نئے وطن چلا جائے گا۔ اس کی اس حرکت سے باپ کو ایسی مایوسی ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ یہ تو ایسا سرپرائز تھا کہ ایک جہاں دنگ ہو کر رہ گیا۔ اس کی عقل کا ماتم کرنے لگا۔ اور اس سے بڑھ کر تو بعد میں لوگوں کو یہ سرپرائز ملا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہرگز پاکستان نہیں جائے گی۔ نہ ہی اس کے رشتہ داروں سے ملے گی اور نہ اس کو یہاں رہنے اور واپس آنے پر مجبور کرے گی کیونکہ اسے اپنے نظریات اور اپنی جائداد اور اپنا ماحول بے حد عزیز تھا ان سب کو چھوڑنے سے اس کی آن میں فرق پڑتا تھا۔ اور جب اس کے شوہر نے کہا تھا کہ ہوسکتا ہے میں کبھی واپس نہ آؤں تو تم یہ پہاڑ سی زندگی تنہا کیسے گزارو گی۔ تو وہ چڑھ گئی۔

"بھلا یہ آپ مرد لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ آپ کے بغیر زندگی نہیں کٹے گی۔ عورت مرد سے کہیں زیادہ مضبوط فطرت کی مالک ہوتی ہے میں دکھا دوں گی میرے ارادوں میں کتنی [illegible] ہے سمجھے۔ اور یہ شادی تو۔ اس لمحہ کو مقید کرنے کے لئے کی تھی۔ ج[illegible]نے آپ کو اپنا سمجھا۔ دنیا میں بعض چیزیں بڑی پراسرار ہیں۔ ان میں سے ایک میرا یہ فعل بھی ہے۔ جب میں اس شادی کے لئے راضی ہو گئی جس کے بعد۔ اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ اور اس کا شوہر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کو مندر کے کلس اور مسجد کے میناروں پر دیکھتا رہا۔ اور وقت بیتتا رہا۔ اور وہ اس کو دیکھ کر سوچتی رہی۔ اس کی عادات، اطوار، غرور، لاپرواہی، ذہانت اور سنجیدگی میں میرے پاپا کی کس قدر مشابہت ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی شخصیت

اور زیادہ پرکشش ہے اس کی آواز ــــ ہاں یہی تو ــ خیر ــ اور یہ مسلم لیگی ہے۔ لیکن میں اس کے نظریہ کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں مانتی نہ مانوں گی ــــ وہ لمحہ کیسا تھا؟ــــ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

اور پھر تو جیسے اس پر سوالوں کی بوچھار ہوگئی۔ امی کو تو اس نے یہ جواب دے دیا کہ وہ بہرحال ذات برادری کا ہے خاندانی اور حد سے زیادہ اونچے کردار کا ہے اور پھر یہ کہ میری جائداد کہیں نہیں جائے گی۔ اس نے خالص جاگیردارانہ ٹرم میں بات سمجھائی لیکن لڑکیوں سہیلیوں کے اس سوال کا جواب وہ کیسے دیتی کہ کیا دیکھ کر مرمٹی ہو تم۔ ڈارلنگ تم جس پر ایک جہان فدا تھا۔ تو وہ انہیں کیسے سمجھاتی کہ بعض وقت کوئی ایک جھونکا، کوئی ایک مسکراہٹ ــ کسی کی ایک نظر، ذرا سی خوشبو پلک جھپکنے کا انداز یا ذرا سا جملہ کیسا تمام زندگی کو بیکار کر دیتا ہے۔ یہ چیز تو ایسی نازک ہے کہ بتائی ہی نہیں جا سکتی۔ اور وہ ہنس کر صرف یہی کہتی کہ ایک عظیم سرپرائز، اب اسے کیا معلوم تھا۔ یہ سرپرائز اس نے نہیں قسمت نے اسے دیا ہے اور پھر تو جیسے قسمت کو سرپرائز دینے کا چسکا ہی پڑ گیا ــــ اور اسے تاج محل کی برج سے اترتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا سراپا کبھی نہ بھولنے والا کیسا حیرت انگیز لگ رہا تھا۔

افوہ ــ اور پھر انہوں نے شادی کی اور پاکستان بن گیا اور وہ چلا گیا اور وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے آگرہ کے سرکاری ہسپتال میں ملازم ہو گئی اور اس کے باپ جن کا کبھی ڈنکا بجتا تھا۔ ایک دم بوڑھے ہو گئے۔ لوگوں کی ابن الوقتی اور طوطا چشمی نے ان کا دل توڑ دیا، جائداد کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں چلا گیا۔ حکومت نے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا اور وہ جو آزادی کا اتنا بڑا آئیڈیل لئے قائد اعظم پر ہنستے تھے رو پڑے اور بستر سے لگ گئے اور باپ کی ایسی حالت سن کر وہ تڑپ اٹھی اور آ کر اس نے انہیں منا لیا۔ اور جب باپ نے ایک دن کہا کہ وہ ہی لوگ حقیقت میں صحیح راستہ پر تھے جو چلے گئے تب اسے اپنا شوہر یاد آیا۔ لیکن وہ تو اس سے اس کے وطن نہ آنے کا پکا ارادہ ظاہر کر چکی ہے۔ یاد کر کے وہ چپ ہو گئی اور باپ اس دنیا سے چل بسے۔ بہرحال اس کے دنیا کا یہی تقاضا تھا کہ وہ زندگی کے میدان میں ہر طرح کے طوفان سے مقابلہ کر کے منزل تک پہنچے گی۔

کچھ وقت اور گذر گیا۔ ہسپتال میں مریضوں کے درمیان گھر کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ یوں بھی وہ غیر معمولی قوت برداشت اور قوت ارادی کی مالک تھی اور آزادی کے باوجود زندگی کی پاکیزگی سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ گہری عقیدت تھی۔ اس کی بھی وہی بات یعنی اپنے شوہر کی تو اسے بہت پسند آئی تھی ــ اور پھر وہ ایک خوبصورت کالی کالی آنکھوں والے بچہ کی ماں بن گئی۔ پھر تو وہ اس قدر بدل گئی۔ ایسی سنجیدہ ہو گئی کہ اس کی ماں بھی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ بچہ اس کی تمام خوشیوں، تمام تمناؤں، تمام امیدوں کا مرکز تھا وہ ذمہ دار ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ ماں ہو گئی تھی جس کو قدرت کی تخلیق کی ذمہ داری ملی تھی جس کو پوری کرنے کے لئے جان دے دینا بھی معمولی بات تھی۔ اس معاشرہ کی عورت بس یہ ہی ایسی وہ انسان کو خوشیاں مسرتیں، پاکیزگی، تقدس، زندگی، اور حسن سب کچھ دیتی ہے حتیٰ کہ جان تک۔ لیکن خود کچھ نہیں مانگتی وہ سب کے لئے ہے اس کے لئے کوئی نہیں وہ سب کے حقوق کو پورا کرتی ہے لیکن اس کا کسی پر حق نہیں ــ تو یہ حقیقت تھی وہ ایک مکمل عورت ایک مکمل اور مقدس ماں بن گئی تھی۔ اب تو اسے نہ اپنے بچپن کی حماقتوں پر ہنسی آتی نہ سرمایہ کے مانیٹر کے لئے تعجب ہوتا نہ سیاسی نظریہ سے ہونے کا دکھ ہوتا نہ حیرت انگیز اور متاثر کرنے والے شوہر کی یاد آتی نہ اپنی ضد اور آن پر افسوس ہوتا۔ اب اس کی زندگی کا مقصد تھا ــ بڑا مقدس بڑا اہم ــ لیکن اس نے بچہ کے باپ کو اس کی پیدائش کی اطلاع تک نہیں دی۔ وہ محبت میں رقیب نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی۔

اور وقت کی پرواز ایک دم بڑی تیز ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ نوکروں اور اپنے بچے فاروق کو لے کر وہ نینی تال گئی اور اسے سینٹ جوزف جیسے اچھے ادارے میں داخل کر کے خوشی خوشی واپس آئی وہ اسے ہر ماہ منی آرڈر اپنے شوہر کی طرف سے کرتی وہ خوش ہو جاتا ــ پاپا نے بھیجے تو دیا ہے ــــ اور جب چھٹیوں میں گھر آ کر وہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھتا۔

"ممی سب کے پاپا تو ... آتے ہیں میرے پاپا کیوں نہیں آتے"۔ تو وہ ــ بڑی سنجیدہ معتبر اور باوقار لہجہ میں کہتی۔

"ڈارلنگ جب تم پڑھ لکھ لوگے تو پاپا آئیں گے" اور وہ ہنستا ہوا لان میں جا کر چھوٹی سی سائیکل سے کھیلنے لگتا۔ اور وہ بڑی ویران آنکھوں سے خلا میں تکتے ہوئے سوچتی ــ اس کی آنکھیں بھی بالکل باپ کی طرح ہیں اور ہاتھ پیر بھی اور چہرہ بھی ــ اور ــ بڑے ہو کر شاید آواز بھی ایسی ہی پرکشش ہو میرا تو صرف رنگ ملا ہے اور پھر اسے بلا کر وہ گلے سے لگا لیتی بے تحاشا چومتی۔ ایسے جیسے ڈر ہو کہ کوئی لے جائے گا۔ خیر بڑا ہو جائے گا تو میں اس کے پاپا کو لکھوں گی۔ پھر تو وہ بھاگتے ہوئے آئیں گے اور میں فخر سے ان سے متعارف کرواؤں گی ــ یہ کتنا دلچسپ سرپرائز ہو گا۔ کتنا حسین، وہ اکثر ہسپتال میں راؤنڈ لیتی ہوئی سوچ کر مسکرا دیتی ــ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ــ یہ سرپرائز۔

پھر ایک دن ثریا جمشید کی بہن کی شادی میں شرکت کے لئے وہ فاروق اور امّی کے ساتھ گئی۔ سارا خاندان ہی جمع تھا۔ اس دن اس نے سات آٹھ سال بعد رنگین نارنجی رنگ کی ساڑی باندھی اور زیور پہنے اور اس کا بچہ بھی چست پتلون، گرم کوٹ اور مفلر میں سارے ہی بچوں سے نمایاں اور اہم معلوم ہو رہا تھا۔ ہر شخص نے اس کے بچہ کی بڑی تعریف کی۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ کسی کام سے وہ بڑی تیزی سے مہمانوں کے کمرے سے باورچی خانہ کی طرف جا رہی تھی کہ ایک شخص سے ٹکرائی ــ اور پھر لرز کر رہ گئی ــ اس کے سامنے ہزاروں مایوسیوں کی تصویر بنا ویران آنکھیں لئے ناظم رضا کھڑا تھا ــ وہ بڑی پریشان ہوئی۔ لیکن تیسرے دن خاندان بھر کے ساتھ اس نے ناظم رضا سے دنیا بھر کی باتیں کیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ تو شادی شدہ عورت تھی اسے کیا کہ ناظم سے پہلے کیا رشتہ تھا اور وہ بھی تو اب بدل گیا تھا وہ بھی یوں ملا جیسے زیبا بی بی اس کی سگی بہن ہے اور یہ سنکر تو اسے سچ مچ سرپرائز ہوا کہ اس نے اس کی تمام ناپسندیدہ حرکات مدتیں ہوئیں چھوڑ دی ہیں ــ رات کو جب اس نے بھاری ریشمی ساڑی اور زیوروں میں خود کو دیکھا تو دکھ کی ایک لہر اس پر سے گزر گئی ــ یہ سب کس کے لئے ہے ــ پھر اس نے یوں یہ کپڑے اور زیور اتار پھینکے جیسے بچھو ہوں ــ اس رات وہ کتنی مضطرب، کس قدر بے چین اور دکھی ہو گئی۔ وہ دو بجے رات تک جاگی پھر حسب معمول ــ اور پھر فاروق کو بھینچ کر پیار کر کے وہ ایسے مطمئن ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو ــ ہاں اور پھر وہ سو گئی۔ فاروق کو تو دیکھ کر ہی دکھ بھول جاتے تھے۔

ناظم بھی اسی کے شہر میں ملازم تھا وہ اکثر خیریت دریافت کرنے آتا بڑے خلوص سے کوئی کام ہوتا تو کر دیتا اور فوراً ہی چلا جاتا۔ اب تو وہ خود ہی جیسے زیادہ بیٹھنا نہیں چاہتا جیسے اس کی حالت پہلے سے بڑا دکھ ہوتا ــ اور وہ اس کا رویہ دیکھ کر سوچتی ــ تو بات ساری یہ ہے کہ یوں بھی ہو جاتا ہے۔ اب قسمت کو یوں بھی منظور تھا کہ وہ اتنا پرخلوص ہو کہ مجھے سہارا دے گا ــ یہ بھی ایک سرپرائز ہے ــ یہ سب کچھ سرپرائز ہے زندگی ہی سرپرائز ہے ــ چودھویں کا چاند جھک جاتا وہ چاندنی میں اپنا حسین سا چہرہ ہتھیلی پہ رکھے سوچتی رہتی ــ ہوائیں سرسراتی گزر جاتیں اور وہ بے چین ہو کر لیٹ جاتی۔ کبھی باپ اور کبھی بیٹے کے تصور میں سو جاتی اور خواب میں ان سے ملتی رہتی۔

کیسا المیہ ہے کہ انسان کو زندگی ملی ہے ــ عقل ملی ہے ــ خواہش ملی ہے ــ لیکن وہ مجبور ہے وہ جو چاہے کر نہیں سکتا۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ آنے والا لمحہ اپنے پہلو میں کیسا ہیبت ناک طوفان لائے گا۔ جو زندگی کو شاہراہ حیات کے کسی خطرناک موڑ پر کھڑا کر دے گا ــ جب جینا نہیں چاہتا تو جینا پڑتا ہے اور جب زندگی کی آرزو کرتا ہے تو زندگی روٹھ جاتی ہے ــ عجیب المیہ ہے ــ چھٹیوں میں فاروق آیا ہوا تھا وہ ہسپتال سے ڈیوٹی دے کر واپس آئی اسے سست پڑا ہوا دیکھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اسے زبردست انفلوئنزا ہو گیا تھا ــ وہ تڑپ کے رہ گئی ــ دوائیں دیں تمام رات جاگی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ صبح کو ناظم نے کسی اور تجربہ کار ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا ــ دکھایا گیا ناظم نے اسے سہارا دیا۔ امّی نے دلاسا دیا۔ لیکن وہ تو نیم پاگل ہو گئی تھی اور تین دن کی کشمکش کے بعد موت کے خونیں پنجے اس کے فاروق کو دبوچ لے گئے اور وہ اس بھری پری دنیا کی وسعتوں میں تنہا اور ویران ہو کر رہ گئی بے مقصد ــ بے منزل اس کی زندگی اجڑ گئی۔ اس کی آرزوؤں کے محل منہدم ہو گئے۔ اس کی دنیا میں اذیت کی باد سموم چلنے لگی ــ اور وہ بالکل ساکت، مجسم لاش ہو گئی ــ یوں بھی ہونا تھا ــ قسمت کو ایسا سرپرائز دینا تھا ــ وہ ہسپتال میں ہو یا شرک پر

گھر میں ہو یا بازار میں، بڑبڑانے لگتی۔ ایک دن یوں ہی رو رو کر جب وہ نڈھال ہو گئی تو اسے خیال آیا کہ کیوں نہ اب فاروق کے پاپا کو اطلاع دے دی جائے۔ وہ خود نہ بھی آئے تو دلاسے کا خط تو لکھیں گے۔ اسے ہمیشہ ہی شوہر کے خط سے سکون ملتا تھا۔ چاہے چار سال میں ایک ہی آئے۔ وہ سوچتی ہی رہی دو دن اور گزر گئے اور ہسپتال سے واپس آ کر تھکی تھکی سی صوفے میں گری تو میز پر جانی پہچانی تحریر اور لفافہ۔ دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس نے خوشی سے آواز دے کر فاروق کو بلانا چاہا کہ۔ پھر اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اسے خیال آیا شاید انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ یوں اتنا بڑا ہو کر مر بھی گیا۔ میری منزل میرے کتنے قریب تھی افسوس! ۔ وہ کتنی ہی دیر خط کھولے بغیر سسکتی رہی۔ پھر لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا اور ڈرتے ڈرتے پڑھا پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ الفاظ کو گھورتے گھورتے چکرا کر گر پڑی۔ چند مختصر الفاظ جس نے اس کی بدقسمتی پر آخری مہر لگا دی تھی۔ طلاق نامہ کے ساتھ اس نے مختصر خط میں لکھا تھا:

"چونکہ سیاسی نظریہ پرستی اور اپنی ضد کی وجہ سے تم یہاں نہیں آسکتیں اپنی ذمہ داریوں کے باعث میرے آنے کا بھی سوال نہیں۔ یہاں آنے کے بعد فوجی ملازمت کی وجہ بھی پیش نظر سمجھو۔ ایسے میں تمہیں بلاوجہ اپنے نام کے ساتھ باندھے رکھنا غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی فعل ہے اب تمہیں بالکل آزادی ہے تم باحوصلہ عورت ہو جیسے مناسب سمجھنا زندگی کی راہ متعین کرنا۔"

اس کے تیسرے ہی دن سے وہ ہسپتال داخل ہے۔ پے در پے قسمت کے حملوں نے اسے پندرہ بیس دن میں اس عالم کو پہنچا دیا ہے۔ اس کے دل میں زخم ہیں اس کی آنتوں کا آج صبح تیسرا آپریشن ہوا ہے۔ ہر ڈاکٹر ہر نرس بے حد مستعد ہے۔ مگر وہ کیا کرے وہ جینا نہیں چاہتی۔ بالکل نہیں۔ رات کے اس سناٹے میں لرزتے ہاتھوں سے اس نے اپنے شوہر کو آخری خط لکھا جس میں فاروق کی پیدائش سے مرنے تک سب کچھ لکھا۔ پھر اس نے سوچا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے مرنے کا خط بھی ضرور جائے گا۔ جاننا چاہئے یہ کیسا مزیدار کتنا دلچسپ سرپرائز ہوگا۔ خط بند کرتے ہوئے اس نے سوچا اور اس کے نیلے پڑے ہوئے ہونٹوں پر طنزیہ بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور تب وہ تکیہ میں منہ چھپا کر اتنا روئی کہ جتنا زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی اسکی گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز سے امّی جاگ گئیں۔ انہوں نے گھبرا کر قریب آ کر دیکھا، گلو کو زیلا پایا خط کے بارے میں تاکید سنی اور اس کے کانپتے ہاتھوں سے خط لیتے ہوئے سوچا۔ کاش، باقیوں کی طرح یہ بھی مرجاتی۔ میں اس کے سانس اکھڑنے کا منظر کیسے دیکھوں۔ اور پھر ہسپتال کا سارا عملہ ہی جمع ہو گیا۔ لیکن موت کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ وہ حسرت سے تکتے رہے اور وہ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہتی رہی۔ "ممی یہ کیسا ہولناک سرپرائز ہے۔ یہ کیسا اندھیرا ہے۔ ظالم۔ اوہ ظالم۔ بھیّا ہائے مجھے معاف کر دینا۔ بالکل۔ مم۔ معاف۔ ممّی۔ مجھے۔ جانا ہے علی گڑھ میں جلسہ ہے کانگریس بہت اچھی جماعت ہے۔ مسلم لیگ کنگال ہے۔ مسلم لیگ اچھی ہے۔ فاروق ڈارلنگ میرے گلے سے لگ جاؤ۔ اوہ بھئی۔ ہاں۔ نہیں نہیں نہیں تمہارے پاپا نہیں آئیں گے۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ اندھیرا بڑا دبیز اندھیرا۔ سرپرائز ہولناک سرپرائز۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھے تم چکے بے وفا ہو۔ فاروق ڈارلنگ آجاؤ۔"

اور کہیں گرجے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دھند گہری ہو گئی گھنے درختوں میں چڑیاں شور مچانے لگیں۔ پچھلے پہر کا چاند مغرب میں جانکنی کے عالم میں معلوم ہو رہا تھا۔ مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آئی۔ اس نے آخری بار سحر انگیز آنکھیں پوری کھول کر سب کو دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔ ہواؤں کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ ایک پاکیزہ روح خلا کے پار جا چکی تھی۔ اینگلو انڈین نرس دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی لڑکے کی موت نے اسے مار ڈالا۔ اف زیبا ڈارلنگ تمہاری موت کیسا سرپرائز ہے۔ راور ٹیریبل۔"

لمحہ بیت رہا تھا۔ وقت کا تسلسل جوں کا توں تھا۔ زندگی کو ذرا بھی معلوم نہ ہوا کہ اس قافلہ سے کوئی جدا ہو گیا۔ رات گزر گئی دن طلوع ہو رہا تھا ایک نیا دن۔ یہ سب کچھ نہیں۔ سب سرپرائز ہے۔ زندگی موت۔ سب کچھ۔

حیدر صفی

کمند

اُن دنوں محلے کی تاریک گلی کوچوں میں بانو کا ذکر اسی میٹھے انداز میں ہو رہا تھا جس انداز میں جاڑے کے دنوں میں نرم دھوپ کا ذکر ہوتا ہے۔

حالانکہ بانو ابھی عمر کی اس سرحد پر نہیں پہونچی تھی جہاں ٹھہر کر وہ ایک گہری سانس بھی لیتی تو دیکھنے والوں کے ارد گرد بے شمار خواب لپٹ جاتے۔ لیکن اس ابتدائے بہار میں بھی جب وہ دل کی پیاس کا خوبصورت جوڑا پہن کر اور اپنے کاندھوں پر شفق کا دوپٹہ لہراتی اپنے گھر سے نکل کر اپنی پڑوسن کے گھر جاتی تھی تو یہاں سے وہاں تک دیکھنے والے تمام لوگ اس طرح لمبی لمبی سانس کھینچنے لگتے تھے جیسے فضا میں رچی بسی کسی خوشبو کو اپنی روح میں تحلیل کر رہے ہوں۔

لیکن بانو کے اس بے پناہ حسن کا احساس مجھے کبھی بھی اس شدت سے نہیں ہوا تھا۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بانو میرے پڑوس میں رہتی تھی اور ایک پڑوسی ہونے کی حیثیت سے میں آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اسے دیکھا کرتا تھا۔ آدمی جب کسی چیز کو اپنے قریب سے برابر دیکھتا رہتا ہے تو اس میں واقع ہونے والی کسی تبدیلی پر اس قدر دھیان نہیں دیتا۔ اور چونکہ احساس کا تعلق بھی دھیان سے ہے اس لئے میں بانو کے حسن کو کبھی اس شدت سے محسوس نہ کر سکا تھا۔ میں تو اسے وہی معمولی ناک سنکنے والی بانو سمجھ رہا تھا جو آج تقریباً دس سال سے میرے پڑوس کے کچے مکان میں سکونت پذیر تھی۔

میری انہیں آنکھوں نے بانو کی زندگی کا وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب وہ میرے محلے کے پرائمری اسکول میں بچوں کے ساتھ مل کر پڑھا کرتی تھی اور اسکول سے چھٹی پانے کے بعد سارا سارا دن اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے کولہے پر اٹھائے تیرے میرے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ اس وقت اس کے کپڑے بہت گندے ہوتے تھے۔ اس کے سر میں سر دل دھول بھی رہتی تھی اور وہ ازلی زکام سے بہتی ہوئی اپنی ناک کو انتہائی پھوہڑ انداز میں اپنے جمپر کی آستین سے اس طرح پونچھتی رہتی تھی کہ ایک بار کھانا کھاتے وقت اسے سامنے دیکھ کر میں بے اختیار چیخ پڑا تھا۔

"ماں! بھگا اس مہترانی کے بچی کو میرے سامنے سے!"

جی ہاں! اس وقت کی بانو بھی مجھے یاد تھی۔ اس طرح کی پھوہڑ اور گندی بانو بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ لیکن اس وقت کی بانو مجھے اس لئے یاد رہ گئی تھی کہ ان دنوں وہ میرے لئے بڑا ہی اہم کام انجام دیا کرتی تھی ــــــــــ وہ میرے اور میری محبوبہ کے درمیان کسی وائرلس یا ڈاکیہ کا فرض انجام دیتی تھی۔

پھر میری انہیں آنکھوں نے بانو کے جسم کے گندے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کو صاف ہوکر چست ہوتے بھی دیکھا تھا۔ ان کپڑوں پر شوخ رنگوں کی چھاپ لگتے بھی دیکھا تھا۔ اس کے دھول سے اٹے ہوئے بالوں کو سمٹ سمٹا کر بنگال کی گھنگھور گھٹاؤں کی طرح خطرناک ہوتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے یہ ساری تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلیاں میری نظروں کے سامنے ہو رہی تھیں۔ اور بڑے ہلکے دھیمے انداز میں ہو رہی تھیں اس لئے ان تبدیلیوں پر اتنا غور نہ کر سکا تھا۔

ویسے بھی میرے سابقہ تجربوں نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی تھی کہ کسی لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے پہلے سے کوئی پروگرام مرتب کرنا انتہائی حماقت ہے۔ کیونکہ یہ لڑکیاں تو کسی کی زندگی میں ہمیشہ بن بلائے مہمان کی طرح آتی ہیں۔

جی ہاں! یہ میرا تجربہ ہے۔ اس وقت میری عمر ستائیس سال ہے لیکن اس چھوٹی سی عمر میں بھی مجھے لڑکیوں کے بارے میں بڑے اچھے خاصے تجربے ہوئے ہیں۔ لیکن نہیں۔ ذرا ٹھہرئے! لڑکیاں نہیں بلکہ عورتیں کہئے (ویسے آج کی ہر لڑکی مجھے عورت نظر آتی ہے) کیونکہ میری زندگی میں اب تک جتنی عورتیں داخل ہوئی ہیں وہ تمام کی تمام شادی شدہ تھیں۔ میں ان عورتوں کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں ان کے بارے میں زیادہ کچھ خود بھی نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ عورتیں میری زندگی میں بالکل اچانک طور پر داخل ہوئی تھیں۔ کسی اندھے تیر کی طرح یک بیک۔ یوں جیسے کسی نے سوتے سوتے خواب دیکھ لیا ہو۔ اور اسی لئے ان کے یکے بعد دیگرے اپنی زندگی میں داخل ہونے اور پھر اسی طرح یکے بعد دیگرے اپنی زندگی سے نکل جانے کے بعد میں اپنی زندگی کو ویران نہ سمجھ سکا۔ صرف ایک وقتی بے کیفی ہوئی تھی ——— ایک ایسی بوریت جو نیند سے اچانک ہوشیار ہو جانے کے بعد کسی رنگین خواب کے ٹوٹ جانے سے ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس طرح اچانک اپنی زندگی میں داخل ہوتے دیکھ کر میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ میں یہ بات خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ میری زندگی میں واپس جانے کے لئے داخل ہو رہی ہیں۔ کوئی بھی شادی شدہ عورت جب کسی کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو محض تفریح کی غرض سے۔

بہت ممکن تھا اگر میں خوبصورت ہوتا تو ایسی باتیں نہیں سوچتا۔ باتیں یہی سوچتا مگر ذرا دوسرے انداز سے۔ اک ذرا الٹ پھیر کرکے۔ لیکن میں تو اچھا خاصہ بدصورت آدمی ہوں۔ میرا جسم ہرگز ایسا نہیں ہے جس پر میں خوش ہو سکوں۔ میری ناک چپٹی ہے۔ میری آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ اور چہرا تو اس قدر چیچلا ہے۔ ایسا کالا کلوٹا کہ آج بھی جب کوئی دوست مجھ پر خوش ہوتا ہے، یا مجھ پر ناراض ہوتا ہے۔ تو طنز کا ایک تیر ضرور چھوڑ دیتا ہے۔

"یار تمہارے چہرے پر تو گناہوں کی سیاہی پھیل گئی ہے"۔

اور میں اس ریمارکس کو ہر بار ہنس کر جھٹلا دیتا ہوں۔

"نہیں میرے یار! یہ تو صابن بنانے کا نتیجہ ہے۔ صابن بناتے وقت تیزاب ملی ہوئی جو بھاپ اٹھتی ہے نا اس نے میرے چہرے کو جلا دیا ہے" (جی ہاں! میں گناہ اور ثواب پر قطعی یقین نہیں رکھتا)

ویسے میرے اندر ایک خوبصورتی بھی ہے۔ اور میرا تو خیال ہے میری یہی خوبصورتی میرا سب سے بڑا حسن ہے۔ اور آج کل کی لڑکیوں کو متاثر کرنے کا سب سے کارآمد حربہ۔ جی ہاں! میں اب تک غیر شادی شدہ ہوں۔ صرف کنوارا ہی نہیں بلکہ ایک ایسا نوجوان جو میٹرک پاس کرنے کی تیاری کے ساتھ ساتھ صابن بنا کر بڑے اچھے خاصے پیسے کما لیتا ہے۔

ہاں تو میں بانو کی بات کر رہا تھا۔ اس درمیان میرے تجربوں کی بات نکل آئی اور پھر کمائی کی۔ اور وہ بھی اس لئے کہ مجھے توی امید تھی کہ اگر کچھ نہیں تو میرے اس غیر معمولی حسن سے (جی ہاں! میری کمائی) متاثر ہو کر بانو بھی ایک نہ ایک دن بن بلائے مہمان کی طرح میرے دل کے خالی دروازے

پرونک دینے چلی آئے گی۔

اور اسی لئے ایک دن جب میں اپنے گھر سے اپنے کھیت کی طرف آرہا تھا تو اس پتلی سی گلی سے گزرتے وقت بانو کو اس کے گھر کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنا شوخ رنگوں والا چھپرا ہر بانس کے پیڑ پر پھیلانے کے لئے آگے بڑھی تو میں نے ذرا کی ذرا ٹھہر کر ادھر اُدھر دیکھا پھر اس کے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو میں اک زور کی چٹکی بھرلی۔

"ہائے۔"

بانو بل کھائی ہوئی ناگن کی طرح یک بیک یوں پلٹی جیسے ابھی ڈس لیگی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھ پر نظر پڑتے ہی رک گئی۔

"شیطان کہیں کے۔"

"وہ تو میں ہوں۔" میری ایک انگو شرارت سے پھڑک اٹھی۔ "تو تو بچپن سے جانتی ہے میں کتنا بڑا شیطان ہوں۔"

لیکن میری اس شرارت کا بانو نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ بس کچھ اس طرح شرما کر رہ گئی۔ جیسے اس کے بچپن کا ایک ایک لمحہ ننگی تصویر بن کر اس کے سامنے سے گزر گیا ہو۔ ذرا دیر بعد اس نے بس ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر آپ ہی آپ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی کہ میرا پرانا تجربہ جیسے کسی پاگل کی طرح چلا اٹھا۔

وہ پھنسی!

اس روز میں بڑی دیر تک گنگناتا رہا تھا۔ بات بات پر قہقہہ لگاتا رہا تھا۔ تیر نشانے پر لگ جائے تو آدمی کیسا خوشیوں کا فوارہ ہو جاتا ہے۔ اس دن ماضی کا ایک ایک لمحہ میری نظروں کے سامنے سمٹ آیا تھا۔ بانو کے وہ مخصوص اشارے جن کے ذریعہ وہ مجھے میری محبوبہ کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ میری محبوبہ کے نام میرا خط لیتے وقت کی وہ پرمعنی سی مسکراہٹ جو یوں تو دیکھنے پر بس ایک معمولی سی مسکراہٹ نظر آتی ہے ـــــــ ایک معصوم بچی کی بھولی بھالی مسکراہٹ ـــــــ لیکن جس کے پیچھے ایک بھرپور عورت کے تمام تجربات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے ملاپ کے وقت چاروں اور کسی چوکنی ہرنی کی طرح اپنے کان کھڑے رکھنا اور ہمیں ہر آنے والے خطرے سے ہر وقت آگاہ کرنا ـــــــ!

اس دن یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آرہی تھیں۔ اور جیسے جیسے یہ باتیں مجھے یاد آرہی تھیں ویسے ویسے مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ مجھے اپنے تجربات پر غصہ آرہا تھا۔

آخر میں نے اس وقت تک بانو کی طرف توجہ کیوں نہیں دی تھی؟

بانو تو اب سے بہت پہلے جوان ہو چکی تھی!

اس دن کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں جب بھی اپنے گھر سے نکل کر اپنے کھیت کی طرف آتا تو اس پتلی سی گلی سے گزرتے وقت ہلکے سروں میں کچھ گنگنانے لگتا تھا۔ سیٹی بجانے لگتا تھا۔ یا نہیں تو پھر زور زور سے کھانسنے لگتا تھا اور بانو میرے اس اشارے پر گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکنے یا اپنی سفید بکری باندھنے یا نہیں تو پھر بند دروازے کو دوبارہ بند کرنے کے لئے باہر ضرور نکلتی تھی۔ اور ایسے میں جب کبھی بھی میری شریر انگلیاں اس کے جسم کے کسی حصے کو چھیڑ دیتی تھیں اور بانو اس چھیڑ خانی سے بچنے کے لئے شاخ گل کی طرح لچک جاتی تھی تو اس لچک کے دوران اس کی آنکھوں میں جو چمک لہراتی تھی۔ میں اس کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یوں سمجھئے جیسے لانبی لانبی پلکوں کی گھنی چھاؤں تلے کوئی خواب انگڑائی لے رہا ہو۔ ایسا خواب جسے صرف جاگتی آنکھیں دیکھتی ہیں اور جس خواب کی تعبیر کی تلاش میں قدم آپ ہی آپ بہک جاتے ہیں۔

مجھے بھی یقین تھا کہ بانو کے بہکے ہوئے قدم ایک نہ ایک دن اسے خود میرے دروازے تک کھینچ لائیں گے۔ آنکھوں کے دوار کھل جائیں تو دل کی دنیا لٹتے کتنی دیر لگتی ہے؟

انہیں دنوں کی بات ہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ بانو اور میرے درمیان کا فاصلہ بڑی تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ پہلے نگاہوں سے دل کی باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب ان باتوں کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ہاتھوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور اب صرف ایک گلی رہ گئی تھی جو کسی وقت بھی لپک کر پار کی جا سکتی تھی۔

لیکن اس سے قبل کہ میں وہ گلی بھی پار کر ڈالتا میرے ایک دوست ہی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ ایسا مضبوط پھندا کہ آج بھی جب میں اس کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

میرا وہ دوست میرے گھر سے تقریباً دو میل دور ایک دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ وہ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ لڑکپن میں ہم نے ایک ساتھ ہی اسکول میں داخلہ لیا تھا اور میٹرک کا امتحان بھی ایک ساتھ ہی دیا تھا اور نتیجہ کے طور پر وہ اب تیسرے سال کا طالب علم تھا اور میں تین سال سے مسلسل میٹرک پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تعلیم میں اتنا طویل فاصلہ قائم ہو جانے کے بعد بھی ہماری دوستی آج بھی اسی سطح پر تھی جہاں ابتدائے تعلیم میں تھی۔ اور اسی لئے اب بھی جب وہ میرے گھر سے تھوڑی دور پر واقع کالج میں پڑھنے آتا تھا تو فرصت کی ایک گھنٹی بھی وہاں ضائع نہیں کرتا تھا بلکہ اس ایک گھنٹی کے لئے بھی وہ سیدھا میرے ہاں چلا آیا تھا۔ اس درمیان میں وہ یا تو اپنا کوئی تازہ افسانہ سناتا رہتا تھا یا پھر یونہی فضول گپ لڑاتا رہتا تھا۔

لیکن نہیں۔ ذرا ٹھہریئے۔ یہاں شاید میں غلطی کر رہا ہوں۔ فضول گپ لڑانا نہیں۔ کیونکہ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ اس کے اس طرح گپ لڑانے کو میں فضول سمجھتا تھا۔ یہ حقیقت تو مجھ پر بعد میں واضح ہوئی تھی کہ اس طرح روزانہ آکر اور میرے خیالوں کے مطابق فضول گپ لڑا کر اس نے اپنے لئے بڑے کام کی باتیں کر ڈالی ہیں۔

جی ہاں! وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے اور اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ کیونکہ اس دن کو میں جب بھی یاد کرتا ہوں تو میرا چہرہ راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

اس دن بھی میرا دوست فضول باتیں ہی کر رہا تھا۔ لیکن اسی طرح باتیں کرتے کرتے جب اس نے کہا۔ "یار مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے"۔ تو میں یوں چونک اٹھا تھا جیسے کھولتے ہوئے صابن کا کوئی چھینٹا میرے چہرے پر پڑ گیا ہو۔ "نہیں"۔ خدا جانے بغیر سوچ سمجھے یہ لفظ میرے منہ سے کیسے پھسل پڑا تھا۔

"ہاں"۔ اس کے ہاں میں میرے "نہیں" سے کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ "دیکھو نا ایک دن بھی یہاں نہیں آتا اور یہاں آکر اسے ایک نظر دیکھ نہیں لیتا تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ خدا کی قسم میں بانو سے بڑی شدید محبت کرنے لگا ہوں"۔

اس "شدید" پر مجھے ہنسنا نہیں چاہیئے تھا لیکن مجھے پھر بھی ہنسی آگئی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ اپنی شدید محبت کا اظہار اس شخص کے سامنے کر رہا تھا جس کے متعلق وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں خود تالاب میں بنسی ڈالے بیٹھا ہوں۔ اور یہی نہیں بلکہ مچھلی اب تو چارے پر بھی چڑھ آئی ہے اور اب بنسی نکلنے سے پہلے شرارت سے دم مار مار کر اس سے کھیل رہی ہے (ارے ہاں میں شاید یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ اس وقت تک میرے اور بانو کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور جن میں سے اکثر خطوط میں اپنے دوست کو بھی دکھا چکا تھا) اب ایسی صورت میں آپ ہی کہئے، میرا دوست بانو سے محبت کرنے لگے اور محبت ہی نہیں بلکہ شدید محبت کرنے لگے تو مجھے اس "شدید" پر ہنسی نہیں آئے گی!

لیکن پھر بھی میں نے اپنے دوست کی اس شدید محبت کا اس وقت بالکل مذاق نہیں اڑایا اور نہ ہی اس کا کوئی جواب دیا۔ چونکہ میں بانو سے خود محبت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے کسی رقیبانہ جذبے کو اس شدت سے محسوس نہیں کر سکا۔ دوسرے مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ میرے دوست کی محبت صرف ایک طرفہ آگ ہے اور جب دوسری طرف سے اس کا جواب بالکل سرد انداز میں ملے گا تو یہ آگ خود بخود بجھ جائے گی۔

اس لئے میں نے اپنے دوست کا دل نہیں توڑا۔ بلکہ اس کے مشورے سے اور حرف بحرف اس کے کہنے کے مطابق اپنے اگلے خط میں اس بات کا ذکر کر دیا کہ میرا دوست اس کو چاہنے لگا ہے۔ اور بالکل پاگلوں کے انداز میں چاہنے لگا ہے۔ اور وہ صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہر روز دو میل کی لمبی مسافت طے کرکے یہاں آتا ہے۔

اور پھر اس خط کا جو جواب آیا تھا۔ اس کے متعلق آج بھی سوچتا ہوں تو کمرے سے نکل کر خواہ مخواہ برآمدے میں چکر لگانے لگتا ہوں۔ بانو کے جواب نے تو میرے سارے تجربات جھٹلا کر رکھ دئے تھے۔ اس دن شاید زندگی میں پہلی بار میری اس خوش فہمی کو شدید دھچکا پہنچا تھا کہ میرا غیر شادی شدہ ہونا ایک بہت بڑا حسن ہے۔ کیونکہ میرا دوست شادی شدہ تھا۔ اور اس بات کو بانو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس خط کا جواب ——؟

بانو نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ خود بھی تو میرے دوست کو بے پناہ چاہتی ہے اور اسی شدید انداز میں چاہتی ہے جس انداز میں میرا دوست اس کو چاہتا تھا۔

اس دن میں نے اپنے دل میں بانو کے لئے بے پناہ نفرت کا جذبہ محسوس کیا تھا اور کچھ ایسا ہی جذبہ میں نے اپنے دوست کے لئے بھی محسوس کیا تھا۔

بات یہ تھی کہ اس دن سے پہلے میں اپنے دوست کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتا تھا اور دل ہی دل میں اس کا بے پناہ احترام کرتا تھا کیونکہ بچپن سے لے کر اس وقت تک میرا دوست خطرناک حد تک خوبصورت ہوتے ہوئے بھی (جی ہاں اس کی خوبصورتی کو خطرناک کہا جا سکتا ہے) ہمیشہ اپنے کیریکٹر کی بلندی کا ثبوت دیا تھا۔ اور شادی کے بعد تو اس کے کردار میں اور بھی پختگی آ گئی تھی۔ اور اس کا یہ دعویٰ حرف بحرف درست ہوتا آ رہا تھا کہ وہ صرف اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی بیوی اس کے خیالوں کی طرح خوبصورت نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی روح کی مالک ہے۔ لیکن اس دن — اس دن تو جیسے اس نے اپنے کردار کی ساری بلندی کو کسی نالے میں رستے ہوئے گندے میل کی طرح بہا دیا تھا —— اس دن مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ میرا دوست بھی ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ اس کا بھی صرف چہرا خوبصورت ہے۔ ورنہ دل میری ہی طرح سیاہ ہے۔

جی ہاں! میں اعتراف کرتا ہوں۔ میرا دل میرے چہرے کی طرح سیاہ ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں آنے والی تمام عورتوں کے لئے بس چند جملے رٹ لئے ہیں۔

محبت انسان کی پہلی عبادت ہے۔

مجھے تم سے محبت ہے۔

تم اور صرف تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔

لیکن نہیں۔ میرے دوست کے دل کی سیاہی شاید میرے مقابلے میں زیادہ گہری تھی۔ میں تو پھر بھی غیر عورتوں کو دھوکا دیتا تھا ایسی عورتوں کو جو خود اپنے آپ کو دھوکا دیکر میرے قریب آتی تھیں۔ ان عورتوں کو جن کے لئے میرے دل میں کوئی احترام نہیں تھا جن کی میری نظر میں کوئی عزت نہیں تھی۔ لیکن میرا دوست تو اس عورت کو دھوکا دے رہا تھا جو اس کے قول کے مطابق اس کی زندگی تھی۔ جس کی سچی اور بے لوث محبت نے اس کی روح میں اجالے کا رنگ بھرا تھا۔ اپنی اس شریک حیات کو جو اس کے کہنے کے مطابق اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

اس لئے اس دن میں نے اپنے دل میں بانو کے ساتھ ساتھ اپنے دوست کے لئے بھی نفرت کا بے پناہ جذبہ محسوس کیا تھا۔ لیکن اس نفرت کے ساتھ ہی مجھے اس بات پر حیرت بھی تھی۔ آخر اپنا بھرم گنوانے کے لئے اس نے بانو کا انتخاب کیوں کیا۔ اس کے ایک اشارے پر سینکڑوں کھڑکیاں کھل سکتی تھیں۔ اور پھر بانو کے متعلق تو اس نے کئی بار میرے سامنے اس درجہ نفرت کا اظہار کیا تھا کہ میں غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے پہلے پہل جب میں نے اپنے اور بانو کے تعلقات کا ذکر اس سے کیا تھا تو وہ اتنے زور سے قہقہہ لگانے لگا تھا کہ اگر کوئی باہر سے سنتا تو سمجھتا اندر کوئی پاگل بند ہے۔ پھر قہقہوں کی بارش تھمی تھی تو اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا تھا

"آدمی کا ذوق لاکھ گھٹیا سہی۔ لیکن معیار نظر اس قدر تو نہ گرنی چاہیے۔ بانو بھی کوئی لفٹ دینے کی چیز ہے۔"

میں نے اسی پرانے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

"میں لفٹ دے کہاں رہا ہوں۔ میں تو لفٹ لے رہا ہوں۔ بس چند دنوں کے لئے۔"

"اچھا" اس کے قہقہوں کی پرواز بدستور قائم رہی۔ "تو پھر دن میں تین چار بار لکس صابن سے منہ دھویا کرو۔ کچھ نہیں تو کم از کم اس بنگالی چھوکرے سے خوبصورت تو ہو ہی جاؤ گے جو آج کل اپنی ساری تنخواہ بانو کے بھائی پر لٹا رہا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں واقعی تھوڑی دیر کے لئے لاجواب ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ ان دنوں ایک بنگالی لڑکا کارخانے کی ساری تنخواہ بانو کے بھائی پر لٹا رہا تھا۔ اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے اپنی کمائی لٹانے میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کو میں بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا اپنی صلاحیت پر بھروسہ تھا اور اپنے تجربات پر یقین تھا اس لئے میں نے اپنے دوست کو بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"محبت اور جوانی دونوں اندھی ہوتی ہے۔ اور اندھا کبھی دور نہیں جاتا۔ وہ تو اپنے پاس کے پتھر کو بھی پھول سمجھ کر ٹٹولتا رہتا ہے۔"

لیکن شاید میری یہ بات میرے دوست کی الٹی کھوپڑی میں نہیں اتری۔ کیونکہ اس کے بعد بھی اسے جب بھی موقعہ ملتا وہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی بات ضرور کہتا۔ کبھی بدنامی کا خوف، کبھی امتحان میں فیل ہو جانے کا ڈر اور کبھی صرف نصیحتیں۔ آخر جب اس کے اس طرح دن رات سمجھاتے سمجھاتے رہنے کے باوجود میں بانو کی طرف اسی تیزی سے بڑھتا رہا تو پھر مجبوراً اس نے اپنی محبت کا وہ کمزور صفحہ کھول ہی دیا تھا جس کا پیش لفظ وہ نصیحتوں کی صورت میں اب تک سناتا آ رہا تھا۔

اس دن مجھے بانو کی طرف بڑھنے سے روکنے کا سارا جذبہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ میرا دوست کتنا بڑا فراڈ ہے؟

اور اسی لئے اس کی محبت کے جواب میں بانو کا جو تصدیقی جواب آیا تھا اس کے خلاف میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی اس کے سامنے اپنی اس بے پناہ نفرت کا اظہار کیا تھا جو میرے دل کے گوشے گوشے میں اچانک انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھی۔ بلکہ اپنے سینے میں ابھرنے والے تمام جذبوں کو مار کر ہونٹوں پر صرف مسکراہٹ کا رنگ جما لیا تھا۔ دراصل میں اپنے دوست اور بانو کی اس محبت کا ایک ایسا منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا کہ وہ دونوں زندگی بھر اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے سسکیاں بھرتے پھریں (جی نہیں! میں کھٹے انگور کی بات نہیں کرتا اور نہ ہی کھسیانی بلی ہوں)

اس دن کے بعد میں نے بانو کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی ترک کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے والد سے لڑ جھگڑ کر اور اسٹڈی کا بہانہ کر کے اپنے کھیت کے نکڑ پر بانو کے پچھلے دروازے کے عین سامنے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بھی بنوالی اور پھر اس کی دو کنجیاں بنوا کر ان میں سے ایک کنجی اپنے دوست کو یوں بخش دی جیسے کوئی بادشاہ کسی کی محبوبانہ ادا سے خوش ہو کر اسے جاگیر بخش دیتا ہے۔

اس روز کے بعد میرے دوست اور بانو کے درمیان کی بہت ساری دشواریاں دور ہو گئی تھیں۔ اب نہ تو میرے دوست کو بیچ میدان میں کھڑے ہو کر بانو کو اشارہ کرنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی ملنے ملانے کے لئے کسی جگہ کے انتخاب کی مشکل باقی رہ گئی تھی (جی ہاں! میں یہی چاہتا تھا)

اس کے بعد دو ہفتے کا طویل عرصہ بس یونہی گذر گیا۔

اس درمیان سوائے اس کے کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی کہ میرے دوست نے بانو کے نام درجنوں خطوط لکھ ڈالے تھے۔ ان خطوں میں تھوڑی بہت

تبدیلی کے بعد بس ایک ہی بات پر زور دیا گیا تھا۔

محبت انسان کی پہلی عبادت ہے۔

لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اس عبادت کی طوالت اب اس سرحد کو چھونے لگی ہے جہاں سے انتہائی بوریت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دوست کی خاطر جو جھونپڑی بنوائی تھی اور جس پر اپنے روپے خرچ کئے تھے وہ اس لئے ہرگز نہیں تھی میرا دوست وہاں بیٹھ کر بانو کو پر لطف اشارے کرے یا اس کے نام محبت بھرے رنگین خطوط لکھے۔ جی نہیں! میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح بانو کو ایک بار اس جھونپڑی میں بلوا لے اور بس!

اس بات کا اظہار میں نے ڈھکے چھپے طریقے سے کئی بار اپنے دوست کے سامنے کیا۔ اسے کتنے ہی قیمتی مشورے دیئے۔ لیکن وہ تو ایک نمبر کا گدھا تھا۔ خواہ مخواہ ایک معمولی سی بات کو طول دئے جا رہا تھا۔

آخر ہار کر میں نے ایک نئی چال چلی۔

ارے ہاں! میں شاید یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ ان کے خطوط ایک دوسرے تک میں ہی پہونچاتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے اپنے دوست سے کہا تھا۔ میں نے اس کی دوستی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے اور ایک وفادار دوست کی طرح اس کی اس محبت کو اپنے ہاتھوں سے پروان چڑھاؤنگا۔ (جی ہاں! ان دونوں سے باخبر رہنے کا یہی ایک ذریعہ تھا)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ آخر ہار کر میں نے ایک نئی چال چلی۔ اس روز کے بعد میں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا کوتاہی برتنی شروع کر دی۔ میرا دوست جب بھی میرے پاس آتا تو میں خود کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہاں سے کھسک جاتا۔ وہ مجھے پہونچانے کے لئے خط دیتا تو میں کوئی وجہ بتا کر ٹال جاتا۔ میں جانتا تھا۔ میرا دوست اس میدان میں بالکل کورا تھا۔ وہ بزدل تھا۔ اور ابھی اس کے اندر اتنی ہمت نہیں آئی تھی کہ میری مدد کے بغیر وہ بانو تک اپنا خط پہونچا سکے یا میری غیر موجودگی میں اسے اشارہ ہی کر سکے۔

چند دنوں تک ان دونوں کو اسی طرح تڑپاتے رہنے کے بعد اور اپنے خیالوں کے مطابق ان دونوں کو سخت سزائیں دینے کے بعد ایک دن جب میرا دوست آیا اور میں نے اس کا مسکین چہرا دیکھا تو مجھے یک بیک ہنسی آگئی۔ محبت کا بھوت اچھے اچھوں کو اُلّو بنا دیتا ہے۔

"اب کیا خیال ہے میاں مجنوں؟" میں نے پوچھا۔ "زندگی بھر اس کی تحریر ہی سے محبت کرتے رہو گے یا اسے پاس بھی بلاؤ گے"۔

لیکن میرا دوست کچھ بھی نہ سمجھا اور بدستور اُلّو کی طرح میرا منہ تکتا رہا۔

"یہ سب ڈھکوسلا چھوڑو اور اگر محبت ہی کرنا چاہتے ہو تو اپنے بل پر کرو۔ آخر تم دونوں کب تک میرے محتاج رہو گے؟" میں نے یہ بات بالکل اس انداز میں کہی جیسے اس کا سب سے بڑا اور سب سے مخلص دوست ہوں۔

میرے دوست کو شاید میرے خلوص پر یقین آگیا۔ اس نے پوچھا۔

"میں کیا کروں ——— ؟"

"کچھ نہیں" میں نے رنگ جمتے دیکھ کر جھٹ جواب دیا۔ "تم اسے بس ایک بار اس جھونپڑی میں بلا لو۔ (جی ہاں! جھونپڑی پر خرچ کئے ہوئے میرے پیسے ضائع ہو رہے تھے)

"جھونپڑی میں ——— !"

"ارے ہاں ———" اس کے استعجاب پر میں نے جھٹ عیاری کا پردہ ڈال دیا۔ "اس سے مل کر تم خود سارے معاملات طے کر لو۔ میرا خیال ہے بانو تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہے۔ وہ خود کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ضرور بتا دیگی کہ آئندہ تم میری مدد کے بغیر بھی اپنی محبت کو پروان چڑھا سکو۔"

میرے دوست نے میری اس رائے پر اپنا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا جب اب خود بھی اس سے کچھ اور سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اگر میں اپنے دوست کے سامنے اس طرح کھری کھری باتیں نہ کہتا اور اپنے کو ناراض ظاہر نہ کرتا تو دوسرے ہی دن سے پھر خط و کتابت کا وہی لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا، کیونکہ میرے دوست کے نزدیک یہ تجربہ نیا تھا اور اس کے رومانی جذبے کی تسکین کے لئے کافی تھا۔

اپنے دوست کی محبت کی اس طوالت سے اکتانے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میرے دوست اور بانو کے تعلقات کا ذکر سرگوشیوں میں محلے والوں کی زبان پر بھی ہونے لگا تھا۔ لیکن بالکل سرگوشیوں کے سے انداز میں اس لئے مجھے اس کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی۔ مجھے فکر تو اس بات کی تھی کہ جوان لڑکی کے گھر والوں کے تو کان بجتے ہیں۔ کہیں یہ سرگوشی اس کے گھر والوں تک نہ پہونچ جائے۔ بانو کی منگنی تو کب کی ہو چکی تھی پھر جھٹ پٹ بیاہ ہوتے کتنی دیر لگتی؟

اس دن میرے دوست کا خط بانو کے پاس نہیں گیا۔ بلکہ میرا خط گیا۔ حالانکہ تحریر میرے دوست ہی کی تھی۔ لیکن اس خط کا ایک ایک لفظ میرا تھا۔ اس خط میں الٹ پلٹ کر بس ایک ہی بات پر زور دیا گیا تھا۔

میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔

جیسے بھی ہو بس ایک منٹ کے لئے مل لو۔

میں تنہائی میں تم سے ایک بے حد ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔

میں یہ خط لکھوا کر مطمئن تھا۔ میں جانتا تھا۔ عورت ویسے ہی کم عقل ہوتی ہے۔ ضروری بات کا جھانسہ بانو کو مقناطیس کی طرح کھینچ لائے گا لیکن خدا بھلا کرے میرے ڈرپوک دوست کا۔ میرا خیال ہے جتنا خوف بانو نہیں کھاتی تھی۔ اس سے زیادہ خوف وہ خود کھاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود اس نے خط کے آخیر میں ایک دم چھلا لگا دیا تھا۔

ملنے کے سلسلے میں احتیاط برتنا۔ کہیں جلد بازی میں تمہاری بدنامی نہ ہو جائے۔

اس جملے کے لئے میرے دوست سے کافی بحث ہوئی۔ میں کہتا تھا یہ لکھنا بالکل فضول ہے۔ وہ کہتا تھا اس میں بے پناہ اپنایت ہے۔ آخر میں خود ہی خاموش ہو گیا۔ ویسے بھی میرے دوست نے میری بہت ساری باتیں مان لی تھیں اور پورا خط میری مرضی کے مطابق لکھا تھا اس لئے مجھے بھی مجبوراً اس کی بات مان لینی پڑی۔

وہ رات مجھے آج بھی یاد ہے۔

وہ رات شاید چودھویں کی رات تھی۔ کیونکہ چاند کا چہرہ کسی جوان عورت کی طرح بھرپور تھا۔ میرا دوست بیچ کھیت، چاندنی میں کھڑا تھا اور میں خود ایک اندھیرے کنج میں بیٹھا تھا رجی ہاں! کمین گاہ میں) کوئی پتہ بھی کھڑکھڑاتا تو ایسا لگتا جیسے ہواؤں کے دوش پر بیٹھی ہوئی بانو چلی آ رہی ہے۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو جاتی تھیں۔ میرا دوست ٹھیک میری ہدایت کے مطابق ہر چوتھے منٹ پر کھانستا کھنکھارتا ہوا پورے بگان کا چکر لگا لیتا تھا۔ اس چاندنی کے باوجود اپنی چھوٹی سی ٹارچ بار بار جلا کر اپنی موجودگی کا اشارہ کرتا تھا۔ لیکن بانو نے جیسے کچھ نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اتنی بڑی ہو کر بھی وہ شاید یہ نہ سمجھ پائی تھی کہ رات کے سناٹے میں اور بھری چاندنی میں جب کسی جوان لڑکی کے گھر کے پیچھے کوئی ٹارچ جل اٹھے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ٹارچ نہیں بلکہ کسی کا ارمانوں بھرا دل جل رہا ہے۔

آخر اسی طرح جلتی آنکھ اور دھڑکتا دل لئے ہم رات گئے تک جاگتے رہے۔ میرا دوست اجالے میں اور میں اندھیرے میں۔ لیکن بانو نہیں آئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے رات کا تیسرا پہر ڈھل گیا۔ لیکن بانو نہیں آئی۔

آسمان پر تھکے ماندے ستاروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ لیکن بانو نہیں آئی۔

آنکھوں آنکھوں میں ساری رات بیت گئی۔ لیکن بانو نہیں آئی۔

اور پھر عین صبح کے وقت جب پارتی پور سے آنے والی ٹرین اپنی بھیانک آواز سے سونے والوں کو جگانے لگی تو میرا دوست یہ کہکر واپس چلا گیا کہ وہ پارتی پور کا بہانہ کرکے گھر سے آیا تھا اس لئے اب مزید نہیں ٹھہر سکتا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد بھی میں بستر پر یونہی پڑا رہا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا —— جھوٹ موٹ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ لیکن نیند کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ دل میں آگ لگی ہو تو آنکھیں صرف سلگنا جانتی ہیں بند ہونا نہیں!

اس شام جب میرا دوست آیا تو میرا چہرہ کچھ بیداری اور کچھ غصّے کی وجہ سے بھرایا ہوا تھا۔ مجھے اپنے دوست کی بزدلی پر غصّہ آ رہا تھا جس نے خط کے آخر میں بدنامی کا احساس دلاکر خوامخواہ بانو کے اندر بزدلی کا احساس بیدار کر دیا تھا۔ مجھے غصّہ اس بانو پر آ رہا تھا جو اس قدر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اس رات گھر سے قدم نہیں نکال سکی تھی۔

لیکن اس کے برعکس میرے دوست کے چہرے پر ایسا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کا چہرہ کسی جھیل کی طرح پرسکون تھا اور اس پر بے پناہ تازگی تھی۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے یہاں سے جانے کے بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ سارا وقت لمبی تان کر سوتا رہا ہو۔

اس وقت پہلی بار میرے جی میں آیا کہ میں اپنے دوست کے اس تر و تازہ چہرے پر صابن میں استعمال ہونے والا تیزاب چھڑک دوں۔ سالا بیوی رکھ کر دونوں طرف سے فائدہ اٹھا رہا تھا —— بانو نہیں آئی تھی تو کیا ہوا گھر پر بیوی کے پہلو تو گرم تھے۔

اسی شام مجھے اپنے دوست کے نام بانو کا ایک جوابی خط ملا تھا۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ آنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔

اور اس "موقعہ" نے جیسے سچ مچ میرے تن بدن میں تیزاب چھڑک دیا تھا۔ اور غصّے میں میری نظر جتنی بار بھی بانو کے گھر کی طرف گئی تھی میری زبان سے صرف گالیاں ہی ابلی تھیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بانو اپنی پڑوسن کے ہاں بیٹھی رات گئے تک کشیدہ کاری میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے ساتھ مل کر پہروں دھاچوکڑی کیا کرتی تھی۔ اب ایسے میں اگر وہ ملنے کے لئے گھڑی دو گھڑی کی خاطر موقعہ کا بہانہ تراشے تو غصّہ کیسے نہیں آئیگا؟

میں نے اس روز وہ خط اپنے دوست کو نہیں دیا۔ بلکہ بانو کو دکھاکر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

اس دن کے بعد تقریباً ہفتوں تک میرے دوست اور بانو کے درمیان کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی حالانکہ میرے دوست نے کئی بار مجھے خط لکھکر دیئے۔ لیکن میں نے ہر بار یہ کہکر خط پھاڑ ڈالا

"میں بانو کو اس بار ایسا سبق دینا چاہتا ہوں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔ آخر وہ اپنے کو سمجھتی کیا ہے؟"

اور یہ حقیقت ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد میں محسوس کرنے لگا کہ اس سبق نے بانو پر واقعی خاطر خواہ اثر کیا ہے۔ بے رخی کے اس احساس نے اس کے اندر ایک نئی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ وہ دن میں کئی کئی بار اپنے گھر سے نکل کر اپنی پڑوسن کے گھر جانے لگی تھی اور اس طرح جب بھی جاتی تھی تو اپنی لانبی اور مخروطی انگلیوں کو فضا میں لہراتی ہوئی جیسے اشاروں کی ایک لکیر کھینچتی چلی جاتی تھی۔

"مجھے اب تک خط کیوں نہیں لکھا؟"

میں اس کی اشاروں بھری یہ تحریر پڑھتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی میں چونکہ اپنے دوست سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا اور خاص کر ان سب معاملوں میں اس سے زیادہ تجربہ کار تھا اس لئے بانو کے ان بہکتے ہوئے اشاروں سے بے چین نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ان کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی ہر بار اس انداز میں منہ پھیر لیتا تھا جیسے اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

یہ انہیں دنوں کی بات ہے۔

اس شام میں اپنے کنوئیں پر بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔

بانو اس وقت اپنے دروازے پر کھڑی اپنی بکری کو آنگن میں لے جانے کے لئے خواہ مخواہ مار رہی تھی اور میں بانو کی اس ادا پہ جیسے سر سے پاؤں تک سلگ رہا تھا۔ آج کل کی لڑکیاں تریا چلتر میں کس قدر آگے بڑھ گئی ہیں۔ دراصل بانو بکری کو مار کم رہی تھی اور چلا زیادہ رہی تھی۔ جھوٹ موٹ کی جھنک پٹک ادھر میرا دوست اس کی جھنک پٹک کا مطلب مجھے ٹھونکے دے کر سمجھا رہا تھا۔ وہ بات میں خط لئے بار بار مجھے دق کر رہا تھا کہ میں اس کا خط بانو تک پہونچا دوں ——— میں تھوڑی دیر تک تو یہ تماشہ خاموشی سے دیکھتا رہا پھر کچھ تو غصّے سے اور کچھ بانو پر غصّہ جتانے کی غرض سے میں نے اپنے دوست سے خط لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں بکھیر دئے۔

میں نے محسوس کیا کہ میری اس حرکت سے بانو جیسے بلبلا اٹھی۔ وہ کسی قصائی کی طرح اپنی بکری کو گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی اور دروازہ بند کر کے بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اپنا تیر یوں نشانے پہ لگتے دیکھ کر میں آپ ہی آپ مسکرا اٹھا تھا۔ جنون اس حد تک کو چھونے لگے تو عورت آنکھ بند کر کے آگ میں کود جاتی ہے۔

لیکن میری اس حرکت سے شاید میرے دوست کے دل کو ناقابل برداشت صدمہ پہونچا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ غصّے کے تمام زہر کو اندر ہی اندر گھونٹ کر صرف منہ پھلائے اپنی سائیکل اٹھائی تھی اور ر زندناتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے خود بے حد افسوس ہوا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور رکتا تو میں اسے اپنی اس حرکت کا انفرادی نقطہ سمجھا دیتا۔ یا نہیں تو پھر دوسرا خط لکھوا کر ضرور پہونچا دیتا۔ کیونکہ اپنے خیال کے مطابق میں انہیں کافی سزائیں دے چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ کچھ بھی ہو وہ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ اور پھر اب تو اسی میں اپنی غرض بھی پوشیدہ تھی (جی ہاں! بانو پہ ہات ڈالنے کے لئے اب سوائے اس کے اور کون سا سہارا باقی رہ گیا تھا)

اس دن میں رات گئے تک اسے تلاش کرتا رہا۔

اس کے گھر پہ

ستارہ ٹیلرنگ ہاؤس میں۔

لائٹ سینا کے پاس۔

کتاب مرکز میں۔

غرض جہاں جہاں اس کے ملنے کی امید تھی میں اسے تلاش کرتا رہا۔ لیکن اس سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ آخر ہار پچھتا کر گھر واپس لوٹا تو اپنے کمرے میں اسے بیٹھے دیکھ کر میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

"صفدر ———"

"ہاں بیٹے صفدر"۔ اس کے لہجے کی مٹھاس بدستور قائم تھی "میں تمہاری طرح کٹھور نہیں ہوں۔ کچھ بھی ہو تم میرے دوست ہو اور مجھے تمہاری دوستی ہر حال میں عزیز ہے"۔

لیکن اس وقت دوستی کا یہ لفظ میرے تن بدن میں چنگاریوں کی طرح اڑتا چلا گیا تھا اور میرے ہونٹوں پر ایک بڑی ہی زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس دنیا میں خود غرضی پر کس خوبصورتی سے دوستی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اپنے روٹھے ہوئے دوست کے اس طرح بن منائے واپس لوٹ آنے اور پھر سارے غصّے کو دھو کر اس طرح پر خلوص دوستی جتانے میں جو جذبہ کارفرما تھا میں اسے خوب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور اسی لئے مجھے دکھ بھی ہوا تھا لیکن اس سلسلے میں میں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

دوسرے دن صبح میرے دوست نے بانو کے لئے ایک بڑا ہی مختصر خط دیا۔

بانو!

آج تمہارے ابا کی رات ڈیوٹی ہے اس لئے مل لو۔

ایک بہت ضروری کام ہے۔

اس خط کو سنسر کرتے وقت میں بڑا جھلایا (جی ہاں! میرے دوست کا کوئی خط بغیر میرے سنسر کے بانو تک نہیں پہونچتا تھا) دراصل میں چاہتا تھا کہ اس وقت جب کہ وہ ہفتوں کے طویل انتظار کے بعد خط لکھ رہا تھا تو کوئی بھرپور قسم کا خط لکھے۔ ایک طول طویل خط غصے اور شکایتوں سے بھرا ہوا، کوئی ایسا خط جس میں یہ دھمکی بھی دیدی جائے کہ اگر وہ اب بھی نہ آئی تو آئندہ سے سارے تعلقات ختم! پھر بھی اس روز میں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں نے سوچا بات بات پر اعتراض کرکے اس سے جھگڑا کر لینا اب میرے حق میں بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوگا۔ اس لئے میں نے انتہائی ضبط کے ساتھ اس کا خط جوں کا توں بانو تک پہونچا دیا۔

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے اور اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔

اس روز میرے دوست نے شام ہی سے میرے گھر ڈیرا ڈال دیا تھا۔ اور رات ہوتے ہی کسی چوکیدار کی طرح کھیت میں خواہ مخواہ چکر لگانے لگا تھا۔ لیکن اس رات کھیت میں میرا دوست اکیلا تھا۔ اس رات میں اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ خاموشی سے جھونپڑی کے اندر بیٹھا ہوا اس کے بور ہونے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک دن میں بور ہوا تھا اور وہ تماشہ دیکھ رہا تھا اس دن وہ بور ہو رہا تھا اور میں تماشہ دیکھ رہا تھا۔

اس درمیان میں میں نے کئی بار مشورہ دیا کہ وہ گھر چلا جائے۔ اس کے مختصر سے خط کے وہ چند الفاظ بانو کو ہرگز نہیں لا سکتے۔ لیکن وہ تو بالکل ناتجربہ کار تھا۔

لیکن چند ہی گھنٹوں بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری اپنی تجربہ کار آنکھیں بے نور ہوگئی ہیں۔ کیونکہ میں آنکھیں ملتا ہوا دور سے بانو کے دھندلے دھندلے سائے کو پہچانتے ہوئے بھی یوں گھور رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

مہکتی چاندنی میں ان دونوں کی دبی دبی سرگوشیاں دیر تک ابھرتی رہیں۔ چوڑیوں کے جل ترنگ بار بار بجتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود میرے بے وقوف دوست سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ کچھ نہیں تو کم ازکم بانو کے کنوارے ہونٹ کو اس ابھرتی مٹھاس سے تو روشناس کر دے جسے ایک بار منہ لگ جانے کے بعد عورتیں اکثر تنہائی میں اپنے ہونٹ چاٹتی رہتی ہیں۔ اور جس کی لذت بعض اوقات قدموں کو کسی مدہوش شرابی کی طرح بہکا دیتی ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد بانو واپس چلی گئی۔

اور میں یونہی کھڑا دیکھتا رہا

بانو کے جانے کے بعد جب میرا دوست جھونپڑی میں واپس آیا تو بڑا خوش تھا۔ جیسے آج اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد پورا ہوگیا ہو۔ اس دن مجھے اپنے دوست کی اس معصومیت پر بڑا پیار آرہا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ کسی لڑکی کے ساتھ محض بات کر لینے پر اس قدر خوش نظر آرہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر ڈالا ہو۔

لیکن میں نے اپنے دوست سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ان کی اس ابھرتی ملاقات پر دل کھول کر مبارک باد دی۔ اب تو چڑیا دانہ چگنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ اب اسے اس جھونپڑی تک چلے آنے سے کون روک سکتا تھا؟

لیکن اس کے بعد میری جھونپڑی یونہی خالی پڑی رہی۔

ایک ہفتہ۔
دو ہفتہ۔
تین ہفتہ۔
مہینوں گذر گئے۔
لیکن میری جھونپڑی یونہی خالی پڑی رہی۔

میرا دوست ہر روز ایک خط لکھتا رہا۔
خود میں نے بھی اپنے دوست کی جعلی تحریر میں سیکڑوں خطوط لکھ ڈالے۔
لیکن میری جھونپڑی یونہی خالی پڑی رہی۔

جاگتے جاگتے میری آنکھوں میں سوجن پیدا ہو گئی۔
سوچتے سوچتے میرے دل و دماغ جلنے لگے۔
میرا سارا وجود ایک دہکتا ہوا انگارہ بن گیا۔
لیکن میری جھونپڑی یونہی خالی پڑی رہی۔ البتہ بانو کا گھر دھیرے دھیرے مہمانوں سے بھر گیا۔
بانو کے گھر رات گئے تک سہاگ کے گیت گائے جاتے۔ ڈھولک پر ایک ایک کر تھاپ لگائی جاتی۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے کوئی میرے سینے کے اندر چھپا ہوا میرے دل پر پے در پے ضربیں لگا رہا ہو۔
اور پھر اس دن جب بانو گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی تمام خوشبو سمیٹ کر اور اپنے پیچھے ماں کی سسکتی ہوئی ممتا اور باپ کا لٹکا ہوا منہ چھوڑ کر چلی گئی تو میں دیوانوں کی طرح گھر سے بے اختیار یوں نکل پڑا جیسے ابھی اپنے دوست کے لہو میں نہا کر سرخ ہو جاؤں گا۔
راستے بھر میرے اوپر یہی جنونی کیفیت طاری رہی۔
گھر میں قدم پڑتے ہی یہ جنون جیسے ایک چیخ بن کر ابل پڑی۔
" بانو رخصت ہو کر چلی گئی "۔
لیکن اس چیخ کے باوجود میرے دوست کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔
" میں نے کہا کچھ سنا تم نے۔ بانو رخصت ہو کر چلی گئی "۔
اس بار میرے لہجے میں اس شیر کی غراہٹ تھی جس کے منہ سے اس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔
لیکن میرے دوست پر اس غراہٹ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنی آنکھیں کھولیں اور میرے چہرے پر مسکراتی ہوئی نگاہوں کے کیل پیوست کر دیئے۔
" او ہو ہو مسکرا رہے ہو سالے۔ میں بھلا گیا۔ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ــــ تم میرے دوست بنتے ہو ــــ دوست ــــ
" ہاں ــــ " اس نے بڑی آہستگی سے بات کاٹ دی۔ پھر آرام کرسی پر اکڑوں ہو گیا اور اپنی گردن اونچی کرتا ہوا بولا۔
" میں آج بھی تمہارا دوست ہوں۔ ایک بزدل اور کمزور دوست جو تمہیں تمہاری منزل تک نہ پہونچا سکا "۔

سیپ کراچی

سیدہ امہ فضل

جنگل کا پھول

اور پھر ایک دن ـــ بہت سے شگوفے کھل گئے اور سارے چمن میں بہار آگئی۔

تم نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ۔

شمائل سے شادی ـــ بہر صورت۔ بہر طور ـــ

تم کچھ ایسے ہی تھے۔ سرکش سے ـــ ہنگامہ خیز۔ ہمیشہ اسی طرح تم، ادھر اُدھر کی سوئی ہوئی پرسکون فضا میں اپنے انوکھے فیصلوں سے ارتعاش پیدا کر دیا کرتے ـــ تمہاری تیز رفتار ـــ تمہارا سر جھٹکنے کا انداز ـــ تمہاری ہنگامہ خیز ہنسی۔ تمہاری ہر اک ادا سے آشکار تھا۔

احساس برتری ـــ فتح و حصول ـــ

یوں لگتا جیسے تمہاری منہ زور شخصیت کسی بڑی ہی عظیم فتح کی متلاشی ہے، جیسے تمہیں کسی بہت بڑی شکست سے انتقام لینا ہو۔ بارہا یوں ہوتا، تم ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہتے "یہ شے میری ہے"۔ اور پھر وہ شے تمہاری ہو جایا کرتی ـــ

تم جس شے کی طرف اشارہ کرتے اس کے اطراف اپنے حقِ ملکیت کی دیواریں کھینچ دیا کرتے۔

وہ شاید محفلِ مشاعرہ تھی۔ یا کوئی اور ادبی محفل ـــ بہت سی خوبصورت لڑکیوں کے زرق برق ہجوم میں ـــ سر جھکائے بڑے ہی انہماک سے وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھی، معمولی سے نقش و نگار ـــ چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری ـــ بس ایک مسکراہٹ ـــ دھیمی سی، آنچ دیتی ہوئی۔

وہ تمہیں اچھی لگی، تم نے دیکھا ـــ "یہ میری ہے"۔

اور پھر اس لڑکی کے گرد ـــ تم نے اپنے حق کے بہت سے دائرے کھینچ دیئے۔

فیصلہ اب بھی کافی ہنگامہ خیز تھا۔

کالج کا حسین ترین ـــ صفِ اول کا طالب علم ـــ سیدؔ عظیم ـــ اور ایک لڑکی۔ انتہائی معمولی ـــ بالکل غیر اہم۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ لوگوں نے کہا دیوانے ہو تم ـــ بہت سے اس فیصلے پر ہنس دیئے۔ بہت سوں نے اسے تمہاری دل لگی پر محمول کیا۔ مگر جب چھوٹے چھوٹے کوارٹروں کی لمبی قطاروں کے درمیان۔ ایک چھوٹے سے "گھر" کی تنگ و تاریک گلی سے۔ تمہاری کار مع بارات میں گھری۔ بڑی ہی شان بے نیازی

سے۔ تمہارے خوبصورت گھر کی طرف چلی۔ تو تم پر فریفتہ ساری حسین لڑکیاں۔ دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئیں۔
تمہاری شمائل سے شادی پر کئی طرح کے تبصرے ہوئے۔

اور جب بہار اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ، شمائل کے حضور جھک آئی اور کلیوں نے اپنے دل کھول کر سیاہ بھونروں کے مترنم گیتوں کو سنا۔ تو شمائل نے سوچا۔ لوگ کہتے ہیں۔ تم پر فتح پانا ممکن نہیں۔ میں تلاش تو کر دیکھوں، شاید پا لوں، (واقعی کبھی کبھی تم ایک بڑا ہی خوبصورت۔ بڑا ہی شاندار قلعہ معلوم ہوتے۔ خوبصورت مگر ناقابل تسخیر۔)

مگر کبھی کبھی۔ یوں بھی تو ہوتا ہے شمائل، بڑے بڑے آہنی قلعہ صرف دل کی ایک نرم سی دستک سے کھل جاتے ہیں۔

وہ سوچتی کتنا ہی کیوں نہ چلنا پڑے، میں نہ تھکوں گی۔ تلاش کرتی رہوں گی۔ سب کچھ اس بازی میں ہار کر بھی نہیں تو جیتنا ہی ہوگا۔ شاندار عظیم کو، وہ جو شدت سے بیدار لگتا ہے اور وہ جو ہر وقت اپنی ہی آنکھوں میں سویا رہتا ہے۔ احساس برتری نے جس کی شخصیت کے گرد۔ ناقابل تسخیر دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کسی سے بات کرتے ہوئے بھی جو، ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو نہیں بھولتا۔ ان اونچی دیواروں کے اس پار کا عظیم۔ نہ جانے کیسا ہوگا ؟؟

وہ عجیب و غریب سہی شمائل! مگر ہے تو انسان ہی نا ؟۔ وہ فلسفی ہو کہ شاعر۔ آرٹسٹ ہے کہ دیوانہ۔ تیری زندگی کا ہمسفر۔ اب وہی تیری منزل ہے۔ اور شمائل۔ منزل کٹھن بھی ہو تو چلنا ہی ہوتا ہے، پاؤں فگار ہوئے کہ دل، منزل تو پانا ہی ہوگی، اور پھر عظیم۔ اس سفر میں کئی بار میرے پیر بھی زخمی ہوئے اور دل بھی ٹوٹا، پر تم نہ ملے۔ میں ان اونچی دیواروں کے اس پار کے عظیم کو نہ پا سکی۔
(میں جو تمہاری شریک زندگی تھی)

اب سوچتی ہوں۔ یہ کیسا سفر تھا۔ جو دو قدم چل کر ختم ہو گیا۔ یہ عمر بھر کا بندھن کیسا تھا، جو پل بھر میں ٹوٹ گیا۔
کیا سارے بندھن ایسے ہی ہوتے ہیں، کیا سارے راستے اتنے ہی مختصر ہوتے ہیں، کیا سارے ہمسفر ایسے ہی اجنبی بن جایا کرتے ہیں؟
ہم۔ جو زندگی کے بھرے میلوں میں، پل بھر کو رکتے ہیں اور اپنی ساری زندگی کے لئے، ہمسفر چن لیتے ہیں۔ جلد بازی میں ہم کتنے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔ جن کا خمیازہ درد کی آگ کی صورت میں دلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ دلوں کے انتخاب، اور شخصیتوں کی جنگ میں، جب ہمارے آئیڈیل ٹوٹتے ہیں۔ تو جانے اس کی سزا روحوں کو کیوں ملتی ہے؟

قرب اور دوری۔ جانے ان میں حد فاصل کہاں سے شروع ہو جاتی ہے، محبت اور نفرت، اپنائیت اور اجنبیت، یہ سب شاید ایک دوسرے میں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔ گھات میں چھپے۔ معصوم دلوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ اور یوں ہم ایک دوسرے کا دل توڑتے ہیں۔ اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہم اپنے بندھن، اپنے رشتے خود ہی قطع کرتے ہیں۔ اور بے خبر رہتے ہیں، اور آخرکار اجنبیت۔ ہمارے سارے شاداب کھیتوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ قرب کے "مہکتے پھول" مرجھا جاتے ہیں اور ہم خاموش اور بے بس رہ جاتے ہیں۔
"تنہا!" اور زندگی کے بھرے میلوں میں اکیلے۔

اور یہ بندھن نہیں تھا، جو ہم نے جوڑا تھا، اور یہ اجنبیت نہیں تھی جو تمہاری طرف سے تھی، اور یہ محبت بھی نہیں تھی جو میری طرف سے تھی۔ یہ تو دراصل، انہیں "آئیڈیلز" کی شکست تھی۔ جس نے دو معصوم روحوں کو اتنے عرصہ بھٹکائے رکھا۔ اور ہماری شخصیتوں کو زخمی کر دیا۔

"آئیڈیلز" تمہارے اور میرے اور سب کے، انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہیں، جو ہم اپنی انتہائی کاوشوں اور خون دل سے، زندگی کے بڑے ہی خوابناک لمحوں میں اپنے خیالوں کے آسمان پر تخلیق کرتے ہیں اور جو پل بھر میں دوپہر کی تپتی، زرد اور بے مروت دھوپ میں، زمین پر آن گرتے ہیں۔ دلیسے ہی جیسے، کوئی حسین سا تاج محل، یا ایسی ہی کوئی اور عظیم عمارت ہزاروں برس کی تعمیری کاوشوں کے بعد، پل بھر میں، ایک شدید

زلزلے سے زمین بوس ہو جائے)

اور جب "ہمارے آئیڈیلز" ہمارے اندر کی شکستوں کے لرزہ خیز جھٹکوں سے ٹوٹتے ہیں تو اپنے ساتھ ہماری شخصیت کے سارے "تناد" اور سارے عزائم ابھی لہو لہان کر جاتے ہیں! اور یہ شیشے آج میری روح میں پیوست ہیں، جن کی چبھن سے بے چین ہو کر میں نے تمہیں آواز دی ہے۔ انہیں چنا نہیں جا سکتا۔ پھر بھی بارہا انہیں چننے کے لئے بے اختیار میں نے اسی محبت کو صدا دی ہے عظیم، جس نے یہ ٹکڑے میری روح میں پیوست کئے ہیں۔

اور دیکھو تو یہ کیسی مجبوری ہے۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ جسے محبت نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر پھر بھی ہو۔ محبت ہے۔

"سائے" سمجھ میں آنے والی شے نہیں ہوتے پھر بھی، میں نے سوچا تھا، تمہیں سمجھنے کے لئے، چاہے کتنا ہی چلنا پڑے۔ میں نہ تھکوں گی۔ میں تمہاری روح کا سراغ پا لوں گی۔ وہ ضرور تمہاری شخصیت کے انہیں عجیب و غریب صحراؤں میں، کہیں راستہ بھول گئی ہے جبھی تو تم اتنے عجیب ہو۔ اتنے لاپرواہ۔ اتنے بے رحم۔

"کیوں اتنے بے رحم ہو تم"۔ تم مسکرا دیتے۔

"کچھ تو بولو"۔ تم کتاب میں کھوئے رہتے۔

"تم اتنے گہرے کیوں ہو؟ تم اتنے مغرور کیوں ہو۔ تم اتنے . . ." میں ہارنے لگتی،

"تم بے وفا ہو نا عظیم! لوگ کہتے ہیں"۔

"ہاں، سچ کہتے ہیں"! تم کتاب سے نظریں ہٹائے بنا ہی جواب دیتے۔ تم ایسی باتوں کا اعتراف بڑی جلدی کر لیا کرتے،

"کیوں بے وفا ہو تم؟"

"پتہ نہیں"! وہی شانِ بے نیازی۔

"تم بتاؤ"۔ تم کہتے۔

"بتاؤں گی۔ پر ابھی نہیں"۔

"کب؟"

"تمہیں ڈھونڈنے کے بعد" میں کہتی۔

"نہیں۔ مجھے کھونے کے بعد"

"اور یوں تم میری جستجو۔ میری عزم کا ماحاصل لکھ دیتے۔

کئی بار۔ ایسا ہوا بہت دور چلنے کے بعد بھی مجھے پتہ نہ چلا کہ یہ راہ گزر تو بدلنا ہوگی۔

ساحلِ سمندر کی سرکش ہواؤں میں گھرے۔ تم بڑے ہی سکون سے گنگناتے۔

"ان بے قرار ہواؤں کی طرح۔" میں کہتی۔ "سرکش ہو تم بھی"۔

"پھر"

"میں باندھ دوں گی تمہیں"۔

"اچھا"۔ "تم بڑی دانائی سے ہنستے"، کیونکر۔؟"

"مضبوطی سے۔"

"یوں تو تم مجھے کھو دو گی شمائل"۔ تم جلتے ہوئے سگریٹ کو پانی میں پھینک دیتے۔

(تمہارا وہی فیصلہ کن۔ اور ڈرا دینے والا انداز ہوتا)

اُف! کیسے کٹھور رہتے تم۔ مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے۔

ہر اُس خوبصورت سی شام۔ جب دن کھڑکیوں کے سرخ پردوں میں چھپنے کی سعی کرتا۔ اور سرخ روشنی۔ محبت کی کرنوں کی طرح ہمارے اطراف پھیل جاتی تو۔ تم خوب ہنستے۔ بلاوجہ۔ (میں بھی تمہارے لئے چائے بنانے میں مصروف ہوتی)

"تم بھی ہنسو"۔ تم کہتے۔

میں ہنستی۔

"نہیں میری طرح۔ بے ساختہ۔" تم حکمرانی کرتے۔

"طوفان ہو تم تو۔ میں کیسے ساتھ دوں"۔ میں پیچھے رہ جاتی۔

"ساتھ نہ دو گی؟" (تمہارا وہی انداز، دل ہلا دینے والا)

میں ہنس پڑتی دھیمے سے۔

"تمہارا دھیما پن۔ اچھا لگتا ہے مجھے۔ تم کتنی اچھی ہو شمائل، شاعروں جیسی۔" کبھی کبھی تم کہتے۔ پیار سے۔

"کیسا لگتا ہے یہ" مدھر سا۔ سندر۔ میں سنتی۔

"تم مجھے کیا بنا دو گے عظیم!"

"لافانی"۔ تم ہنستے، میں بھی ہنس پڑتی،

تب مجھے یوں لگتا عظیم! جیسے تمہاری شخصیت کے سارے عجیب و غریب اسرار تمہاری شفاف بلوریں ہنسی میں بہہ گئے ہیں۔ تب مجھے تم سے ذرا بھی خوف نہ لگتا۔

"میں تمہیں پکڑ لوں گی"

"اوہ"۔ تم مسکراتے۔

"دیکھ لینا"۔ میں ناز کرتی۔

"فتح کا دعویٰ؟" تم فوراً سنبھلتے۔

"ہاں۔" میں نڈر بنتی۔

"کر دیکھو پھر۔" تمہارا احساسِ برتری تمہاری آنکھوں میں سلگ اٹھتا۔

اُف۔ میں ہار جاتی۔ (خدایا! ہار کا درد بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے... بھلا یہ ہمیشہ جیتنے والا کیا جانے....)

اکثر ایسا ہوتا، گھنٹوں۔ ہم خاموش رہتے۔ ایک دوسرے کے قریب ایک دوسرے سے دور۔ خاموشی ایک تیسرا وجود بن کر ہمارے درمیان حائل رہتی۔ جی چاہتا اس خاموشی سے الجھ پڑوں۔ ناراده کرتی تو تمہارے لب و رخسار۔ تمہاری آنکھیں۔ تمہارے بال۔ تمہارا سارا وجود میری راہ روک لیتا۔

ہر شے ساکن۔ سراپا سکوت۔ اگر ذرا سی بھی آہٹ ہوئی تو کوئی بڑی ہی انمول شے ٹوٹ جائے گی شمائل۔ کوئی بڑا ہی خوبصورت خواب۔ یوں لگتا۔ اگر ذرا بھی حرکت ہوئی۔ تو تم بکھر جاؤ گے۔ اور پھر۔ اور پھر... میں بھی۔

اُف یہ خاموشی ۔۔۔ یہ خاموشی ۔۔۔ بے رحم ۔۔۔ بے رحم جان لیوا ... میں رو دیتی، کیسی ہے یہ آزمائش ۔ کیسی ہے یہ محبت ۔۔۔ ؟ معذور ۔۔۔ اپاہج ۔۔۔ ویران، مجھے اپنی محبت پر ترس آنے لگتا ۔۔۔ مجھے اپنی محبت پر پیار آنے لگتا ۔۔۔ تم سنبھلتے ۔ کچھ ڈھونڈنے لگتے۔

"تمہاری کف میں ہے۔" میں رومال نکال لیتی، تم اسی طرح ہمیشہ بھول جایا کرتے تھے۔ خود ہی رکھ کر۔

"لاؤ اِدھر۔" تم ہاتھ بڑھاتے۔

"پہلے ہاتھ جوڑو۔" تم کلائیاں جوڑ لیتے۔ میں رومال سے تمہارے ہاتھ باندھ دیتی۔

"بگڑے نواب! تم سرکش بچوں کو یوں باندھنا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہو جاتے ہیں ۔۔۔ کیوں؟"

"ہاں ۔ بالکل۔"

"فتح پانا جانتی ہو ۔ ؟"

"جانتی ہوں۔"

"کیسے ۔ ؟" تم تیور بدلتے۔

"ہار کر ۔" میں ہنس پڑتی۔

کبھی کبھی تو تم مجھے، بہت ہی دور ایستادہ ۔ روشنی کا کوئی ساکت مینار لگتے، گہرے اور نیلے سمندر کے بیچوں بیچ ۔ اور تب سمندر کے کنارے چلتے چلتے ۔ میں اوپر نظر اٹھاتی۔

روشنی کے عظیم مینار ۔ اگر میں تم تک پہنچ نہ بھی سکی تو کیا ہے، تمہاری روشنی مجھے راہ تو دکھا سکتی ہے۔

"کتنا فاصلہ ہے عظیم! اس کا پاٹنا تو مجھے اپنے بس میں نہیں لگتا۔" میں تھک ہار کر بیٹھ جاتی۔ کبھی کبھی تم اپنا آپ، اپنا سب کچھ میرے حوالے کر دیتے ۔۔۔ تمہاری آنکھیں بند ہوتیں ۔۔ اور تمہارے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ۔۔۔ تمہاری گم گشتہ جنت کا ایک دکھ بھرا احتجاج بن جاتی۔

تم پکارتے ہولے سے۔

"ہاں عظیم"

"کوئی شعر سناؤ، خوبصورت سا دکھ بھرا۔"

"میرے خوابوں کے سمن زاروں کی گم گشتہ ندیم
تو کہ عنواں ہے مرے پیار کے افسانوں کا!
تو کہ روشن ہے میرے دل میں دیئے کی مانند
تو کہ . . . ."

"رہنے دو ۔ بس کرو ۔ مت سناؤ۔" تم بے تاب ہو اٹھتے "اپنا ہاتھ دو شاہی" تم سہارے کی تمنا کرتے۔ تب میرا جی چاہتا عظیم، میں کوئی بجر مرلی شے بن کر تمہارے اندر اتر جاؤں۔ تمہاری "گم گشتہ جنت" کا سراغ پانے کے لئے،

میرا جی چاہتا میں تمہارے ان خوبصورت رازوں میں سے ایک ہوتی جو تمہاری بے تاب آنکھوں اور بند پلکوں کے سائے تلے ۔۔۔ صدا بے قرار رہتے ہیں۔ زخمی سے ۔ بے چین ۔ سر پٹکتے ہوئے،

کیسا دکھ ہے یہ میں کان لگا کر سنتی، بے آواز ۔ کوئی آہٹ نہیں، کوئی چاپ سنائی نہیں دیتی۔

"کون چلتا ہے تمہارے دل میں۔ کون بند ہے تمہاری ان آنکھوں میں؟" بارہا پوچھا۔ تم نہ بولے۔

"کوئی تو ہوگا" تمہاری خاموشی ایک ہی جواب بن جاتی، اور عظیم! یہ میں تو نہ تھی۔ میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتی تھی اور — اور تم بھی — مگر کبھی اپنے دکھ سے نظر پھیر کر تم نے میرے المیہ کی طرف نظر نہ کی تم کبھی میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔ تم تو اپنے آپ سے پیار کرتے تھے نا۔ تمہیں ہمیشہ اپنا بڑا خیال رہتا۔ — اپنے خوابوں کا اور اپنے دکھوں کا — اور اپنی بلندیوں کا۔

"میں تمہاری شریک سفر بھی ہوں مجھے اپنے دکھ کا بھی ساتھی کرو عظیم!"

"نہیں"

"کیوں آخر؟"

"یہ میرا غم ہے — اور جو شے "میری" ہے۔ وہ کسی کی نہیں" تم تنک کر کہتے۔ اور یہ سچ تھا — جو شے تمہاری ہوتی۔ پھر وہ کسی کی نہ ہوتی۔ تم ہمیشہ شراکت سے گریزاں رہے۔ دکھ میں بھی۔

نہ جانے ماضی کی یہ کس بے رحمی کا ردعمل تھا۔ بہرحال — "حق ملکیت" تمہاری شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا، کوئی تمہاری شے چھو بھی لیتا تو تم سلگ اٹھتے، کالج کے زمانے میں — بارہا میں نے دیکھا۔ کسی نے تمہاری کتاب پر ہاتھ بھی رکھ دیا تو تم بے قرار ہو اٹھتے۔ ایسا لگتا — جیسے تمہیں اجنبی ہاتھوں سے خوف آتا ہو۔ جیسے انہوں نے تم سے تمہارا کچھ چھین لیا ہو، کوئی بہت ہی عزیز شے۔

ہجوم میں گھرے — تم بڑے ہی نڈر لگتے، بڑے ہی دلیر — بڑے ہی نمایاں، مگر میں نے تمہیں خائف بھی دیکھا — پسپا ہوتے بھی، اس وقت جب تم اپنے آپ سے منہ پھیر لیتے۔

تم تھک جاتے تو گر پڑتے، میرے بازوؤں پر سر رکھے تم بڑے ہی بے ضرر لگتے۔ بچوں کی طرح معصوم — جلد ہی رو پڑنے والے۔ تمہارا وجود تمہاری آنکھوں میں تحلیل ہونے لگتا۔ درد ... درد ... بیکراں درد، تمہاری آنکھوں میں جھانکنے کی تاب نہ رہتی۔

میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر — تم سہارا لیتے — یوں لگتا جیسے تم ہار رہے ہو۔ اپنے آپ سے۔ ایک بڑی ہی خوفناک جنگ کے بعد طوفان میں گھرے تم کنارے کی تمنا کرتے۔

(کنارا خود ہی تمہارا تمنائی ہے عظیم! کاش تم اتنے مغرور نہ ہوتے) میرے آنسو چھلک پڑتے —

میں تمہارے بال چھوتی — نرمی سے۔ تمہارا سر سہلاتی۔ آہستہ آہستہ تمہاری بے خواب آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ تمہیں سکون ملتا — تم آنکھیں بند کر لیتے۔

"تم مذہب ہو شائل" تم ہارتے — "پرسکون — پناہ دینے والا —" تم اعتراف کرتے۔

"کون ہے — کون ہے؟" میں بے قرار ہو اٹھتی — "کون ہے تمہاری ان آنکھوں میں — ان بند دریچوں کے اندر جھانکا بھی تو نہیں جا سکتا۔"

اُف بے بسی — میں سوچتی۔

"بے رحم درد — یہ بار بار کیوں ہوتا ہے۔ یہ رہ رہ کر کیوں اٹھتا ہے" مجھے تمہارا یوں سلگنا اچھا نہ لگتا۔

تمہارا خوبصورت چہرہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے سامنے ہوتا — ایک سویا ہوا درد لیے — مدھم ....
باہر دریچے سے پرے آسمان پر سرخ چاند جگمگا رہا ہوتا۔

اف یہ سلگتا ہوا چاند، یہ آنچ دیتی ہوئی چاندنی مجھ سے دیکھا نہ جاتا۔ آنچ تیز ہوتی تو میرے پیار کے کنارے بھی جلنے لگتے۔

گرد و پیش کا یہ عالم ہے تو نہ جانے اس جگہ کا کیا عالم ہوگا جہاں ہر وقت آگ روشن ہے۔ میں دکھ سے سوچا کرتی۔

اپنے ماضی کی تلاش میں تم بہت دور۔ اپنے خیال کی راہوں پر نکل جاتے "میرے وجود سے بے خبر" میں جو ایک زندگی، زندہ اور سانس لیتی ہوئی تمہارے قریب ہوتی تھی، تم گہری سوچ میں کھو جاتے، تو یوں لگتا۔ جیسے۔ کسی برف سے ڈھکے، بلند پہاڑ کے دامن میں واقع، کسی چھوٹے سے گھر میں۔ کوئی بہت ہی خوبصورت آتش دان، تنہا سلگ رہا ہو۔ تم میرا ہاتھ تھامے رہتے، مجھے یوں لگتا۔ جیسے میں کوئی پجارن ہوں، جو۔ اس سرد مقام پر صدیوں سے تنہا۔ سر جھکائے۔ اس آتش دان کے کنارے عبادت میں مصروف ہو۔ بے مقصد، بے حس و حرکت، آنکھیں بند کئے یہ آگ کس کی ہے۔ یہ آتش دان تو میرا ہے۔ میں رو پڑتی۔ چپ چاپ۔

میرے دل کی سرزمین پر۔ بارہا آنسو گرے۔ چپ چاپ گرتے رہے۔ آواز بھی ہوئی۔ بکھرے بھی۔ ٹوٹ بھی گئے۔

مگر کبھی تم کوئی آہٹ نہ سن سکے۔ کبھی تم نے نظریں اٹھا کر اس ذی نفس کو نہ دیکھا۔ جسے تم نے منتخب کیا تھا۔ اور اپنے ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے تھے۔

بے شمار دلوں نے مجھ پر رشک کیا، میں جو تمہاری "شاندار عظیم" کی شریک تھی، اف کتنی بے بس تھی میں۔

"اگربتی سلگاؤ۔ پھول سجا دو" "ستار سنو، لہرا سنو، اور ایمن کلیان" تم یونہی حکمرانی کرتے۔

"کون ہو تم آخر۔؟"

"مغل شہزادہ"

"اور میں۔؟" میں اشتیاق سے پوچھتی۔

"جنگل کا پھول" تم بے انصافی کرتے۔

"کیسے ہوتے ہیں"

"زہریلے" تم چھیڑتے۔

"نہیں پھول کبھی زہریلے نہیں ہوتے" میں رو پڑتی "شہزادے، تو کیوں لا سجایا ہے اپنے ایوان میں۔ جنگل میں رہنے دیا ہوتا" میں شکوہ کرتی۔

"تم سراپا آہستگی تھیں" "تم سنورنے لگتے" "تم مجھے اچھی لگیں، مدھم سی۔ ٹھنڈی چاندنی۔ شاعروں جیسی" تم بالکل میرے بن جاتے۔

"میں نے تمہیں دیکھا، سکون سے سر جھکائے، کچھ لکھتے ہوئے، تو میں نے سوچا۔ شمائل: ایسی آنکھوں کی تو مجھے تلاش تھی۔ جھکی ہوئی، وہ جو سایہ کر دیتی ہیں، نرم سا، وہ جو۔ نگرانی نہیں کرتیں۔ تعاقب نہیں کرتیں۔ زخمی نہیں کرتیں۔"

تم جذباتی ہو جاتے، تمہیں خوشی سے ناچتی ہوئی تیز نگاہوں سے نفرت تھی۔

"تمہیں دیکھا تو یوں لگا شمائل۔ جیسے مدتوں بعد۔ بپھری ہوئی موجوں نے بھنور سے اچھال کر مجھے پھر سے کسی پرسکون جھیل میں لا ڈالا ہے۔ میرے دل کا کنول، ایسے ہی پرسکون پانیوں کا متلاشی تھا۔ میں نے چاہا تھا۔ "کوئی دل"... جو تقاضہ نہ کرے۔ پناہ دے۔ اس وقت جب میں زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کر چکنے کے بعد اس تک پہنچوں"

"پناہ گاہ کے خواہاں۔ شہزادے ہو کر؟" میں چھیڑتی۔

"یونہی سمجھ لو" تم لاپروائی سے بال سنوارتے۔

میں نے بہت چاہا۔ تمہاری کھوئی ہوئی جنت کے نشان پاؤں، میں بھی ڈھونڈوں تمہارے ساتھ مل کر۔ میں بھی اسے پیار کروں جس سے تم کرتے تھے۔

جانے کون۔؟ میں سوچتی جس نے تمہیں ایسا وحشی ایسا بے رحم بنا رکھا ہے۔ جانے کون۔؟ جسے تم شراب و سرود میں ڈھونڈتے۔ (کیا جانئے ڈھونڈتے تھے کہ بھول جانے کی سعی کرتے)

تم نڈھال۔ بستر پر آ کر گر پڑتے۔ جوتوں سمیت۔

"مغل شہزادے!" میں تم پر جھکتی۔ شراب کی تیز بو۔ پریشان کر دینے والی۔

"پھر تم نے پی۔؟"

"ہاں۔" تم فوراً اقرار کرتے۔

میں خاموش رہ جاتی، کیا چارہ تھا۔ ایک سے زیادہ بار استفسار کرنا تمہیں کھو دینے کے برابر تھا۔ تمہیں کھو دوں گی۔ اگر تمہیں تنگ کیا تو یہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اور میں تمہیں کھونا نہ چاہتی تھی۔ اپنے مغل شہزادے کو۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔ اپنی زندگی ہار کر بھی نہیں۔

"وقت کے تیز دھارے کے حوالے میں اپنی کشتی چھوڑ دیتی، کیا جانے کب سحر ہو، ہو بھی کہ نہیں۔" دنیا میں کچھ مسافر ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔" تم کہا کرتے۔

وہی کیفیت۔ میلوں بے مقصد چلنے کے بعد وہیں تھک کر بیٹھ جانے والی، کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے منزل بہت ہی قریب ہو، بس چند قدم اور۔

"تم کس کے ہو عظیم! سچ بتاؤ۔"

"تمہارا۔" تم صاف جھوٹ بولتے۔ جی چاہتا ساری عمر اس جھوٹ کے ٹھنڈے سائے تلے بسر کر دوں۔ تب تم کوئی بڑا ہی خوبصورت افسانہ لگتے۔ پھر بھی تم پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

"بگڑے نوابوں جیسے۔" میں کہتی، تم ہنس پڑتے، سب دکھ بہلا لے جانے والی ہنسی۔ تب میں سوچتی۔ شمائل تا ابد دکھ سہہ سکتی ہے عظیم صرف تمہاری اس ایک شبنمی ہنسی کے لئے۔

"اب کھونا مت۔" میں منت کرتی۔ "دیکھو میرے پیر زخمی ہیں رہگذر، رہگذر رچلی ہوں اور منزل منزل ڈھونڈا ہے۔ بڑی مشکل سے ملے ہو شہزادے! کتنے زخم ملے، کتنے کانٹے، ہر بن کے، ہر جنگل کے۔ تمہاری تلاش میں۔"

"پھول بھی تو ہوتے ہیں جنگل میں۔"

"ہاں زخم زیادہ ہیں۔ پھول کم۔"

تم دفعتاً بدل جاتے۔ "بہت دکھ سہنا پڑے میرے لئے؟" تمہارا لہجہ بیگانہ سا لگنے لگتا، تمہیں میرا یہ احسان لینا بھی گوارہ نہ تھا۔

"شمائل! مزید دکھ مت اٹھاؤ میرے لئے کیا حاصل؟"

"زندگی" میں جواب دیتی۔

"تمہیں اس دکھ سے کوفت نہ ہو گی۔ یہ تو زندگی بھر کا دکھ ہو گا۔"

"نہیں۔ مجھے یہ دکھ پیارے ہیں۔"

"دکھ سے دکھ ہی پیدا ہوتا ہے خوشی نہیں ملتی۔" تم کہتے۔

"نہیں۔ خوشی بے کنار بھی۔ تم کیا جانو۔ محبت کے بدلے میں محبت نہ بھی ملے۔ پھر بھی محبت کی جا سکتی ہے، کسی صلہ و عوض کی توقع کے بغیر۔"

"جھوٹ ہے۔"

"محبت جھوٹ نہیں بولتی۔"

"دھوکا ہے۔"

"محبت دھوکا نہیں دیتی۔"

تمہیں یقین نہ آتا۔ "نیلے آسمان پر۔ پرندوں کی آزاد اڑان، تمہیں اچھی تو لگتی ہوگی۔"

"نہیں۔"

"پھر کیا۔ لذتِ اسیری۔ یونہی رہنے دو۔ یونہی رہنے دو عظیم۔" میں تمہارا بازو تھام لیتی۔

(مجھے تمہارے اچانک فیصلوں سے خوف آتا)

"چاہے پیار نہ کرو۔ پیار کا حق تو مت چھینو۔"

"کوئی کسی سے بغیر صلہ کی توقع کے محبت نہیں کرسکتا شمائل" تم ہمیشہ جواب دیتے۔

"سائیکی بھی نہیں؟"

"نہیں تنہا ہیں سب۔"

"تنہا نہ نکلو، مجھے بھی ہمسفر کرلو۔" پر تم راضی نہ ہوئے۔ تمہیں میری محبت پر بھروسہ نہیں تھا، تم بہت کم بھروسہ کیا کرتے، بدگمانیاں ہمیشہ تمہارے رستے سکون کے درپہ رہا کرتیں۔ اور آخر کار۔ میری مظلوم محبت بھی۔ تمہاری پیچیدہ شخصیت کی انہیں بے رحم بدگمانیوں کا شکار ہوگئی۔ میں نے تمہیں سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی، مگر ناکام، تم چالاک تھے نا، پہلو بدلنا خوب جانتے تھے۔

تم کہتے: "مجھے سمجھو شمائل!"

میں سعی کرتی، تب تم۔ ایک وقت اثبات و نفی کی علامتوں سے کام لیتے اور یوں اپنی جستجو کرنے والے دلوں کو مغالطوں میں ڈال دیا کرتے،

تم راتوں کو گھر نہ آتے، کہاں ہوتے تم؟ پاگلوں کے دیس میں۔ یہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ پھول کہیں بھی کھلتے عظیم خوشبو تو مجھ تک آ ہی جایا کرتی، پھر بھی میں تم سے استفسار نہ کرتی، تو تم چڑ جاتے۔

"احتجاج کرو۔" تم حکم دیتے۔

"کیونکر؟" میں سوچتی، "تمہیں تعاقب پسند نہیں۔" میں بے بس ہوکر رو پڑتی۔

"بزدل ہو پھر" تم بے دل ہو جاتے۔

اور یوں تم میری سہمی ہوئی محبت کو اپنے متضاد تقاضوں سے پریشان کیا کرتے۔ مجھے آزماتے رخ بدل بدل کر۔ میں تھک جاتی، تم روٹھنے لگتے۔

"مجھے سمجھو شمائل۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایک ساتھی کے لئے۔" تم اصرار کرتے۔ "کہاں سے۔؟" میں سوچتی۔

ہر صفحہ بے ترتیب۔ بکھرا ہوا۔ جہاں سے پڑھو ناقابلِ فہم، کیسی الجھی کتاب ہو تم،

ایک روز۔ سائیکلوجی کی کوئی کتاب تھی شاید، عورت کی فطرت کے بارے میں تم نے مجھ سے رائے لی۔

"وہ سچائی اور محبت سے تخلیق ہوئی۔"

تم ہنسے۔ "مت ہنسو عظیم!۔ عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔"

ہم انہیں سے محبت کرتے ہیں جن سے دکھ پاتے ہیں۔ اور ہم انہیں دکھ دیتے ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔

"دکھ دینے والی شے سے تو گریز کیا جاتا ہے"۔ تمہیں یقین نہ آیا شاید۔ "اصول ہے یہ ـــ" تم نے کہا۔ اس اصول کا اطلاق ـــ عورت کے دل پر بھی ہوتا ہے۔ یہ تم نے کیونکر جان لیا تھا عظیم؟ ـــ مگر تم تھے ہی ایسے، ضدی، سرکش، کسی کی بات نہ ماننے والے، تم محبت کی عظمتوں کے کبھی قائل نہ ہو سکے۔

پھر بہاروں نے رخصت ہونے کی ٹھان لی، کیونکہ موسم بدل رہا تھا۔ کلیوں نے منہ ڈھانپ لئے تھے، اور بھونروں نے باغوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔

اور یہاں سے ہمیں جدا ہونا تھا ـــــــــ

اور اب رُت بدل رہی تھی۔ اور تم بھی بدل رہے تھے، اب تم نے ایک اور روش اپنائی ـــ سب سے زیادہ تکلیف دہ ـ بالکل غیر متوقع۔

"یہ کلاس" کی بات تھی، جس کا اب تمہیں خیال آ رہا تھا، اور اب تم اپنے چناؤ کو اپنی کلاس کے "میزان" پر تولنے لگے تھے۔ اور جس کا میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

"اتنی مستقل مزاجی سے جی نہیں گھبراتا تمہارا، ـــ اتنی اطاعت گزاری سے تنگ نہیں آ جاتیں ـــ" خودی اور خودداری ـــ تم اصرار کرتے، اور حیرت زدہ ہوتے۔

"نہیں ـ" میں ضد کرتی۔

"اطاعت گزار ـــ کلاس سے تعلق رکھتی ہونا؟ ـــ دراصل "اقدار" کا فرق بڑا فرق ہوتا ہے شمائل ـــ یہی وجہ ہے کہ تم مجھے کبھی نہ سمجھ سکو گی۔"

"عظیم ـــ خدا کے لئے" میں تڑپ جاتی۔ "اپنی شخصیت کے قلعہ سے تو باہر نکل کر دیکھو، میری محبت اپنی ساری صداقتوں کے ساتھ تمہارے لئے ـــ چشم براہ ہے۔"

(قلعہ کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور تم باہر نہ آ سکے)

"کسی کو اس کے ماضی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے "اقدار و اذہان" کا اشتراک بہت ضروری ہے اور زندگی میں "ساتھ" کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ناگزیر ہے۔" تم منطق و استدلال کی راہوں پر چلنے لگتے۔

"اور جب دو ہمسفر ـــــ ایک دوسرے کو سمجھنے میں ناکام ہو جائیں، تو انہیں اسی لمحہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی راہوں کا انتخاب کر لینا چاہئے۔ جس لمحہ بھی انہیں اس حقیقت کا پتہ چل جائے۔"

تم نے سمجھانا چاہا تھا، اور میں سمجھ نہ سکی تھی۔ کیونکہ ابھی میری محبت نے منطق و استدلال کی راہوں پر چلنا نہ سیکھا تھا۔

"تمہاری محبت سے وابستگی ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی انسان کی کسی خیال سے ـ اور اس رشتہ میں پائیداری محال ہے"

(گھور اندھیرا مجھ پر چھانے لگتا)

"مجھ سے محبت تمہارے لئے شاندار چیزوں سے محبت، کی طرح ہے۔"

"محبت" اور تم ـ تم اور خاندانی اور شاندار چیزیں ـــ کلاس ویلیوز، اور مینٹیلیٹی" ـــ اور ـــ تم اسی طرح کے تانے بانوں میں الجھتے گئے ـــ اور میری محبت زخمی ہوتی گئی۔

"تمہیں مجھ سے پیار ہے اور غم سے؟ ـ غم کسے ناگوار نہیں ہوتا۔" تم بے یقینی سے کہتے۔

"محبت کے رشتے "درد" کے رشتے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی پیارے ہوتے ہیں۔ تم اپنی طرف دیکھو عظیم!"

"میری بات اور ہے شمائل!" احساس برتری تم پر غالب آنے لگتا۔

"منفرد ہو تم! یکتا ہو کیا ---؟" میں رو پڑتی،

"ہاں" تم مضبوط ہنستے۔ "تم مجھے سمجھ نہ سکو گی"۔

"کوشش تو کر دیکھوں"۔

"اس سے حاصل ---؟"

"سعی لاحاصل سہی"۔

"بے کار ہے پھر ---" اور یوں تم ساری شمعیں گل کرتے چلے گئے۔ "آزادی کیسے پسند نہیں"؟

"مجھے تو نہیں ---"

"کیوں ---؟"

"خوف آتا ہے مجھے"۔ میری بے بسی پر تم ہنستے۔

"ہر شے سے خوف آتا ہے تمہیں، مجھ سے، اپنے آپ سے، فتح و شکست میں آخر تم شکست ہی کی متوقع کیوں رہتی ہو"۔

"فتح و شکست مجھے ایک سے لگتے ہیں عظیم، مجھے مقدر سے ڈر لگتا ہے"۔

"یہی کمی ہے تم میں --- احساس کمتری" تم بے رحم بن کر طعنہ دیتے، "یہ نظریات تمہیں تمہاری کلاس نے بخشے ہیں۔ تم سب لوگ اسی طرح کے ہوتے ہو"۔

تم آخری وار کرتے۔ بڑا ہی دردناک، تڑپا دینے والا۔

"خدا کے لئے عظیم، یوں نہ کہو، تمہیں زیب نہیں دیتا"۔

تم جو اتنے عظیم اتنے شاندار لگتے۔ یوں کہتے۔ تو ان ادنیٰ الفاظ پر یقین کرنے کو ذرا بھی دل نہ چاہتا۔ تم نے ایسے ہی کئی وار کئے۔ پے در پے۔ اور پھر۔ طوفان بہت تیزی سے آیا۔ اور میری ساری جراتیں، سارے عزم، ساری ہمتیں، بہا کر لے گیا --- اور پھر کچھ بھی نہ بچا۔

اور --- میری محبت منہ ڈھانپ کر رو پڑی، کیونکہ۔ تم نے میری محبت کے سر سے آنچل کھینچ کر اسے برہنہ سر کر دیا تھا۔ وہ آنچل --- جو تمہیں نے محبت پر ڈالا تھا ---

تم نے ایک بار پھر --- تنہا ویسا ہی سنسنی خیز فیصلہ کر لیا تھا۔ بلا شرکت غیرے اپنے باقی مانند فیصلوں کی طرح۔ جیسا کہ تم کیا کرتے تھے۔ (اور اب خزاں کا چاروں طرف دور دورہ تھا۔ اور اکیلی راہوں پر ریت اُڑ رہی تھی۔ اور ان راہ گزاروں پر درد کی دھوپ گھلی ہوئی تھی۔ جن پر --- اب مجھے تنہا سفر کرنا تھا)

تم نے مجھے آزادی سے نواز دیا تھا --- اس پنچھی کی طرح --- قفس ہی جس کا گھر اور صیاد ہی جس کا محبوب ہو۔ اور جس کا آشیانہ دنیا کے کسی باغ میں نہ رہا ہو۔ میں بے یار و مددگار رہ گئی --- اور ایسے قیدی کو لذت اسیری سے محروم کرنا کیا ظلم نہ تھا۔ تم مجھ سے پیار نہ کر سکے عظیم تو تم نے مجھ سے اپنے سے پیار کا حق بھی چھین لیا --- اور یوں تم نے میری وفا سے انتقام لیا۔

"انتقامی طور پر تم میرے خلاف جو چاہو کہہ لینا" --- اس داغ کو مٹانے کے لئے تم نے کہا تھا۔

"محبت انتقام نہیں لیا کرتی اور محبت مٹ جانے والے داغ دلوں پر نہیں ڈالتی" --- تم یہ نہ جان سکے۔

(میرے دل کا داغ تو اب بھی تمہاری محبت سے مہک رہا ہے)

تم نے مجھے --- احساس کمتری کا طعنہ دیا --- اب سوچتی ہوں، جانے میرے احساس کمتری کا قصور تھا --- یا تمہارے غیر معمولی --- احساس برتری کا۔

بہرحال، عظیم ــ المیہ ہم دونوں کا برابر تھا ــ

تم متمول تھے، میں نہ تھی، مجھ میں جو کچھ ہے وہ شاید مجھے تمہاری روح سے کبھی ہم آہنگ نہ ہونے دے۔ یہ خیال جب میرے تنہائی کی آغازِ سنی تھی تو ایک تیز دھار کی طرح میرے دل پر سے گزر گیا تھا ــ میں نے ایسا سوچا بھی تو کیا تھا؟ ایک معمولی لڑکی کے لئے۔ ایسا سوچنا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ مگر عظیم۔ تم نے ایسا کیوں سوچا۔

تم! ــ جو لتنے شاندار ــ لتنے عظیم لگتے تھے۔ تم نے یہ کیوں نہ سوچا جس کمی سے تم برافروختہ ہو، وہ تو ایک بالکل اضافی اور حقیر شے ہے۔ اور محبت کی ویلیوز ہر کلاس میں مشترک ہوتی ہیں۔

"کیا کوئی انسان اپنی خودی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے" تم کہا کرتے تھے نا۔

"اور کیا کوئی انسان اپنی محبت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟" میں جواب دیا کرتی تھی نا ــ تو عظیم، آج جبکہ مجھے تمہارے بغیر زندہ رہنا پڑا ہے تو میں سوچتی ہوں، بے شک انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان۔ محبت کے بغیر جی تو لیا ہی کرتا ہے۔

محبت اور شخصیت ــ کی اس المناک جنگ میں اور آج جبکہ میں اپنا سب کچھ ہار چکی ہوں اور میری اپنی شخصیت ہر پہلو سے ٹوٹ پھوٹ کر چور چور ہو چکی ہے۔ اپنی رہی سہی خودی کو سمیٹ کر ــ آج بھی میں سوچ رہی ہوں۔ کہیں تم نے جلدی میں ــ تاکہ میں تو یہ فیصلہ نہیں کر لیا۔ تم جو بڑے بردبار لگا کرتے تھے اور سمجھداری ہر وقت تمہاری آنکھوں میں مسکراتی کرتی نظر آتی تھی ــ پھر کیا ــ تم کو جلتے اور یوں جلدی میں غلطیاں کر بیٹھتے تھے۔ تم نے یہ فیصلہ کہیں اسی جذبہ کے تحت تو نہیں کیا کہ تم میری وفا سے تنگ آچکے تھے؟

تم ہر اس چیز سے تنگ آجاتے جو تمہیں اپنا پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہوتی اور جو تمہاری منہ زور شخصیت کی راہ میں حائل ہونے لگتی ــ

اور اب جبکہ تم فیصلہ کر چکے ہو تو میں بھی ــ اسی مقام پر لوٹ آئی ہوں جہاں سے میں نے اپنی محبت کا یہ دردناک سفر شروع کیا تھا ــ آج یہ سفر ــ دائرے کے چکر کی طرح ختم ہو چکا ہے ــ میں سوچتی ہوں، دراصل میں تو چلی ہی نہ تھی۔ میں تو آج بھی وہیں ہوں۔ جہاں تھی ــ تم بتاؤ عظیم! اب تم کہاں ہو ــ؟ کتنی عظمتوں سے آگے ــ؟

اب میں یہ باتیں بھول جاؤں گی ــ اور ایسا کرنے کے لئے میں نے اپنے سارے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ مبادا! اجالے کی کوئی کرن تمہاری یاد کی راہنمائی کرے۔ میں نے اپنے دل کے سارے دریچے، سارے روشندان، بند کر دیئے ہیں ــ مبادا! کہیں یہ سرکش ہوا، تمہاری یاد کو میرے گھر کا پتہ بتا دے۔

مگر پھر بھی ــ پھر بھی ــ تمہاری یاد ہر روز، ہر شام، کسی نہ کسی در سے، کسی نہ کسی دریچہ سے میرے اندھیرے دل میں راہ پا لیتی ہے۔

(تمہاری طرح بے رحم، کتنی سرکش ہے تمہاری یاد بھی)

اور آج ــ پھولوں کے دل ــ داغ داغ ہیں ــ اور جنگل کے راستے ویران پڑے ہیں کہ اب کبھی ــ کوئی شہزادہ جنگل میں پھولوں کے شکار کو نہ نکلے گا، اور کسی بھی ــ زرد سے جنگلی پھول کو ــ شاخ سے توڑ کر اپنے ایوان میں نہ سجائے گا

"تم جنگل کا پھول ہو؟" تم کہا کرتے تھے نا؟

تو عظیم! ایک بیگانہ سی مختصر بہار کے بعد جنگل کا پھول، پھر سے جنگل میں آگرا ہے ــ بے درد ہوا نے ــ اسے اٹھا کر پھر سے جنگل میں لا پھینکا ہے۔

جنگل کا پھول، جنگل ہی میں سجتا ہے۔ تمہارا کوٹ تو بہت قیمتی ہے نا ــ؟ یہ بھلا وہاں کیا بہار دیتا۔ وہاں تو وہی پھول اچھے لگتے ہیں عظیم

جو اوبچے گلزاروں میں کھلتے ہیں۔
آج بھی۔ جب موسم بہار میں چاند آسمانوں پر سلگتا ہے، اور آنچ دیتی ہوئی چاندنی میں۔ جنگل کا پھول کسی مغل شہزادے کی یاد میں رو دیتا ہے۔

اور آج بھی جب ہوا تیز ہو جاتی ہے۔ اور شمعیں لرز۔ لرزنے لگتی ہیں تو اندھیروں میں گھری۔ تم سے بہت دُور کوئی "معمولی لڑکی" گھبرا کر اپنے دل کی "شمع" پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ تیز ہوا سے خوف زدہ اپنے جھلملاتے پیار کو اپنے ہاتھوں کی اوٹ میں چھپا کر وہ کہتی ہے۔

"لرزتی لَو کی قسم۔! میں اب بھی کسی صلہ کی توقع کے بغیر عظیم سے محبت کرتی ہوں"۔

اور مغل شہزادے تو کیا تم اُس معمولی لڑکی کی بات کا یقین کرو گے۔ جواب بھی یہی کہتی ہے۔

پھول، پھول ہی رہتا ہے عظیم، وہ چاہے جوہڑ میں کھلے، چاہے جنگل میں۔

اور پھول امر نہ بھی ہوئے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ پھولوں کا پیار تو امر ہوتا ہے نا۔

سلیم خان گمی

شریف جادی

چوہدری نتھو خاں اپنی دوکان کے تھڑے پر بچھی بید کی کرسی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ اُسے خادو نظر آیا۔ وہ بازار میں حلوائی کی دوکان کا چکر کاٹ کر گلی میں داخل ہوا تھا۔ اسی گلی میں چوہدری نتھو خان کی جوتے بنانے کی دوکان تھی جس پر "چوہدری لیدر ورکس" کا اردو اور انگریزی میں لکھا ہوا بورڈ آویزاں تھا۔ چوہدری اس دوکان کو کارخانہ کہتا تھا۔ چوہدری نے حقے کا زور سے کش لیا اور ہالوں سے اُٹھے ہوئے نتھنوں سے دھواں چھوڑتے ہوئے گلی میں نظر دوڑائی۔ خادو گلی کا فرش ناپتا آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور قدم بوجھل تھے۔ یوں جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ چوہدری نتھو نے سوچا ضرور کوئی پیغام لایا ہے۔

چوہدری نتھو خاں چند سال پہلے کفش دوز تھا۔ مگر اب کاروباری سوجھ بوجھ سے "چوہدری لیدر ورکس" کا مالک بن گیا تھا۔ اُس نے ایک درجن کاریگر تنخواہ پر ملازم رکھے ہوئے تھے جو اس کے لئے جوتے بناتے، اور چوہدری ان جوتوں کو چھوٹے چھوٹے دوکانداروں میں بیچ کر ڈھیروں منافع کماتا۔ اس کمائی سے اُس نے چند پلاٹ خرید کر چھوٹے چھوٹے مکان بنائے تھے۔ جو فی مکان پچاس روپیہ ماہوار پر اٹھے ہوئے تھے۔ ذاتی استعمال کے لئے اس کے پاس ایک تانگہ تھا جسے بلوچی گھوڑی کھینچتی تھی اور جس میں بیٹھکر وہ رخصت جان کے پاس نمائش بینی کے لئے جاتا تھا۔

خادو نے ماتھے پر ہاتھ لےجا کر افیونیوں کے سے انداز میں سلام کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر بے زاری کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

" خادم حسین! کیسے آئے ہو؟" چوہدری نے نتھنوں سے دھوئیں کی قطاریں روانہ کرتے ہوئے مربیانہ انداز میں پوچھا۔

" حضور کی خیر۔ بی بی جی نے پوچھ بھیجا ہے کہ اب حضور ہمارے غریب خانے پر کیوں نہیں آتے"۔ خادو نے کچھ اپنے حقے کی اور کچھ رخصت جان کے حقے کی نرمی لہجے میں گھولتے ہوئے کہا۔

* " خادم حسین! بات اصل میں یہ ہے کہ اب ٹبّی جاتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے۔ کیونکہ پولیس والے اب رُعب لحاظ میں نہیں رہے۔

" حضور کی خیر! بی بی جی نے کہا تھا، کہ اگر آپ یہ فرمائیں کہ ڈر لگتا ہے، تو میں بی بی جی کی طرف سے عرض کر دوں کہ ڈرنے کی ابھی کوئی ایسی بات نہیں کیونکہ رنڈیوں والا قانون ابھی لاگو نہیں ہوا۔"

چوہدری ہنس پڑا۔ اس کی کُپا توند، لمبی مونچھیں، اور رمشیلی ٹوپی پر ذرا دیر کے لئے تھرتھراہٹ امڈی اور پھر سکون میں بدل گئی!

" خادو! قانون واقعی ابھی لاگو نہیں ہوا۔ مگر عقلمندی یہی ہے کہ احتیاط برتی جائے۔ شہر میں میری تھوڑی بہت عزت ہے۔ میں نہیں چاہتا یہ

عزت پولیس کے ذریعہ خاک میں مل جائے۔"

"حضور کی خیر۔ بات تو ٹھیک ہے مگر بی بی جی ذرا گھبرائی ہوئی ہے، اور اس کی گھبراہٹ نے مجھ کو گھبرا دیا ہے"۔ خادو نے عرض کیا۔ چوہدری نتھو خاں سنجیدگی سے بولا۔

"میں اس کی گھبراہٹ دور نہیں کر سکتا۔ اور پھر وہ اکیلی نہیں ہے، اس جیسی سینکڑوں عورتیں ہیں، اُس سے کہنا اپنے آپ پر بھروسہ رکھے۔ اور اب تم جاؤ۔"

چوہدری نے پہلو کی جیب سے بڑی احتیاط سے ایک روپے کا نوٹ نکالا خادو کو دیا۔ خادو نے نوٹ پکڑا۔ ذرا سا جھکا اور نوٹ والے ہاتھ کو ماتھے پر لے جا کر سلام کیا، اور منہ موڑ کر گلی میں چلنے لگا۔

خادو رخصت جان کا نوکر تھا۔ اور ہر وقت رخصت جان کے پاس رہتا تھا، وہ رخصت جان کے علاوہ اس کے گاہکوں کی بھی ٹہل سیوا کرتا تھا، اور یوں معاوضے میں دو چار روپے روزانہ کما لیتا تھا۔ شکل و صورت میں وہ تیس[۳۰] پینتیس[۳۵] سال کا بے ضرر آدمی نظر آتا تھا۔ مگر ایک عرصے تک جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی وجہ سے کافی خرانٹ ہو گیا تھا۔ وہ شکل دیکھ کر پہچان لیتا تھا کہ یہ کس قسم کا اور کس قماش کا گاہک ہے، مشکل وقت میں وہ افیونی کے خول سے نکل کر سلگتی آنکھوں والا قاتل بھی بن سکتا تھا۔ اس کے برعکس رخصت جان ایک سادہ سی مخلص عورت تھی جس کی سب سے بڑی خوبی اس کا بھولا بھالا شگفتہ چہرہ اور تازہ پتنگ کی طرح تنا ہوا خستہ جسم تھا۔ بھولا بھالا شگفتہ چہرہ، تنا ہوا خستہ جسم، اور ضرورتیں سمجھنے والا نوکر۔ ان تین باتوں نے مل کر چوہدری نتھو خاں کو رخصت جان کا گاہک بنا دیا تھا، مگر اب رنڈیوں کے خلاف قانون لاگو ہونے والا تھا۔ اور نتھو خاں جیسے معززین علاقہ گاہک محتاط ہو گئے تھے، کمائی گھٹ گئی تھی، اور رنڈیوں میں گھبراہٹ تھی۔ ان رنڈیوں میں ایک رخصت جان بھی تھی، جس کا نوکر نتھو خاں سے مایوس ہو کر واپس لوٹا تھا۔ دوسرے دن رنڈیوں کے خلاف آرڈی ننس نافذ ہو گیا۔

آرڈی ننس کے نفاذ کے تیسرے دن خادو پھر چوہدری نتھو خاں کی دوکان پر آیا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اُس نے جھک کر چوہدری کو سلام کیا اور پریشانی کے عالم میں چوہدری جی کے منہ کو تکنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چوہدری جی سے کیونکر بات کرے۔ پھر نتھو خاں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔

"خادم حسین بولو، کیا بات ہے، کچھ گھبرائے ہوئے ہو؟"

"حضور! کیا عرض کروں۔ بی بی جی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں کوئی ایسا آدمی تلاش کروں جس کے ساتھ وہ شادی کر سکے"۔ چوہدری کرسی سے اچھل پڑا "تو کیا وہ واقعی رخصت جان شادی کر لے گی؟"

"جی حضور! وہ کہتی ہے۔ اب اور کوئی چارہ نہیں، وہ چھوٹی سی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا اور پھر وہ پشاور رستے لے کراچی تک بکتی رہی۔ اب نہ تو اس کا کوئی ماں باپ ہے اور نہ ہی کوئی بہن بھائی، وہ پڑھی لکھی بھی نہیں پچھلے چھبیس ستائیس برس میں تھکا توڑ کر دھرا نہیں کیا، اس لئے کسی گھر میں کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالنے سے رہی۔ اب صرف ایک صورت ہے کہ اس کی کسی بھلے آدمی سے شادی ہو جائے۔"

"خادم حسین! اگر رخصت جان کی شادی ہو گئی تو تم کہاں جاؤ گے؟"

چوہدری نے خادو کا ردِ عمل جاننا چاہا۔

"اللہ کارساز ہے۔ میں تنہا ہوں۔ کسی آپ جیسے دھنوان کی چلم بھر کے پیٹ پوجا کر لیا کروں گا۔"

"تو تمہیں اپنی ذات سے زیادہ اپنی بی بی جی کا فکر ہے؟ ہے نا۔؟"

"جی حضور۔ میں نے پانچ سال تک اس کا نمک کھایا ہے۔ اب اس پر مصیبت آئی ہے، اگر میں ساتھ چھوڑ دوں تو میں ساری عمر اپنے آپ سے شرمندہ رہوں گا۔ جو بھی جانے گا، کہے گا مرد کا بچہ نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے ، ٹھیک ہے" چوہدری نتھو خاں نے خادو کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا ۔ وہ خادو سے جان چھڑانا چاہتا تھا ۔ اُسے ڈر تھا کہ کوئی خادو کو پہچان نہ لے ۔ اور یہ نہ کہے کہ ایک رنڈی کا نوکر چوہدری نتھو خاں سے گفتگو کر رہا ہے ، اور معلوم نہیں کیا گفتگو کر رہا ہے ؟

"مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں خادم حسین کہ کوئی آدمی تیار بھی ہوا ہے تمہاری بی بی سے شادی کرنے کے لئے ؟ ہوا کوئی ؟" "جی کیوں نہیں ۔" خادو نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا ۔ "ایک صاحب آئے تھے ۔ عمر کوئی چالیس سال تھی ۔ کاروالے تھے پیسے والے آدمی تھے ، مگر بی بی جی نے اُسے پسند نہیں کیا ۔"

"پسند نہیں کیا ؟ کیا کہا تو نے ؟ پسند نہیں کیا ؟" چوہدری نے غصہ دباتے ہوئے کہا "حضور بی بی جی نے کہا کہ یہ آدمی کانا ہے ، میں اس سے شادی نہیں بناؤں گی ۔ شادی بناؤں گی ، تو کسی اچھی شکل والے سے بناؤں گی ۔"

"بیوقوف ۔ اُسے روٹی چاہیئے نہ کہ آنکھیں" چوہدری غصّے میں بولا ۔

"ایک دوسرے صاحب آئے تھے ۔ جوان تھے ، صورت شکل فس کلاس تھی ۔ بی بی جی نے اُسے پسند بھی کیا مگر وہ صاحب غریب تھے ۔ بی بی جی نے کہا کہ میں نے اب تک عیش کیا ہے ، اب غریبی میں بسر نہ ہو گی ۔"

"بس دو ہی آئے یا کوئی تیسرا بھی آیا ؟"

"جی ایک تیسرا صاحب بھی آیا ۔ اس کی شکل بھی اچھی تھی ۔ اور زمینوں کا مالک بھی تھا ۔ زمیندار قسم کا آدمی تھا ۔"

"تو پھر شادی اس سے طے ہو گئی ؟"

"نہیں حضور ! معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی قتل کے مقدمے میں سزا پا چکا ہے" "اور تمہاری بی بی نے جس کا نام رخصت جان ہے ، اسے بھی دھتکار دیا ۔ وہ پرلے درجے کی بیوقوف ہے ، وہ کاروباری اعتبار سے بالکل نہیں سوچتی ۔ وہ ذہن سے نہیں دل سے سوچتی ہے ، وہ صرف جسم سپرد کرنا جانتی ہے ۔ بتاؤ اب میں تمہارے لئے کیا کروں ۔" چوہدری لال پیلا ہو کر بولا ۔ اصل میں اسے غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ خادو بات ختم کر کے جاتا کیوں نہیں ۔ "حضور ! آپ کیا کر سکتے ہیں ۔ بس دعا مانگئے بی بی جی کو اس کی پسند کا شوہر مل جائے ۔"

چوہدری نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ خادو کے حوالے کرتے ہوئے غصے میں کہا ۔ "میری دعا سے کچھ نہ ہو گا ۔ میں ولی اللہ نہیں ہوں کہ میری دعا قبول ہو ۔ تم خود کوشش کرو ، کوئی چارہ کرو" اور وہ یہ کہہ کر دکان کے اندر چلا گیا ۔

اگلے دن خادو پھر چوہدری نتھو خاں کی دوکان کے سامنے کھڑا تھا ۔ وہ بے حد خوش تھا ۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے ، سر کے بال تیل میں چپڑے تھے ، اور جبڑے میں گلوری ٹھنسی ہوئی تھی جسے وہ آہستہ آہستہ جگالی کے عمل سے ریزہ ریزہ کر رہا تھا ۔ چوہدری دوکان سے باہر آیا ۔ اور تھڑے پر کھڑا ہو گیا ۔

"خادم حسین کیسے آئے ہو ؟ اور ہاں تم خوش نظر آتے ہو ۔"

"حضور ! میں خوشخبری لایا ہوں آپ کے لئے ۔ بی بی جی کو اس کی پسند کا شوہر مل گیا ۔"

"مبارک ہو ! تیری محنت اکارت نہ گئی اور تیری بی بی جی کو بھی کہ اب وہ شریف جادی بن کر زندگی گزارے گی ۔"

"حضور وہ تو ٹھیک ہے کہ وہ شریف جادی بن گئی ، مگر اب وہ رہے گی کہاں ؟"

"اپنے شوہر کے پاس ؟" "حضور اُس کے شوہر کے پاس مکان نہیں ۔" "تو پھر کہیں مکان کرائے پر لے لو ۔"

"جی اسی لئے حاضر ہوا ہوں ۔ سنا ہے آپ کے پاس کرائے کے مکان ہیں ، اور ان میں سے کوئی خالی بھی ہے ۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ میرے پاس کرائے کے لئے کوئی خالی مکان ہے ؟"

"حضور میں دیکھ کر آیا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے خادو ہنس پڑا اور اس کے منہ سے سُرخ سُرخ لہو ایسا تھوک گر کر گریبان پر آ رہا۔"

"بہت بدمعاش ہو پھر تو۔" چوہدری مسکرا کر بولا۔ "مکان کا کرایہ پچاس روپے ہوگا۔ نہ کم نہ جیادہ۔"

"حضور! منظور ہے۔ پچاس روپے کرایہ منظور ہے"۔ خادو دُگی میں ناچتے ہوئے بولا۔

"مگر خادم حسین؟ تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ رخصت جان کا شوہر کون ہے؟ کیا کوئی دفتر کا بابو ہے؟"

"نہیں حضور! دفتر کا بابو نہیں ہے۔ کاروباری آدمی ہے"۔

"ویری گڈ۔ ہم بھی کاروباری آدمی اور ہماری رخصت جان کا شوہر بھی کاروباری آدمی۔ خادم حسین؟ مجھے بے حد خوشی ہے کہ رخصت جان شریف جادی بن گئی ہے۔ مگر اس کا شوہر ہے کون۔ میں اس شہر کا رہنے والا ہوں۔ شاید وہ میرا تھوڑا بہت واقف نکلے"۔ خادو نے پیک نالی میں تھوک کر میلے سے رومال سے منہ صاف کیا اور سر جھکا کر بولا۔

"حضور! آپ کے اسی خادم نے بی بی جی سے بیاہ کیا ہے"۔

چوہدری نتھو خاں کچھ دیر کے لئے تھڑے پر گُم سُم کھڑا رہا۔ پھر وہ تھڑے سے اُتر کر گلی میں آیا۔ اور خادو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا تو سچ کہتا ہے؟"

"حضور کی خیر! بالکل سچ کہتا ہوں۔ شادی کے کاغذ پر میں نے اپنا نام لکھوا دیا ہے"۔ پھر وہ سازشی انداز میں بولا۔ "آپ سے پردہ کیسا۔ کاروبار وہی رہے گا، جواب تک رہا ہے۔ میری حیثیت بھی وہی رہے گی۔ جواب تک رہی ہے۔ بس ذرا دکان بدل جائے گی۔ آپ کو پسند ہو تو مکان دے دیجئے۔ ورنہ میں کوئی اور مکان تلاش کرتا ہوں"۔

چوہدری نتھو خاں نے اپنا ہاتھ خادو کے کندھے پر رکھا۔ اور آہستہ سے بولا۔ "میں خود کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے تمہاری ترکیب اور چال بہت پسند آئی ہے۔ مکان آج سے تمہارا۔ مگر ایک بات ہے۔ کرایہ سَو روپے ماہوار ہوگا۔ کہو منظور ہے؟"

"حضور مجھے منظور ہے"۔ خادم حسین نے گردن فخر سے بلند کرتے ہوئے کہا۔ چوہدری نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ خادو کی آنکھوں کے سامنے کسی جادوگر کی طرح لہرایا اور پوچھا۔ "خادم حسین! ہم پہ تو کوئی پابندی نہیں ہوگی نا؟"

"حضور! آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں، یہ سب کچھ آپ کے آرام اور سہولت کے لئے کیا گیا ہے"۔

اور وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

نسیم درّانی

چچا سام کے نام گیارھواں خط

پیارے چچا جان ـــــ تسلیمات

کافی عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں ـــــ یعنی پورے تین سال بعد ـــــ پچھلے دنوں میں بے حد مصروف رہا، اور آپ بھی ـــــ اور آپ تو کہیں زیادہ ہی پریشان رہے۔ کتنے عظیم حادثات سے آپ کو دوچار ہونا پڑا، یوں تو میں آپ کے ہر غم میں برابر کا شریک ہوں، کیونکہ آپ کا غم میرا غم ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ کو پوری دنیا کا غم ہے (یعنی وہی بات، قاضی جی دُبلے کیوں؟) لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ جب ـــــ

آپ کی بھتیجی میریلین منرو نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی ـــــ (اور صبح بستر مرگ پر برہنہ پائی گئی، ہائے کیا منظر ہوگا وہ بھی! معلوم ہوتا ہے ننگا پن آپ امریکیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے)

پاکستان نے چین سے مضبوط بنیادوں پر دوستی کا رشتہ قائم کیا ـــــ (چچا جان، چڑیاں چُگ گئیں کھیت) ـــــ

آپ کے بڑے بھائی مسٹر کینیڈی قتل کر دیئے گئے۔ (ع۔ رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا) ـــــ

میرے ملک کے عوام نے آپ کی خارجہ پالیسی کے خلاف مسلم بغاوت ملبا کیا (جو میرے ملک کی سترہ سالہ تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ عوام کو بدہضمی کی شکایت ہوئی ـــــ مگر چچا جان، یہ تحفہ بھی تو آپ ہی کا تھا) ـــــ

ادھر آپ کی مغربی تہذیب کے علمبردار اور آپ کے عزیز دوست ملک برطانیہ کے ڈاکٹر وارڈ کو خودکشی کرنا پڑی ـــــ (خس کم جہاں پاک ـــــ لیکن کہاں، ابھی آپ جو زندہ ہیں) ـــــ

ایشیا میں بقول آپ کے، آپ کے سب سے بڑے دوست پنڈت نہرو کا انتقال ہوا۔ (ع نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا)

الزبیتھ ٹیلر نے میرے بجائے نالائق برٹن سے شادی کر لی ـــــ

اور تو اور متحدہ حزب اختلاف صدارتی انتخاب میں ہار گئی۔ صدر ایوب بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے چچا جان ـــــ اور ؎

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے   وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے)۔

لیکن میں نے کسی موقع پر بھی آپ کو خط نہیں لکھا ـــــ

پھر یہی نہیں جب آپ تخت نشین ہوئے (اور ماموں جان خروشچیف کا بیڑہ ہوا۔ اور ویٹ نام پر آپ نے حملہ کیا) میں نے ہر موقع پر اپنی ناخلفی کا ثبوت اس طرح دیا کہ آپ کو مبارکباد کا تار بھی نہیں بھیجا۔ اگر آپ اپنے ڈالروں کے علاوہ خدا کے وجود پر بھی یقین رکھتے ہیں، تو یقین کیجئے، میں نے اس روز چھپکے چپکے خوشی

سے نہیں بچائی تھیں کہ آپ میرے چچا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بشیر اونٹ والے کے پرانے دوست بھی ہیں، اور بس اب اپنے "پوبارہ" ہیں۔ لیکن آپ کی تو وہی بات ہے کہ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر ——

دیکھئے نا چچا جان یہ کتنے شرم کی بات ہے میرے لئے کہ میرے ملک کے ایرے غیرے تو آپ کے عظیم امریکہ کی سیر کریں، اور آپ کا یہ خاکسار بھتیجہ صرف شیر شاہ کالونی سے صدر تک کے سفر سے آگے نہ بڑھے، اور وہ بھی بس کا سفر —— بڑی تمنا ہے چچا جان آپ کا ملک دیکھنے اور ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی۔ میں نے کبھی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کیا۔ اب چاہتا ہوں کہ آپ کے سہارے لنگوٹی میں پھاگ کھیل لوں ——

ہوائی جہاز کے سفر کی خواہش تو میں اپنے ملک کی ہوائی سروس پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز، جس کا مخفف "پیا" ہے (اور جسے پیا چاہے وہی سہاگن)، کے بوئنگ، میں بیٹھ کر بھی پوری کر سکتا ہوں لیکن یہ دل تو صرف آپ کے ہاں امریکہ کے آرام دہ جیٹ طیارے ہی میں سفر کرنے کو چاہتا ہے، اور وہ بھی صرف عظیم امریکہ تک، (انگلستان میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے "بلیٹن" ملانے کو ابھی اچھی طرح نہیں آیا ہے) ہاں تو اپنے اس خاکسار بھتیجے کو بھی شرف باریابی بخش دیجئے نا چچا جان، چلئے یہ طے ہے کہ اس کے بدلے میں آپ کا کوئی کام کر دوں گا۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بہت کام کا آدمی ہوں، قاضی کے گھر کے تو چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں، اور پھر میں تو آپ کا بھتیجہ ہوں —— چلئے ایک مضمون لکھ دوں گا "آہنی پردے کے پیچھے" —— اسے آپ بعد میں کسی رسالے میں بند تھی کے ساتھ چھپوا بھی دیجئے گا اور اگر خدا نخواستہ آپ کا ہاتھ تنگ ہو تو کوئی حرج نہیں، میں اس کے چھپنے کا بندوبست بھی کر دوں گا —— یہاں کچھ رسائل ایسے ہیں جو چند "سالانہ چندے" کے عوض ادبیہ پر ہر قسم کی چیز چھاپنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال آپ کو کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں ہوگی ——

لیجئے بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں آگئی —— سوال یہ ہے چچا جان کہ آخر میں یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں، بات یہ ہے چچا جان کہ آج ۱۸ جنوری ہے، آج اردو کے مشہور افسانہ نگار اور آپ کے بھتیجے سعادت حسن منٹو کی دسویں برسی ہے —— مجھے آپ منٹو کی برسی پر ضرور یاد آتے ہیں۔ میں نے اردو کے اس ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہی تھا کہ اچانک آپ اپنی لمبی تاروں بھری ٹوپی پہنے میرے سامنے "اڑ کر" کھڑے ہو گئے —— "اڑنا" چونکہ آپ کی خصلت ہے (تفصیلات کے لئے جھانکئے "گریبان میں") لہٰذا مجھے آپ کی "امداد" قبول کرنا پڑی۔ آپ کی امداد نے جہاں دنیا کے بیشتر ملکوں کو آپ کا محتاج بنایا ہے وہاں مجھ جیسے باصلاحیت نوجوانوں کو (اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہیں) "ناکارہ" بنانے میں بھی آپ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہاں "ناکارہ" بنانے سے مراد وہ نہیں ہے جس کا ذکر میں نے اپنے پچھلے خط میں کیا تھا۔ رہی، وہ جو آپ نے ہمارے ہوٹلوں میں استعمال ہونے والے دودھ میں میرے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کا "سدباب" شامل کر کے ہم پر اپنا مزید کرم فرمایا ہے —— بلکہ آپ نے اپنی فلموں، اپنے لٹریچر، اور اپنے نت نئے فیشنوں سے ان لوگوں کو اس طرح رجھایا ہے کہ بس وہ دھوبی کا کتا ہو کر رہ گئے ہیں، نہ گھر کے نہ گھاٹ کے، آپ کی اندھی تقلید ان کا مسلک اور "امداد" ایمان بن کر رہ گیا ہے۔

خیر، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر منٹو سے مجھے عقیدت نہ ہوتی، اور آپ میرے چچا نہ ہوتے تو شاید میں آپ کو یہ خط نہ لکھتا، تین سال قبل ۱۸ جنوری [illegible] کو جو میں نے دوسرا خط بھیجا تھا، اس کی وجہ جب بھی یہی تھی —— اور آج بھی یہی ہے ——

چچا جان، اگر آپ شرمندہ نہ ہوں تو ایک بات کہوں (مشکل تو یہی ہے کہ آپ کی مٹی میں شرمندگی کے ذرات ہوتے ہی نہیں) کہ آپ کی "دریا دلی" اور "حاتم طائیت" کی وجہ سے یہاں بڑے لوگوں میں ایک رسم اور چلی ہے کہ جہاں کوئی بات ہوئی بس جھٹ سے آپ کا نام لے دیا، کہ یہ سب کرنے اور کرانے والے ہاتھ آپ کے ہیں، اور سچ پوچھئے تو اس میں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ نے میرے ملک میں گزشتہ چودہ پندرہ سالوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی روشنی میں اگر ایسا کہتے ہیں تو کیا برا کہتے ہیں ——

ایک بات ہے چچا جان، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں؟ دنیا کے بیشتر ممالک میں مجھے آپ کی ٹانگ نظر آ رہی ہے (کتنی ٹانگیں ہیں چچا جان آپ کی ہی کیوبا میں، کانگو میں، ویٹ نام میں، اور ادھر پاکستان میں بھی آپ کی ٹانگ کہیں نہ کہیں نظر آہی جاتی ہے —— چچا جان ہم پاکستانی بڑے صلح کن اور "صلح پسند" انسان ہیں۔ چلئے ہم آپ کی ٹانگیں بھی برداشت کر لیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی ٹانگیں ہوں،

خوبصورت سڈول، چکنی اور ملین ڈالر ٹانگیں، (شاید آپ کو یاد ہو منٹو نے بھی آپ سے ایسی ہی ٹانگیں مانگی تھیں) پھر جو مزاج یار میں آئے کریں ــــ ہمیں کوئی اعتراض نہیں (ویسے کیا ہم نے کبھی اعتراض بھی کیا ہے؟) ــــ

ایک اخباری اطلاع ہے چچا جان کہ آپ نے اس سال مالی بجٹ میں فوجی مصارف کے لئے ۵۲ ارب ۴۵ کروڑ، ۶۰ لاکھ ڈالر کے مطالبات منظور کئے ہیں جو پاکستانی روپے میں تقریباً ارھائی کھرب روپے کے برابر ہے ــــ خدا آپ کو اور ترقی دے، اور رہتی دنیا تک سلامت رکھے ــ خبر میں یہ بھی ہے کہ اس رقم میں دوسرے ملکوں کی فوجی امداد کے مصارف بھی شامل ہیں۔ ــ میری ناچیز درخواست تو یہ ہے چچا جان کہ آپ دوسرے ملکوں کو دیئے جانے والی مجموعی امداد صرف پاکستان ہی کو دیں ــــ اس لئے کہ آپ نے ہندوستان کے مقابلے میں پچھلے چند سالوں میں ہمیں بہت کم امداد دی ہے، اس سے ایک تو یہ کسر پوری ہو جائے گی دوسرے اتنی امداد ملنے پر ہم آپ کے متعلق ذرا سنجیدگی سے بھی سوچ سکیں گے ــــ اس کام میں ذرا جلدی کیجئے گا، ابھی چین سے معاہدوں پر دستخطوں کا مرحلہ جاری ہے۔ اگر یہ تمام مراحل طے ہو گئے تو پھر کچھ بھی نہ ہو سکے گا ــــ

چچا جان پچھلے کچھ دنوں سے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کے ستارے گردش میں ہوں، اب یہی دیکھئے انڈونیشیا بھی آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے اقوام متحدہ سے الگ ہو گیا، چچا جان دراصل یہ منہ لگائی ڈومنی والی بات ہے ــــ اور کیا، صدر سوئیکارنو کہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کچھ عرصے سے نامناسب رویہ اختیار کر رہا ہے اور عالمی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے ــــ ارے بھئی اس میں بیچاری اقوام متحدہ کا کیا قصور، خدا کی قسم چچا جان یہ لوگ بڑے ہی بھولے ہیں۔ کشمیر، کانگو، کیوبا، ویٹ نام کے مسائل حل نہ ہو سکے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اقوام متحدہ ناکام رہی ــ بلکہ آپ نے چاہا ہی نہیں اور پھر اقوام متحدہ ہے کیا، ایسے بیسیوں ادارے آپ کی جیب میں پڑے رہتے ہیں، شہے چچا جان مرحوم روزویلٹ صاحب یہ ادارہ تو اقوام عالم پر آپ کی برتری قائم رکھنے کے لئے قائم کر گئے تھے ــــ لیکن برا ہو برے وقت کا، وہ وقت آہی گیا، جسے کہتے ہیں چور کے گھر مور ــــ

میرا جی چاہ رہا ہے چچا جان کہ میں آپ کو کچھ پاکستانی ادب کے بارے میں بھی لکھوں، آج کل ہمارے یہاں منوں کے حساب سے ادب تخلیق ہو رہا ہے جبکہ لکھ صرف وہی ادیب رہے ہیں جن کی نوکریوں کا رائٹرز گلڈ اور پریس ٹرسٹ نے ابھی بندوبست نہیں کیا ہے، اللہ نے چاہا تو بیکار ادیبوں کا مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو جائیگا۔ چچا جان اگر آپ کو اپنے ملک کے کچھ ادیبوں کا لکھنا پسند نہ ہو، اور آپ چاہتے ہوں کہ وہ نہ لکھیں تو اپنے یہاں بھی ایک رائٹرز گلڈ بنا دیجئے ــــ اس کام کے لئے آپ یہاں سے مرزا جمیل الدین عالی صاحب کو بلالیں جو "بابائے گلڈ" ہیں۔ اور گلڈ چلانے کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں ــ چچا جان یہ رائٹرز گلڈ بھی بڑی عجیب چیز ہے یہ یوں تو لکھنے والوں کی جماعت "کہلاتی" ہے۔ لیکن یہاں لکھنے والوں کے علاوہ ہر قسم کا آدمی پایا جاتا ہے۔ اس جماعت کو بقول شمیم احمد "سوائے ادب کے ادیبوں کے تمام مسائل سے دلچسپی ہے"۔ ویسے عام طور سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ گلڈ نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ادیبوں کی "تحقیق" ضرور کی ہے، اگر تمام کارکنان گلڈ کو نہیں تو کم از کم ایک کو اس "تحقیقی کام" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے ہی دینا چاہیئے۔ اچھا یہ کیجئے ایک کمیشن بٹھوا دیں۔ جو یہ فیصلہ کرے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے یا نہیں ــــ

پچھلے دنوں اطلاع ملی تھی کہ سارتر نے نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا ہے، چچا جان مجھے کچھ دال میں کالا معلوم ہوا تھا، آپ نے غور سے دیکھ تو لیا ہے نا اس کا رنگ "سرخ" تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو سارتر کو پاکستان کے دورے پر بھجوا دیئے ــــ (مجھے اپنے ملک بلانا نہ بھول لیے گا) ماموں ڈیگال تو آپ کے دوست ہیں ہی۔ وہ آپ کا حکم نہیں ٹالیں گے۔ اور سارتر ماموں جان کا ــــ ان کا رنگ چاہے کتنا ہی "سرخ" کیوں نہ ہو، ہم یہاں کالا نہ کر دیں تو کہئے ــــ اور شاید آپ کو علم نہیں، پاکستان میں جتنے بڑے ترقی پسند ادیب تھے، سب کے سب ادب چھوڑ کر بیٹ پر آ گئے ہیں۔ بیچاروں نے کسان، مزدور، خون پسینہ کے نعروں میں بال سفید کر لئے۔ لیکن اس دوران کسی نے بھی تو ان سے یہ نہ پوچھا، میاں تمہارے منہ میں کے دانت ہیں؟ ــــ ادب کی بات تو سب ہی کرتے رہے، معاملہ کی بات کسی نے نہ کی ــــ (آپ نے بھی نہیں) ویسے مجھے بڑی خوشی ہے چچا جان کہ اب ان کو عزت آبرو سے تو روٹی مل رہی ہے، یہ کیا کہ ادھر بند ہوئے ادھر چھٹے، ادھر بند ہوئے ادھر نکلے ــــ

دیکھا آپ نے یہ کمیونزم میرے ملک میں کس بری طرح مر رہا ہے (کسی لڑکی پر نہیں) بلکہ بے موت مر رہا ہے، یقین جانئے کچھ عرصہ بعد اس دنیا کے نقشہ پر

صرف آپ کا "ڈالرانم" ہی باقی رہے گا ــــ انشا اللہ ــــ معاف کیجئے غلط لکھ گیا ــــ "ڈالرا"

ٹی ایس ایلیٹ تو بیچارے اپنی موت ہی مرے ہیں، لیکن مجھے افسوس اردو کے ان بہت سے نقادوں کا ہے جو بیچارے بے موت مارے گئے، میں پریشان ہوں یہ اب لکھیں گے کیا؟

چچا جان مجھے انگریزی بالکل نہیں آتی، اور اردو بھی بس واجبی ہی آتی ہے۔ خدا بھلا کرے جمیل جالبی صاحب کا جنہوں نے "ایلیٹ کے مضامین" ترجمہ کر دیئے ہیں ــــ اور محترمہ قرۃ العین حیدر کا جنہوں نے دو ایک ڈرامے اور چند نظموں کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اب میں ان چند مضامین، ایک ڈرامے اور چند نظموں کے سہارے ایلیٹ پر دھڑلے سے بحث کر لیتا ہوں ــــ

یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرور ہوں کہ آپ کی مہربانیوں کے طفیل "کونٹیسٹ ڈانس" بھی ہمارے یہاں آگیا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ زندہ سلامت رکھے ــــ آپ ہم لوگوں کی تفریح و طبائع کا کس قدر خیال رکھتے ہیں ــــ آپ کا "ٹوئسٹ" تو ہمارے اونچے طبقے میں تو کافی مقبول تھا ہی۔ لیکن متوسط طبقے میں بھی اب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا ــــ اب آپ نے "کونٹیسٹ" بھیج دیا ہے ــــ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ڈانس رگ و پٹھوں کو تازگی، توانائی، اور نشاط بخشتا ہے ــــ واہ واہ چچا جان واہ ــــ کیا بات ہے آپ کی بھی ــــ لیکن ایک بات بتایئے، یہ جو ہمارے یہاں "مردانہ تازگی اور توانائی" کے لئے شربت اور دوسری ادویات تیار ہوتی ہیں پھر وہ کہاں جائیں گی ــــ آپ خریدیں گے انہیں؟ ــــ

لیجئے، آپ تو آپ ہی تھے ــــ آپ کے اباجان آرچ بشپ کارڈینل بھی کسی سے کم نہیں، اور پھر یہ ٹھیک بھی ہے جو روم میں انہوں نے پادریوں کے ایک اجتماع میں کہا ہے کہ "ننوں" کا لباس بھی بدلنا چاہئے۔ تاکہ لوگ مذہب کو بھی ترقی پسند سمجھیں ــــ چچا جان ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن آپ ضرور سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ آپ کے یہاں تو "ننگ" کی بڑی افراط ہے نا ــــ چچا جان یہ لوگ لباس ہی کیوں پہنتے ہیں ــــ اپنے آباؤ اجداد کے لباس میں آجائیں تو میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی ترقی پسندی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی ــــ میری ناچیز رائے تو یہ ہے چچا جان کہ انسان چھپائے وہ چیز جس کا دوسرے کو علم نہ ہو ــــ میں جانتا ہوں کہ آپ کے کوٹ اور قمیص کے نیچے کیا ہے، تو پھر لباس کا فائدہ ــــ میرا ملک تو اس معاملے میں بہت دقیانوسی ہے ابھی تک "ٹیڈی" لباس تک ہی آیا ہے۔ لیکن آپ کو کیا ہوا ــــ آپ کیوں نہیں اپنے ہاں "ننگ" ہی کو قومی ڈریس بنا دیتے۔ اور پھر تن کی عریانی سے بہتر نہیں کوئی لباس۔ خدا آپ کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے ــــ اور آپ کے طفیل وہ دن جلد آئے جب لڑکیاں جسموں پر صرف "پینٹ" کرا کر نکلیں ــــ (اس وقت مجھے اپنے یہاں کی شہریت دینا نہ بھولئے گا چچا جان)۔

اور ہاں آپ نے اس کا انتظام بھی نہیں کیا، آپ کو اپنی پچاس ریاستوں کی قسم چچا جان یہ حکم اپنے ملک میں فوراً جاری کر دیں کہ کوئی دبلا پتلا، ٹہنی جیسا لڑکا، اور چھپکلی جیسی کھچی منا لڑکی ٹیڈی لباس نہیں پہنے گی ــــ مجھے وہ لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں، جن کی نہ شکل نہ صورت اور نہ جسم ہوتا ہے اور سڑک پر تنگ لباس پہن کر مٹک کر اس طرح چلتی ہیں کہ گھر واپس آنے کو دل چاہتا ہے ــــ

حسن تو ہمارے یہاں پہلے ہی ناپید ہے۔ حقیقی حسن تو ابھی تک چچا جان پردے کے اندر رہتا ہے (آہنی سلاخوں پر پڑا ہوا پردہ نہیں) اور جو حسن پردے سے باہر آیا بھی ہے، اس کا یہ حال ہے کہ کاجل کی کجلوٹی اور پھولوں کا سنگھار ــــ یہاں کے کالج اور یونیورسٹی میں بھی بس پوچھئے نہیں ــــ دراصل ہمارے یہاں جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے پردے سے باہر آتی ہیں وہ دراصل تعلیم کو جہیز کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں ــــ اس لئے کہ حسن تو اسکول ہی سے چھٹ جاتا ہے۔ جو بچ گیا وہ انٹرمیڈیٹ کے بعد کام میں آجاتا ہے۔ اور پھر بچا کھچا گریجوایشن کے بعد ــــ ایم اے ــــ ٹیوشن ــــ ٹیوشن ــــ اب رہی یونیورسٹی تو بس ــــ اللہ ہی اللہ ہے ــــ آپ ہی کچھ خوبصورت لڑکیاں "امداد" کے طور پر یہاں بھیج دیں۔ اچھا زیادہ نہیں تو ایک حسین سی لڑکی تو ضرور بھیج ہی دیں ــــ (اس کے بدلے ایک مضمون اور سہی) ــــ

الزبتھ ٹیلر نے تو نالائق برٹن سے شادی کر لی ــــ اور کوئی ایکٹریس مجھے آپ کی پسند نہیں۔ اگرچہ آپ کا قریبی تعلق نہیں پھر بھی اب میں صرف آپ کی معرفت کرسٹائن کو پیار کا تحفہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں اگر وہ پسند کرے تو پاکستان آجائے، یہاں سوسائٹی میں ایک بنگلہ کرایہ پر دلا دوں گا ــــ وہ "باعزت" شہری کی طرح زندگی بسر کر سکے گی۔ لیکن اگر شہر کی اونچی سوسائٹی کی خواتین نے اپنے "حق" کی حفاظت کے لئے اس کے خلاف مظاہرہ کیا تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔

سیپ کراچی

آپ کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جایئے گا چچا جان، ہمارے یہاں صرف چکلوں میں عصمت فروشی پر پابندی ہے۔ (اور وہ بھی کیا ع نالہ پابند نَے نہیں ہے)

اچھا خدا حافظ چچا جان ___ باقی باتیں پھر ___

چلتے چلتے ایک خوشخبری سن لیجئے ___ ٹیلو کو ہوش آ گیا ہے ___

فقط ___ آپ کا ناچیز بھتیجہ

نسیم درّانی

وزیر مینشن، بلاک ڈی،

شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸



ای ایم فاسٹر
صبیحہ آذر

وجدان کا سفر

اگاتھلس لاج، ۸۴، بجگم روڈ، سربٹن میں رہنے والے لڑکے کے لیے وہ سائن بورڈ جو سامنے بجلی لگا ہوا تھا مستقل پریشانی کا باعث بن گیا۔ اس پریشانی اور الجھن سے تنگ آ کر جب اس نے ایک دن اپنی ماں سے بورڈ کے متعلق پوچھا تو ماں نے نفرت انگیز اور حقارت آمیز لہجے میں اسے بتایا کہ چند سال پیشتر دو بدتہذیب سے لڑکوں نے یہ بے ہودہ سا مذاق کیا تھا۔ پولیس کو چاہیئے تھا کہ بورڈ ہٹا دیتی کیونکہ ایک تو یہ کہ سائن بورڈ ایک سنسان اور بے گلی کی جانب اشارہ کرتا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ بورڈ پہ دھندلے حروف میں الفاظ تحریر تھے۔

"آسمان کی طرف۔"

"آخر وہ نوجوان کون تھے۔" لڑکے نے دریافت کیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔" ماں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارے ابا بتلاتے ہیں ان میں سے ایک شاعر تھا، نظمیں لکھا کرتا تھا یونیورسٹی سے اسے خارج کر دیا گیا تھا ۔۔۔ اور یہ حادثہ اس کیلئے بڑا اندوہناک ثابت ہوا۔ بہرحال یہ بات کافی پرانی ہے۔ تم اپنے ابا سے معلوم کرنا وہ بھی یہی کہیں گے۔ کہ یہ سب کچھ محض مذاق ہے۔"

"تو اسکا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے۔"

ماں نے اسکا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور لڑکے کو ہدایت دی کہ اوپر جا کر کپڑے تبدیل کرے کیونکہ مسٹر بونس اپنی بیوی بچوں سمیت آنے والے تھے۔ اور اسے کیک دان سنبھالنا تھا۔

لباس تبدیل کرتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اس نے سائن بورڈ کے متعلق کچھ نہ پوچھا تو بہت برا ہوگا۔ یہ ٹھیک تھا اس کا باپ بہت شفیق اور مہربان تھا لیکن جب کبھی وہ یا کوئی اور بچہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ تو وہ مضحکہ اڑاتا اور خوب زور زور کے قہقہے لگاتا لیکن مسٹر بونس کی بات دوسری تھی۔ وہ شفیق تھا اور سنجیدگی سے سب کچھ سن لیتا تھا۔ اسکا ایک خوبصورت سا مکان تھا اور ایک عمدہ لائبریری کا مالک تھا۔ جس سے ہر کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا ۔۔۔ وہ چرچ کا نگہبان تھا۔ اور علاقہ کی کونسل کا امیدوار بھی۔ اس نے ایک عوامی کتب خانے کے لئے دل کھول کر چندہ دیا تھا اور پارلیمنٹ کے ممبر اکثر اسکے پاس ٹھہرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ علاقے کے لوگوں میں وہ سب سے ذہین شخص تھا۔

ان تمام خصوصیات کے باوجود مسٹر بونس بھی اس سائن بورڈ کو محض ایک مذاق کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکے ۔۔۔ "اس کا ذمہ دار شیلے سا کوئی شخص ہے۔"

"بالکل بالکل۔" اس کی ماں چلائی۔ "اس کا نام یہی تھا۔ میں نے بھی تو تمہیں یہی کچھ بتایا تھا۔"

"کیا تم نے کبھی شیلے کے متعلق نہیں سنا؟" مسٹر یونس نے سوال کیا۔

"نہیں" یہ کہہ کر لڑکے نے سر جھکا لیا۔

"لیکن ——— کیا گھر میں شیلے نہیں ہے۔"

"کیوں ——— ہے کیوں نہیں؟" ماں کا لہجہ اونچا اور احتجاجی تھا "مسٹر لونس اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ——— کم از کم دو تو ضرور ہیں ایک تو ہماری شادی کا تحفہ ہے اور دوسرا ایک مختصر سا مطبوعہ جو ہمارے فالتو چیزوں کے کمرے میں رکھا ہے۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں اس کی تعداد سات ہے؟" مسٹر لونس نے آہستگی سے کہا اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر تھی۔ پھر اس نے پیٹ پر پڑے ہوئے کیک کے ذروں کو جھاڑا اور اپنی لڑکی کے ساتھ چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اپنی ماں کی آنکھ کے اشارے پر سعادت مندی کے طور پر لڑکا انہیں باغ کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ فوراً ہی گھر واپس نہ ہوا بکنگھم پارک روڈ پر کھڑے تھوڑی دیر تک وہ دور تک راستہ کو تکتا رہا۔

اسکے والدین سڑک کی دائیں جانب رہتے تھے۔ مکان نمبر ۳۹ کے بعد کے مکانات کی حیثیت عجیب طور سے گر گئی تھی۔ یہاں تک کہ ۴۲ نمبر مکان میں تو نوکروں کے لئے علیحدہ باہر جانے کا راستہ بھی نہ تھا۔ لیکن اسوقت تو اسے تمام سڑک اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ سورج ابھی ابھی ڈوبا تھا۔ اور کرایہ کا یہ تفاوت کیسری رنگ میں دکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں چہک رہی تھیں اور خوبصورتی سے تراشی ہوئی باڑھ میں سر جیلن کی تمام خوبصورتی سمٹ آئی تھی۔ اور یہ باڑھ کوہ المپس کی کسی وادی کا سماں پیش کرتی تھی۔ یہی باڑھ تو تھی جس نے اس لڑکے کے دل میں پہلے پہل خواہشات جگائی تھیں نامعلوم خواہش۔ انجانی اور نامعلوم شے کی خواہش ——— یہ کیسی خواہشات تھیں اسے خود معلوم نہ تھا۔ یہ خواہشات اسوقت اور زیادہ شدید ہو جاتیں جب ہول۔ سورج کی روشنی سے چمک رہا ہوتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج چمک رہا تھا اور پھر یہ خواہشات اس کے وجود میں اس وقت تک چکراتی رہتیں کہ وہ تمام چیزوں کو غیر معمولی محسوس کرتا۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا کہ وہ چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ لیکن آج وہ کچھ احمق سا ہو گیا تھا۔ وہ سڑک سے گزر کر اس سائن بورڈ تک پہنچا اور پھر خالی تنگ گلی میں بھاگتا چلا گیا۔

گلی کے دونوں طرف "آئی ون ہو۔" اور "بیلی ڈیسنا" باغات کی بلند دیواریں تھیں۔ تمام گلی میں خوشبو بکھری ہوئی تھی اگر آخری موڑ بھی شامل کر لیا جائے تو گلی مشکل سے بیس گز طویل ہو گی۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا ——— لڑکا ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ "میں اس شیلے کو ٹھوکر مار کر نکال دینا چاہتا ہوں" بے ساختہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ پھر اس نے اداسی سے اس کاغذ کو دیکھا جو دیوار پر چسپاں تھا۔ ایک بے ہودہ سا پوسٹر "اس نے واپسی سے پہلے اس کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی۔

الیف۔ اینڈ۔ سی۔ آر۔ سی۔ سی

سروس میں تبدیلی

تعاون کی کمی کی بنا پر کمپنی مجبور ہے کہ ایک ایک گھنٹے کی سروس معطل کرے۔

طلوع آفتاب و غروب آفتاب کی گاڑیاں

آپ کی خدمت کے لئے معمول کے مطابق چلایا کریں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ عوام اس نئے انتظام کی سرپرستی کریں گے جس کا مقصد ان کی خدمت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ اسکے علاوہ مزید دلچسپی کی خاطر کمپنی کی طرف سے پہلی مرتبہ جاری کئے جا رہے ہیں۔

"واپسی ٹکٹ!"

(یہ ٹکٹ صرف ایک دن جاری کیے جائیں گے، جو ڈرائیور سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مسافروں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ ٹکٹ دوسری جانب سے جاری نہیں کیے جاتے۔ اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی شکایت پر کمپنی غور نہیں کرے گی۔ اور نہ ہی مسافر کی فروگذاشت یا غلطی کی ذمہ دار ہوگی ژالہ باری، رعد، ٹکٹ کی گمشدگی یا خدائی آفت کی صورت میں بھی کمپنی کسی قسم کی ذمہ داری لینے پر تیار نہیں۔ برائے انتظامیہ

اس نے یہ اعلان اس سے پیشتر نہ پڑھا تھا۔ نہ ہی وہ یہ سمجھ سکا تھا کہ ——— اومنی بس آخر جاتی کہاں ہے "ایس" سے تو یقیناً "سربٹن" مراد تھا — اور "آر" "سی" "سی" سے مراد روڈ کار کمپنی ——— لیکن پھر دوسرے "سی" کا کیا مطلب تھا۔ شاید کومب اور مالڈن یا پھر ممکن ہے کہ "سٹی" ہو۔ اسکے باوجود یہ جنوب مغربی علاقہ کی کمپنی سے مقابلہ نہ کر سکتی تھی) لڑکے نے الجھاہٹ سے سوچا کہ تمام کاروبار بے دلی اور انتہائی غیر کاروباری طریقہ پر چلایا جا رہا ہے۔ آخر دوسری جانب سے ٹکٹ نہ جاری کرنے کی وجہ ——؟ اور گاڑیوں کی روانگی کے اوقات کیا ہیں؟ پھر اسے خیال آیا کہ اگر یہ نوٹس جعلی نہیں ہے تو جس وقت اس نے مسٹر لوئس اور اس کی لڑکی کو رخصت کیا تھا۔ یقیناً ایک اومنی بس روانگی کے لئے تیار ہوگی۔ پھر بڑھتی ہوئی تاریکی میں جھک کر اس نے زمین پر ان نشانات کو غور سے دیکھا جو پہیوں کے نشانات معلوم ہوتے تھے۔ تھے بھی اور نہیں بھی۔ لیکن اس تنگ گلی میں اس قسم کا کوئی نشان ابھرتا نہیں معلوم ہوتا تھا ——— اور اس نے بکنگھم پارک روڈ پر کبھی کوئی گاڑی نہ دیکھی تھی ——— نہیں یہ سب کچھ جھوٹ ہے، فریب ہے مذاق ہے، ایسا مذاق جیسا کہ وہ سائن بورڈ ہے۔ جیسے کہ پریوں کی کہانیاں جیسے وہ خواب جن میں راتوں کو اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ——— گہرا سانس لے کر وہ قدم اٹھاتا گلی سے نکلا اور سیدھا اپنے باپ کے بازوؤں میں چلا گیا۔

اور پھر اسکے باپ کے قہقہے کچھ نہ پوچھو۔ "عجیب بے چارا پولیسی!" وہ چلایا، "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم، بھاگ کے چلے جاتے ہیں ہر دم" اس کی ماں بھی قہقہے لگاتی اکا عکس لاشے کے زینہ پر نمودار ہوئی۔ "چھوڑو بابا" اس نے قہقہے کے درمیان کہا۔ "مت تنگ کرو اتنا ——— ارے میں مری ——— ارے بچے کو تو چھوڑ دو۔"

پھر دیر گئے تک یہ مذاق جاری رہا۔ جس میں اسکا باپ پیش پیش تھا ——— کیا یہ سفر تھکا دینے والا تھا۔ ایسا کہ آدمی مجبور ہو جائے کہ وہ اپنے جوتے دروازے کے قریب پڑے ہوئے پائیدان پر صاف کرے۔ شدید اکتاہٹ اور تکان کے احساسات دل میں لئے لڑکا اپنے بستر میں گر گیا۔ اس وقت صرف ایک بات پر خدا کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ اس نے اپنے باپ سے اومنی بس کے سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ یہ سب کچھ گو ایک مذاق سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن اس کے خواب میں یہ سب کچھ حقیقت کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا اور سربٹن کی وہ سڑکیں جن پر وہ اومنی بس کو دوڑتے دیکھ رہا تھا اور اومنی بس کے مقابلے میں محض ایک مذاق اور سایہ بن کر رہ گئیں۔ اور پھر وہ صبح سویرے چیخ مار کر اٹھ بیٹھا کیونکہ اس نے اپنی منزل کی جھلک دیکھ لی تھی۔

اس نے ماچس جلائی، اور اس کی زرد روشنی نہ صرف یہ کہ گھڑی ہی پر بلکہ کیلنڈر پر بھی پڑی۔ اور یوں اسے معلوم ہوا کہ سورج نکلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی میں کہرا لندن سے بڑھ آیا تھا اور تمام سربٹن کو اپنی آغوش میں لپیٹ لیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی جست لگا کر بستر سے باہر آ گیا، کپڑے تبدیل کئے کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہ قضیہ ہی ختم کر دے کہ حقیقت کیا ہے۔ آیا اومنی بس یا سڑکیں۔ "جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو" اس نے سوچا "میں کسی نہ کسی طور پر بے وقوف ہی بنا رہوں گا" تھوڑی دیر بعد وہ گیس لیمپ کے نیچے کھڑا سردی سے کانپ رہا تھا۔ یہ لیمپ ایک عرصے سے اس تنگ گلی کا محافظ تھا۔

گلی میں داخل ہونا بذات خود کافی جرات کا کام تھا۔ نہ صرف یہ کہ گلی خوفناک حد تک تاریک تھی۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ یہ گاڑی کا آخری اسٹاپ ہونا ممکن ہے اگر وہ کہر میں آتے ہوئے پولیس مین کے قدموں کی چاپ نہ سن لیتا تو شاید وہ کبھی اس گلی میں داخل ہونے کی کوشش ہی نہ کرتا۔ سکوت ——— اور ویرانی ——— کچھ بھی تو نہ تھا علاوہ اس ویران اور سنسان گلی کے اور ایک بے وقوف سارڈ کا

جو اس گلی کے گندے فرش پر چل رہا تھا۔ یہ سب کچھ مذاق تھا لغو مذاق ——— اس نے سوچا۔ "میں یہ سب کچھ اماں اور ابا کو بتا دوں گا میرے لئے یہ ضروری ہے۔ ہاں یہ میرے لئے انتہائی ضروری ہے کہ انہیں معلوم ہو جائے ——— میں بے وقوف ہوں کہ زندہ ہوں ———" اور پھر وہ الا فلکس لاج کے دروازہ پر واپس پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر اسے یاد آیا کہ اس کی گھڑی تیز چل رہی تھی۔ سورج ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ اس کے طلوع ہونے میں ابھی دو منٹ باقی تھے ——— "گاڑی کو اپنی حقیقت ثابت کرنے کے لئے ہر موقع دینا چاہیئے۔" اس نے خشک مزاجی سے سوچا اور واپس گلی میں رینگ گیا۔

لیکن ——— لیکن ——— اب وہاں اومنی بس موجود تھی۔

(۲)

گاڑی میں دو گھوڑے جتے تھے۔ اور اس کے دونوں پہلوؤں سے طویل سفر کے باعث دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ اور اسکے دو بڑے بڑے لیمپ کہرے اور دھند میں گلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چمک رہے تھے۔ اور ناکافی روشنی سے دیواروں پر لگی کائی اور مکڑی کے جالوں کو کسی پرستان کے سہلیں دلفریب تانے بانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ اومنی بس تھی۔ اور اس کا ڈرائیور ——— بغیر آستین کی تنگ قبا میں جکڑا ہوا بیٹھا تھا ——— اور اس کا منہ خالی دیوار کی جانب تھا۔ اور وہ آخر کسطرح اتنی صفائی اور خاموشی کے ساتھ گلی میں گاڑی لے آیا تھا۔ یہ بہت سی ایسی باتوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ تھا جو لڑکے کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکیں۔ اور یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالا تھی کہ آخر وہ کسطرح اس گاڑی کو باہر نکال لے جائے گا۔

"مہربانی ہوگی۔" اس کی آواز گڑگڑائی اور گندی فضا میں ابھری۔ "کیا یہ اومنی بس ہے۔"

"ہاں ——— اومنی بس۔" ڈرائیور نے بغیر گھومے کہا ——— اور پھر ایک لمحہ کے لئے خاموشی مسلط ہو گئی۔ گلی کے نکڑ پر سپاہی کھانستا ہوا گذرا۔ لڑکا سائے میں رینگ گیا۔ کیونکہ وہ کسی کا سامنا نہیں چاہتا تھا ——— اسے یقین تھا کہ یہ ایک سمندری لٹیرا تھا اس کی دلیل تھی کہ اسے بے ہودہ مقامات سے اتنے بے ہودہ وقت میں اور کوئی نہیں گذر رہے گا۔

"تم کس وقت روانہ ہوگے۔"

"طلوع آفتاب کے وقت۔"

"تم کہاں تک جاتے ہو۔"

"تمام راستے۔"

"اور کیا مجھے واپسی ٹکٹ مل سکتا ہے جس سے کہ میں واپس آ سکوں۔"

"قطعی۔"

"لیکن تمہیں معلوم ہے مجھے اپنی واپسی پر لوہار کا یقین نہیں ہے۔" اس بات کا ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا سورج شاید طلوع ہو گیا تھا۔ کیونکہ [illegible] ۔ اور لڑکا بمشکل تمام اچھل کر گاڑی پر سوار ہوا تھا کہ اومنی بس روانہ ہو گئی۔

آخر گاڑی گلی میں کسطرح گھوم سکے گی کیونکہ وہاں تو جگہ ہی نہ تھی۔ کیا یہ سیدھی جائے گی؟ وہاں تو صرف ایک سپاٹ دیوار تھی۔ لیکن گاڑی حرکت میں تھی۔ اور شاہانہ رفتار سے دھند میں سے گذر رہی تھی۔ دھند کی گدلائی رنگت [illegible] پیلے پن میں تبدیل ہو گئی تھی گرم گرم بستر اور گرم گرم ناشتے کے

خیال سے لڑکا نیم جان سا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کاش وہ اس طرح نہ آیا ہوتا۔ اسکے والدین اس چیز کو ناپسند کریں گے۔ وہ یقیناً واپس چلا جاتا اگر موسم اس ارادہ میں مزاحم نہ ہوتا۔ تنہائی ناقابل برداشت تھی۔ کیونکہ گاڑی میں وہ تنہا مسافر تھا۔ اور اومنی بس کو اچھی طرح تیار کی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی سرد تھی اس نے اپنے کوٹ کو چاروں طرف سے خوب لپیٹ لیا اور اس کا ہاتھ جیب سے ٹکرایا۔ جیب بالکل خالی تھی اور وہ اپنا بٹوہ بھول آیا تھا۔

"روکو ——" وہ چلایا "روکو" مایوسی اور پریشانی کے عالم میں اس کی نظر نوٹس بورڈ پر پڑی اور پھر اس نے ڈرائیور کو نام لے کر پکارا "مسٹر براؤن —— ٹھہرو —— خدا کے لئے ٹھہرو ——"

لیکن مسٹر براؤن نے گاڑی نہ روکی —— اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول کر اندر جھانک کر لڑکے کو دیکھا۔ اسکا چہرہ بہت عجیب و غریب تھا۔ شفقت اور نرم دلی کے جذبات کا آئینہ۔

"مسٹر براؤن میں اپنا بٹوہ بھول آیا ہوں۔ میرے پاس ایک دمڑی نہیں۔ میں ٹکٹ کے پیسے ادا نہیں کر سکتا۔ کیا تم اس کے بدلے میں میری گھڑی لے لو گے —— میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں"۔

"اس سفر کا ٹکٹ" ڈرائیور نے کہا "چاہے یکطرفہ ہو یا واپسی کا دنیاوی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے سکوں سے نہیں خریدا جا سکتا۔ اور وہ گھڑی بھی چاہئے وہ شارلیمین کی شب بیداری میں اسکی رفیق بنی ہو۔ یا لورا کی نیند کی پیمائش کرنے کا فخر رکھتی ہو۔ کسی صورت میں بھی ٹکٹ کا بدل نہیں ہو سکتی۔ جسپر آسمان کے پہرے سربیرس[1] کی نظر ہو"۔ یہ کہہ کر ڈرائیور نے مطلوبہ ٹکٹ لڑکے کو تھما دیا۔ اور جب لڑکے نے شکریہ کہا تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ بلا وجہ کی بیانہ بازی کتنی بے سود ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ باتیں کسی ہنستے ہوئے لبوں سے ادا ہوں تو ان پر کوئی پابندی نہیں لیکن یہی باتیں اس بیرنگ دنیا کے آدمی ہیں کیونکہ انہیں کی وجہ سے ایک شخص اپنے ساتھی سے علیحدہ پہچانا جا سکتا ہے۔ تو میاں لڑکے یاد رکھو کہ میرا نام سر تھامس براؤن ہے"۔

"کیا آپ سر ہیں اوہ —— مجھے افسوس ہے"۔ اس نے ایسے بڑے ڈرائیوروں کے متعلق سن رکھا تھا۔ "آپ کا شکریہ جناب کہ آپ نے مجھے ٹکٹ دیا۔ لیکن اگر آپ ہی گاڑی کی رفتار یہی ہے۔ تو پھر آپ کو فائدہ کیا ہوتا ہوگا"۔

"اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔ اسے منافع کے لئے نہیں بنایا گیا۔ میرے سامان میں بہت کچھ خرابیاں ہیں۔ اس میں بہت سی غیر ملکی لکڑیاں جوڑی گئی ہیں۔ اس کے گدے آرام دہ نہیں ہیں۔ لیکن اپنی لڑکھڑاہٹ سے عظمت و فضیلت بہم پہنچاتے ہیں۔ اور میرے گھوڑے سدا بلند رہنے والی گھاس پر نہیں پلے بلکہ ان کی پرورش لافانی گھاس اور چارے پر ہوئی ہے۔ لیکن اس سے کیا حاصل ہوتا ہے یہی کہ کسی موقع پر بھی کسی غلطی کا احتمال نہ تھا اور نہ ہی غلطی ہوئی"۔

"میں ایک مرتبہ پھر معافی چاہتا ہوں" لڑکے نے تقریباً مایوسی کے لہجہ میں کہا۔ سر تھامس بھی اداس ہو گئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ لڑکے کی اداسی کا سبب بنا ہے۔ خواہ ایک لمحہ ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس نے لڑکے کو دعوت دی کہ اوپر آ کر اسکے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے۔ اور پھر وہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے دھند کے درمیان سفر کرتے رہے۔ یہ دھند اب پیلا رنگ چھوڑ کر سفید دودھیا رنگ اختیار کر گئی تھی سڑک کے کنارے مکانات نہیں تھے۔ تو پھر یہ جگہ یا تو پٹنی ہو سکتی تھی یا ومبلڈن کا میدان۔

"کیا آپ ہمیشہ ڈرائیور رہے ہیں"؟

---

(۱) Cerberus کئی سروں والا کتا جو Hades (جہنم) کے دروازہ کی نگہبانی کرتا ہے۔ (۲) Sir Thomas Browne (۱۶۰۵-۱۶۸۲) Religio Medici کا مصنف، لندن کا مشہور طبیب تھا [illegible] سرس رکھتا تھا۔

"کسی زمانے میں میں ایک طبیب تھا۔"

"تو پھر آپ نے وہ پیشہ ترک کیوں کر دیا؟"

"جسمانی امراض کے معالج کی حیثیت سے میں کوئی کامیاب طبیب نہ ہو سکا۔ اس سلسلہ میں میرے اکثر مریض مجھ سے سبقت لے گئے۔ لیکن جہاں تک روحانی علاج کا تعلق ہے اس میں میں اپنی امید اور قابلیت سے زیادہ کامیاب رہا۔ اگرچہ میری دوائیں اور نسخے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور نتیجہ خیز نہ تھیں۔ لیکن میں نے فریب اور چالاکی کے ایسے پیالوں میں ان کو دوائیں دیں کہ ان کو دوا پینے کی ترغیب ہوتی اور کمزور روحیں شفایاب ہو جاتیں۔"

"کمزور روحیں" لڑکا بڑبڑایا "اگر پیڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو جائے اور تم وہاں اچانک بھوندار ہو جاؤ، تو کیا یہی کمزور روح کہلائے گی۔"

"کیا تم نے کبھی ایسا محسوس کیا ہے؟"

"ہاں ۔۔ کبھی ۔۔"

کچھ وقفے کے بعد اس نے لڑکے کو سفر کے متعلق بہت ہی مختصر طور پر معمولی سا اظہار کیا لیکن وہ لوگ اب زیادہ باتیں نہ کر رہے تھے۔ کیونکہ لڑکے کی عادت تھی کہ جب وہ کسی کو پسند کر لیتا تو اسکے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش بیٹھا صرف سنتا رہتا۔ سرتھامس براؤن بھی اسی مزاج کے ان شخصوں میں سے ایک تھا۔ جن سے لڑکے کو ابھی متعارف ہونا تھا۔ اس نے شیلے کے متعلق بھی بہت کچھ سن رکھا تھا جو اب بہت مشہور ہو گیا تھا جس کی اپنی گاڑی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے اور دوسرے ڈرائیوروں کے متعلق بھی بہت کچھ سنا تھا۔ جو کمپنی کی ملازمت میں تھے۔ اسی دوران روشنی تیز تر ہوتی گئی۔ کیونکہ کہر ابھی تک نہیں چھٹی تھی۔ لیکن اب یہ کہر سے زیادہ دھند معلوم ہوتی تھی جو کبھی کبھی ان کے اطراف سے یوں بکھرتی ہوئی گزر رہی گویا وہ کسی بادل کا ٹکڑا ہو۔ یہ دونوں بڑے پرپیچ راہ سے بلندی کی طرف محوِ سفر تھے۔ گھوڑوں کو اپنی منسی کی ٹھڈی پر زور دیکر کھینچتے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا تھا۔ اگر یہ چند پہاڑی بھی ہوتی تو بھی وہ بہت پہلے اس کی چوٹی تک پہنچ گئے ہوتے۔ شاید یہ الیسم یا ارتھرڈلاون پہاڑی ہوگی۔ لیکن یہاں کی ہوا ان دونوں مقامات کی ہوا کے مقابلہ میں زیادہ تیز اور سخت تھی۔ جہاں تک ان کی منزل کا تعلق تھا سرتھامس براؤن اس سلسلے میں قطعی خاموشی اختیار کئے تھے۔

دھماکہ!

"خدا کی قسم یہ تو بجلی کا کڑکا ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "اور یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں۔ ذرا اس سے پیدا ہونے والی گونج تو سنو یہ تو پہاڑی سے بھی زیادہ مہیب معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے اپنے ماں باپ کے متعلق سوچا لیکن اس وقت وہ ان کے لئے زیادہ پریشان نہ تھا تصور میں اسنے ماں باپ کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ اس کی جگہ خالی تھی۔ اسکے بعد یقیناً کچھ سوالات کچھ اندیشے، چند مذاق کچھ مسائل اور دم دلاسہ کی باتیں ہونگی۔ پھر دوپہر کے کھانے پر انتظار کیا جائیگا۔ لیکن دوپہر کے کھانے کے وقت وہ نہ جا سکیگا اور نہ چائے کے وقت البتہ یہ ممکن ہے کہ رات کو وہ کھانے کے وقت پہنچ جائے اور یوں دن بھر گھر سے فرار کا اختتام ہوگا۔ اگر اسکے پاس بٹوہ ہوتا تو وہ ان کے لئے چند تحائف ضرور خرید لیتا۔ گو پہلے سے نہ معلوم تھا کہ تحائف کے لئے وہ کیا کچھ خرید کرتا۔

دھماکہ!

تیز ہوا کا ایک جھکڑ اور بجلی کی روشنی ایکساتھ آئیں۔ بادل یوں لرزا گویا وہ جاندار ہو۔ اور دھند کی منتشر لکیریں تیزی سے گذر کر معدوم ہو گئیں۔۔ "کیا تم خوفزدہ ہو۔" سرتھامس براؤن نے پوچھا۔

"کس چیز سے ڈرو گے —— یہ تو جو کچھ بھی ہو رہا ہے بہت دور ہو رہا ہے۔"

گاڑی کو کھینچنے والے گھوڑے یوں رک گئے گویا اچانک آگ کا کوئی گولا پھٹ کر بکھر جائے اور پھر ایک مہیب آواز گونجی ہے ایسی مہیب آواز جو کانوں کے پردے پھاڑ دے۔ گویا کسی لوہار کی بھٹی سے اٹھنے والی آگ کی آواز پھر تمام بادل یکایک بکھر گئے۔

"سر تھامس پراؤن سنئے۔ ! ہاں میرا مطلب ہے۔ دیکھئے ہمارے سامنے کیا عمدہ منظر ہے۔ نہیں نہیں ذرا سنئے میرا مطلب ہے سنئے وہ آواز جو یوں ابھر رہی ہے گویا دھنک !"

وہ تمام شور معمولی سرگوشیوں میں ڈوب چکا تھا اور اس کی تہہ سے ایک نئی سرگوشی ابھر رہی تھی، اور چپکے چپکے پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کا پھیلاؤ بتدریج ایک قوس کی شکل اختیار کر رہا تھا جس میں گو کہ وسعت مزید تھی لیکن اختلاف نہ تھا۔ پھیلتی ہوئی ان قوس قزح —— دھنک تھی جو گھوڑوں کے پاؤں سے ابھر رہی تھی اور فضا میں گھلی ہوئی دھند میں معدوم ہو جاتی تھی۔

"لیکن —— واہ کیا خوبصورتی ہے ! کیا رنگ ہیں ! یہ کہاں ختم ہو گی —— ؟ یہ دھنک تو یوں معلوم ہوتی ہے کہ اس پر چلا بھی جا سکتا ہے —— یہ تو کچھ کچھ خواب سا ہے۔"

وہ رنگ اور وہ صدا (آواز۔ آہنگ) ساتھ ساتھ پیدا ہوئے —— اور ایک بہت بڑی خلیج پر یہ دھنک یوں اتری کہ پل کی شکل اختیار کر گئی —— بادلوں کے گالے اس کے نیچے سے تیرتے ہوئے گذرتے اور بکھر بکھر جاتے —— اور دھنک تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے کی جانب، تاریکی کو ختم کرتی تقسیم کرتی ہوئی۔ اور آخر کار دھنک اس مقام پر آ کر کہ جو بادل سے زیادہ ٹھوس معلوم ہوتی تھی۔

لڑکا کھڑا ہو گیا —— "وہ پار کیا ہے ——" وہ چیخا —— "آخر یہ دوسرے کنارے پر کس چیز پر ٹھہری ہوئی ہے"!

صبح کی سورج کی روشنی میں دور خلیج کے پار ایک ٹیلا چمکا —— ٹیلا تھا یا کوئی قلعہ۔ گھوڑے بڑھے اور پہلا قدم دھنک پر پڑنے لگے۔

"آہا —— آہا" لڑکا چلایا "دیکھئے —— سنئے —— کیا وہ غار ہیں۔ یا پھاٹک۔ ذرا پہاڑوں کے اس سلسلے کے پیچھے چمکتی ہوئی چوٹیوں کو دیکھئے —— مجھے تو وہاں درخت بھی نظر آ رہے ہیں اور انسان بھی۔"

"ذرا نیچے بھی تو دیکھو لو" سر تھامس نے سرگوشی میں کہا۔ "خدائی ایکرن[1] کو نظر انداز نہ کرو"

لڑکے نے نیچے دیکھا۔ دھنک کے ان شعلوں سے بھی نیچے جو گاڑی کے پہیوں سے چھٹے ہوئے تھے۔ خلیج اب بالکل صاف ہو گئی تھی اور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک ابدی دریا رواں تھا —— سورج کی کرن گذری اور ہر رنگ کی جھیل سے جا ٹکرائی۔ جب وہ لوگ وہاں سے گذر رہے تھے تو لڑکے نے تین دوشیزاؤں کو جھیل کی سطح پر ابھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ تینوں گا رہی تھیں۔ اور کسی ایسی چیز سے کھیل رہی تھیں۔ جو انگشتری کی طرح چمک رہی تھی۔

"تم کہ جو نیچے پانی میں ہو ——" اس نے مخاطب کیا۔

"اور تم جو اوپر پل پر ہو ——" انہوں نے جواب دیا اور تیز موسیقی فضا میں منتشر ہو گئی۔ "تم جو اوپر پل پر ہو —— سدا خوش رہو سچائی گہرائی میں بھی ہے اور سچائی بلندی پر بھی ہے"

---

(۱) Acheron تھسپروشیا (Thesprotia) کی ایک ندی جسکا دیوتا Ceres زمین کی دیوی کا بیٹا تھا اور جو Titans کے خوف سے جہنم میں جا چھپا۔ وہاں وہ کڑوے پانی کے چشمے میں تبدیل ہو گیا۔ مردہ لوگوں کی روحیں اولاً اسی مقام پر لائی جاتی ہیں۔

"تم کہ جو نیچے پانی میں ہو کیا کر رہی ہو۔"

"اس مرتبہ مسٹر تھامس براؤن نے جواب دیا۔"اس دولت طلائی پر مسرور ہیں جو ان کے اپنے قبضہ میں ہے۔" اس وقت گاڑی اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی

(۳)

لڑکا بڑی افسوسناک حالت میں تھا۔ اور اگلا تھک ۔۔۔ ایک کمرے میں مقید بیٹھا سزا کے طور پر شاعری پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ نے غصہ سے کہا تھا"برخوردار ۔۔۔ میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن غلط بیانی کو نہیں معاف کر سکتا۔" اور پھر اس نے لڑکے کو بید سے خوب پیٹا ۔۔۔ اور ہر ضرب پر اسکے منہ سے الفاظ نکلتے "نہ اومنی بس کا کوئی وجود ہے اور نہ ڈرائیور کا، نہ پل کا، نہ پہاڑ کا ۔۔۔ تم ذلیل ہو ۔۔۔ نالائق کیڑے ہو اور جھوٹے ہو" کبھی کبھی اسکا باپ انتہائی جابر ہو جاتا۔ اس کی ماں بہت گڑگڑائی تھی کہ وہ اپنی غلطی کی معافی مانگ لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین دن تھا باوجودیکہ اسکا خاتمہ بید کی سخت مار اور شاعری کے مطالعہ پر ہوا۔

ٹھیک غروب آفتاب کے وقت وہ واپس آگیا تھا اس موقع پر مسٹر تھامس براؤن گارڈ کی بانسری تھا ملکہ ایک ایک خوبصورت دوشیزہ یہ فرائض ادا کر رہی تھی۔ جو خوش مذاق تھی ۔ اور ان کا موضوع گفتگو اومنی بس کے علاوہ بجلیاں اور طلسم تھیں۔ اور اسوقت اس کی شیریں آواز کتنی دور تھی! اور ابھی صرف تین گھنٹے ہی گذرے تھے ۔ جب اس نے اسے تنگ گلی کے نکڑ پر چھوڑا تھا۔

اس کی ماں نے دروازے میں آکر آواز "ڈیئر ۔۔۔ آؤ تم نیچے آجاؤ اور شاعری کی کتاب بھی لیتے آؤ۔"

نیچے آنے پر اسے معلوم ہوا کہ مسٹر لوئس اسکے باپ کے ساتھ سمبا کو نوشی کے کمرے میں موجود ہے۔ آج ایک ڈنر پارٹی تھی۔

"یہ عظیم سیاح سے ملو" اسکے باپ نے مضحکہ خیز لہجہ میں کہا "اس نوجوان سے ملو جو اومنی بس میں دھنک پر سفر کرتا ہے۔ اور نوجوان دوشیزائیں اسکے لئے گیت گاتی ہیں۔ خوش مذاقی کے اس انداز پر اس نے قہقہہ لگایا۔

"بہرحال" مسٹر لوئس نے کہا "ویگنر[1] کے ہاں بھی کم وبیش اسی سے ملتی جلتی کیفیات ہیں۔ گو یہ بات عجیب ہے لیکن غیر تربیت یافتہ میں بھی فنکارانہ صداقت کی روشنی مل جاتی ہے مجھے تو یہ معاملہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ مجرم ہے تو مجھے اس کی وکالت کرنے دو ہم اپنے زمانے میں ہم سب لوگ رومان پسند رہے تھا ۔۔۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ ؟"

"سنا ۔۔۔ مسٹر لوئس کتنے رحمدل ہیں" اس کی ماں نے کہا۔ لیکن اسکے باپ نے کہا۔ "ٹھیک ہے ذرا اسے نظم سنانے دو ۔۔۔ تو

---

(۱) RICHARD WAGNER (۱۸۱۳–۱۸۸۳) لیپزگ میں پیدا ہوا۔ وہ موسیقی کا عظیم کمپوزر تھا اور ۱۹ویں صدی میں فن موسیقی پر بری طرح اثر انداز ہوا۔ اس نے موسیقی کے فن کو برتنے کے طریقوں میں انقلاب برپا کیا سادہ گوریں (Choruses) اور Set Ballads کے بغیر اوپیرا Opera میں وحدت عمل کا وہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جو کسی ڈرامہ میں بغیر موسیقی کے موجود ہوتی ہے۔ موسیقی میں خیالات اور [illegible] کے تسلسل کی اس تشکیل کو مقبول ہونے میں گو بہت عرصہ لگا لیکن آج اس کی موسیقی میں ڈرامائی اظہار کے واحد ذریعہ مانا جاتا ہے۔ ویگنر اپنے مقام کے لئے بڑی برات وقت کے ساتھ رہا لیکن اسکو اپنے جوہر دکھانے کا پورے طور پر اسوقت موقع ملا جب شاہ لیوارلنے کی مدد کی۔ بیروت کے مشہور اوپیرا ہاؤس میں ویگنر کے آخری نام اوپیرا پیش کئے گئے۔ جن میں تین حصوں میں مکمل RING DES NIBELUNGEN اور آخری پیشکش PARSIFAL تھی جس میں اسکا فن انتہائی کمال کو پہنچا ہوا ہے۔

تو بات ختم ہو جائے گی۔ یہ سنگل کوکو میری بہن کے گھر جائے گی ہی اور وہ گلی کے اس گندے کیڑے کا مزاج ٹھکانے کر دے گی۔" (قہقہہ)

"چلو نظم سناؤ ـــ"

لڑکے نے نظم شروع کی "بھیانک لاعلمی کے درمیان تن تنہا کھڑے ہوئے۔"

اسکاٹ پھر ہنس پڑا اور رگڑ کر بولا۔" برخوردار ـــ یہ تمہارے لئے ہے ـــ بھیانک جہالت میں تن تنہا کھڑے ہوئے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ شاعر حضرات بھی کبھی کبھی عقل کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہ تمہارے اوپر صادق آتا ہے۔ اچھا لیونس اب اس شاعری کو تم سنبھالو اور ان حضرات کو سمجھاؤ، ٹھیک ہے نا ـــ جب تک میں وہسکی لاتا ہوں۔"

"اچھا ـــ لاؤ کیٹس کی کتاب مجھے دو تاکہ یہ یاد کی ہوئی نظم مجھے سنائیں۔"

چنانچہ سٹاک روشنی کے کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے وہ دانشمندانہ شخص اور کم علم لڑکا تنہا رہ گئے ـــ

"بھیانک لاعلمی کے درمیان تن تنہا کھڑے ہوئے خوابوں میں میں تجھے دیکھتا ہوں اور سائیکلیڈز کو بھی بالکل اسی طرح جو ـــ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا اور اچانک اسکے دل میں خواہش جاگ اٹھے کہ وہ جائے ـــ"

"بالکل ٹھیک، ـــ کہاں جائے؟"

"گہرے سمندروں میں ان مچھلیوں کے پاس جنکا رنگ سرخی ہوتا ہے۔" یہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑکا زار و قطار رونے لگا۔

"ادھر آؤ ـــ آخر تم رو کیوں رہے ہو ـــ"

"کیونکہ ـــ کیونکہ یہ الفاظ جو پہلے نظم یا گیت کی شکل میں تھے۔ اب جبکہ میں واپس آ گیا ہوں میرا وجود اختیار کر گئے ہیں۔"

مسٹر لیونس نے کیٹس کی کتاب نیچے رکھ دی۔ یہ واقعہ تو ان کی توقع سے زیادہ ہی دلچسپ تھا ـــ "تم ـــ" وہ چلایا ـــ "یہ نظم تمہارا وجود ہے؟"

"جی ہاں ـــ آگے سنئے۔ اور تاریکی کے کنارے پر روشنی ابھر رہی ہے ـــ اور پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن کے سبزہ زاروں پر کسی کے قدم نہیں پہنچے۔ ـــ جناب یہ سب کچھ ایسا ہی ہے ـــ یہ تمام باتیں حقیقت ہیں۔"

"میں نے کبھی ان کی حقیقت پر شبہ نہیں کیا۔" مسٹر لیونس نے آنکھیں بند کرکے کہا۔

"تو ـــ تو آپ میرا یقین کرتے ہیں ـــ آپ کو اومنی بس، ڈرائیور، طوفان، اور واپسی کے ٹکٹ پر بھی یقین ہے۔ واپسی کا ٹکٹ جو مجھے بغیر معاوضہ کے ملا تھا اور ـــ"

"اچھا برخوردار اب اپنی داستان طرازی ختم کرو۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میں نے شاعری کی اہم صداقت پر کبھی شبہ نہیں کیا کچھ دن بعد جب تم کچھ اور زیادہ پڑھ لکھ جاؤ گے تو تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن مسٹر لیونس حقیقت یہی ہے کہ تاریکی کے کناروں پر روشنی موجود ہے۔ میں نے اس روشنی کو ابھرتے دیکھا ہے ـــ روشنی اور تیز ہوا ـــ"

"کیا حماقت ہے" مسٹر لیونس نے کہا۔

"کیا اچھا ہوتا اگر میں وہیں ٹھہر جاتا ـــ وہ تمام چیزیں مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اپنا ٹکٹ واپس کر دو ـــ کیونکہ ٹکٹ واپس کرنے کے بعد وہاں سے واپس نہیں آیا جا سکتا۔ ان پریوں نے مجھے دریا سے پکارا ـــ اور میں یقیناً ان کی باتوں میں آ جاتا۔ کیونکہ میں نے کبھی بھی اتنی مسرت محسوس نہ کی تھی۔ جتنی پہاڑوں کے ان سربلند سلسلوں میں مجھے محسوس ہوئی۔ لیکن مجھے اپنی ماں

کا اور اپنے باپ کا خیال آیا اور میں نے چاہا کہ ان کو بھی وہاں لے جاؤں ۔ لیکن وہ جانے کے لئے تیار نہیں۔ اگرچہ وہاں جانے کے لئے سڑک ہمارے مکان کے بالکل مقابل ہے ۔۔ اور یہ تمام واقعات بالکل اسی طرح پیش آ رہے ہیں۔ جیسا کہ ان آسمانی لوگوں نے پیش گوئی کی تھی ۔ یہاں تک کہ مسٹر لوبنس نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھ پر یقین نہ کیا ۔ مجھے بید سے پیٹا گیا اور اب شاید میں کبھی اس کوہسار کو نہ دیکھ سکوں"۔

مسٹر لوبنس کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچانک مستعد ہو گئے۔ اور کہا۔ "میرے متعلق کیا بات ہے "

"میں نے انہیں آپ کے متعلق بتایا تھا کہ آپ کتنے ذہین ہیں آپ کے پاس کتنی ڈھیر ساری کتابیں ہیں اور انہوں نے کہا کہ مسٹر لوبنس بھی یقیناً تم کو جھوٹا سمجھیں گے "

" محض حماقت اور بے وقوفی کی باتیں ہیں میرے دوست ۔ تم گستاخی پر اتر آئے ہو ۔ میں ۔۔۔ پھر میں اب اس قصہ کو ختم ہی کر دونگا تمہارے ابا سے اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ کہونگا ۔ میں تمہارا علاج کر دونگا ۔ کل شام میں خود تم کو تمہیں سیر کرانے لے جاؤنگا ۔ اور غروب آفتاب کے وقت ہم مقابل کی اس تنگ گلی میں جائیں گے ۔ اور تمہاری اومنی بس کو تلاش کریں گے ۔ میں تمہیں کیا بتاؤں تم جھوٹے بھی ہو اور بے وقوف بھی "

اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا کیونکہ لڑکا اس تجویز کا مخالف نہ تھا ۔ بلکہ وہ تو کمرہ میں گنگناتا پھر رہا تھا ۔" واہ ۔۔۔ واہ ۔۔۔ میں کتنا خوش ہوں ۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم یقیناً میری بات پر یقین کر دگے ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ دھنک پر سفر کریں گے ۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے ۔" بہرحال کیا کہانی میں کوئی نہ کوئی حقیقت ہو سکتی ہے ؟ دیگنز ۔ کیٹس ۔۔۔ شیلے ۔ سر تھامس براؤن آخر یہ کیا ہیں ۔۔ ؟ معاملہ یقیناً دلچسپ تھا ۔

اور دوسرے دن شام کے وقت اگرچہ بارش ہو رہی تھی لیکن مسٹر لوبنس اگا تھکس لاج جانا نہ بھول سکے ۔

لڑکا تیار تھا ۔۔ اور خوشی اور جوش کے جذبات سے بے قابو ۔ اور سڑک پر یوں اچھلتا کودتا چل رہا تھا کہ لٹریری سوسائٹی کا سیکریٹری پریشان سا ہو گیا ۔ پھر وہ گھوم کر بکنگھم پارک روڈ پر ہو لئے ۔ اور پھر اطمینان کر کے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے وہ تنگ گلی میں رینگ گئے اور قدرتی طور پر (کیونکہ سورج غروب ہو رہا تھا) وہ اومنی بس کے پیچھے بھاگے ۔

" غضب خدا کا " مسٹر لوبنس چلایا " اف توبہ خدایا ۔۔۔ غضب ہے "

یہ وہ اومنی بس نہ تھی جس میں لڑکے نے پیشتر سفر کیا تھا ۔ اور نہ وہ تھی جس میں اس کی واپسی ہوئی تھی ۔ اس میں تین گھوڑے جتے تھے سیاہ ، بھورا اور سفید ۔ اور ان میں بھورا گھوڑا سب سے عمدہ تھا ۔ ڈرائیور نے مسٹر لوبنس کا استفہامیہ جملے سن کر پلٹ کر دیکھا ۔ وہ سانولے سے رنگ کا شخص تھا اسکے بڑے بڑے خوفناک آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں ۔ مسٹر لوبنس نے اسے دیکھا تو ان کے منہ سے ایسی چیخ نکلی کہ گویا وہ اسے پہچانتے تھے اور پھر خوف سے تھر تھرانے لگے ۔

لڑکا کود کر اندر داخل ہو گیا ۔

" کیا یہ ممکن ہے " مسٹر لوبنس چلائے ۔ " کیا ناممکن ممکن ہو سکتا ہے "

" آیئے جناب ، اندر آ جایئے " لڑکا چلایا " یہ اومنی بس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تو انتہی عمدہ ہے کہ بس ارے واہ یہاں نام بھی لکھا ہوا ہے ۔۔۔ کوئی ڈان ہے "

مسٹر لوبنس بھی اچھل کر داخل ہوئے ۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اومنی بس کے دروازے تیز کھٹ سے بند ہو گئے اور تیز جھٹکے کی وجہ سے کھڑکیوں کے پردے بھی کھسک کر بند ہو گئے ۔ کیونکہ ان کے اسپرنگ کمزور ہو چکے تھے ۔

"بھی کہا تھا آن ——— میں بھی تو دیکھوں ——— اوہ خدایا گاڑی تو چل رہی ہے!"

"واہ ——— واہ" لڑکا خوشی سے چلایا۔

مسٹر لونس بدحواس ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں یوں اغوا کر لیا جائے۔ انہیں دروازے کا نہ تو ہینڈل ہی مل سکا اور نہ وہ کھڑکی کے پٹ کھول سکے۔ اومنی بس بالکل تاریک تھی اور اسوقت تک انہوں نے ماچس جلائی تھی۔ رات باہر تمام ماحول پر قبضہ جما چکی تھی۔ اور وہ تیزی سے سفر طے کر رہے تھے۔

"یہ ایک عجیب اور یادگار سفر ہے" مسٹر لونس نے کہا اور ماچس کی روشنی میں گاڑی کے اندر کا جائزہ لیا۔ گاڑی خاصی بڑی اور کشادہ تھی اور ہر حصہ انتہائی قاعدے میں بنایا گیا تھا۔ اور ہر حصہ دوسرے حصے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ دروازے پر جسکا ہینڈل باہر تھا، یہ الفاظ تحریر تھے۔ Lasciate Ogni Baldanza voi che Entrate صرف یہی الفاظ وہاں پر درج تھے ——— لیکن مسٹر لونس کے خیال میں [illegible] سے مراد یا تو Ashby Army تھی یا کچھ اور جیسا کہ غلطی سے Speranza کی بجائے Baldanza لکھ دیا گیا تھا۔

یہ بات کہتے وقت مسٹر لونس کا لہجہ ایسا ہو گیا گویا وہ کسی چرچ میں گفتگو کر رہے ہوں۔ اسی دوران لڑکے نے بگھی کے ڈرائیور سے دو واپسی ٹکٹ طلب کئے۔ ڈرائیور نے خاموشی سے دو ٹکٹ اسے تھما دیئے۔ مسٹر لونس خوف سے کانپ گئے۔ اور چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور چپکے سے کہا "معلوم ہے یہ کون ہے؟" اسوقت ڈرائیور کی چھوٹی سی کھڑکی بند ہو گئی تھی ——— "یہ ناممکن ہے"

"کچھ بھی ہو میں اس کو مسٹر تھامس براؤن سے زیادہ پسند نہیں کرتا ——— لیکن اگر یہ اس سے زیادہ بہتر تھا تب بھی مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا"

"اس سے بھی زیادہ بہتر" مسٹر لونس نے غصہ اور جھلاہٹ سے کہا "یہ محض اتفاق ہے کہ تم نے اس صدی کی سب سے بڑی حقیقت کو دریافت کر لیا ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ یہ شخص زیادہ بہتر ہے۔ کیا تمہیں سفید جلد چڑھی ہوئی وہ کتابیں یاد ہیں۔ جو میری لائبریری میں موجود ہیں اور جن پر سونے کے سرخ پھول چھپے ہوئے ہیں ——— یہ شخص ہے جس نے وہ کتابیں لکھی ہیں۔"

لڑکا خاموش بیٹھا رہا ——— اور تھوڑے توقف کے بعد بولا "معلوم نہیں ہم مسز گمپ سے مل بھی سکیں گے یا نہیں!"

"مسز ———"

"مسز گمپ اور مسز ہیرس ——— مجھے مسز ہیرس زیادہ پسند ہیں۔ میں اچانک ان سے ملا تھا۔ مسز گمپ کے دفتی کے ڈبے ڈھکن پر تیزی کے ساتھ متحرک تھے کہ اچانک ان کے پیندے علیحدہ ہو گئے۔ اور مسہری سے دو سیب لڑھک کر نیچے چھلنی میں جا گرے۔"

مسٹر لونس نے چیخ کر کہا۔ "باہر وہ شخص بیٹھا ہوا ہے۔ جو ان کتابوں کا مصنف ہے جن پر باریک جھلی کی جلد چڑھی ہے اور میرے پاس ہیں لیکن تم ہو کہ ڈکنس اور مسز گمپ کی باتیں کر رہے ہو۔"

لڑکا محجوب ہو گیا اور کہنے لگا "میں مسز گمپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور اسکو دیکھ کر اپنی خوشی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی وہ اسوقت مسز ہیرس سے مسز پریگ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔"

"کیا تم نے وہ تمام دن اس کی پُرعظمت رفاقت میں گزارا تھا۔"

"نہیں نہیں ——— میں دوڑتا بھاگتا پھر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک شخص نے مجھے ریس کورس میں بٹھا دیا۔ آپ دوڑیں گے تو آپ کو بھی سمندر میں وہ سرخ رنگ کی مچھلی ملے گی۔"

"واقعی ——— کیا تمہیں اس شخص کا نام یاد ہے۔"

"اکلیز[1] ——— نہیں وہ تو بعد میں ملا تھا۔ اسکا نام ٹوم جونز ہے"

مسٹر یونس نے گہرا سانس لیا۔ "تم نے تو تمام کچھ گڑبڑ کر دیا ——— تم سوچو اگر تمہاری جگہ کسی مہذب اور عالم آدمی کو یہ موقع ملتا تو کیا ہوتا ——— تعلیم یافتہ شخص ان تمام کرداروں سے اچھی طرح واقف ہوتا اور اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اسکو ہر ایک کردار سے کیا کچھ کہنا ہے ——— وہ اپنا وقت یوں کسی مسز گیمپ یا ٹوم جونز سے مل کر نہ برباد کرتا۔ ہومر، شیکسپیئر اور اس شخص کی تخیلات (جو اس وقت ڈرائیو رہے) ہی اسکو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہوتیں۔ وہ تمہاری طرح ادھر ادھر بھاگتا نہ پھرتا۔ وہ کچھ ذہانت کے سوال کرتا۔"

لڑکے نے عاجزی سے کہا "مگر مسٹر یونس میں نے نہیں بتا دیا تھا۔ کہ آپ ایک عالم آدمی ہیں"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" مسٹر یونس نے کہا۔ "جب ہم وہاں پہنچیں تو کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ مجھے شرمندگی ہو۔ نہ بلا وجہ کی باتیں کرنا، نہ ادھر ادھر دوڑتے پھرنا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے رہنا اور ان لافانی شخصیتوں سے اس وقت تک ہمکلام نہ ہونا جب تک کہ وہ خود تم سے گفتگو کریں۔ (دربار) واپسی ٹکٹ مجھے دو۔ تم انہیں کھو دو گے۔"

لڑکے نے ٹکٹ تو واپس کر دیئے لیکن اسے افسوس بہت ہوا۔ بہر حال وہ اسے یہاں تک لانے میں کامیاب تو ہو ہی گیا تھا۔ اول تو اس پر یقین ہی نہ آنا چاہیئے تھا۔ کجا یہ کہ اس کو ہدایت دی جا رہی تھیں ——— اس وقت بارش تھم چکی تھی اور چاند کی روشنی پردے کی جھریوں میں سے ادمنی بس میں داخل ہو رہی تھی۔

لڑکا چلایا "لیکن آج دھنک کیونکر ہوگی۔"

"تم مجھے پریشان کر دیتے ہو۔" مسٹر یونس نے ناگواری سے کہا۔ "میں اس حسن پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر میرے ساتھ کوئی مودب اور ہمدرد شخص ہوتا۔"

لڑکے نے اپنے ہونٹ چبائے۔ اس نے سینکڑوں ارادے کئے۔ کہ وہ اس دوران ہر لمحہ مسٹر یونس کی نقل کرے گا۔ نہ وہ ہنسے گا نہ دوڑے گا۔ نہ گائے گا۔ اور نہ ہی کوئی ایسی بے ہودہ حرکت کا مرتکب ہوگا۔ جس سے اسکے نئے دوست کو پچھلی ملاقات کے موقع پر بدمزگی حاصل ہوئی ہوگی۔ ان کے ناموں کے صحیح تلفظ ادا کرنے میں بہت محتاط رہے گا۔ اور یاد رکھے گا کہ ان میں سے کون کس کو جانتا ہے ——— اکلیز، ٹام جونز کو نہیں جانتا تھا یہ تو بہر کیف مسٹر یونس نے اسے بتا ہی دیا تھا۔ گو حیرت انگیز مسز گیمپ سے تو عمر میں بڑا (؟) ہی تھی، یہ بھی مسٹر یونس نے ہی بتایا تھا۔ اب وہ بڑا خود آگاہ، محتاط اور سنجیدہ رہے گا۔ وہ کبھی یہ نہیں کہے گا۔ کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اچانک اس کے سر کی جنبش سے کھڑکی کے پردے کھل گئے اور یہ تمام نیک ارادے ہوا میں بہہ گئے۔ کیونکہ اب ادمنی بس چاندنی میں نہائی ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ اور سامنے ایک غار تھا۔ جسکے پیچھے کہساروں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ اور ان پر نیلا بید (؟) چھائی ہوئی تھی۔ اور کہساروں کے بیچ لافانی دریا میں بہار رہے تھے۔ لڑکا خوشی سے چلا اٹھا "پہاڑ ——— سنیئے پانی سے ابھرتے ہوئے نغمے کو سنیئے۔ اور گھاٹیوں میں (؟) روشنی کو دیکھیئے۔" مسٹر یونس نے جلدی سے دیکھا۔ اور جھلائے ہوئے لہجہ میں کہا "پانی الاؤ کی روشنی! کیا خرافات بک رہے ہو، اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

---

(1) Achilles ——— پیلوس (Peleus) اور تھیٹس (Thetis) کا بیٹا جب بچہ تھا تو اس کی ماں نے اسے جھوٹ (؟) میں جھونکا جس کی بنا پر اس کا تمام جسم ناقابل تسخیر ہو گیا۔ سوا ایڑیوں کے کیونکہ اس کی ماں نے اسے ایڑیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ ایک جنگ میں اس نے Hector کو بھی قتل کیا لیکن بالآخر پیرس نے ایڑی پر تیر مار کر اسے ختم کر دیا۔

لیکن اس کی آنکھوں میں ایک دھنک ابھر آئی۔ اس کی تخلیق میں سورج کی روشنی اور طوفان کی ملاوٹ نہ تھی ـــ بلکہ یہ دھنک تو چاند کی روشنی اور دریا کے عکس ریزوں کی تخلیق تھی۔ تینوں گھوڑوں نے اس دھنک پر قدم اٹھائے۔ اس نے سوچا کہ یہ ان تمام دھنکوں میں سب سے افضل ہے۔ جو اب تک اس نے دیکھی تھیں ـــ لیکن وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ مسٹر لونس تو اسبات کا یقین ہی نہ کر رہے تھے کہ کھڑکی کھل گئی تھی وہ کھڑکی میں جھک گیا۔ اور وہ دھن گنگنانے لگا جو خوابیدہ پانیوں سے ابھر رہی تھی۔

"رائن گولڈ کا دیباچہ" مسٹر لونس نے اچانک کہا۔ "تمہیں یہ تمام حوالے کس نے بتائے ہیں ـــ؟" اور پھر انہوں نے بھی کھڑکی سے باہر دیکھا اور ان کے رویہ میں اچانک غیر معمولی تبدیلی آ گئی اور نہ پوچھا: کہ حلق سے ابھری اور اومنی بس کے فرش پر بے سدھ ہو کر گر پڑے وہ بری طرح اپنے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور چہرے کا رنگ سبز پڑ گیا تھا۔

لڑکے نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا۔ "کیونکہ کیا پل کو دیکھ کر آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے"۔

"حالت غیر ہو رہی ہے"۔ مسٹر لونس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں واپس جانا چاہتا ہوں، ڈرائیور سے کہو واپس چلے۔"

لیکن ڈرائیور نے انکار میں اپنا سر ہلایا۔

"ہم وہاں پہنچ ہی چکے ہیں ـــ" لڑکے نے کہا۔ "وہ سب سو رہے ہیں۔ کیا میں انہیں آواز دوں، وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے کیونکہ میں نے ان کو پہلے ہی بتا دیا ہے"۔

مسٹر لونس کراہ کر چپ ہو رہے۔ وہ چاندنی کی اس دھنک پر بڑھتے رہے، اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے رہے یہ دھنک گاڑی کے پہیوں کے پیچھے ٹوٹ کر بکھرتی رہی۔ رات کس قدر پرسکون تھی۔ اور اس ماحول میں گیٹ پر کون پہرہ دے رہا ہوگا ـــ؟

"میں آ رہا ہوں"۔ لڑکا یکبارگی پھر اپنے تمام منصوبے بھول کر چیخا۔ "میں واپس آ رہا ہوں ـــ میں واپس آ رہا ہوں"

"لڑکا واپس آ رہا ہے" ایک آواز نے دوسری بہت سی آوازوں کو خبردار کیا اور ان کی طرف سے بھی یہی صدا آئی "لڑکا واپس آ رہا ہے ـــ"

"میں مسٹر لونس کو بھی اپنے ہمراہ لا رہا ہوں"۔

صرف خاموشی ـــ

"مجھے شاید یہ کہنا چاہیئے تھا کہ مسٹر لونس مجھے اپنے ہمراہ لا رہے ہیں"۔

گمبھیر خاموشی۔

"سنتری کے فرائض کون ادا کر رہا ہے"۔

"اکلیز"۔

اور پھر اس چٹانی راستہ پر دھنک کے پل کی قوس ختم ہو گئی ـــ اور اس نے ایک توانا جوان دیکھا جو ایک حیرت انگیز ڈھال اٹھائے ہوئے تھا۔

"مسٹر لونس ـــ یہ اکلیز ہے ـــ آلات حرب سے لیس"۔

"میں واپس جانا چاہتا ہوں"۔ مسٹر لونس نے کہا۔

دھنک کی آخری خوشبو بھی فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اور پہلے اس زندہ و جاوید پہاڑی پر نغمہ باری کرنے لگے۔ اومنی بس کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا ـــ لڑکا تیزی سے باہر آیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اچھل کر اس بہادر سے ملنے کے لیے بڑھا۔ وہ ہیرو

ایک دم تیزی سے جھکا اور لڑکے کو اپنی ڈھال پر روک لیا۔

" اکلینز" لڑکا چلایا " مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جاہل ہوں اور آوارہ ہوں مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اس مسٹر یونس کا انتظار کروں جس کے متعلق میں نے تم کو کل بتایا تھا۔"

لیکن اکلینز نے اسے اوپر اٹھا لیا۔ اور وہ اس حیرت انگیز ڈھال پر دبک گیا۔ اور پھر اس نے شہ زوروں کو دیکھا جلتے ہوئے شہروں کا نظارہ کیا۔ وہ انگوروں کے باغات میں جو سنہرے پن میں ملفوف تھے گھوما۔ اور پھر اسے اپنے تمام جذبات کی تسکین اور ہر خوشی کے میسر ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے اس کہسار کا پورا پورا نقشہ دیکھا جو اس کی دریافت تھی۔ وہ ان تمام چیزوں پر محیط تھا اور ایک لافانی روشنی کو رواں دواں تھی ــــ " نہیں ــــ نہیں ــــ میں اس قابل نہیں ہوں " لڑکے نے احتجاج کیا۔ " مسٹر یونس کو اس جگہ ہونا چاہیئے۔"

لیکن مسٹر یونس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اکلینز نے واضح طور پر ان سے چیخ کر کہا۔ " میری ڈھال پر سیدھے کھڑے رہو۔"

" جناب میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا کسی انجانی قوت نے مجھے کھڑا کر دیا ہے۔ جناب آخر آپ دیر کیوں کر رہے ہیں؟ جناب یہاں صرف اکلینز ہی ہے۔ جس کو آپ بھی طرح جانتے ہیں۔"

مسٹر یونس چلائے " مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے ــــ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں " پھر مسٹر یونس نے ڈرائیور سے چیخ کر کہا۔ " مجھے بچاؤ! اپنی گاڑی روکو ــــ میں نے تمہاری عزت کی ہے۔ میں نے تمہارے حوالے دیئے ہیں۔ میں نے تمہاری کتابوں کی خوبصورت جھلی دار جلد بنائی ہے ــــ مجھے میری دنیا میں واپس لے چلو۔"

ڈرائیور نے جواب دیا ــــ " میں ذریعہ ہوں انجام نہیں۔ میں غذا تو ہو سکتا ہوں لیکن زندگی نہیں اپنے آپ کھڑے ہو اسی طرح جیسے لڑکا کھڑا ہوا ہے۔ میں تمہیں نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ شاعری روح ہے اور وہ لوگ جو اس کی پرستش کرتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ روح اور سچائی کی پرستش کریں۔"

مسٹر یونس ــــ وہ بے چارے یہ تمام کچھ برداشت نہ کر پائے۔ اور آگے کھسک کر باہر آ گئے۔ ان کا چہرا نکلا۔ جو خوفناک حد تک پھیل گیا تھا۔ پھر ان کے ہاتھ باہر آئے۔ ایک ہاتھ سے انہوں نے سیڑھیوں کو پکڑ رکھا تھا۔ اور دوسرا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ پھر ان کے کاندھے آگے آئے، پھر ادر سینے ــــ " مجھے لندن دکھائی دے رہا ہے " ان کے منہ سے چیخ کے درمیان یہ الفاظ نکلے اور پھر وہ تیزی سے گر گئے ــــ گرنے اور انتہائی زور سے چاندی میں نہائی ہوئی سخت چٹان پر جا پڑے ــــ وہ اسپر اس طرح گرے تھے گویا وہ چٹان نہیں بلکہ پانی ہے گرے اور غائب ہو گئے اور پھر اس لڑکے کو کبھی نظر نہ آئے۔

" مسٹر یونس آپ کہاں گر گئے! دیکھئے۔ روشنیاں سے اور موسیقی بکھرتا ایک جلوس آپکی پیشوائی اور عزت کے لئے آ رہا ہے۔ یہ مرد تھا۔ یہ عورتیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ناموں سے آپ خوب واقف ہیں کہسار جاگ اٹھا ہے۔ دریا بھی نیند سے چونک اٹھا ہے۔ اور دیکھیں دور سے میرے سمندر ان خوشنما اور خوشرنگ مچھلیوں کو نچا رہے ہیں۔ یہ تمام چیزیں آپ کے لئے ہیں۔ یہ سب آپکو چاہتی ہیں۔"

اس وقت اسکو اپنی پیشانی پر تازہ تازہ پتوں کا لمس محسوس ہوا۔ کسی نے اسکو تاج پہنایا تھا۔

ΤΕΛΟΣ

(اقتباس از کنگسٹن گزٹ، سربٹن ٹائمز، اور رینز پارک آبزرور۔ برانڈ سی تھیس ورکس کے علاقہ میں مسٹر سپٹیمس یونس کی لاش بڑی خستہ حالت میں پائی گئی ہے۔ ہلاک ہونے والے کی جیبوں سے برآمد ہونے والی اشیا میں ایک طلائی ٹھوس نقرئی سگار کیس بیجو تحفظ کی لغت اور ادبی لسانی کہ دو طبعات شامل ہیں۔ صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ اس بدقسمت شخص کو کافی بلندی سے پھینکا گیا ہے۔ واقعات انتہائی مشکوک ہیں اور حکام اس کی تندہی سے تحقیق میں مصروف ہیں۔

بیرٹولٹ بریشٹ

علی ناظم

نالائق بڑھیا

بیرٹولٹ بریشٹ Bertolt Brecht. جسے آج کے جرمن ادب میں صرف (BB) کے مختصر نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جرمنی کے اس صف اول کے فنکاروں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے جرمن ادب و روایت میں اپنا مستقل مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں آؤس برگ کے ایک انتہائی مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہوا اور زندگی کے ابتدائی ایام نہایت سختی میں بسر کئے لیکن ۱۹۵۶ء میں انتقال کے وقت اس کی موت کو جرمن ادب میں ایک عظیم ستون، گرنے سے تعبیر کیا گیا۔

جنگ عظیم اول سے قبل کے جرمن ادب پر اظہاریت کی تحریک غالب تھی۔ سوشیلزم کے اثرات قبول کر لینے کے بعد اس تحریک میں قومیت کا رجحان تیز تر ہو گیا چنانچہ بریشٹ کے یہاں یہی اجتماعی شعور انقلابی انداز کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ماضی پر فخر کے ساتھ ساتھ اس کو حال کی پستیوں کا بھی شدید احساس ہے۔ چنانچہ جا بجا طنز کے پردے میں اسی حقارت کا اظہار کرتا ہے۔ یہی انداز فکر آگے چل کر اس کو اشتراکی مسلک سے بھی ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ بریشٹ کی ادبی شہرت کا آغاز اس کی ڈرامہ نگاری سے ہوا جس میں وہ تاثراتی تحریک سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔ یہ زمانہ ویمر جمہوریہ کے آغاز کا زمانہ تھا چنانچہ ایک انقلابی کی حیثیت سے بریشٹ نے بڑے جرأت مندانہ تجربے کئے۔ ۱۹۳۳ء میں نازی غلبے کے بعد اس نے جرمنی کو خیر باد کہا اور یورپ کے مختلف ممالک میں گھومتا پھرتا ۱۹۴۱ء میں امریکہ پہونچ گیا۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر وہ جرمنی واپس آگیا۔ اور کچھ عرصہ مشرقی برلن میں قیام کے بعد آسٹریا کے غیر جانب دار ملک میں چلا گیا اور زندگی کے باقی ایام وہیں بسر کئے۔

ڈرامہ کے علاوہ بریشٹ شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے اس کا انداز جدت سے عاری ہونے کے باوجود جذبات سے مملو ہے نثر میں اور خصوصیت کے ساتھ مختصر افسانے میں بریشٹ کا سرمایہ بہت کم ہے۔ لیکن یہ کم سرمایہ بھی اس کو آج کی جرمنی کے مختصر افسانہ نگاروں میں چوٹی کا فنکار تسلیم کرواتا ہے، موضوع، ہیئت اور اسلوب تینوں اعتبار سے اس کی تخلیقات مکمل فنی کہی جا سکتی ہیں۔ ٹیکنک سے قطع نظر پیش کش میں بھی بریشٹ کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس سے وہ قاری پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے گو اس میں کوئی Decoration نہیں ہوتا، لیکن اس پر بھی کہی جانے والی بات کا پیرایہ قاری کی دلچسپی کا موجب بنتا ہے، زیر نظر افسانہ "نالائق بڑھیا" Die Unwürdige Greisen

اس کے مشہور افسانوی مجموعہ "کیلنڈر کی کہانیاں" (Kalender Geschichten) سے لیا گیا ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی یا اس سے کچھ پہلے تک صرف کیلنڈر پڑھ لینا ہی جرمنی کا عوامی معیارِ مطالعہ خیال کیا جاتا تھا۔ برلیشٹ اپنی افسانوی دنیا میں اسی قدیم المانی زندگی کی مختلف جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ اس کا انداز اگرچہ بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی اس کا شوخ قلم جابجا طنز سے نہیں چوکتا۔ یہاں اگر ہمیں تخلیق کے پس منظر میں اس عہد کے معاشرے کی صحیح عکاسی سے برلیشٹ کے سماجی شعور کا اندازہ ہوتا تو شخصیت و کردار کے تجزیے سے اس کی نفسیاتی آگہی کا بھی احساس ملتا ہے — مترجم

جس وقت دادا جان کا انتقال ہوا تو میری دادی کی عمر بہتر سال تھی۔ دادا کا قصبہ میں ایک چھوٹا سا چھاپہ خانہ تھا۔ جس میں وہ مرتے دم تک دو چار کاریگروں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ گھر کا سارا کام کاج دادی ہی کے ذمہ تھا حتیٰ کہ کاریگروں کے لئے کھانا بھی وہ خود ہی پکاتی تھیں۔ بہتر سال کی یہ پستہ قد دبلی پتلی عورت یوں تو بالکل کم گو تھی۔ لیکن اس کی چھپکلی جیسی چمکدار آنکھوں میں زندگی کا پورا ہنگامہ سمایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس بے کیف زندگی کے آتے آتے ان کے سات بچے ہوئے تھے۔ جن میں سے پانچ زندہ رہے۔ یہ سب اب جوان تھے۔

دادی کی اولاد میں سے دو لڑکیاں تو امریکہ چلی گئی تھیں اور اسی طرح دو لڑکے بھی کسی جگہ نکل گئے تھے۔ اب قصبہ میں ان کا سب سے چھوٹا بیٹا باقی رہ گیا تھا۔ یہ جلد سازی کا کام کرتا تھا اور مستقل طور پر بیمار رہتا تھا۔ اس بیچارہ اپنے کنبہ کا اکیلا کمانے والا تھا۔

جب دادا کا انتقال ہوا تو گھر پر صرف اکیلی دادی ہی موجود تھیں۔

دادا کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے چاروں طرف سے خطوط بھیجے جن میں سب ہی نے دادی کے مستقبل کا سوال اٹھایا۔ ان میں سے ایک نے تو ان کو اپنے ساتھ رکھنے کی بھی پیش کش کی۔ جلد ساز بھی ان کو اپنے یہاں لے آنا چاہتا تھا۔ لیکن بڑی بی نے کسی کی تجویز نہ مانی۔ اور اولاد سے صرف تھوڑی رقم ماہانہ بانٹ کرنے کے لئے لکھ دیا۔ اس وقت کاروبار کی حالت انتہائی سقیم ہو چکی تھی، چھاپہ خانہ بہت پرانا ہو گیا تھا اور اس پر قرض کا بھی بار تھا۔

پہلے تو ہر ایک نے یہی کہا کہ اس عمر میں بڑی بی کو تنہا نہیں رہنا چاہئے۔ لیکن جب وہ کسی طرح بھی راضی نہ ہوئیں تو لوگوں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تھوڑی تھوڑی رقم ماہوار بھیجنا منظور کر لیا۔ ویسے بھی جلد ساز تو قصبہ ہی میں تھا، لہٰذا سب مطمئن ہو گئے۔

جلد ساز وقتاً فوقتاً اپنے بھائی بہنوں کو ماں کے بارے میں لکھتا رہتا تھا۔ اس کے وہ تمام خطوط جو اس نے میرے والد کو تحریر کئے میں نے پڑھے اس کے علاوہ ایک مرتبہ میں خود بھی قصبہ گیا تھا۔ اور آخر میں دادی کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے سے مجھے ان تمام واقعات کا علم ہوا جو ان دو سالوں میں رونما ہوئے تھے۔

جلد ساز شروع ہی سے اس بات سے سخت ناراض تھا کہ ماں نے اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کا مکان کافی بڑا تھا اور اس کا بہت بڑا حصہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ اور جلد ساز بے چارہ اپنے پورے کنبہ کے ساتھ ایک تنگ مکان میں گزر بسر کر رہا تھا۔ دادی سے اس کے تعلقات واجبی ہی تھے۔ وہ ہر اتوار کو اس کے بچوں کو چائے پر بلا بھیجتی تھیں۔ یا پھر کبھی آٹھ نو مہینے پیچھے ایک یا دو مرتبہ بیٹے کے یہاں چکر لگا جاتی تھیں۔ لیکن کچھ یوں ہی سا۔ کبھی بہو کو چٹنیاں اور مربے بنانے میں مدد دیتیں یا پھر بہو کے تنگ و تاریک مکان کے بارے میں چند جملے کہہ دیتیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی خاص لگاؤ یا کسی قسم کا تاسف نہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ میرے والد نے جلد ساز کو خط لکھا اور اس میں دادی کے موجودہ مشاغل کے بارے میں دریافت کیا جس کا اس

نے بہت مختصر سا جواب دیا یعنی "آج کل وہ سینما دیکھ رہی ہیں۔"

ظاہر ہے یہ جواب اولاد میں سے کسی کے لئے پسندیدہ نہ تھا۔ یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ آج سے تین پینتیس سال پہلے سینما کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔ جائے وقوع نہایت نامعقول بلکہ اکثر تو آبادی کے بیچوں بیچ ہی ہوتا تھا۔ رنگے ہوئے گتوں اور تختوں ہی پر کل کائنات منحصر ہوتی تھی۔ انہی پر قتل وغارت گری، لڑائی، عشق و محبت کی داستانیں غرض سب کچھ دکھا دیا جاتا تھا۔ یہ جگہ یا تو من چلے نوجوانوں کے لئے مخصوص تھی۔ یا پھر یہاں وہی لوگ آتے تھے جو طبعاً اوباش واقع ہوئے تھے۔ بہتر سال کی ایک بوڑھی عورت کے لئے بلاشبہ یہاں کوئی تفریح نہ تھی۔

نوبت یہاں تک پہونچی کہ دادی نے نہ صرف بیٹے ہی سے ملنا جلنا ترک کر دیا بلکہ اب تو وہ جان پہچان والوں سے بھی ملتے ہوئے کترانے لگیں۔ وہ نہ کسی کے گھر جاتیں اور نہ ہی کسی کو اپنے یہاں مدعو کرتیں۔ قہوہ خانہ جانا بھی ترک کر دیا اور اس کی جگہ جوتوں کی ایک فیکٹری میں آنے جانے لگیں۔ یہ جگہ ان دنوں نہایت ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی اور عوام میں اس کا چرچا سنا جاتا تھا۔ خاص طور پر سہ پہر کے وقت وہاں جانا بہت ہی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت کارخانے کی ملازمائیں اور کاریگر عام طور سے اپنے پیشہ ورانہ کاموں سے خالی ہوتے تھے۔

فیکٹری کا مالک جو خود بھی جوتے بناتا تھا ادھیڑ عمر کا ایک جہاں دیدہ سا آدمی تھا۔ لیکن ساری دنیا دیکھنے کے باوجود بھی وہ ہر قسم کے جوہر سے خالی تھا۔ اس کے علاوہ اپنی شراب نوشی کے لئے بھی بدنام تھا۔ اس طرح اس میں کوئی بات بھی ایسی غیر معمولی نہ تھی جس سے اسے دادی کا ہم مشرب قرار دیا جا سکے۔

جلد ساز نے ایک مرتبہ لکھا کہ میں نے جوتے بنانے والے کی شخصیت کے بارے میں کئی مرتبہ ماں کی توجہ دلائی۔ لیکن انہوں نے مطلق دھیان نہ دیا۔ "آخر اس میں کوئی بات تو ہوگی۔" یہاں کا مختصر سا جواب تھا۔ اس کے بعد کسی نے ان سے اس بارے میں گفتگو نہیں کی۔ دادی جس مسئلہ پر بات نہ کرنا چاہیں اسے چھیڑنا واقعی آسان کام نہ تھا۔

دادا کے انتقال کے کوئی چھ مہینہ بعد جلد ساز نے میرے والد کو لکھا "اب تو اماں ہر دوسرے دن ہوٹل میں کھانا کھاتی ہیں۔" واقعی کتنی عجیب بات تھی!

دادی جنہوں نے ساری عمر درجن بھر آدمیوں کا کھانا اپنے ہاتھوں پکایا اور خود بچن کھچن ہی پر گذر بسر کی۔ اب ہوٹل میں کھانا کھانے لگیں!

اس کے فوراً ہی بعد کاروبار کے سلسلہ میں میرے والد کا قصبے جانا ہوا۔ انہوں نے ماں سے ملاقات کی۔ اس وقت وہ کہیں جانے کو تیار تھیں بیٹے کو آتا دیکھ کر ہیٹ اتار دیا اور بیٹھ گئیں۔ اپنے ہاتھوں سے سرخ شراب[1] کا ایک گلاس اور کچھ بسکٹ والد کو دیئے۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ بالکل معتدل نظر آ رہی تھیں۔ نہ بہت ہشاش بشاش اور نہ ہی بالکل سنجیدہ۔ لیکن یہ تو ان کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ کمرہ واقعی بہت صاف ستھرا تھا اور وہ خود بھی صحت مند نظر آ رہی تھیں۔

لیکن اس ملاقات میں ایک بات واقعی بڑی عجیب تھی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے میرے والد کے ساتھ قبرستان جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں شوہر کی قبر پر جانا پسند نہ تھا۔

"تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔" انہوں نے بڑی سادگی سے کہا۔ "اور ہاں وہ گیارہویں قطار میں الٹے ہاتھ سے تیسرے نمبر والی ہے۔ اچھا اب میں چلی۔"

بعد میں جلد ساز نے میرے والد کو بتایا کہ اب یہ سیدھی جوتے بنانے والے کے یہاں جائیں گی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے

---

[1] جرمنوں کی قومی شراب، RO TWAN

اور بہت سی شکایتیں کیں۔

"میں اس تنگ کوٹھری میں پڑا ہوا ہوں۔ پانچ گھنٹہ کام کرتا ہوں۔ طبیعت الگ ساتھ چھوڑے جا رہی ہے۔ ہاضمہ ٹھیک نہیں رہتا۔ اور اب دھندا بھی کچھ نہیں رہا ہے۔ مگر ان کا سڑک کے کنارے والا مکان بالکل خالی پڑا ہے۔"

میرے والد نے سرائے میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ لیکن وہ بھی کم از کم دل میں اس بات کے ضرور آرزو مند تھے کہ ماں کی جانب سے مکان میں رہنے کی پیش کش ضرور کی جائے گی۔ لیکن دادی نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ حالانکہ پہلے مکان میں جگہ نہ ہونے کی صورت میں اگر کبھی والد سرائے میں ٹھہر جاتے تو دادی ان پر خفا ہوتی تھیں۔

اب تو وہ خاندان سے بالکل ناطہ توڑ چکی تھیں اور ایک نئی راہ پر گامزن تھیں۔ لیکن آخر زندگی کا یہ کونسا رجحان تھا اور اس کی منزل کہاں تھی؟ میرے والد بڑے خوش باش آدمی ہیں اس مسئلہ پر بھی ان کا فیصلہ کچھ اسی قسم کا تھا انہوں نے چچا سے کہا۔

"بڑی بی سے کچھ نہ بولو، جو چاہیں سو کریں۔"

دوسری خبر یہ آئی کہ دادی نے ایک گاڑی بھی خرید لی ہے اور ہر جمعرات کو کسی تفریح گاہ پر جاتی ہیں۔ گاڑی بھی اچھی خاصی بڑی، بڑے بڑے پہیے، مضبوط گھوڑے اور پورے خاندان کی گنجائش۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کبھی کبھار جب ہم بچوں کی پلٹن دادا کے یہاں پہونچتی تو سیر کرانے کے لئے ایک گاڑی کرایہ پر لی جاتی تھی جس میں ہم سب بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن دادی کبھی شریک نہ ہوئیں۔ وہ ہمیشہ کھڑکی پر رہ جاتیں اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہم سب کو رخصت کر دیتیں۔ گاڑی میں دادی کا سفر "ک" تک ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑا شہر تھا اور قصبہ سے کوئی دو اسٹیشن کے فاصلہ پر واقع تھا یہاں گھوڑدوڑ ہوتی تھی۔ اور اسی میں شرکت کے لئے دادی جمعرات کے یہاں پہونچتی تھیں۔

جلد ساز دن بدن چوکنا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا میرے والد نے حظ بڑھ کر سر ہلا دیا۔ وہ اس بارے میں ڈاکٹری مشورے کے مخالف تھے۔

"ک" تک دادی تنہا نہیں جاتی تھیں بلکہ ان کی ہمراہی میں ایک جوان عورت بھی ہوتی تھی۔ یہ اسی ہوٹل کی باورچن تھی۔ جہاں اب دادی کھانا کھانے لگی تھیں، "بڑی سرانہ ہے۔" جلد ساز نے ایک خط میں اس کے لئے لقب بھی تجویز کر دیا۔

اس عورت نے تو ایک نیا کھیل شروع کر دیا۔ دادی اس کے ہاتھوں بالکل احمق بن گئیں۔ وہ اس کو روزانہ اپنے ساتھ سینما لے جاتیں اور واپسی پر جوتے بنوانے والے سے بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ دونوں عورتیں سرخ شراب کے ساتھ باورچی خانے میں تاش کھیلا کرتی ہیں۔

"اب تو انہوں نے اس بے کالا کے لئے ایک ہیٹ بھی خرید دیا ہے۔" جلد ساز نے بہت جل کر لکھا "اور اپنی آنلکے اس سالگرہ کے لئے جوڑا بھی نہیں ہے!"

اب چچا کے خطوط دیوانہ وار چلے آ رہے تھے۔ جس میں ہماری پیاری ماں کے نالائق کردار کے علاوہ اور کچھ تحریر نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد کی تمام باتیں مجھے والد کی زبانی معلوم ہوئیں۔

سرائے کے مالک نے اجنبی سمجھ کر ایک دن آنکھیں گول کر کے میرے والد سے کہا۔

"مساۃ 'ب' تو مزے اڑا رہی ہیں جیسا کہ سننے میں آیا ہے۔"

لیکن زندگی کے آخری چند سال جو دادی نے بسر کئے کسی طرح بھی پر تکلف نہیں کہے جا سکتے۔ جس روز وہ ہوٹل میں کھانا

نہیں کھاتیں تو گھر پر ان کی غذا تھوڑی سی آملیٹ، ایک پیالی کافی اور ان کے پسندیدہ بسکٹوں ہی تک محدود ہوتی تھی۔ اس بچت سے وہ سرخ شراب خریدتی تھیں جسے کھانے کے دوران صرف ایک چھوٹے گلاس کی حد تک استعمال کیا جاتا تھا۔ گھر البتہ بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور یہ صفائی صرف ان کے اپنے استعمال کی جگہوں میں یعنی باورچی خانے اور سونے کے کمرے ہی تک محدود نہیں ہوتی تھی بلکہ اس سرے سے اس سرے تک گھر کا کونا کونا جھڑا پونچھا نظر آتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اولاد کے علم میں لائے بغیر مکان بھی رہن رکھ دیا۔ لیکن یہ بات آج تک معلوم نہ ہو سکی کہ انہوں نے اس روپیہ کا کیا کیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس روپیہ سے جوتے بنانے والے کی کفالت کرتی تھیں۔ اس لئے کہ دادی کے انتقال کے بعد اس نے دوسرے شہر میں جوتوں کا بھاری کاروبار شروع کر دیا جہاں محض تھوک سے جوتوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

یقیناً دادی پہلو بہ پہلو دو مختلف اور متضاد زندگیاں بسر کر گئیں۔ پہلی زندگی بحیثیت بیٹی، بحیثیت بیوی اور بحیثیت ماں اور دوسری زندگی صرف بحیثیت عورت بس — ایک بالکل سیدھی سادی زندگی جس میں آزادی کے باوجود بلا کا توازن قائم رہا۔ پہلی زندگی تقریباً ساٹھ سال جاری رہی اور دوسری دو سال سے بھی کچھ کم۔

میرے والد کی آنکھوں دیکھی بات ہے ان کا کہنا تھا کہ اپنی زندگی کے آخری سال کے نصف حصے میں دادی نے حقیقی آزادی حاصل کر لی تھی جس کو عام آدمی حاصل کرنا تو درکنار سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ گرمیوں میں وہ تین بجے ہی بستر سے اٹھ جاتیں اور قصبہ کی سنسان گلیوں میں چہل قدمی کرتیں۔ اس طرح ان کو تنہائی کا صحیح لطف حاصل ہوتا تھا۔ قصبہ کا پادری جو اکثر ان کی تنہائیوں کا شریک ہوتا تھا، کبھی کبھی ان کے ساتھ سینما بھی چلا جاتا تھا۔ لیکن اس تنہائی کے باوجود وہ تنہا نہیں تھیں۔ فیکٹری والے کی صحبت میں اور بہت سے اسی قماش کے لوگ شریک رہتے تھے اور بڑی افواہیں سننے میں آتی تھیں۔ ان صحبتوں میں بھی وہ ہمیشہ اپنی ذاتی شراب استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ نشست کے تمام افراد نہایت بیہودہ اور لغو قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ وہ دنیا بھر کی باتیں کرتے اور قصبہ کی مقتدر شخصیتوں کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ ان نشستوں سے اٹھتے ہوئے دادی نشہ میں دُھت ہوتی تھیں۔

اچانک دادی کا انتقال ہو گیا۔

جی ہاں خزاں کی ایک سہ پہر کو سونے والے کمرے میں — لیکن بستر پر نہیں بلکہ لکڑی کے ایک اسٹول پر، وہ بھی کھڑکی کے سامنے نشستہ حالت میں — انہوں نے شام کو اپنی لنگی کو سینما چلنے کی دعوت دی تھی اور جلد ہی وہ آئی ان کا دم نکل گیا — اس وقت وہ پورے بہتر سال کی تھیں۔

میرے پاس ان کا ایک فوٹو ہے جس میں وہ موت کے بستر پر دراز ہیں۔

دیکھنے میں ایک چھوٹی سی پیشانی جس میں جا بجا شکنیں پڑی ہیں، پتلے پتلے ہونٹ لیکن چوڑا دہانہ، قامت میں بہت چھوٹی لیکن چھوٹے انسانوں کی طرح نہیں — اپنی زندگی کے طویل سال انہوں نے محض دوسروں کو جیتا رکھنے میں بسر کر دیئے اور بہت ہی قلیل عرصہ کے لئے صرف اپنے لئے زندہ رہیں۔ اس پر بھی انہوں نے زندگی کے دسترخوان کا آخری ریزہ تک چن لیا —

سُدھیندر ناتھ
ہارون سوریا

ابھاگن

نریندر پرشاد کی بیوی بھانومتی کی آٹھویں اولاد تھی، لکشمی عرف ابھاگن۔

ابھاگن کی پیدائش کا وقت ہی منحوس تھا۔

نریندر پرشاد اپنی پانچ بیٹیوں کی شادی کا بوجھ اٹھا چکا تھا۔ اپنی تمام تر پونجی سے محروم اب قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ دو بیٹے تھے، جن کے تعلیمی اخراجات اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ پچاس روپے ماہوار آمدنی، گھر کے تمام تر اخراجات کو کس طرح پورا کیا جائے، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

آٹھویں اولاد اور وہ بھی لڑکی۔ باپ نے اپنے من کے دکھ کو من ہی من میں دبا کر لڑکی کا نام لکشمی رکھا۔ اور ماں نے اُسے "ابھاگن" کا نام دیا۔

ابھاگن کی عمر بڑھتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا روپ اس کی عمر کو چھپاتا گیا۔ بھرپور جوانی اس کے پورے جسم پر چھا گئی۔ اور وہ دوشیزہ نظر آنے لگی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی، اس کی شادی کی فکر سے ماں باپ کی آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔

ایک روز ماں نے سبزی کاٹتے ہوئے اپنی انگلی کاٹ لی۔ بیٹی فوراً دوڑی آئی۔ انگلی پر پٹی باندھی، اور دونوں ہاتھ ماں کے گلے میں ڈال کر بولی۔

"ماں! یہ تم ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہو ——— ؟"

ماں رکھائی سے بولی۔ "جا، تو اپنا کام کر۔"

لڑکی نے ماں کی جھڑکی کا کوئی اثر نہیں لیا اور بولی "کہو نا ماں، ماں کہو نا"۔

ماں نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کو مارنا چاہا، مگر ہاتھ گال کی بجائے گردن سے چپک گیا۔ ماں نے لڑکی کو سینے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابھاگن! دوسری جگہ نہ ملی تجھے، مرنے کے لئے میرے ہی پیٹ اتر آئی۔ پورا نصیبہ جلا کر آئی!"

لڑکی ہنستے ہوئے بولی "میرا طوطا کیا کہہ رہا ہے، سُن ماں"

طوطا اس وقت بول رہا تھا "لکشمی بہن آ، لکشمی بہن آ"۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولی "جا طوطے کو کھانا دے آ۔"

"میں باورچی خانے میں جاتی ہوں"

لڑکی طوطے کے پاس جانے کے بجائے آہستہ آہستہ باپ کے پاس پہنچی۔ باپ اُس وقت پچاس روپے گننے میں مصروف تھا۔ نئے مہینے کی ابتدا ہے۔ قرض خواہ یکے بعد دیگرے آئیں گے۔ مالک مکان کرایہ کے اور گوالہ دودھ کے پیسے مانگے گا، اور پھر راشن والا، کپڑے والا بھی۔

ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا خرچ کس طرح پورا کیا جائے گا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اتنے میں ابھاگن نے پکارا "باپو!" آواز نریندر پرشاد کے کانوں تک نہ پہنچی۔

پھر لڑکی نے ذرا زور سے آواز دی "باپو!"

اب کے نریندر پرشاد نے سن لیا۔ اس نے جواب دیا "کیا بات ہے لکشمی؟" ابھاگن نے سوچا تھا۔ باپو سے پوچھوں گی کہ ماں رات دن کس لیے اتنی فکرمند رہتی ہے۔ مگر باپ کا چہرہ دیکھ کر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

نریندر پرشاد بولا "پیسہ لینا ہے؟ لکشمی یہ ایک پیسہ لے۔" ابھاگن پیسہ کو پلو میں باندھ کر لوٹ آئی۔ اور راستے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سوچنے لگی کہ ماں اور باپ کس لیے اس قدر فکرمند رہتے ہیں۔

گوالے کے کافی پیسے باقی تھے۔ اُس نے دھمکی دی تھی کہ اب کے دودھ نہیں دے گا۔ راشن والا کہہ کر گیا تھا، دال اور چاول اب ادھار نہیں ملے گا۔ سنار کہہ چکا تھا کہ تین روز میں پیسے نہ ملے تو رپورٹ کر دے گا۔ یہ سب کیا ہے، اس نے سوچا۔ جو آتا ہے، پیسوں کا تقاضا کرتا ہے۔ کوئی اگر آواز دیتا ہے تو نریندر پرشاد کا چہرہ بھی توفق ہو جاتا ہے۔

پھر ابھاگن نے سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ سارا دن باپ کے اردگرد گھومتی رہی۔ دروازے کے پاس، کھڑکی کے نیچے، یا کسی اور کونے سے، جہاں سے بھی ممکن ہوا وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے، باپ کے چہرے کو تکتی رہی۔ آج باپ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ سینے کی پسلیاں بھی گنی جا سکتی ہیں۔ روز بروز وہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ ابھاگن منہ چھپائے رونے لگی۔

اُس دن شام کو نریندر پرشاد دکان سے گھر واپس نہ لوٹا۔ دو وردی پوش آدمی ہاتھ میں لاٹھی لیے دروازے کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اور زور سے آواز دی۔

"نریندر بابو۔ نریندر بابو۔ گھر میں ہو؟"

ابھاگن دروازے سے یمراج کی سی دو مورتیوں کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ اس نے سوچا۔ کیا یہ لوگ میرے باپو کو ماریں گے تو نہیں؟

وہ آہستہ آہستہ ان کے پاس جا کر بولی "میرے باپو سے کچھ نہ کہنا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، اگر کہو تو تمہیں پھول دوں۔"

وہ کچھ نہ سمجھے اور بولے "کیا کہتی ہو بہن۔"

ابھاگن بولی "میرے باپو کو ذلیل نہ کرنا بھیّے۔ اچھا ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے دوپہر کو مالا بننے کے لئے کافی پھول رکھے تھے۔ پلو میں تمام پھول سمیٹ کر اس نے ان کی جیبوں میں انڈیل دیئے، اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جاؤ بھائی، تم لوگ جاؤ۔"

وہ دونوں وردی پوش ایک دوسرے کے چہرے کو تکتے ہوئے، یہ سوچ کر کہ پھر آئیں گے۔ آہستہ آہستہ واپس چلے گئے۔ ابھاگن نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر بیٹھ گئی۔

شام ہو چکی تھی، ابھاگن لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔ ہاں! پھول اگر روپے ہوتے تو صبح سویرے چن کر لاتی اور ماں کو دیتی۔ پھر تو ماں کہتی "ابھاگن تو سونا لکھی ہے۔" باپ کہتا "لکشمی سچ مچ لکشمی ہے۔" گوالے کی پوری رقم ادا ہو جاتی۔ سنار باپو سے کچھ نہ کہہ سکتا۔ ماں رانی کی طرح گہنے پہنے بیٹھی رہتی۔ داسیاں خدمت کرتیں۔ باپ گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جاتا۔ اور اسی سوچ میں ابھاگن سو گئی۔

اچانک نیند ٹوٹ گئی اور ابھاگن نے سنا۔ برابر کے صحن سے خالہ آکر ماں سے باتیں کر رہی تھی۔

"تم نہیں جانتیں بہن۔ دیوی کالکا ماں" نے ٹھکرانی کو سپنے میں درشن دے کر کہا ہے "تمہارے نئے گھاٹ میں میرا مسکن ہے۔ اگر کوئی اپنی آٹھویں اولاد میری بھینٹ چڑھائے تو تیرا گھاٹ پانی سے چھلک جائے گا۔ دھان بھرپور ہوگا۔ پوتے، پرپوتوں کے منہ دیکھے گی۔ ورنہ تیرا گھربار سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا" ٹھکرانی نے کہا ہے، ایک لاکھ روپیہ دینے کو اگر کوئی اُسے اپنا آٹھواں بچہ دے دے تو۔۔۔!"

ابھاگن نے کان کھڑے کئے اور بغور سنتی رہی۔

ماں بولی "ہوگا بہن۔ مجھے ان تمام باتوں کا کیا کام؟ ایسا سننا بھی پاپ ہے"۔

خالہ نے کہا "نہ بہن۔ میں ایسا کب کہتی ہوں؟ میں تجھے کب بھینٹ دینے کو کہتی ہوں؟ ماں باپ کا دل ہے نا!"

خالہ کے جانے کے بعد ماں کافی دیر تک لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر روتی رہی۔ پھر لڑکی کو اٹھا کر اپنی آنکھیں پونچھتی پونچھتی نیچے اتر گئی۔

ہفتہ بیت گیا۔ ابھاگن نے ایک روز باپ کے پاس جا کر پوچھا۔

"بابو، ایک لاکھ روپے، یعنی کتنے"؟

باپ نے جواب دیا "بہت سے"!

ابھاگن بولی "گاؤں کے روپے ادا ہو جائیں گے؟"

باپ نے کہا "ہو جائیں گے"

ابھاگن بولی "پورا قرض اتر جائے گا؟"

باپ نے ہنستے ہوئے جواب دیا "کیوں! کیا تو لاکھ روپیہ دے گی؟"

ابھاگن مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے دھیرے دھیرے چلی آئی۔

دیوالی پر سب کے گھروں میں دیئے جلنے لگے۔ ابھاگن نے کہا۔

"ماں، میں گھاٹ پر دیپ رکھ آؤں"

ماں بولی "جلدی لوٹ آنا۔ مگر اس نئے گھاٹ پر نہ جانا"!

چھوٹی سی نئی ساڑھی پہنے، تھالی میں مٹی کا دیا رکھ کر ابھاگن گھاٹ کی طرف چلی۔ اور اس نئے گھاٹ کی طرف ہی چلی۔

گھاٹ کا زینہ ابھی تعمیر نہ ہوا تھا۔ مٹی پر مٹی جم جانے سے گھاٹ کا کنارہ ٹیلے کی طرح اونچا ہو گیا تھا۔ ابھاگن نے چاروں اور دیپ جلائے۔ ٹیلے پر کھڑی ہو کر سامنے نظر ڈالی۔ گھاٹ میں پانی چمک رہا تھا۔ کالا کالا سا پانی جو رات کو اور بھی کالا نظر آ رہا تھا۔ ابھاگن کافی دیر تک پانی کو تکتی رہی۔ پھر پلو کو گلے سے باندھے، دھیرے دھیرے پانی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر "ماں کالی" کو پکارا۔ اور پھر چیخ مارتے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

اس آواز سے جنگل کے پنکھ پکھیرو کے پر پھڑپھڑا اٹھے۔ خوف زدہ جانوروں کے پاؤں تلے سوکھے پتے کھڑکھڑا اٹھے۔ اور پھر۔۔۔ مکمل سناٹا!

ایک کے بعد ایک، آہستہ آہستہ تمام دیئے بجھ گئے۔

چاروں طرف صرف اندھیرا تھا۔ بھیانک گھپ اندھیرا!

آج کے عہد کا اہم ترین سوال

امنِ عالم

موت اور زیست کا درمیانی وقفہ ہمارا عہد ہے۔ ہمیں اسی وقفہ میں اپنے عہد کی بقا کے لئے جدوجہد کرنا ہے تاکہ آنے والے زمانے میں وہ لوگ موجود ہوں جو ہمارا اثبات کر سکیں۔

آج کا انسان حیات کے لئے تشکیک کے بھیانک کرب سے گذر رہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے مقابلے میں تیسری عالمگیر جنگ کی ہلاکت خیزیاں اور تباہ کاریاں بعید از قیاس ہیں۔ تیسری عالمگیر جنگ کے بعد اس دنیا پر علاوہ ویرانوں کے کچھ نہ ہوگا۔

آج کا عہد ——— آج کا انسان ——— امن چاہتا ہے

امن کے اسی عالمگیر موضوع پر

سیپ

عالمی امن نمبر

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

بقائے حیات کے اس موضوع پر قلمی معاونت ہر ذی شعور اور ذی فہم کا انسانی فرض ہے

چند اہم کتابیں

تاریخ اسلام: عرب فن تاریخ کے موجد کہے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ عربوں کی تاریخ کا اساس روایات پر رکھی ہوئی ہے جن میں مشرق و مغرب کا اختلاف ہے۔ اسی لئے سید امیر علی صاحب History + Saracens لکھنا شروع کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو پانچ چھ سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی لکھی نہیں گئی جو زاویہ نگاہ کے اعتبار سے کسی مکتبۂ خیال کی پابند نہیں، بہرصورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں، لیکن وہ سب نایاب ہیں۔ زیر نظر ترجمہ وحشی محمود آبادی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ قیمت نو روپے

مقدمات عبدالحق: بابائے اردو کی خدمت ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ "دوسروں کے کام کو ابھارنا بابائے اردو کا کمال فن ہے" اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ "بابائے اردو کی صحیح شخصیت دوسروں کی تخلیق ابھارنے ہی میں نمایاں ہوتی ہے"۔ اور ان کا یہ احسان خود سے زائد فنکاروں پہ ہے۔ جن کی فنکاری کے جوہر "مقدمات عبدالحق" سے روشنی میں آئے۔ یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شائع ہوئے تھے جن کو بابائے اردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سر نو ترتیب دیا ہے، اور یہ بیش قیمت مجموعہ اُن دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں ان گنت ستاروں کی روشنی لئے ہے۔ اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کی بجائے بڑھا رہا ہے۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف۔ اردو ادب کا ایک شاہکار۔
قیمت مجلد ۱۵ روپے۔ پیپر بیک ۱۲.۵۰ روپے

مسدس حالی: حالی افق مشرق کے اولین آفتاب کی ایسی کرنیں تھے جس نے اردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا۔ ڈاکٹر بجنوری "دیوان غالب" کو "وید" کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں۔ لیکن غالب کے اس شاگرد رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔
قیمت دو روپے پچیس پیسے

ہماری داستانیں: کون ہے جو سید وقار عظیم کے نام سے واقف نہیں۔ کسی نے اگر ان کے نقادانہ کمالات کا جائزہ نہیں لیا ہے، تب بھی ان کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیکھی ہوگی۔ سید وقار عظیم نے یوں تو مختلف شعبہ ہائے ادب پر قلم اٹھایا ہے، لیکن افسانوی ادب ان کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں کتنی ہی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور "ہماری داستانیں" ان کی ایک عظیم کڑی ہے۔ جو نہ صرف مصنف کے وقار کا نمایاں شاہد ہے، بلکہ اردو ادب کی ایک گرانقدر تصنیف ہے۔ اس کتاب کو داستان گوئی اور داستان نویسی کی تاریخ کا درجہ حاصل ہے جس میں تنقید کے معیار فن پر ہر فن کار کی صحیح جگہ متعین نظر آتی ہے۔ نقاد کے قلم کو بے لاگ ہونا چاہئے۔ اس کا ثبوت وقار عظیم کی ہر تحریر دیتی ہے مگر اس کتاب میں تو انہوں نے انصاف پسندی اور متوازن نقد و نظر کی ایک نظیر قائم کر دی ہے۔ اردو کی داستان ہمیشہ جس کی منت کش رہے گی۔ فن داستان گوئی و داستان نگاری کی یہ بیش قیمت دستاویز مصنف کی نظر ثانی کے بعد بار دیگر شائع کی گئی ہے اور حسن کتابت و طباعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ قیمت دس روپے۔

مختصر تاریخ ادب اردو: اردو ادب کی تاریخ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے، جس پر ملک کے اکثر اہل قلم نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہل ذوق دونوں کے لئے یکساں طور پر اہم ہے۔ اور اسی لئے اساتذہ کرام اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ چند سو صفحات میں سمٹی ہوئی زبان اردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دور بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بار دیگر پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپیہ

اردو اکیڈمی سندھ — کراچی — لاہور — حیدرآباد

نظمیں

اخترالایمان

ساتویں دن کے بعد

غرض نقشِ ثانی ہوا جب مکمل تو دیکھا خدا نے
کہا خود سے ہی زیرِ لب مسکرا کر کہ "اچھا ہے"
اور آدمی کو جو تنہائی کا ایک احساس تھا مٹ گیا
بوئے گل کی طرح، چاند کی ضو کی مانند، نغموں کی صورت،
چلے دونوں گلگشت کے واسطے اور باغِ جناں
آج تک جو فضول ایک تخلیق تھی، ایک جنگل تھا خود رَو
چمن ساز کی قوتِ صانعہ کا کرشمہ بنا
موجِ تسنیم و کوثر ہی راحت جاں فزا،
اور پھر یوں ہوا وقت جیسے گذرتا گیا
ایک احساس پھر سے ابھرنے لگا دونوں ہیں اجنبی
پھر وہی پہلی تنہائی شدّت سے محسوس ہونے لگی
دونوں کو پھر کہیں سے یہ تحریک ملنے لگی، وہ شجر
جس کو چھونے کی بالکل اجازت نہیں، آخر ایسا ہے وہ کیا
اور یہ جاننے کے لئے دونوں بے چین اتنے ہوئے،
سخت تنبیہ کے بعد بھی، چھپ کے ممنوعہ پھل کھا لیا
زلزلہ سا اٹھا۔ کھاتے ہی دونوں کے ہوش جاتے رہے،
اور جب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ آغوش جنت نہیں
پاؤں سے تا جبیں، دونوں عریاں ہیں چاروں طرف بے زمیں
دوڑ کر جسم پتوں سے ڈھانپے، لگے سوچنے کیا کریں
ایسے دن ڈھل گیا، رات نے لے لیا دونوں کو اپنی آغوش میں
آسمانوں سے دیکھا خدا نے کہا مسکرا کر کہ "اچھا ہے"
اور عرش سے روح انساں میں آ گیا، دوسرا ساتواں دن ہوا۔

عبدالعزیز خالد

محبت کی راہیں

محبت کی راہیں پُراسرار ہیں
ہوائے محبت کرے آگ پانی سے مٹی
طبیعت ز خود رفتہ ہو خود بخود
پگھل جائے موم آگ کی آنچ میں
حسین جامہ زیب و طرحدار ہیں
خود اپنے ہی نشّے سے سرشار ہیں
جسے چاہے یہ دل آشنائی کرے
عجب اس کی ہیں خصلتیں
جو اسیر ہے اس سے یہ بے وفائی کرے
ہم اس کی تلوّن مزاجی سے بیزار ہیں!
برستی ہے آنکھوں سے بجلی تڑپتا ہے جی
پھر ملاقات قسمت پہ موقوف ہے
نکل آئے آنکھوں سے [illegible]
[illegible] آنسو، بجا
فغان و بکا کا مگر فائدہ؟
یموتُ الکرامُ بدینِ الهویٰ
پھرے ہیں اہلِ دل کو بکو
گریباں دریدہ خراشیدہ رو
ہوں جس شہرِ بیدرد میں

نہ چاک گریباں کے بھی بخیہ گر
کرے کون چاکِ جگر کو رفو!
خونِ عشاق سے سب گزرگاہیں گلنار ہیں
محبت ہے اک اشتراکِ تبسم مگر
سحر انگیز ہوتا ہے روتا ہوا حسن بھی
بہت جائے گی کیا یونہی روتے سسکتے جوانی؟
جو لڑتا نہیں ہے وہ مرتا نہیں
کرو زندگی سے محبت
محبت ہے دانش، محبت ہے طاقت
محبت ہے گنجینۂ علم و حکمت
ہر اک شے سے سخت و جلیل و گراں بار تر
نہ عدن ہے اسکو
جو کہتا ہے بے سایہ و بے ثمر
سمجھتے ہیں وہ جو سمجھدار ہیں
نہاں آبِ حیواں ہے ظلمات میں
اوڑھتی ہے اندھیرے کی چادر عروسِ سحر
حل نسخہ ہے مائی کے مردہ دلوں کا نہ ماتم کرو
حقیقت کے سانچے میں خوابوں کو ڈھالو

کرو ترک کمتر کو بہتر کو ڈھونڈو
کہو وادیٔ شوق کے رہرووں سے
رہیں سرمست ہوں بات آہستہ کرا
زندگی اک سفر ہے جو بہت مختصر
تیز چلتا ہے تنہا سفر کرنے والا
ہماری جوانی کے دن ہیں ہماری حکومت کے دن
لیں پرومتھیئس کی طرح دیوتاؤں سے ٹکر
جو پیلان آشفتہ کی طرح کرتے ہیں مستی
سمجھتے ہیں سب کو جو اپنا سا کپٹی
جو مُردار خوری کریں کرگسوں کی طرح
پئیں جو لہو جرعہ جرعہ ذیبی کی طرح
جنیں کی طرح
سمجھتے ہیں سپنوں کی بِنا کا خود کو کھویا
سجائیں پھر بھی جس طرح گوپیوں میں کنھیا
کریا کافرستان کا بودَ لک
مے جبینانِ نو ناز میں
پری چہرگانِ خوش آوازتیں
ہر شب بھر میں سو نازنینوں کی توڑے
مروڑے لچکدار باہوں کو محفوظ ہونٹوں کے رس کو نچوڑے
کسی کو اچھوتی نہ چھوڑے
تو ہوس ہر نفس تشنہ تر
شرابی کبھی ہو نہ پانی سے سیر
گردنِ جواں کو کہاں چھوڑے شیر
بالآخر ہمیں اپنا قرضہ چکانا پڑے گا
لڑائی سے بھاگے نہ مردِ دلیر
ہے تلوارِ ذلت سے بہتر ہلاہل

سلاسل بدلنے سے زنجیریوں کا مقدّر نہ بدلے
غلامی کے دھبوں کو دھوتا ہے خونِ شہادت
بلا مزد خدمت ہے شانِ پیمبر
ہے زہد ریائی
فقط جگ ہنسائی
کیسے دعویٔ پارسائی
حکمِ کبریتِ احمر کا رکھتے ہیں اہلِ نظر
زندگی ہے صدف، مقصدِ زندگی ہے گہر
لچک زندگی، موت سختی، تناؤ
ہیں حرص و غرور و حسد اُمہات المعاصی
کر، اعراضِ دنیا سے اعراض کر
ہے تہذیبِ دل ہی مداوا
غمِ بیش و کم کا
جو تھوڑے پہ راضی ہوں شاداں رہیں
زمانہ پرستوں کی خُو
تقیہ، تعصب، غلو
کہیں ناتراشیدہ کُندوں کو ہم کرتے ہیں دکیدو
ہے چہروں پہ لالی مگر ذہن بیمار ہیں

جنوں کے سوا کچھ الاہی نہیں
رہِ عشق میں درد ہمراہ ہے
بِنا عشق کی بے قراری پہ ہے
کہاں مرہمِ داغ دردِ جدائی؟
پسِ پردۂ آشنائی ہے بیگانگی
غموں کا سمندر ہے معشوق و عاشق میں حائل
مرے عارض و لب مرے خونِ دل کے گواہ

بہایا اسے تیرے ہاتھوں ہی نے بے گناہ
اپنی آنکھوں کی مانند تیرے پپوٹوں میں بھر دوں
جدائی کا زہرِ سیاہ!

کہاں ہیں محبت کے نغمے، مسرت کے چشمے؟
پہاڑوں سے اونچے، سمندر سے گہرے
فراموش ہوں عہد و پیماں!
ہے احساں فراموش انساں!
کف آلود دنیا و تفسیدہ صحرا
کھلے کام پڑنے پہ ہی آدمی کی حقیقت!
جہاں دیدہ، کار آزمودہ
سمجھتے ہیں ہم عشق کی فیلسوفی
کنول کی طرح مسکراتے ہیں جیون کے جوہڑ میں ہم
ہم اہلِ ہم
سہیں مسکرا کر زمانے کے ظلم و ستم
کبھی ہاتھ سے جیتے جی ہم نہ چھوڑیں علم
ہمارا علم
تیشہ و خامہ و مُو قلم
بڑھاتے ہیں ہم
خوں فشانی سے نورِ جہاں
خاک ہے ارغواں، سنگ ہے پرنیاں
اسنگیں جواں!

کہیں جامِ جم ہے کہیں چشمِ نم
کوئی تاجور تخت پر جلوہ گر
کوئی نغمہ گر بسملِ شامِ غم

زمیں ہم پہ ماں کی طرح مہرباں
ٹپکتے ہیں دل سے خیالات، بہتا ہے چشمے سے پانی
ہے گردش میں جامِ مئے ارغوانی

فغانِ جرس ہے نہ بانگِ درا
کریں جان کو خرّم و شاد و تازہ
ہے تو ہی پہاڑوں کی دیوی، بہاروں کی رانی
ہے قوسِ قزح
مرصع گلوبند، سنگر مت قادہ ترا!

تری آنکھوں میں ہیں زعفرانی شفق کے دھندلکے
یہ آنکھیں شبِ تار میں جیسے چمکیں دو جھلمل ستارے

محبت سے بوجھل یہ مخمور و منوم آنکھیں
یہ خاموش و گویا و مظلوم آنکھیں
ملیدہ ابھری خواب آلود معصوم آنکھیں
تو سرمایۂ دلبری، لب ترے انگبیں

رسیدہ مگر نا چشیدہ
ہے کُندن سا تن اور کافر سراپا
سیہ چشم و بالا قد و ماہ سیما

اندھیرے میں جب تک چمکتا ہے چاند
ترے حسن کی روشنی ہو نہ ماند!

غلافِ شگوفے سے گُل کو نکال

درِ ناسفتہ کب تک رہے گا نسفتہ
رشکِ دینار چہرے سے کہ
طالبِ وصل کو مرحبا

پئے خیر مقدم
میں زیرِ قدم
بچھاؤں گل و یاسمن
مرا پیشہ فن، ماانا منّ دُوِر
لپکتا ہوں اس کی طرف
جو بڑھتا ہے میری طرف اک قدم!

"یہ احسان ہے مکرمت ہے کرم
کہاں کی محبت، کہاں کی غزل
یہ گرم اختلاطی ہے مکر و دجل
طلسمِ فریب دگماں سے نکل
میں ابلا ہوں نرمل نہیں
نہ واقف ہو جو شخص اس بھید سے
اٹھائے گا کیا ناز معشوق کے
سمجھتا ہے قلبِ حزیں

فقط تم نے دیا ہے مجھے دل نہیں
گزر گاہِ رہرو ہوں منزل نہیں

چلاتا ہے شاعر اندھیرے میں تیر
طلبگارِ تن ہے نہیں یارِ دل

دلِ بے ضمیر!
جو لفظوں کے قاروں پہ نادارِ دل
عشق ہے میری صورت سے مجھ سے نہیں
نرگسیت کا ہے حسن خود بیں اسیر
میں عورت ہوں عورت سمجھتی ہے اسرارِ دل!

کوئی دوسری خود کو آراستہ
کر رہی ہے تمہارے لئے!

یہ ناسورِ سینہ، یہ آزارِ دل!
عروسِ چکاں، مندمل!"

دل کے ہاتھوں سے سب لوگ لاچار ہیں
محبت کی راہیں پُر اسرار ہیں!

باقر مہدی

چوپاٹی کی ایک رات

چوپاٹی پہ رات ہے اتری! —
بھیگی ریت سے بھوکا بھکشو بدھ کی مورت گڑھتا ہے
پاس ہی ایک نیا جوڑا فلم کے سنسر شدہ مناظر پیچھے دھراتا ہے
۱۴ نومبر ختم ہوئی۔
لاوارث گندے بچے پیسے مانگتے پھرتے ہیں
ایک ذرا اونچائی پر! —
کوکا کولا، ٹی ڈبلو اے، ایر انڈیا اور ٹائمس کے، بڑے
بڑے رنگین الفاظ، جلتے بجھتے، تاریکی کو روشن کرتے رہتے ہیں
پانی میں وہ لرزاں عکس کتنا سندر لگتا ہے
کچھ امریکی نئے بھارت کی فلم بنانے جاتے ہیں
پاس کے ایک بڑے ہوٹل میں قوالی کے ساتھ ہی ساتھ
بوڑھے ترقی پسند شاعر اپنی نظمیں گجراتی سیٹھوں کو
سنا کر خوش ہیں
پتھریلے فٹ پاتھ پہ سونے والے لوگ
آلھا اودل گاتے ہیں
میں اک ٹوٹی بنچ پہ بیٹھا
نئی نظم کے ٹوٹے مصرعے جوڑ رہا ہوں

سارے شہر میں مہنگائی کا، ایک انوکھا قحط پڑا ہے
بھوکی مریم بس اسٹینڈ پہ تنہا کس کو ڈھونڈ رہی ہے
مشرق میں تقدیس بہت ہے
گاندھی اور نہرو کے بُت دُبلے دُبلے چپ کھڑے ہیں
پورا بھارت اک بھوکا بنگال بنا ہے
"چمپی سیٹھ، چمپی سیٹھ"
مریل کتے خالی تھیلے چاٹ رہے ہیں —!

چاند، بہت ہی پیلا چاند
شاید سورج کی کرنوں کا بھوکا ہے
تاج[ا] ہوٹل کی چھت پہ تھک کر بیٹھ گیا ہے
نیچے چوپاٹی کا منظر دیکھ رہا ہے
موجیں جتنی تیزی سے آگے آگے بڑھتی ہیں ریت میں چھپتی جاتی ہیں
۱۲۳ کی آخری بس، شور مچاتی، مرین ڈرائیو، روشنیوں کے
کلس میں
اک آویزہ بن جاتی ہے، کھو جاتی ہے
مری زخمی فکر بھی شاید
نئی نظم کے سناٹے میں کھو جائے گی۔

(ا۔ ہینگنگ گارڈن کا سب سے اونچا ہوٹل)

پوپ کی آمد آمد ہے

باقر مہدی

تمنّاؤں کی حوّا

زندگی، خوف کی شمعیں لئے
تھرتھراتی، ٹھوکریں کھاتی
(خواب و حقیقت کی ہزاروں منزلوں کو بے نشاں
کرتی ہوئی)
تمنّاؤں کی حوّا
علم و دانش، رنگ و رامش
کے شبستانوں میں
ڈھونڈتی پھرتی ہے —!

اسکو کیا خبر —!
وہ تمنّاؤں کی روح
زندگی سے چھوٹ کے پچھتائی تھی لیکن
اب مکمل خود فراموشی کے گہوارے میں سوتی ہے
کوئی الجھن، اک تڑپ، بھولی خلش بھی،
پاس آسکتی نہیں
ایک خاموشی ہے رگ رگ میں نہاں
دہر امیدوں کا کوئی سانپ اس تک لے کے
جا سکتا نہیں
کوئی کیوپڈ لاکھ چاہے اپنے تیروں کا نشانہ تک
بنا سکتا نہیں
معجزے سے یہ ذرا بھی کم نہیں —!

وہ تمنّاؤں کی حوّا، ایک دن
زندگی کی تھی رفیق
لیکن اس میں صبر کی قوت نہ تھی
جو درد کو سمجھے
اُسے تنہائیوں میں روشنی دے کر بنا لے ایک راز —!
(دھڑکنیں اکثر چھپا لیتی ہیں کتنے راز !)

جیسے ٹوٹا سب طلسم، لذتوں کی راکھ ہر نشہ خود ملتی گئی
بلب سے سڑکوں پہ برسا، ہر طرف پھیلا دھواں
وہ تمنّاؤں کی حوّا زندگی سے تنگ آکر
جانے کب اور کس طرح سے کھو گئی —!

— لیکن یہ ضدی زندگی
کچھ بھی ہو جائے یونہی ڈھونڈا کرے گی —!

باقر مہدی

افسانہ

شبنم، ننھے کرنیں، اکثر ملتے رہتے تھے
لیکن اک شب پچھلے پہر
اتنے بادل چھائے تھے
صبح نہ آئی ـــــ!

شام ہوئی اور ڈرتے ڈرتے کرنیں آئیں
ساحل کی ریت پہ لیکن
ننھے ننھے تاروں جیسے نقشِ قدم تھے
صبح نہ آئی لیکن اپنا اک افسانہ چھوڑ گئی

باقر مہدی

لمبی لکیریں

ننھی لمبی لکیریں
ایک مدت سے
ازل سے
ڈھونڈتی پھرتی ہیں
اُس مرکز کو جس کا اک اشارہ
اک کشش،
بن جائے ایسی زندگی،
جو اُنہیں موت کی سرحد سے آگے لے چلے —!
پاس ہی تنہا مرکز،
سوچتا ہے
"کاش مل جائے اُسے آوارگی کا دائرہ —!"

فارغ بخاری

حجرہ[1]

اندھی راتوں کے سینے پر روشن ہے اک تارا
جاگ رہا ہے کہساروں کے دامن میں انگارا
بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کا ہے یہ گہوارا

اس نے دنیا کو کتنے ہی رنگ بدلتے دیکھا
جن کے لہو کی آنچ پہ ہر اک کھیت کو پلتے دیکھا
ان کے بچوں کو فاقوں کی آگ میں جلتے دیکھا

دن بھر اجڑے، رات کو ہووے اس میں دھکم پیل
سورج ڈھلتے ہی ہونے لگتا ہے سب کا میل
گائیں، ناچیں، کودیں، کھیلیں رنگ برنگے کھیل

ڈھول، رباب اور نقارے دن رات سنے ہیں اسنے
کتنے ہی دکھیاروں کے حالات سنے ہیں اسنے
خوشحالوں رحمانوں[4] کے نغمات سنے ہیں اسنے

سب گاؤں والوں نے اس آنگن میں ہوش سنبھالا
دکھ سکھ بھولے اپنا اس میں آ کر اد نے اعلےٰ
جادو کی اس نگری میں ٹوٹے اشکوں کی مالا

آدم اور درخانے[5] کے رومان بھی اسنے دیکھے
مشرق اور مغرب کے سب طوفان بھی اسنے دیکھے
انسانوں کی صورت میں حیوان بھی اسنے دیکھے

اسکی بوڑھی آنکھوں نے دیکھے ہیں تیز الاؤ
تازہ ہیں اسکے سینے میں وقت کے گہرے گھاؤ
یاد ہے اسکو ہمسائیوں[2] سے خانوں[3] کا برتاؤ

سب کچھ دیکھ کے بھی لیکن مسرور رہا یہ ڈیرا
اسکے اجلے سپنوں نے ہر دل میں نور بکھیرا
کہتے ہیں سب اسکو امیدوں کا رین بسیرا

[1] پشتونوں کا معاشرتی مرکز [2] کرایہ دار [3] خوانین [4] پشتونوں قوم کے دو عظیم شاعر۔
[5] پشتو کا مشہور رومان۔

بلراج کومل

سلئے کے ناخن

کنستروں، غلیظ خالی بوتلوں کا ہر طرف ہجوم تھا
جدھر سے ہم نکل گئے، پتہ چلا
ہمارے میزباں سبھی
جو پیٹ بھر کے کھا چکے تھے سو گئے
جو پی چکے تھے کچھ زیادہ پی گئے، بہک گئے
جو اس عمل سے بچ گئے

وہ بے زباں
فراخدل تھے بھوک کی نذر ہوئے

ہم اجنبی تھے شہر میں، ہمارا کون تھا وہاں
قطار در قطار سامنے تھے ان گنت مکاں
مگر ہمارے سر پہ چھت رہا تمام شب سیہ مہیب آسماں
کنستروں، غلیظ خالی بوتلوں کے درمیاں
سحر ہوئی تو ہم خفیف دھوپ سر پہ اوڑھ کر
تھکے ہوئے تھے سو گئے
کثیف تھا وہ خواب جس کی دلدلوں میں کھو گئے

بلراج کومل

ڈرگ سٹور

(DRUG STORE)

اگر میں جسم ہوں تو سر سے پاؤں تک میں جسم ہوں
اگر میں روح ہوں تو پھر تمام تر میں روح ہوں
خدا سے میرا سلسلہ وہی ہے جو صبا سے ہے
اگر میں سبز پیڑ ہوں
تو روح اور جسم کی
وہ کون سی حدیں ہیں فاصلوں میں جو بدل گئیں؟
زمین میری کون ہے؟
چمکتا، نیلگوں حسین آسمان کون ہے؟
جو برگ برگ میں دھیرے دھیرے جذب ہو رہی ہے
دھوپ زرد دھوپ کیوں مجھے عزیز ہے

یہ سوچتا ہوں سب مگر میں طاقچوں میں بند ہوں
میں نام کوئی ڈھونڈتا ہوں آج اپنے کرب کا
تلاش کر رہا ہوں ایک ایک پل

قطار در قطار شیشیوں کے اس ہجوم میں
وہ آسمان کیا ہوا؟ وہ سبز پیڑ کیا ہوا؟
جگر میں آگ تھی مگر جگر سفوف بن گیا
جو سرخ تھا کبھی مرا لہو سپید ہو گیا
میں بوٹیوں میں کٹ گیا
میں دھجیوں میں بٹ گیا
یہاں پہ میری زندگی، یہاں پہ میری روشنی
سپید، سرخ، زرد، نیلگوں، سیاہ لیبلوں میں بٹ گئی۔
صبا کی رہ گذر سے دور ہٹ گئی۔

یہ جسم کی تلاش تھی
جو دراصل سکون کی تھی کیا ہوئی۔
وجود کی تھی کیا ہوئی۔

اخترؔ اعظمی

میں

صبح کی تازگی، شام کے سانولے حسن نے
میرے بارے میں اتنا کہا
طاق نسیاں پہ رکھا ہوا
اپنی گزری ہوئی ساعتوں کا یہ اک حرفِ بے مایہ ہے
اور میں
اپنے خوابوں کی دہلیز پر
سر جھکائے ہوئے رو رہا ہوں کہ خود میری تعمیر میں
ایک صورت خرابی کی تھی
مگر
آنے والے زمانوں سے پوچھے کوئی
روشنی کن خرابوں سے آئی ہے، کس کا لہو
رنگ بھرتا رہے گا شب و روز میں
میں کہ اک حرفِ بے مایہ ہوں
اپنے خوابوں کی دہلیز سے سر اٹھاتا نہیں
آنسوؤں اور شکستوں سے دامن بچاتا نہیں

انجم اعظمی

وصال

جھوٹی باتوں سے اب گریز کرو

سچ کے سائے میں نیم خواب آنکھیں
لے کے آئیں سکون کی دولت
دل میں اک اجنبی سحر کی طرح
جاگ اٹھی ہے وصال کی لذّت

دن کی مشغولیت تمام ہوئی
چاندنی رات کا کوئی سایہ
چاندنی سے ہے محوِ سرگوشی
نیند خوابوں کے جال بننے لگی
رات بستر کے پھول چننے لگی

جھوٹی باتوں سے اب گریز کرو

شاہد منصور

تیمور کا خواب

ہے افق تا افق دشتِ ریگ رواں
زندگی ہے کہ صحرائے تکلا مکاں
سب وجود و عدم لکۂ ابر ہیں
وہم کی دھوپ کرتی ہے اٹکھیلیاں
سایۂ عنقا ہے اس بیکراں دشت میں
اور جو بھی تو ہے حاصلِ رائیگاں
چار سو گرد بادِ عدم کا ہے رقص
چار جانب سرابوں کے ہیں کارواں
سنگِ خارا کی چھاتی تلے دفن ہیں
کارواں کارواں، استخواں استخواں۔

•

کیسے جیتا رہوں کیسے زندہ رہوں
ایک نکتے پہ مرکوز ہیں جسم و جاں

•

اور میں بے اماں دشتِ سفاک میں

میری فوج و سپہ سب ہزیمت شدہ
میرا ہیبت حریفوں کے جشنِ طرب کی ہے آماجگہ
میرے پیچھے بچی جو کہ چست و چالاک
جاسوس ہیں
جو نقوشِ قدم سونگھتے دم بدم (تازی کتوں کے مانند)
بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔
اور میں تشنہ و گرسنہ
دشتِ ویراں کی وسعت میں آوارہ ہوں
گھونسلے ہیں پرندوں کو جائے اماں
اور بھٹ ہیں درندوں کی آرامگہ
پر مرے واسطے بیکراں دشت میں کوئی مامن نہیں
کوئی گوشہ نہیں کوئی سایہ نہیں
میں ہوں اور آگ کی طرح جلتی ہوئی ریگ ہے
میں ہوں اور ذہن کی آڑی ترچھی لکیروں پہ
بڑھتا تخیل کا شہباز ہے
پھر خیالوں میں اک تند شعلہ اٹھا
میں نے دیکھا کہ صحرا سمندر ہوا

میں جب ان [illegible] تیمور کی فوجوں [illegible]

یوں اجالوں میں تاریکیاں گھل گئیں
جیسے دریائے جیحوں پہ کہرا گرا
میری چشمِ تخیل کو جنبش ہوئی
میں نے دیکھا عجب خوابگوں ماجرا

•

اک سمندِ تخیل زقندِ خیالی پہ جوشاں ہوا
میں نے دیکھا کہ جنگل پہ بجلی گری
اور اٹھا دھواں
الحذر الاماں
سایۂ دودِ پیچاں میں رقصاں ہوئی
وسعتِ بحر و بر
سایۂ دشت و در
یک تمنائے رختِ سفر
السفر السفر، السفر السفر
کھو گئیں ذہن کے غار میں دشتِ ذغار کی وسعتیں
اور نظروں کی پنہائیوں میں بدخشاں کے
نازک خرام آ گئے
لالہ رو لالہ رو
گلبدن گلبدن
وادیٔ سبز پوش و سمن فام آغوشِ کہسار میں مسکرانے لگی
ظلم ڈھانے لگی۔
برقِ خاطف نے نظروں کو خیرہ کیا
جب درِ خیمۂ اطلسی سے نکلتے ہوئے اولجائی نے
ہنس کر کہا
"دلبرم ہشکرم"

(ہائے کیا یاد ہے جو ہرن کے کبابوں کلیجی کے تکوں کے
مانند دانتوں میں ہر لحظہ پستی چلی جا رہی ہے)
ہاں تو پھر اولجائی نے ہنس کر کہا
(شام کی ڈوبتی اصفری روشنی میں چمکتے ہوئے
دانت تابندہ لب اور درخشندہ مکھڑے کی کرنیں
آج تک یاد ہیں، آج بھی یاد ہیں۔)
ہاں تو پھر — اولجائی نے ہنس کر کہا
"دلبرم ہشکرم"
سجستاں ابھی دور ہے
منزلوں کی طوالت میں پوشیدہ ہے
آج قسمت سے اس وادیٔ رشکِ فردوس میں
ہم ہوئے خیمہ زن
شام لعلِ بدخشاں کی مانند خونی لبادے میں لپٹی ہوئی آ گئی ہے
اب دبے پاؤں اترے گی لیلائے شب
اور پلکوں کے نازک بچھونے پہ سنگ زناں نیند لے جائے گی
خواب کی وادیوں کی طرف
کیوں نہ اس احمریں شام کو داستانوں کی صہبائے زریں میں
ہم حل کریں
عقل کو دورِ کومیس سے شل کریں"
اور پھر دیکھتے دیکھتے اولجائی کے ابرو کے ادنیٰ اشارے کو پاتے ہی
براکس جاکو
لپکتے اندھیرے میں جانے کہاں کونسے غار سے ایک
فرتوت و پیرِ کہن سال شاماں کو آخر پکڑ ہی لے آیا
کہن سال شاماں
عجیب الخلائق

وہ اسرکی سپیدی تھی یا کوہِ البطائی کی برف تھی
جو ماضی کے لاکھوں دریدہ تپیدہ فراموش لمحوں کو دامن
میں اپنے سمیٹے ہوئے خوابِ صد سالہ میں محو تھی۔
اور اس برف کی تہہ میں دو مشعلیں تھیں درخشاں
جن میں زہد و عبادت، ریاضت مشقت کا پندار تھا
ترکِ لذات کا نور تھا
اسکی آواز تھی یا تقیّن شکن کی سنگی ڈھلانوں پہ
گرتے چٹختے ہوئے
کوئی ایو یلانش کے دندنانے گرجتے دھماکے کا ٹھہراؤ تھا
جھرّیوں دار رعشہ زدہ، دستِ کاہیدہ کو سر اٹھائے ہوئے
یوں وہ بولا

"میرے صاحب قراں
ایل خان و جلائیر کے اے گورگاں
تار غائی کے دل بند، تاتار کی آبرو
اولجائی کے پیوند، برلاس کی زندگی
میر تیمور سن
گذرے لمحوں کے افسردہ بے نور تیرہ ستاروں کی
باتوں سے حاصل بھی کیا۔

وہ خورشید و مہتاب جو
افق کی ردائے سیہ کے تلے سو گئے، انکی یادوں سے کیا فائدہ
بیتی گھڑیوں کے شہ سواروں، مٹے بادشاہوں پرانی
حسین لالہ رخ سیم بر مہ جبینوں کے قصوں میں رکھا
بھی کیا ہے
ذرا منقلِ آتشیں کے لپکتے ہوئے تند شعلوں کو دیکھو
تمہارے لئے صرف شعلے
مگر میری نظروں میں یہ ایسے اوراق ہیں
ثبت ہیں جن پہ اخبارِ غیبی
ایل خان و جلائر کے اے گورگاں
تیرے مستقبلِ تابناکِ جواں کی کہانی کا اک ایک حرف ان لپکتی
زبانوں پہ مرقوم ہے
جسکو پڑھتا ہوں میں
تیرے یورت کے پرچم کے نیچے مجھے
خوں کے دریا کے ہم دوش بہتے ہوئے
دجلہ و نیل و گنگا نظر آئے ہیں
تیرے رخشِ فلک گام کے پاؤں میں
چین کی سرحدیں، روم کی سرحدیں
مصر کی ہند کی روس کی سرحدیں
دست در دست رقصاں نظر آئی ہیں
تیرے قدموں تلے لاشۂ سرد ہیں
دارِیوش و سکندر یہاں گرد ہیں
کوکومن تمنگری، کوکومن تینگری"

•

دھند اور کہر منظر بنی، بن کے غائب ہوئی
میری تنہائی ہے اور تنگ امکاں
اس بھری دوپہر میں میں جاؤں کہاں
سایہ اس دشت میں حاصل رائگاں
باعثِ رنجِ صد شائگاں

•

بحر و بر
گرد بادِ عدم کا سفر
الحذر الحذر
سائے سفاک قتال گردن کشاں

ایبک و اسود و اصفر و احمراں
رہروانِ رہِ مرگ آثار، نوحہ کناں
شہرِ سبز اور قرشی کے صحراؤں سے
غلیل در غلیل مقتل کی شہراہ پر
جوق در جوق کاندھوں پہ سولی لئے دارِ ظلمات کی
پیلے چہروں جھکی گردنوں، بہتے اشکوں کے آنکھوں
میں دریا لئے

قتل گاہوں کی جانب رواں
خجند و سمرقند و قوقند اور کاشغر کے جواں
بالکش، الما لیک اور بکیال کے ٹھنڈے پانی کی
حسرت میں محوِ فغاں

مرگ کے میہماں

•

جیسے یک لخت شیشوں پہ پتھر گرے
چونک اٹھا میں خوابِ طرب ناک سے
میں نے دیکھا، وہی دشتِ تکلا مکاں
گرم بے رحم سورج کی سفاک کرنوں میں شیشے کی مانند
تپتی چمکتی ہوئی ریگ ہے، میں ہوں اور میری تنہائیاں

•

آج اس بیکراں دشتِ سفاک میں
میں ہوں تپتی ہوئی ریگ کا ہم عناں
دل کشیدہ سہی، پا شکستہ سہی
میری یار و مددگار، عمر رسیاں
یہ الگ بات ہے مجھ سے اوجھل ہیں سب
شہرِ پر آس اور تربتِ عتا زمان
لیکن اس دشت کی طرح میری انا
سرکشیدہ ہے جوں چشم کاویاں

میری آنکھوں میں رقصاں ہیں وہ سرحدیں
جن سے گذرے گا سیلابِ خونِ رواں
چشمِ نظارہ دیکھے گی ہر شہر میں
لاشۂ سربریدہ کا رقصِ جواں
میرے سوفار کی زد میں آئیں گے سب
قلۂ ہندوکش وادیٔ سرخساں
سب ہیں جولانگہِ رہوارِ جنوں۔
مرو بغداد و ملتان و مازندراں
وادیٔ ارگج ہو شہرِ حراں ہو
میری شمشیر سے کس کو ہو گی اماں
تا محبِ نظر طارم و سیر میں
سرخیوں کی نظر آئیں گی جھلکیاں
"فصلِ سر" کاٹنے کے لئے ایک دن
رن میں بوؤں گا میں لالۂ ارغواں!
فرحتِ دیدۂ و دل بنیں گے سبھی
زخمِ سر ہوں کہ ارژنگ لالہ وشاں

•

تب میں پوچھوں گا اس دشتِ سفاک سے
تجھ میں مجھ میں ہے کیا فرق تکلا مکاں
تابشِ مہر سے، تو ہے دوزخ تو کیا
ہے مرا قلب خود، دوزخِ بے اماں

•

کون مینارِ عظمت پہ تابندہ ہے
کچھ بتا، کچھ تو کہہ، دشتِ ریگِ رواں
کس کو حاصل ہوئی شہرتِ جاوداں

✤

سیپ کراچی

عرش صدیقی

آبِ گُم کا سفر

غروبِ آفتاب اور سائے ڈھلتی شام کے
لپکتے گاتے کھیت شب کے خوف سے فسردہ رو
روش روش سے لمحہ لمحہ واپسی حیات کی
خموشیوں کے دشت میں مویشیوں کے قافلے
فسردہ دل، تھکے ہوئے!
اور ان کے پیچھے چند سادہ نوجوان
تمام دن کی سختیوں کی دھول میں اَٹے ہوئے!
طیورِ نغمہ بار کے حیات بخش چہچہے
افق سے اٹھنے والی تیرگی میں گم!

طلوعِ آفتاب اور پھر وہ کل سا بانکپن
حیات کا حسیں چلن!

طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب اور طلوعِ آفتاب پھر
مرا یہ سلسلہ نہیں
مری حیاتِ مختصر
ہے آبِ گُم کا اک سفر
مرے سفر کی اک سحر
مرے سفر کی ایک شام
اور اس کے بعد مستقل
زمیں کی گود میں ابد کی تیرگی
پرانے مقبروں کی گہری خامشی!!

ادیب سہیل

دریچے کا داغ

داغ اک خوش نما عمارت کا
دل پہ کھائے ہوئے زمانہ ہوا
اتنے عرصے میں وادیٔ دل سے
صرصرِ تند پے بہ پے گذری
دستِ موسم نے سنگ برسائے
پھر بھی ہر لحظہ رواں کے ساتھ
داغ اُسی بانکپن سے روشن ہے

ہجر کے سانحے کا وہ لمحہ
کتنے برسوں پہ اب تو پھیل گیا
مجھ کو معلوم ہے دریچے پر
اب کوئی چشمِ منتظر نہ رہی
پھر بھی یہ حال ہے کہ جب اس سے
آنکھیں ناگاہ چار ہوتی ہیں
دل کو محسوس ایسا ہوتا ہے
بالکونی میں اب کوئی کھل کر
پنکھڑی سے مہین آنچل میں
رنگِ گل سے سُبک جمال لئے
دادِ جلوہ گری کی چاہے گا
اب کسی در سے خیر مقدم کو
سج کے ہوگی طلوعِ گلبدنی
بام لب سے کوئی حسین تتلی
دل کے آنگن میں اُڑ کے آئے گی
شاخِ نازک کی طرح دلکش ہاتھ
اب اُٹھے گا سلام کی خاطر

جانتا ہوں کہ اس دریچے پر
کوئی دلدار اب نہ آئے گا
کوئی غمخوار اب نہ آئے گا
دیدہ دانستہ یہ فریبِ رنگ
دل سے مجبور کھائے جاتا تھا

ادیب سہیل

درخت کا درد

پھول سی آنکھوں سے پہروں گھورتی سرسبز بیل!
جانتا ہوں تیرے من کی آگ، تیرے جی کی لاگ
چاہتی ہے میری باہنوں سے لپٹ کر کھیلنا
عمر بھر تو جسم و جاں کے پیار کا نیرنگ کھیل
تیری چاہت میری چاہت ہے مگر آپس کا میل
زہر تیری روح میں بھر دے گا امرت کے عوض
میں وہ پتھر ہوں شرر جس کی رگِ جاں کا مقدر ہی نہیں
سوچتا ہوں کیوں صدائے جاں کو تیری دوں سماعت کا فریب
سامنے میرے کہ لہو کا حبس ہے معذورِ عمل
پھول سی آنکھوں سے پہروں گھورتی سرسبز بیل!

تاج سعید

سنار بنگلہ[1]

مشرقی پاکستان کے دورانِ قیام کے تاثرات

سرسوں جیسی رنگت والو، رہو سدا آباد
ہم تو بنگلہ دیس سے لے کر چلے تمہاری یاد

یاد کہ جس میں بسی ہوئی ہے پریم اگر کی خوشبو
خوشبو جس نے پھیلا ہے بکھرے نین کا جادو

رقص کرے رقاصہ اڑے زلف بنگال کی خوشبو
رقاصہ کہ جیسے سندربن کا کوئی آہو

آہو دیکھے شکاری بھاگے اور نہ رُکنے پائے
رُک کر اُٹھ کر پیچھے چھپکے اور پھر بڑھتا جائے

رقاصہ جب بھاؤ بتائے کرے وہ ہار سنگھار
ہار سنگھار کے رنگ بھینٹ کرے ہے پیا

چڑھتا دریا، کالی زلفیں اور بھٹیالی راگ
راگ کہ جن کو سن کر من میں بھڑکے پیار کی آگ

آگ کہ جس میں تپ کر مٹی بھی سونا بن جائے
سونا جس سے بنگلہ نار کا کنگن بن نہیں پائے

دھرتی سونا اگلے پھر بھی بھوک کی فصلیں کاٹیں
ہنس مکھ چہروں والے باسی جنم سے مٹی چاٹیں

بنگلہ نار کی دُنیا میں ہیں دُکھ کے گہرے سائے
بنگلہ نار جو روگ ہی پالے فاقوں سے مر جائے

جھکی کمان بنا ہوا چاشی[2] دھان کی فصلیں بوئے
دھان پکے تو دیکھ کے اس کو لہو کے آنسو روئے

لہو روئے کہ اس سے اس کا پیٹ نہ بھرنے پائے
دُور دیس کا بنیا آکر یہ پونجی لے جاتا ہے

نوکا، ہل اور کھیت کے رسیا رہیں سدا نراس
آس لگائے بیٹھے ہیں کب مٹے گی ان کی پیاس

۱؎ سنہرا بنگال۔ ۲؎ کسان

پہلے چھیکڑوں میں چھپانے دکھڑوں کے ہیں گیت　　گیت کہ جس سے بنگلہ دیس کی ریت بنی سنگیت
منڈل اور ٹیگور کے نغمے اس دھرتی کا مان
طوفانوں سے کھیلنے والے بسیں یہاں انسان

جلتے ہوئے جھرنوں کی اگنی دریاؤں کے گیت　　تنہا مانجھی! دکھ دُبدا طوفان ہیں اس کے میت
گھور گھٹا جب ٹوٹ کے برسے ناؤ کھائے جھکولے　　گم سم مانجھی بڑھتا جائے منہ سے کچھ نہ بولے
میگھا کے سینے پر مانجھی ڈولے تیری ناؤ　　گائے گیت سہانے پھر بھی چھپیں نا تیرے گھاؤ
پیار برہا کے گیت نہ مانجھی تیری بھوک مٹائیں　　تیری لوہا لاٹ سی باہنیں ٹوٹ کے گرنا جائیں
اک تہبند کو باندھے مانجھی ہر موسم تو جھیلے　　اک مچھلی کے کارن ساتھی طوفانوں سے کھیلے
کڑی مشقت کرنے پر بھی ایک ٹکا نہ پائے　　ایک ٹکا جو ساتھی تیرے پیٹ کی بھوک مٹائے
کٹیاؤں کا لیکھ بنا ہے محرومی اندھیارا　　بھوکا مریل جسم لئے ہے جیون کا دکھ سارا
دیا جلے نا کٹیا میں تیری گرمی ہو یا سردی　　اُترے ساگر دُوجے کھائیں تو سرسوں کی زردی
رنگت تیری کالی ہے پر من نہیں تیرا کالا　　اُٹھ کر مانجھی اندھیارے میں مار دے زہر کا بھالا
بھالا لگے تو اندھیارے میں اجیارا لہرائے
اُجیارا کہ جس سے تیرا جسم سپھل ہو جائے

شگو کیہلا

سحر انصاری

یوحنا

جو کہہ رہے ہیں کہ عقل و دانش کی طاقتیں خام ہو چکی ہیں
بلند بینی کو پست کرنے کی سازشیں عام ہو چکی ہیں
وہ میری آمد سے بے خبر ہیں
انہیں خبر دو۔
میں آ گیا ہوں۔
ستارۂ شرقِ وحی و الہام آ گیا ہے۔
وہ سجدہ گاہِ جبینِ ایام آ گیا ہے
کہ جس کی آمد زمینِ اشرار و جن و ادبار پر گراں ہے
جو قاطعِ حمد و مدح و تمجید بن کے آیا ہے
ہجومِ انساں میں ناسخِ اعتبارِ تقلید بن کے آیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ وہ نہ مانیں گے
ان کے سینے گناہگاروں کی قبر کی طرح تنگ و تاریک ہو چکے ہیں
ہوس کی آبِ بد نے ان کا ضمیر مرجھا کے رکھ دیا ہے
اور ان کی رگ رگ میں طبعِ طاغوت آگ بن کر دہک رہی ہے
اور ان کے جسموں کی کھیتیوں میں جذام کی فصل پک رہی ہے
وہ ماہ کو ماہ مہر کو مہر ماننے سے گریز کر کے یہ چاہتے ہیں

میں ان کی بیماریوں کو اپنے غلافِ مقدس میں جذب کر لوں
اور ان کی کمزوریوں کو حصارِ نفس بنا لوں
وہ چاہتے ہیں کہ میرے کہنے سے سنگ نانِ شیریں بن جائے
کہ میرے کہنے سے خشک صحرا ابھی رودِ آبِ کبیر بن جائے

میں اپنی ان آزمائشوں کے ہجوم سے دور دیکھتا ہوں
کہ رب الارباب اپنی ہیکل کے
کنگرے پر کھڑا ہوا مجھ سے کہہ رہا ہے
ہلاک ہو جا، ہلاک ہو جا
فصیلِ خود آگہی سے گر کر ہلاک ہو جا
مرے فرشتے تجھے ہلاکت سے قبل اپنی پناہ میں لے لیں گے
کہ تیرے زخموں سے چہرۂ آفتاب تاریک ہو گیا ہے

گواہ رہنا، ضمیرِ اقوامِ عہدِ حاضر، گواہ رہنا
یہی مری آزمائشیں تھیں
سو میں نے ان آزمائشوں کو
اپنی معجزنمائیوں سے سوا نہ پایا
گواہ رہنا کہ دخترِ حرص و آز کے لب
نہ پا سکے جب مرے لبوں کی حیات افزا حلاوتوں کو
تو میرا سر طشت میں سجا کر دیا گیا ہے
کہ اس کے شعلہ نژاد لب
میرے برف جیسے لبوں سے لیں انتقام اپنا
گواہ رہنا، ضمیرِ اقوامِ عہدِ حاضر، گواہ رہنا

کہ رب الارباب اپنے وعدوں سے پھر گیا ہے

میں اب بھی کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے ہوں اور میرے دست و پا میں
مظالم و مصلحت کی کیلیں چھپی ہوئی ہیں
میری بینائی شام کے ہولناک اندھیروں میں کھو گئی ہے
مگر میرے کرب آتش افروز جاں نے اب تک نہیں کہا ہے
ایلی ایلی لما شبقتنی
میں آسمان و زمیں کی پہنائیوں میں تنہا کھڑا ہوا ہوں
میں اپنی تنہائیوں کی تنہائیوں میں تنہا کھڑا ہوا ہوں
اور آج اس جانکنی کے عالم میں دیکھتا ہوں
کہ اپنے اپنے وجود کی اعتراف گاہوں میں
اپنے اپنے گناہ کی بازگشت سُن کر
ہللویاہ ! کہنے والے
خجالت و انفعال کے شرمسار فرزند
اپنی اپنی صلیب اٹھائے ہوئے مرے پاس آ رہے ہیں۔

احمد ہمیش

اضافے

ادھوری کہاوتوں اور مثالوں کا پُپلی[1] ذہن
سرپھری ڈھلانوں
کی طرف کیوں ہوا !
کیا سامنے کی ڈھلی ڈھلائی راحتیں ہاتھ نہ آئیں !..... نہیں
کہنے کو تو سب کچھ تھا...... رُخ بدل لیتیں تو شائد لاوارث ملکوں کے
دریاؤں میں بہتیں..... کنگال ڈیلٹوں پر مٹی کی نئی نئی پرتیں بچھاتیں
..... یا ننگے ہونے کی حسرت میں کپڑوں کے بدلے رازوں کو
پہنتے والے ایشیا کے مردوں اور عورتوں کے خوابوں کی تعبیریں
بنتیں !..... شاید

◆

"نہیں کہتے..... کہ تیز اور بے لاگ لہریں اپنے اوپر کھڑے ہوئے
پلوں کو نہیں پکارتیں..... تیز رک پرندوں کے پروں پر حکایتیں نہیں لکھتیں...... عبارتیں نہیں
سجاتیں..... حاشیوں اور کناروں کو نہیں پہچانتیں..... نہیں کہتے کہ ان میں میخوں اور برجیوں سے
جڑے ہوئے دروازے نہیں ہوتے...... بالکونیاں نہیں ہوتیں، دھوپ اور چھایا کو تولنے والی!
(تو پھر ہمارے کانوں اور ہماری آنکھوں کے بیچ ترتیب اور وزن اور سیرحٹ[2]
اور فارمولے اور کرافٹ اور ڈکشن کے میلے کیوں لگائے جاتے ہیں!)
..... نہیں سوچتے کہ ہمیں کئی بار بھانت بھانت کے فاؤنٹین پن، رائٹنگ پیڈ اور سوختے ملے.....
مگر ہمارے ٹیڑھے ہاتھوں میں ٹیڑھی ہو گئیں تمام نبوں کی نوکیں!..... پیڈوں کو نیچے اور پرائے

---

[1] پچھی لوٹنے سے مراد [2] سجاوٹ

حوالے نگل گئے ..... اور سوختوں کو ہوا لے اڑی ...... بھاری میزیں اور کرسیاں
چارپائیوں سے ٹکرا گئیں ...... اور جب چارپائیوں کو گھروں سے نکالنے پر گئے تو اُن کے
پائے دروازوں کے منڈی ملبوں میں اُلجھ گئے!
کیسے مان لیں ..... کبھی چلتے ہوئے قدم اُکھڑ بھی جاتے ہیں!
چلنے کو تو راستے میں ایک مقبرہ بھی ملا تھا ..... اپنے سیلے ہوئے چہرے جیسا! .....
چاہتے تو اس کے سڑے گلے پلستر سے ایک ٹکڑا توڑتے اور زبان کے نیچے اتار لیتے
..... آخر بچپن سے آج تک چبائے اپنے اور دوسروں کے لکھے ہوئے کاغذ! .....
حاملہ عورتوں کی طرح کھائے مٹی کے تراشے .... بلکہ کنکر، پتھر، دھات، ربڑ اور لکڑی
والان کی آڑ میں برسوں سے پڑی ہوئی بائیسکل نے ایک بچا جنا!
...... اور انعام میں نئے صحیفے!
ایسی کتنی ہی حیرتیں رہی ہوں گی ..... جنہیں گلے نہ لگا سکے!

نباتات سو رہے ہیں یا چیتے جاگتے گنگ ہوئے جاتے ہیں!
آنکھیں کھلی کھڑکی کے آگے پہنچتی ہیں یا بھورے دھبوں سے اَٹے ہوئے اندھیرے
میں محض تنے ہوئے، اکڑے ہوئے اور پالش کئے ہوئے کھمبے گڑے ہیں!
یا ابھی بدن سے بچا ہوا لہو اچھالتا ہے!
یا ابھی ابھی جو ریل، اچانک موج آجانے سے بے جان لٹکے ہوئے موت کو
سونگھتے پاؤں کے ٹھیک سامنے سے گزری ہے ..... کیا وہ اپنے ڈبوں میں
سو جائیں، آرائشیں اور اسباب لادے، چھوٹے بڑے اسٹیشنوں اور جنکشنوں سے
ہو کر شرم گاہوں تک جائے گی! ..... اگر سچ ہے تو جانیے کہ وہ کبھی واپس
نہ آئیں گی ..... بھلے کراہت کراہت، پکارتے رہیے ..... مگر توانائی کبھی
نہ پوری ہوگی!

مظہر امام

کنگال آدرش

اپنے آدرش کی مفلسی مجھ پہ کیوں تھوپنا چاہتی ہو؟
یہ محبت
جہاں پھول کھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں
یہ محبت جو چولھے سے بستر کی بھدّی شکن تک ہی محدود ہے
یہ محبّت نہیں، جبر ہے
خودغرض، مادرانہ محبت ہے

کسی شام احباب کے ساتھ دریا کنارے نہ جاؤں
کسی شب مئے ناب سے زندگی کو حرارت نہ بخشوں
کسی سہ پہر کو کسی سادہ رو سے نہ اک بار بھی مسکرا کر کہوں ــ
"آج تم اس نئے پیرہن میں بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو!"

کمار پاشی

رشتوں کی پہچان

ہمیں سب پتا ہے
کہ ہم دھرتیوں کے نرالے فسوں سے
ازل سے شناسا ہیں
اور نیلگوں آسمانوں کا نشّہ بھی
ہم نے چکھا ہے

اُنہیں غم یہی ہے، کہ اُن کے سروں پر
کوئی آسماں ہے
نہ پاؤں کے نیچے زمیں ہے
فقط اک خریدا ہوا کرب قسمت ہے ان کی

ہمیں سب پتا ہے
وہ لوٹیں گے اک دن پشیمان ہو کر
سفر کے دکھوں سے پریشان ہو کر
کہ دھرتی کا اور آسمانوں کا رشتہ
ازل سے پرانا ہے
اور ایک ہی سوت میں ہم پروئے ہوئے ہیں

دُکھ کے رستے

ہمیں الزام مت دینا
ہمیں تسلیم ہے، گردش سفر کی
اک تماشا تھی

کبھی تم سے ملے ہوتے
تمہارے علم سے ذہنوں کو اپنے جگمگا لیتے
یا پھر تم کو سفر میں ساتھ لے لیتے
تو نظروں میں تمہاری
ہم بھی کچھ ممتاز ہو جاتے

مگر یہ ہوش ہی کب تھا
رگوں میں گرم لذّت سرسراتی تھی
نرالے راستے ہم کو بلاتے تھے
ہمیں معلوم ہے، ہم بھی انوکھے تھے
تماشا بن گئے ہوں گے!
تماشا بن گئے ہوں گے!!

سلطان زبیری

یک رنگی

نسل کیا قوم کیا کالے گورے سے کیا ! — سارے انسان یکساں ہیں یک رنگ ہیں!!
سب کا من ایک سا سب کا تن ایک سا — سب کے زخموں کا رنگیں چمن ایک سا
سب کے انفاس کا رقص و رم ایک سا — سب کے جذبات کا زیر و بم ایک سا
سب کی روحوں کی تنہائیاں ایک سی — سب کے سینوں کی تابانیاں ایک سی
سب دلوں کے دھڑکنے کی لے ایک سی — سب کے ساغر میں ہے موجِ مے ایک سی
سب رہِ ارتقا کے ہیں جادہ شکن — سب کسی جادۂ جبر پر گام زن
سب حوادث کی آندھی سے دوچار ہیں — سب زمان و مکاں میں گرفتار ہیں
سب وراثت کی زنجیر کے صید ہیں — سب ہی ماحول کے خول میں قید ہیں
سب کے دل میں نہاں درد کا چاند ہے — (جس سے آکاش کا چاند بھی ماند ہے)
سب کی پلکوں پہ ہیں آنسوؤں کے دیئے — سب کے دامن میں ہیں جگنوؤں کے دیئے
سب امینِ متاعِ غمِ زندگی — سب کا دینِ مبیں روشنی! روشنی!
سب کی رگ رگ میں خونِ شفق رنگ ہے — سب کی فطرت ازل سے ہم آہنگ ہے
ایک ہی مے سے لبریز ہے ہر سبو — سرخ ہے ناچتا گنگناتا لہو!!

نسل کیا قوم کیا کالے گورے سے کیا
سارے انسان یکساں ہیں یک رنگ ہیں

سلمٰی فاروقی

مرگِ تمنّا

مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو
میں آرزوؤں کی تنگ و تاریک قبر میں تھک کے سو گیا ہوں

مری رگوں میں مرے ارادوں کا خون اب سرد ہو چکا ہے
شکستِ ناموسِ قلب و جاں سے ہے روشنی طبع کی پریدہ
کہ شعلۂ یخ نفس سے چہرہ حیات کا زرد ہو چکا ہے

نہ جانے کیا کیا جراحتوں کے گلاب مہکا گئے وہ دن جب
میں عرصہ گاہِ شب و سحر میں گئی بہاروں کا ہم سفر تھا
وفا کے ہونٹوں پہ نوحہ خواں ہے تبسمِ مرگِ عہد و پیماں
شعورِ گم کردۂ تمنا ، مآلِ فردا سے بے خبر تھا

متاعِ فکر و نظر ملی تو غبارِ خاطر میں کھو گیا ہوں
مجھے مرے جذبۂ محبت نے حسرتوں کا کفن دیا ہے
میں آرزوؤں کی تنگ و تاریک قبر میں تھک کے سو گیا ہوں

مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو
مرے تعاقب میں آنے والو حسین لمحو مجھے نہ ڈھونڈو

محسن احسان

لیڈی میکبتھ [۱]

رات، ہنگامۂ پیمانہ و ساغر میں کٹی
مئے و مینا سے فروزاں ہوئے طاق و در و بام
قہقہوں میں ڈھلی آزردگیٔ رزمِ حیات
نکہت و نور کا افسانہ بنی بزمِ حیات
جاں نثارانِ شہنشہ ہمہ تن تشنۂ کیف
گل عذارانِ گلستانِ وطن نشہ و کیف
رنگ و آہنگِ دف و چنگ سے تھی گرمیٔ شب
شوقِ خوشنودیٔ شہنشہ ــ مقصودِ نظر
رینگتے سایوں میں سرگوشیاں تھیں شب کو۔ مگر
صبح نے دیکھا لہو قصر کی دیواروں پہ

صبح دامن میں لہو اور اندھیرے لائی
یادِ ہنگامۂ شب دل پہ گراں گذرے ہے
سب کو اپنے ہی پہ قاتل کا گماں گذرے ہے
کس کو معلوم کہ اس پردۂ زنگاری میں
حسن کے مرمریں پیکر کا ستم کتنا ہے
روح اور ذہن کی اس کشمکشِ پیہم سے
دل میں تکلیف ہے کیا آنکھ میں نم کتنا ہے
ہوسِ جاہ نے کس موڑ پہ لا ٹھہرایا
پسِ دامانِ وفا رنج و الم کتنا ہے

۱ شیکسپئر کا ایک کردار

طلعت اشارت

شہرِ خراباں

ایک عجب شہر ہے یہ شہرِ خراباں اے دوست!

کوئی سمجھا یہ کھنڈر ہے تیری یادوں کا، یہاں
ہر نظر میں تیرا اندازِ نظر آتا ہے
میرے ہر گیت میں ہیں تیرے ہی معنی پنہاں
میرا ہر گیت ترا رازِ نظر آتا ہے

٭

کوئی یہ کہنے لگا کرب کا عالم ہے یہاں
صبح آتی ہے تو سر پر لئے رات آتی ہے
یہ سیہ کارشبِ ہجر تو کٹتی ہی نہیں
مژدۂ وصل بھی درد کی بات آتی ہے
مسکراتے ہوئے کچھ لمحوں کو ہم بوتے ہیں
فصلِ غم لے کے تباہی کی برات آتی ہے

٭

روشنی لے کے شمعِ خانۂ ہستی سے یہاں
ہر کوئی نقشِ قدم اپنے سجھاتا ہے
ہر بشر اپنے خیالات کے آئینے میں
اپنے معکوس تصور سے بہل جاتا ہے

کیا عجب شہر یہ شہرِ خراباں کہ یہاں!
ہر نفس اپنے تجربات کو دہراتا ہے

اعجاز فاروقی

آگہی

نیچے وادی سے دھواں سا اٹھا
پھر کوئی قافلہ ساماں آئے
مشعلیں ہاتھوں میں لے کر
شب کی تاریکی میں خیموں سے نکل آئے ہیں
جسم کی آگ میں روشن ہے لہو
مشعلیں رقص میں آئیں
ان کے شعلوں کے خطوں سے
ایک تصویر ہے — رنگوں سے بھری
ان کے شعلوں کی چٹک میں
راگ ہے — بین کا راگ

ناگ نکلا
گہری اندھی غار سے
جھومتا جھومتا لہراتا ہوا
جسم سے جسم ملے
مشعلوں کے سر جڑے
شعلے بھڑکے
جس سے تاریک فضائیں
بقعۂ نور بنیں
ناگ کے پھن سے یکایک
ایک شاہین اڑا

سبطِ نبی صمیم

تین نظمیں

جھروکہ

یہی اک جھروکہ
جسے بند پاکر کئی مسکرائے
کئی ایک نے اپنی گردن جھکا لی
کئی داستانوں کا باعث ہوا ہے

آواگون

اب تو ہر سمت اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کل یہیں نور کی بارش کا گماں ہوتا تھا
کل سے پھر نور کی بارش ہوگی

سوچ

میں نے کھل کر
کیاری کیاری اپنی خوشبو
پھیلا دی ہے
لیکن میں بھی کچھ لمحوں میں
پتی پتی ہو جاؤں گا ـــــ

محمد انیس

سکوتِ سرد

تھکے تھکے سے ہیں اشجار سونے سونے سے سائے
اداس راستے تنہا زمیں سے چھٹے ہیں
فسردہ دشت کی آنکھوں میں انتظار کی گرد
نہ سارباں کی صدائیں نہ اب جرس کی پکار
نہ نقش پا ہے کوئی اور نہ چوبِ خشک کی راکھ
مسافروں نے تو چلنا بھلا دیا جیسے....

نہ کوئی ذکرِ مسیحائے زخم زارِ حیات
نہ کوئی یاد نگاہِ وفا، نہ خواب وصال
نہ کوئی دوست، نہ سرگوشیٔ دلِ ہمدرد
ہر آنکھ اجنبی، ہر لب خموش و بے آواز

نہ وہ جنون کہ آوارگی کا دل دہلے
نہ وہ شعور کہ صدیاں بھلا نہ پائیں جسے
نہ وہ تھکن کہ ابر کی بھی آنکھ بھر آئے
نہ وہ سکوں کہ زمانے کی سانس اکھڑ جائے

نہ کوئی خواہشِ منزل، نہ کوئی ذوقِ سفر
نہ کوئی رات کی آہٹ، نہ کوئی صبح کی چاپ
ہر اک سمت سکوتِ عدم ردا پھیلائے
فضائے شہر و بیاباں میں کوئی فرق نہیں

تصورات بھی دامن کشاں گذرتے ہیں۔
خلائے بیکراں بے ہر د تلخ ٹھہری ہے
سکوتِ سرد یہ انفاسِ جاں سے کہتا ہے
"تمہارے واسطے کوئی پناہ گاہ نہیں
تمہارے واسطے کوئی ...."

شبی فاروقی

دوہے

بن چندا کب چاندنی ہووے، بن سورج کب دھوپ
بن ساجن کیا ساجے گوری تیرا روپ سروپ

مان سرور جھیل ہے مکھڑا، نین کنول کے پھول
ماتھے تلک لگاؤں گوری تیرے چرن کی دھول

پیار ہے جیون، پیار آتما، پیارا امر سنگیت
پیار بنا جگ سونا گوری، مان بھی لے اب میت

سبھی نراش ہیں دکھ کے کارن کون کسے سمجھائے
من کی جوت بجھے تو جیون ایک چتا بن جائے

کبھی کسی کے پیار کی چنتا، کبھی کسی کا دھیان
اپنا من بیراگی ہو تو کہاں ملے نروان

من کی دھیرج، تن کی شکتی، کوئی نہ جانے ہائے
ماٹی کا ہے ایک گھروندا، اوس پڑے ڈھ جائے

شبی ملا ہے جب سے تم کو اس دیوی کا پیار
کوئی کہے تم مہا کوی ہو، کوئی کہے اوتار

اسد محمد خاں

گیت

پہلے گھاؤ کی کتھا سنل تے کٹی رے ساری رین
دن نکلا اک موہنی مورت سجا گئی دو نین
اک پگ چلوں تو رین کھڑی رے
دوجے پگ اجیالا
کون باٹ نہیں گھور نراشا
کس رستے نہیں جوالا
گہری رے ندیا دھیان دیس کی گھنی اماوس رین
دھیرج دور میں باندھ چلے کہیں ڈبو نہ دیں وہی نین

ناصر شہزاد

گیت

باجت ہیں گھڑیال سکھی ری باجت ہیں گھڑیال
من کی نگریا میں اپوا اک سندر روپ نہال
باجت ہیں گھڑیال
میں ناچوں نت تھئی تت تا تھیا
چھنکے گھنگھروا چھیا چھیا
لہکے چنریا لال
باجت ہیں گھڑیال
دیکھ سجن کی اور تو گوری
پریت کرے موسے جوراجوری
جینا بھیو جنجال
باجت ہیں گھڑیال
پریتم کی ہے شان نرالی
نین منوہر، چھب متوالی
چال لچکتی ڈال
باجت ہیں گھڑیال
بات نہ مانے نٹ کھٹ چھلیا
موہ لے چھیڑ کے مست مرلیا
جیارا ہوا بے حال
باجت ہیں گھڑیال

مضامین

پروفیسر احمد علی

تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ لکھا گیا ہو۔ دراصل یہ ایک رومانی تحریک تھی۔ اس میں بغاوت کا عنصر ضرور غالب تھا جو فرسودہ ماضی اور ناگزیر حال کے ان ناقص اور پراگندہ افکار و رجحانات کے خلاف بلند ہوئی۔ جو اس دور کے ادب اور زندگی میں نمایاں تھے۔ اور ایک غیر قوم کی محکومیت کی طرف سے لوگوں کی بے حسی اور ان سب عقائد و پابندیٔ رسوم کے خلاف بھی جو جہالت کی پیداوار تھے (جن کی وجہ سے ذہین انسان کی بہترین راہیں جو غور و فکر یا تدبیر کی طرف لے جاتی ہیں بند ہو کے رہ گئی تھیں) اور ساتھ ہی ساتھ تشدد اور غربت و افلاس اور ترقی کی طرف سے بے اعتنائی کے خلاف احتجاج تھا۔ اس بغاوت کا محرک وہ جذبہ تھا جو ادب میں بیداری پیدا کر کے اسے زندگی سے ہم آہنگ اور نظم و نثر دونوں کو عوام کے لب و لہجہ اور محاورہ کے قریب تر لا کے انسان کی کاوشوں کو ذہنی و مادی آزادی کے مفہوم سے آگاہ و ہم کنار کر دینا چاہتا تھا۔ اس تحریک کے اصل بانیوں کے ذہن میں اُس وقت کوئی خاص سیاسی و نظریاتی مقصد نہ تھا۔ جب بڑے گرما گرم مباحثوں اور تخلیقی جوش و خروش کے بعد انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "انگارے" ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کی بنیاد رکھی۔ ہمیں یہ خیال ضرور تھا کہ اس کے شائع ہونے پر مخالفت ہوگی۔ لیکن اس بات کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ یہ مخالفت اس قدر شدت اختیار کرے گی کہ ملک بھر میں تہلکہ مچ جائے گا اور اصل نظریاتی مفہوم اس تحریک کے سیاسی کارکنوں نے ۱۹۳۶ء میں اس پر عائد کیا اور چنانچہ یہی لوگ جب سے برابر پیش پیش ہیں اور اس کی نمائندگی بھی اپنے قبضہ میں کر رکھی ہے۔ جب صوبائی حکومت نے "انگارے" کو زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند اس بنا پر ضبط کر لیا کہ یہ کتاب ایک خاص فرقہ کے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کرتی ہے۔ تو محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے اُن کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انہوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیجدی۔ چنانچہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں اس کے بانی مبانیوں کے سامنے جو اصل مقصد تھا۔ وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ "ہم ان تمام اہم مسائلِ زندگی پر آزادیٔ رائے اور تنقید کا حق چاہتے ہیں جو نسلِ انسانی کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔۔۔" (لیڈر، الہ آباد، مورخہ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء)۔ اسی زمانہ میں، لیکن اس اعلان کے بعد، برصغیر کے ادیبوں کا ایک جلسہ لندن میں بھی منعقد ہوا جس میں ملک راج آنند، راجہ راؤ، اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر

کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ہمارے مقاصد سے ملتے جلتے خیالات سے اتفاق کیا۔

وہ ہنگامہ جو ۱۹۳۶ء کی پہلی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ہوا۔ زیادہ تر سیاسی تھا اور اس نے تحریک کی اس شکل و ہیئت کو مسخ کر دیا جس پر اس کی بنیاد پڑی تھی اور جس کا اعلان اس کانفرنس کے انعقاد سے تین سال قبل کیا گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کانفرنس کے بعد وہ مصنف جو دراصل تخلیقی تھے۔ آخر کار تحریک کے سیاسی گروہ سے دور ہوتے اور کٹتے چلے گئے۔ جس کی بنا پر سجاد ظہیر نے ان کا اور اصل واقعات کا ذکر اپنی یک طرفہ تصنیف میں یا تو تنگ تعصب سے کیا ہے۔ یا ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور ایسی تصانیف کا نام تک نہیں لیا ہے جو ان کے مفاد کے منافی تھیں۔ یا ان کی بساط کے جمے ہوئے نقشہ کو درہم برہم کر دیتیں، حالانکہ یہی تحریریں ادبی ترقی میں مشعلِ راہ قرار دی گئی ہیں۔ سجاد ظہیر کا اندازِ بیان اکثر تو اس قدر شخصی اور ذاتیاتی ہو گیا ہے کہ ذاتی عناد اور بغض معاویہ کا ثبوت دیتا ہے جس کی اصل وجہ ان کے اپنے ذہن میں ہی پوشیدہ ہے اور ایسی شدت اختیار کر گئی ہے جو ایک مورخ اور نقاد کے لئے حد درجہ ضرر رساں اور باطل ہے، جس کا ذکر ہی سجاد ظہیر کے اپنے افتراد عصبیت کے متوازی ہوگا اور جس سے پرہیز اس لئے بہتر ہے کہ دو اغلاط ایک حق بننے کے مصداق نہیں۔

۳۲ء میں سجاد ظہیر اور اس نظریہ کے حامی چند اور رہرو بنیادی طور پر حسن کے خوگر و دلدادہ تھے۔ جن کی دلی خواہش تھی کہ نظام زمانہ کے فرسودہ جمود میں حرکت پیدا کر کے اس کو اپنی تمناؤں کا آئینہ بنا دیں اور ادب کو بے حسی اور خوابِ غفلت سے بیدار کر کے زندگی کی گھما گھمی سے دوچار کر دیں۔ یہ نوجوان یورپ اور اس کے نئے ادبی رجحانات سے متاثر ہو چکے تھے اور اپنے ملک میں بھی ادب اور زندگی کی وہی لہر دیکھنی چاہتے تھے جو مغربی ممالک میں دوڑ رہی تھی اور دوسری شائستہ زبانوں کی طرح اردو اور برصغیر کی دیگر زبانوں میں بھی عظمت اور عروج کے متمنی اور اپنے ہم وطنوں کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے جذبہ حب الوطنی کے جمالیاتی شعور اور اس ادبی تحریک کے حسن و جمال میں دل و جان سے منہمک تھے جو رفتہ رفتہ انگلستان سے لے کر جاپان تک پھیل رہی تھی اور جس نے یورپ کو جگا دیا تھا اور اب ایشیا کو خواب گراں سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ان کے دلوں میں یہ امنگ بھی تھی کہ وہ بھی اور آزاد قوموں کی طرح اس عقیدے اور اس نظریہ پر کاربند ہو جائیں کہ انسان کے منصب اور اس کی عظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ نئے رجحانات، افکار اور نئے طرز اور اظہارِ خیال کا بانی رہے۔ یہ وہ رجحان تھا جو ایک نو بیدار اور خوگرِ حسن "نوزرز دازی" میں پیدا ہو کر ہر سمت پھیل چلا تھا۔ ہندوستانی نوجوانوں کا یہ محدود حلقہ بھی ایک رنگین اور گہرے تخیل سے لبریز تھا جس میں انسان کی حالتِ زار اور تخلیق کی کاوشوں کا درد برابر کسک بڑھا رہا تھا۔ اس میں شک نہیں یہ ایک ایسی دنیا تھی جسے کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ وہ لازمی بھٹی بھی تھی جس میں نئے رجحان اور خیالات پک کر کندن بن جاتے ہیں۔ تاہم اس تحریک کی دو اہم تحسینیں ۱۹۳۲ء میں بہت چیزوں میں ہم خیال و ہم ذوق تھیں۔ مثلاً شوخ رنگ کی قمیصوں اور متضاد رنگ کی ٹائیوں، چوڑے کنارے کے سیاہ ہیٹ پہننے اوڑھنے اور طرح بہ طرح کے شمعدان اور پیرس کی گرجا پر بنے ہوئے شیطانوں کے مجسمے جمع کرنے کا شوق، باخ اور بیتھوون کے سنگیت سے رغبت اور جیمس جوائس، ڈی، ایچ۔ لارنس، ورجینیا وولف اور "نیو رائٹنگ" کے شعرا کے ساتھ ساتھ گورکی اور چیخوف کی تصانیف سے لگاؤ۔ اور حالانکہ وہ حد درجہ قوم پرست ہونے کے باعث انگریزی راج کے مخالف تھے۔ تاہم مارکسیت کا جذبہ ان پر اس وقت غالب نہ تھا۔ گو ان میں سے بعض اس نظریہ کی طرف مائل ضرور تھے کیونکہ اس کے علاوہ سماجی اور سیاسی دلدل سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آتا تھا۔ مگر کچھ افراد میں یہ جذبہ مبہم تھا۔ گو کئی میں نمایاں حیثیت بھی رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ عقائد سیاسی نہیں بلکہ رومانی تھے اور اس خواہش پر مبنی تھے کہ نظام زندگی کو بہتر بنائیں اور اپنے وطن اور اس کے فنونِ لطیفہ کو اسی معیار و تاثر کے برابر

پہونچادیں جو آزاد اور آزادی حاصل کرنے والے ممالک کو حاصل تھا۔ جو نہ صرف لوگوں کو موجودہ زمانہ ہی میں فرسودہ رسوم اور ذہنی قید سے رہائی دلاکر آزادی کے احساسات کا اثبات کرسکے بلکہ ایک تابناک مستقبل کی طرف بڑھنے کی تلقین و رہنمائی بھی کرے تاکہ وہ خود کو ایک آزاد دنیا کے ادیبوں کا ہم پلہ محسوس کرسکیں اور ان کے ہمراہ خود بھی سیاسی، فکری اور ذہنی آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور انسان کی شکستہ عقیدت اور ایقان کی تعمیر نو کرکے اس کو پھر انسانیت اور ہوشمندی کا گرویدہ بنادیں اور اس طرح سب کے واسطے بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل جدوجہد اور ترقی کی راہیں یکساں کھول کر انسان کی عظمت اور بلندی منصب کو دوبارہ زندہ کردکھائیں۔

ظاہر ہے یہ سب رجحانات اصلاً رومانی تھے۔ جن کا اثبات تحریک سے منسلک ہونے والے تخلیقی مصنفین کی تحریروں سے آج اور بھی صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے۔ چاہے وہ مجاز کی شاعری ہو یا جوش کی یا پریم چند اور کرشن چندر کی تصانیف یا خود سجاد ظہیر کی ناول نویسی کے میدان میں ناکامیاب کوشش یعنی "لندن کی ایک رات"۔ کبھی کبھی ان میں سے کچھ لکھنے والے تخلیق کے کرب میں اپنی ذات سے ابھر کر انسانی جبلت اور نازک ترین احساسات تک پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے "کفن" میں جو انسان کی طبعی بے کلی اور جہد مسلسل کی تمثیل بن جانے کا درجہ رکھتا ہے، اور کہیں کہیں وہ تھوڑی دور تک ترقی پسندی کی طرف رجوع ہوتے ہیں مثلاً کرشن چندر کی "ایک فرلانگ لمبی سڑک" یا منٹو کے "نیا قانون" میں، مجموعی طور پر وہ اس دنیا کا رومانی تصور اور انداز برقرار رکھتے ہیں جو یا تو فرسودہ ہوچکا تھا یا ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی۔

یہ عالم کوئی منجمد اجسام اور ٹھہرے ہوئے خیالات کا مجموعہ نہیں۔ فطرت ہمیشہ سے روانی، حرکت اور نت نئی تبدیلیوں کی طرف راجع ومجبور رہی ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ جو چیز آج حق تصور کی جاتی ہے کل بھی قابل قبول ہو۔ نور وظلمت، حیات وممات، تعمیر وتخریب لازم و ملزوم ہیں۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ ہر شئے اپنا تضاد ساتھ لے کر وجود میں آتی ہے۔ اگر اس تحریک سے منسلک اہل نظر کسی واحد نظریہ اور مقصد کے حصول میں ایقان رکھتے ہیں تو انہیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ تخلیق کا وہی کرب جو ان کے مقصد اور نظریہ کے حصول کا سبب بنا ہے، اس نظریہ کو موت کی گھاٹی میں اتارنے کے لئے تخریبی صورت اختیار کرے گا۔ اس لئے کہ کبھی کوئی شئے ہمیشہ ایک ہی سطح پر برقرار نہیں رہتی۔ ثبات صرف تغیر کو ہے۔ برصغیر سے برطانوی راج کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ اس صدی کے تیسرے دور کی حقیقتیں اور حالات تبدیل ہوگئے۔ چنانچہ اس تحریک کے سیاست پسندوں نے اپنے نظریات ومقاصد میں تبدیلی وترمیم کرکے اشتراکیت کا نعرہ بلند کیا۔ ان سیاست پسندوں کو یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اگر انہوں نے یہ مہم سر کر بھی لی تو کیا آج کی موجودہ حقیقت ختم نہ ہوجائے گی؟ اور کیا کل جو حقیقت اور مسائل ابھر کر سامنے آئیں گے، وہ نئے نظریات، نئے مسائل کو جگہ دینے کے لئے دم نہ توڑ دیں گے؟

ایک تخلیقی مصنف حقیقت کا اظہار ماضی کے گہرے شعور اور آگہی کے ساتھ کرتا ہے۔ اور حال کا احساس اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ ان ہی اوصاف کے اجتماع کی بدولت وہ مستقبل کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے۔ کیا تحریک کے سیاست پسند آج تحریک کے عنوخواست نہیں ہیں؟ یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک مارکسزم یا اشتراکیت کی تحریک نہیں تھی۔ اس خاص نظریہ کے حامی یا تو غلطی پر ہیں یا پھر وہ اس تحریک کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اور بہ فرض محال ایسا تھا بھی تو یہ تصور ان عنوخواست لوگوں کے اذہان ہی میں پوشیدہ اور ان کی ذات سے ہی وابستہ تھا۔ لیکن اس نظریہ کو نہ تو قبول عام کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی یہ راہ دوسروں نے اختیار کی۔ اس صدی کے تیسرے دور کے مشہور تخلیقی مصنفین میں سے کسی نے بھی اشتراکیت شعار نہیں کی علاوہ اس

واحد ذات کے جو آج مشکوک ہو چکی ہے۔ ۱۹۳۸ء-۳۹ء میں جب اس تحریک کو اشتراکی نظریہ کے تابع کرنے کی کوشش کی گئی تو تخلیقی مصنفین کے ایک حلقے نے فوراً اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اگر پریم چند زندہ رہتے تو ان کا فیصلہ بھی یہی ہوتا کیونکہ وہ کسی طرح بھی اشتراکی نہ تھے۔ حالانکہ وہ ان معنوں میں ترقی پسند ضرور تھے جن میں ہم اس لفظ کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ یعنی ادب اور زندگی میں ترقی، وہ ترقی جو آزادی اور خیالات کی ترتیب اور ان کے رجحان میں مسرت انگیزی، صحت مندی اور بہبود کا پیغام لائے۔ ہمارے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب عوام الناس کی بہبودی اور بھلائی تھا نہ کہ صرف مزدوروں، مزارعین اور مخصوص نظریات کے حامیوں کی بھلائی کا۔ ہمارا مقصد ہرگز نہ تھا کہ ہم کسی مخصوص نظریۂ سیاست یا مجموعۂ عقائد کے تابع ہو جائیں۔ اشکال کی صورت میں اگر اس مسئلہ کو دیکھا جائے، جو بیان و تشریح کا ایک ذریعہ ہے لیکن جس سے سجاد ظہیر کو اپنی تصنیف "روشنائی" میں اس قدر چڑ ہے، تو شکل اس طرح نظر آئے گی، کوئی بھی ایک نقطہ وقت پر کھنچے ہوئے ایک خط پہ کبھی ایک ہی مقام پر برقرار نہیں رہتا۔ یعنی الف ب اور ب ج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وقت کا وہ خط بھی مسلسل طور پہ بدلتا رہتا ہے اور س سے ص اور ص سے ک تک بڑھ آتا ہے۔ انسانی تہذیبوں میں بھی اسی نوع کی تحریک برابر ہوتی رہتی ہے۔ جاگیرداری شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی۔ اور شہنشاہیت دوسری تحریکوں میں اور یہ حرکت مستقلاً جاری ہے۔ کسی مخصوص نظریہ اور کسی واحد حقیقت کو قبول کر لینا اور پھر اسی پر قائم رہنا بذات خود ترقی کے منافی ہے۔ یہ وہ مقصد نہیں جس پر ہمارا یقین تھا اور جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ آج جو حضرات اس تحریک کے سربراہ اور محافظ ہیں وہ اسی نظریہ پہ قائم ہیں اور بضد بھی ہیں۔ لیکن کارواں آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔

ان شعرا کو چھوڑ کر جو دیرینہ روایت کے حامی تھے مثلاً جوش یا وہ شاعر جن کے کلام میں ہمواری پیدا نہیں ہوئی، اس گروہ کے دو ممتاز شاعر اسرار الحق مجاز اور فیض احمد فیض ہیں۔ سو ان دونوں کی شاعری بنیادی طور پہ رومانی ہے۔ اس میں انسان اور آرٹ کے ایک نو زائیدہ نظریہ اور شعور کے نئے پردوں کے وا ہو جانے پر نت نیا تحیّر اور استعجاب پایا جاتا ہے۔ اس میں زندگی اور سیاست کا ایک نیا احساس، پہلو ملتا ہے اور سماجی مسائل اور قیودِ ماضی و رسوم کو سمجھنے کی نئی صلاحیت بھی۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے ان کے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے ماخوذ، ان کی زبان لوگوں کی فہم کے قریب تر، اور ان کے اشعار احساسِ ذات اور انسانی عظمت کی صفات کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری دیرینہ خیالات کو نئے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اور ان کی تشبیہات اور تاثر کا نیاپن ایک خاص خوشی بخشتا ہے۔ لیکن مجاز جو رات میں ریل کے سفر کو شیفین سپینڈر سے بھی زیادہ دلکش پیرائے میں بیان کر سکتا تھا یا چاند کو ملاّ کے عمامے اور بنیے کی کتاب سے تشبیہہ دے سکتا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں حد درجہ بجی اور داخلی جدوجہد میں مبتلا تھا۔ اور مستیِ شراب میں ایک میخانہ کے اندر ہانا پائی میں جاں بحق ہوا۔ جو ایک انتہائی رومانی موت تھی۔

فیض حالانکہ زندگی میں سنجیدہ اور متین شخص ہیں اپنی شاعری میں وہ بھی محبت کے جال میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور روایات دیرینہ اور وہ ذاتی مسائل جو ایک شاعر کی تمنا ہیں۔ ان کے لئے مزدور، کسان یا عوام الناس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی آواز کلیتاً شخصی اور ذاتی ہے جو ماضی کی آوازِ بازگشت کے ساتھ ساتھ بیزاری کی تڑپ اور کم از کم شروع کی نظموں میں تو بغاوت کی اولین جھلک سے تیز ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ تو پیشین گوئی اور نہ تجزیہ میں ان رومانی رجحانات سے ابھر کر آگے بڑھتی ہے جو اس میں مضمر ہیں، نہ کسی سیاسی منزل ہی کی نشاندہی کرتی ہے چنانچہ سجاد ظہیر بھی جو اس تحریک کے سیاسی محافظ بنے ہوئے ہیں، ۱۹۵۶ء میں فیض کے تیسرے اور آخری مجموعۂ کلام "زنداں نامہ" کے پیش لفظ میں اقرار کرتے ہیں کہ "فیض کے تمام چاہنے والے۔ ان سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں

لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلہ میں، جو وہ کر چکے ہیں، زیادہ گراں قدر ہوں گی۔" اس صالح امید اور توقع کے باوجود فیض کا کوئی اور مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا، اور وہ دو چار نظمیں جو کبھی کبھار مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً "زنداں نامہ" کے بعد شائع ہوتی رہی ہیں، سجاد ظہیر کی امیدوں اور توقعات پر پانی پھیر دیتی ہیں اور "لینن پرائز" کے باوجود اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے۔

فیض کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد جو صفات ان کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ وہ تغزل کا نغمہ اور محبت کا جوش ہیں۔ ان کی وہ نظم جس کا عنوان "تنہائی" ہے ان کے حقیقی موضوع اور اظہار خیال کی معراج ہے:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا.....

جدید نظموں میں سے چند ہی ایسا تاثر پیدا کر سکی ہیں جو ایک جذبہ کو اس طرح از سر نو تخلیق کرتا ہے کہ اس کا نغمہ ذہن میں دیر تک گونجتا رہتا ہے، اس کے باوجود بھی اس نظم میں جو مسئلہ درپیش ہے۔ اور اس کا حل بھی دوسرے درجہ کی رومانیت سے آگے نہیں بڑھتا اور انگریزی رومانی شاعروں کے دوسرے گروہ کی رومانی شاعری کے ہم پلہ ہے جو "پری ریفیلائٹ برادرہڈ" کے نام سے مشہور ہے۔ "نقش فریادی" کی کئی اور نظموں میں فیض ان ہی خیالات کو مختلف لہجے اور مختلف اسالیب سے اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ اور نئی تشبیہوں میں ماضی لازوال کے افکار غالب کے الفاظ اور جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ گو ان میں غالب کی سی گہرائی اور نشتریت پیدا نہیں ہوتی اور نہ الیٹ ہی کی وہ خالی فضا میں گونج "کھوکھلے انسان" میں سنائی دیتی ہے۔ جن کا شائبہ فیض کی نظموں کے ہیرو میں ملتا ہے۔

اس بات میں شک نہیں کہ فیض اپنی شاعری میں فرسودہ رسوم و رواج اور کہنہ خیالات پر تخلیقی کاوشوں کے دوران چوٹ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے نظریۂ حسن اور جذبۂ عشق میں تحیر و استعجاب کے احساسات نہ تو ہم کو آگے بڑھاتے ہیں اور نہ رومانی جذبات کے منافی ہی ہیں۔ اور جب وہ رسمی محبت کے بوجھ کو اپنے سر سے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں جو ماضی سے اکٹھا ہوتا چلا آیا ہے تو وہ اریسٹوکریٹک ذہن کی قدامت سے آگے نہیں بڑھ سکتے جیسا کہ ان کی اس نظم سے ظاہر ہے:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض کے آخری مجموعے "زنداں نامہ" کی ایک غزل کی ابتدا اس طمطراق سے ہوتی ہے کہ ہماری امیدیں بندھ جاتی ہیں کہ فیض اب بغاوت کی آواز بلند کریں گے:

وہ خزاں میں تلاش بہار کرتے رہے
شب سیہ سے طلب حسن یار کرتے رہے
خیال یار کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے!

مگر اگلے ہی شعر میں بجائے آگے بڑھنے کے وہ خود ہی میں کھو جاتے ہیں اور بغاوت کی آواز جذبۂ رقت کی سرد آہ میں ضم ہو جاتی ہے:

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

اور سجاد ظہیر کی توقع" ترقی" اپنا رُخ یک لخت دوسری سمت میں بدل لیتی ہے۔

اس مجموعہ کی دوسری نظموں اور غزلوں میں جو سب کی سب ایامِ اسیری میں لکھی گئی تھیں یہی حسرتِ حسن اور تمنائے دردِ محبت ملتی ہے:

شاخ پہ خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی
سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی
اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی
برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی
آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی
چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

حتیٰ کہ اُس نظم میں بھی جہاں ہمیں ان کے مخصوص یساری رجحان کے اظہار کی توقع تھی۔ صرف رومانیت اور تغزل ہی نظر آتے ہیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے ....

چنانچہ ان نظموں میں بھی جو جیل میں لکھی گئی تھیں اس سے زیادہ سیاسی فکر نہیں پایا جاتا۔

ایک شاعر کے لئے اِن دو میں سے ایک ہی صورت ہو سکتی ہے: یا تو وہ اپنے آپ سے دروغ گوئی نہ کرے، یا پھر اپنے ذاتی اخلاص کو اس تحریک کے سیاسی نگرانوں کو سونپ کے قربان کر دے جس تحریک سے وہ اس بنا پر منسلک تھا کہ اس میں اس کے اپنے ان خیالوں کا عکس نظر آتا تھا جن کی بنیاد اصولِ انسانیت پر تھی نہ کہ کسی خاص مارکسی سیاسی رجحان پر جو آج بھی اس تحریک کے قدامت پسند گروہ کی منزلِ مقصود ہے اور جس کی تحریریں سیاسی نظریات میں رنگی ہوئی اور صرف مزدوروں اور کسانوں کے مفاد اور بہبود کے لئے وقف ہیں جن میں نہ تو آفاقیت ہی ملتی ہے اور نہ وہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ ہی کو آزادانہ طور پر متاثر کر سکتی ہیں۔ لیکن فیض آج بھی اس لئے مقبول ہے کہ وہ دھیمے سروں میں جذباتِ محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ اس میں رشتۂ ماضی سے استواری کے ساتھ حال سے بھی آگہی ملتی ہے، جس کی شریانوں میں زندگی اور حسن کا لہو دوڑ رہا ہے۔

فیض کو اس تحریک کے سیاسی نگراں آج بھی بلند پایہ شاعر مانتے ہیں اور تحریک کی نمائندگی کا شرف بھی بخشتے ہیں۔ اس مختصر جائزہ

سے وہ وسیع اختلاف واضح ہو گیا ہوگا جو تحریک کے قدامت پسند سیاسی گروہ اور اصلی انجمن ترقی پسند مصنفین کے تخلیقی معنوں کے درمیان ۱۹۳۶ء کے بعد موجود رہا ہے۔ میں نے یہاں نثر نگاروں سے اس لئے بحث نہیں کی کہ تحریک کے سیاسی نگرانوں نے ابھی تک کسی افسانہ نویس یا ناول نگار کو ان معنوں میں "ترقی پسند" ہونے کا اعزاز عطا نہیں کیا جن سے فیض کو سرفراز کر چکے ہیں۔ ناقدین میں مجنوں گورکھپوری کو صفِ اول میں جگہ دی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ تنقید کے محاسن سے قطع نظر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا اندازِ نظر عمرانیاتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس بات کے داعی ہیں کہ زندگی کو مکمل اور جامع بنانے کے لئے روٹی کے علاوہ اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ مزید براں ان مصنفوں اور نقادوں کو جو ابتدا میں اس تحریک سے منسلک اور اس صدی کے تیسرے دور میں ہر طرح اہم اور صحیح و وسیع معنوں میں ترقی پسند بھی تھے۔ سجاد ظہیر نے یکسر فراموش کر دیا ہے یا انہیں روشنائی میں روسیاہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور اگر کہیں ان کے قلم سے ان کے لئے کچھ نکلا بھی ہے تو اس قدر بخل و عناد کے ساتھ کہ اگر اس کو درگزر ہی کر دیتے تو ان کی تو قیر تنقید میں کمی واقع نہ ہوتی۔

دراصل بنیادی غلطی اس خیال سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ تحریک ایک خاص قسم و خیال کی سیاسی تحریک تھی، حالانکہ یہ تحریک اشتراکی نہ تھی بلکہ مصنفوں اور پڑھنے والوں کی ایسی جماعت تھی جو آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دلاتی تھی جس کا مقصد ماضی کی غلطیوں اور بے اعتنائیوں کو دور کرنا، مشاہدہ کی صداقت اور حقیقت پسندی تھا (یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بیشتر اس اصول پر زیادہ دیر تک کاربند نہ رہ سکے) یہ تحریک اس بات کی خواہش کا اظہار تھی کہ معاشرے اور سماج کو خرابیوں سے پاک کر دیا جائے۔ اور اس عقیدہ کی تجدید نو تھی کہ انسان کا مقصد ایک آزاد اور مہذب مخلوق کی طرح زندہ رہنا اور حب الوطنی کے جذبات اور غور و فکر کے مادے کو فروغ دینا ہے۔ اس کا مقصد سماجی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ آرٹ اور ادب میں بلند معیار کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ ان معنوں میں "ترقی پسندی" کا مطلب مختصراً یہ تھا کہ بلا لحاظ امارت و غربت، مہذب انسانوں کی زندگی کو زیادہ پُرمسرت اور مکمل بنانے کے لئے خیالات، معیار اور انداز بیان و اظہار کو بلند کیا جائے اور اس منزل کی طرف رہنمائی کی جائے۔ جہاں ہر شخص تفکرات سے آزاد ہو، جہاں انسانی زندگی اس غربت و افلاس کے سایوں میں مبرّا ہو جو محض جہالت کی پیداوار ہیں، جہاں "انتہائی اہم مسائل حیات پر آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تنقید کے حقوق حاصل ہوں" اور ذہن قیود و رسوم و توہمات سے آزاد ہوں۔ سیاست پسندوں کے علاوہ اس تحریک کے بیشتر نمایاں اور اہم اراکین فرانسیسی مفکر روسو کی طرح رومانوی یا انقلابی تھے۔ جن کا مسلک ایک نئے اور بہتر معاشرے کی تعمیر و تشکیل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد معنوں میں اس تحریک کا اثر اور اس کی مقبولیت ختم ہو گئی۔ اس امر کا مسلمہ ثبوت ہے۔ اس بےچینی و بیزاری کا اظہار جو ۱۹۴۷ء کے بعد حالات سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دور کے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے ذریعہ کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اور ہی ذرائع سے، اور اس تحریک کے اولیں ممبروں کے قلم سے نہیں بلکہ دیگر مصنفوں کی تحریروں سے۔ اس لئے کہ ترقی کے معنی ایک ہی مقام پر ٹھہرے رہنے کے نہیں، اور وہ شئے جس کو وقت کی گردش اور فاصلہ کے تقاضے نے ہم سے دور کر دیا ہے کبھی بھی وقت و فاصلہ کے اسی مقام پر واپس نہیں آسکتی جس سے وہ آگے بڑھ چکی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

زبان کی تدریس کا مسئلہ

دوسروں کی زبان سیکھنے اور دوسروں کو اپنی زبان سکھانے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس انسانی معاشرہ کی وسعت کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ جب انسان کے سماجی تعلقات گھر کنبہ برادری گاؤں قصبہ اور شہر کی وسعتوں سے باہر پھیلے تو انسان کو پہلی مرتبہ اجنبی زبانوں سے واسطہ پڑا۔ یہ زبانیں اجنبی ہونے کے باوجود ان کی زبانوں سے ملتی جلتی تھیں لیکن جب یہ تعلقات اور پھیلے اور انسان نے دور دراز سفر کرنے کے ذرائع اور وسائل پر قابو پالیا تو زبانوں کے اختلاف اور دورنگی نے ہر ہر قدم پر اس کی حیرت میں اضافہ کیا۔ آپس کے میل ملاپ اور سماجی ضروریات کے پورا ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کی بات سمجھیں۔ یہ سماجی ضروریات مختلف نوعیتوں کی تھیں۔ کہیں کسی طاقتور حوصلہ مند افراد کی ایک جماعت نے کسی دوسرے علاقے پر قبضہ کیا تو حاکم و محکوم کی تفریق پیدا ہوئی۔ لیکن حاکم و محکوم بھی ایک دوسرے کی زبان سمجھے بغیر کام نہیں چلا سکتے۔ کہیں تجارت اور جنس و مال کے تبادلہ نے یہ ضرورت پیدا کی۔ کہیں مذہب نے زبانوں کے پھیلانے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت سمجھائی۔ مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہاں کی زبانوں کو سیکھا اور اس کے ذریعہ سے اسلام کی تعلیمات عام کیں۔ دوسری طرف عربی ان کے ساتھ اسپین اور پرتگال کے ساحل سے لے کر چین اور جنوب مشرقی ایشیا تک پھیل گئی۔ اور مدتوں تک عالم اسلامی کی علمی اور تہذیبی زبان رہی۔ حکومت اور سیاست کے ساتھ تہذیب و معاشرت کے اقتدار نے بھی دوسری زبانوں کی تعلیم کو مہذب ہونے کی نشانی بنا دیا۔ صدیوں تک یورپ میں یونانی اور لاطینی کا ڈنکہ بجتا رہا اور ان زبانوں کا جاننا لازمہ تہذیب گردانا گیا۔ یورپ کے مختلف ملکوں اور سلطانیہ عظمیٰ میں مدرسوں اور دانش گاہوں میں یونانی اور لاطینی کی تعلیم لازمی رہی۔ شاعر ادیب اور انشا پرداز اس کا لوہا مانتے رہے اور مدتوں کلاسیکی اور لاطینی مصنفین اور شعرا یورپ کے روحانی پیشوا رہے۔ اسلام کے اقتدار نے عربی کو علوم و فنون کا خزینہ عطا کیا۔ یونانی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور اکثر کتابیں تو ایسی ہیں جن کی اصل یونانی آج ناپید ہے۔ اور ان کے مندرجات صرف ان کے عربی ترجموں میں محفوظ ہیں مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں علمی اور ذہنی اعتبار سے جو ترقی کی اس نے عربی کی تحصیل کو یورپ اور ایشیا کے دور دراز گوشوں تک ناگزیر بنا دیا۔ ایرانی تہذیب اور تمدن کا اثر جب مسلمان حکمرانوں کے ساتھ برصغیر ہندوستان اور پاکستان تک پہنچا تو ایران کی قند پارسی کا تحفہ بھی آیا۔ اور مدتوں فارسی یہاں کی کلچر اور ثقافت کی زبان رہی بلکہ یہاں کی زبانوں اور بولیوں کے ارتقا اور ان کے

ادبیات کے فروغ میں فارسی کا حصہ نظر انداز کر دیں تو جو کچھ رہ جاتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال نے فارسی کی تعلیم و تدریس کو اس ملک میں عام کر دیا اور مدتوں تک عربی فارسی کی تحصیل ہی علمیت کا معیار سمجھی جاتی رہی۔ پھر انقلاب آیا۔ تو عربی فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ انگریزی ایک تو حکمراں قوم کی زبان تھی۔ دوسرے جدید مغربی علوم و فنون تک رسائی کا واحد ذریعہ تھی جو اس وقت اہل ہند و پاکستان کو نصیب تھی۔ اور چونکہ مغربی ممالک کی صنعتی ترقی سیاسی اقتدار اور دولت مندی کا تعلق بڑی حد تک ان جدید علوم و فنون سے سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے انگریزی کی تحصیل لازمی قرار پائی۔ اور آج جبکہ سائنسی ترقی کے دور میں انگریزی داں برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ اور قوموں کے علمی اور تحقیقی کارنامے علوم و فنون کی تاریخ میں ایک نئے دور کے نقیب ثابت ہو رہے ہیں تو انگریزی علاوہ روسی اور جرمن زبانوں سے واقفیت بھی سائنس دانوں کے لئے تقریباً ناگزیر سی ہو گئی ہے۔ پھر ایشیا اور افریقہ میں نئی سیاسی بیداری اور قومی شعور کے فروغ نے ایشیائی اور افریقی ملکوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ ان نئے آزاد ملکوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے قریب آنے کا ایک نیا صحت مند رجحان پیدا ہو رہا ہے، اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ان افریقی ایشیائی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ جن کی طرف چند سال پہلے تک کسی کو توجہ نہ تھی۔

ایک نئی زبان سیکھنے کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ زبان کا تعلق ایک طرح کی عادت کا ہے بار بار کے اعادہ سے جس کا سلسلہ بچپن سے شروع ہوتا ہے رفتہ رفتہ زبان کی عادت راسخ اور پختہ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ فطرت اور جبلت کا جزو بن جاتی ہے اور بولنے والا بغیر تکلف اور اہتمام کے زبان کے ذریعے اور وسیلے سے اظہار مدعا پر قادر اور دوسروں کی بات سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ دوسری زبان کے سیکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عادات کا ایک نیا سلسلہ قبول کیا جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نئی زبان اپنی ہیئت اور ساخت میں پہلی زبان سے مختلف ہوتی ہے اس لئے ایک عادت دوسری عادت سے ایک طور پر برسر پیکار رہتی ہے اور نئی عادت کے راسخ ہونے میں بڑی محنت اور توجہ درکار رہتی ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ کسی زبان میں افعال میں تذکیر تانیث نہیں پائی جاتی۔ اس زبان کا بولنے والا The girl came, The boy came بولتا ہے۔ اردو بولتے وقت اس کی عادت اسے لڑکا آیا۔ لڑکی آیا بولنے پر مائل کرتی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہ تکلف نئی عادت اختیار کرنے میں لڑکا آئی اور لڑکی آیا بھی بولتا ہے۔ یہ تو جملے کی ساخت رہی۔ جس زبان میں زبر اور پیش کی تفریق نہ ہو اس کا بولنے والا گھڑی اور گھوڑی میں مشکل سے فرق کرتا ہے اور اس کے یہاں صرف گھوڑی کافی ہے۔ بعض زبانوں میں ہائیہ اور غیر ہائیہ اصوات میں فرق نہیں ہوتا ان کے بولنے والوں کے نزدیک باپ اور بھاپ ایک ہی طرح ادا ہوتے ہیں۔ غرض ابتدائی آوازوں سے مرکب آوازوں یعنی مکمل لفظوں اور پھر لفظوں کی ترکیب و ترتیب سے جملوں کی ساخت مختلف زبانوں میں اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ایک زبان کے جاننے والے کو دوسری زبان کے جاننے اور سیکھنے میں بڑی کوشش اور کاوش کرنا پڑتی ہے۔ اس کا تعلق ایک حد تک انفرادی افتاد طبع سے بھی ہے۔ جس طرح بعض لوگوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ باآسانی تبدیلی آب و ہوا گوارا کر لیتے ہیں اور اجنبی ماحول میں پہنچ کر بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسری زبانوں کو بہت جلد اور بڑی آسانی سے سیکھ لیتے ہیں اور اس کے برعکس جس طرح بعض لوگ ذرا سے موسم سے سرد گرم تغیر کو برداشت نہیں کر سکتے اور ایک اجنبی ماحول میں برسوں رہنے کے بعد بھی اجنبیت کے احساس پر قابو نہیں پا سکتے۔ اسی طرح بعض لوگ نئی زبانوں کے سیکھنے اور قبول کرنے میں بڑی مزاحمت سے دوچار ہوتے ہیں۔

غیر زبانوں کے سیکھنے اور سکھلانے کا عام اور روایتی طریقہ یہ تھا کہ پہلے اس زبان کے حروف تہجی یعنی ALPHABET سے آشنا کرایا جاتا تھا۔ بجائے خود یہ ایک دوہرا عمل ہے یعنی اس کا ایک پہلو صوتی اور دوسرا تحریری ہے اور دونوں کو بہ یک وقت سکھانے پر زور دیا

جاتا تھا۔ علاوہ اس نفسیاتی قباحت کے اس طریقہ میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ اصوات کا لفظ بجائے مفرد صوت کے مرکب اصوات سے کیا جاتا تھا کیونکہ حروف صحیحہ کو بغیر کسی حرف علت کے ملائے ادا کرنے میں قباحت ہوتی ہے۔ ب کو بے اور پ کو پے کہنا اس کی ایک مثال ہے۔ آپ اس پر اردو، ہندی، فارسی، عربی، انگریزی حروف تہجی کا قیاس کر لیجئے۔ حروف تہجی کا تلفظ مفرد نہیں ملے گا۔ پھر یہ کہ اکثر زبانوں کا املا سائنٹفک کہلانے کے باوجود اتنا ناقص ہے کہ ظاہر اس کی توجیہ مشکل ہو جاتی ہے۔ انگریزی میں PUT اور BUT کے حروف تہجی کا الگ الگ تلفظ دیکھئے تو U T ایک معلوم ہوتے ہیں [illegible] الفاظ میں الگ الگ تلفظ ہو جاتا ہے۔ ایک ہی حرف [illegible] زیر و پیش کی مختلف آوازوں کے زیر اثر بھی ہیں مثلاً [illegible] رکھتا ہے۔ C اور K کی آواز بعض صورتوں میں یکساں ہیں۔ [illegible] حروف تہجی سے زبان سیکھنے کا آغاز ایک قدیم رسم ہے ہم نے بھی قاعدہ بغدادی اور KING's READER سے عربی اور انگریزی کا آغاز کیا تھا۔ اور شاید آج بھی اکثر لوگ اسی طریق کار پر عمل کرتے ہیں۔

حروف تہجی سے شناسائی کے بعد دوسرا مرحلہ مفرد آوازوں کے مرکبات ادا کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ اس میں بھی اصولوں کی بحث نہیں ہوتی۔ T-A-C اور T-A-R سے اس مشق کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اکثر اسی مرحلہ پر جملہ کی ساخت بھی داخل ہو جاتی ہے۔ یعنی دو مرکبات سے ایک سادہ جملہ بن جاتا ہے اور کئی اسباق اس قسم کے سادہ جملوں کی مشق پر صرف ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ جملے پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس پیچیدگی میں سب سے بڑا حصہ رسمی قواعد کا ہوتا ہے۔ جو واقعی سیکھنے والے کے گلے میں اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ تمام عمر اس سے رہائی ممکن نہیں ہوتی۔ قواعد کی تعلیم جو ان طریقوں سے ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ قواعد اصل ہیں پہلے وجود میں آئے اور پھر زبان بن گئی یعنی زبان ان قواعد صرف و نحو کی پابند ہے نہ یہ کہ یہ قواعد صرف و نحو زندہ زبان سے ماخوذ ہیں۔ یہ بات دنیا کے سب سے قدیم قواعد نویسوں یعنی سنسکرت کے قواعد نگاروں نے سب سے پہلے [illegible] سنسکرت قواعد کے دفاتر میں پراتی شاکھیا Pratisakhyas اور شکشا خاص طور پر قابل غور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ [illegible] بھی اصل شکشا ایسی ہیں [illegible] خاص طور پر پانینی شکشا Paniniya Siksa کو بعض لوگ اصل شکشا مانتے ہیں اور پراتی ساکھیائیں کو اس قدیم شکشا [illegible] بہرحال پانینی کی استادھیائی Astadhyayi اور پتانجلی کی مہابھاشیہ Mahabhasya — قواعد نویسوں کے [illegible] ماخذ ہیں۔ ان کا اصل مقصد ویدوں کو جو زبانی روایت سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے تھے محفوظ رکھنا تھا۔ چنانچہ تلفظ کی صحت اور [illegible] کی پابندی اس کی اصل روح ہے۔ [illegible] ہے۔ قواعد کی اہمیت کا یہ احساس اور اس کی روایت یونانی لاطینی اور عربی وغیرہ میں بھی اسی شدت سے پائی جاتی ہے۔ ان زبانوں کی رسمی تدریس میں اب سے چند سال پہلے تک اصل بنیاد صرف قواعد کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے یہاں بھی فارسی پڑھنے والے آمدنامہ کی گردانوں سے زبان شناسی کا آغاز کرتے تھے۔ اور عربی سیکھنے والوں کو یاد ہوگا کہ ابواب اور صیغوں کی تکرار کیسی عذاب جان چیز ہوتی تھی۔

دوسری زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے کی ایک اور روایت کتابی زبان کے اکتساب کی تھی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کتابی زبان عام بول چال کی زبان کے مقابلہ میں کسی نہ کسی قدر پر تکلف ہوتی ہے۔ جسے ہم تہذیب اور شائستگی کا نام دیتے ہیں۔ وہ زبان کے باب میں ایک ضروری سا تکلف ہے نہ اس کی یہی بات حد سے بڑھ جائے تو پھر عام بول چال کی زبان اور تحریر کی زبان ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ یہ تکلف اور اہتمام کتابی زبان سے بول چال کی زبان پر بھی اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی روزمرہ گفتگو اور بول چال بھی عام لوگوں کی گفتگو اور بول چال سے مختلف ہو جاتی ہے، جن لوگوں نے انشاء اللہ خاں

کی دربارِ لطافت میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور انشا کی گفتگو پڑھی ہے اور انہوں نے مرزا رفیع سودا کا دیباچہ بھی پڑھا ہے۔ وہ اس نکتہ سے بخوبی آشنا ہیں۔ بہرحال اس طرح طبقاتی زبانیں بلکہ یوں کہئے کہ طبقاتی محاورے وجود میں آجاتے ہیں جن کو بولی یا DIALECT کہنا چاہئے۔ اگر یہ حلقہ محدود تر اور تنگ تر ہوجائے تو اصطلاحی زبان dialect ہوکر رہ جاتی ہے۔ اور وسیع تر ہوجائے تو عام معیاری بولی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے غیر زبانوں کی تدریس میں صدیوں تک کتابی معیاری زبان کی تدریس اور تعلیم پر زور دیا گیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ غیر زبان سیکھنے والے کم لوگوں میں اہلِ زبان کی سی صفائی اور قدرتِ کلام پیدا ہوسکی۔ زبان ایک زندہ شے ہے۔ اس زندگی کو توانائی اس کے عام بولنے والوں سے ملتی ہے۔ اگر یہ کتابوں علم و فن کے اجارہ داروں اور برہمنوں کی محکوم ہوجاتی ہے تو اس کی توانائی اور تازگی زوال اضمحلال اور فرسودگی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اور بالآخر زبان مردہ ہوجاتی ہے۔ سنسکرت کا زوال اسی داستان کا ایک جزو ہے۔ قدیم یونانی اور قدیم لاطینی بھی کسی قدر اسی کا شکار ہوچکی ہیں۔ اگر ان کی جانشین یورپ کی زندہ زبانیں اور بولیاں عوام سے اپنے رشتے مضبوط نہ کرتیں تو ان کا سلسلہ بھی کبھی کا ختم ہوچکا ہوتا۔ کسی غیر زبان کے کتابی محاورے کا اکتساب ایک خالص علمی مشق کے نقطۂ نظر سے مستحسن ہوسکتا ہے اور ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جن کا اصل مقصد اس زبان کی شاعری اور ادب کا مطالعہ ہو ورنہ عام طور پر جس چیز کے سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت ہے وہ زبان کی بول چال کا محاورہ ہے۔ جو جوانوں بوڑھوں، مردوں عورتوں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں، دفتروں کے کلرکوں دکانداروں کی زبان کہلاتی ہے۔ زبان کی اصل اور اساس یہی محاورہ ہوتا ہے اور اس کے سیکھے بغیر کسی بھی زبان کے سیکھنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

اس کتابی زبان کے سیکھنے کی روایت کے ساتھ ایک اور مشکل یہ بھی ہے کہ اس روایتی تعلیم و تدریس کا دارومدار اور انحصار بڑی حد تک صرف کتابوں پر ہوتا ہے۔ ایسا موقع تو بہت لوگوں کو مل سکتا ہے کہ وہ کوئی غیر زبان خود اہلِ زبان سے براہِ راست سیکھ سکیں۔ اس لئے عام طور پر اپنی ہی زبان کے جاننے والے بعض اساتذہ ضروری کتابوں اپنی تعلیم اور تجربہ کی بنا پر غیر زبانوں کی تدریس اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اساتذہ میں وہ اعتماد نہیں ہوسکتا جو صرف اہلِ زبان کا حصہ ہے۔ اور نہ وہ زبان کو اس جرأت اور آزادی کے ساتھ استعمال کرسکتے ہیں جس آزادی سے اہلِ زبان کرسکتا ہے۔ غیر اہلِ زبان جو کسی دوسری زبان کو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا ہے اپنی احتیاط سے بھی اس بات کی غمازی کردیتا ہے کہ وہ اس زبان کو ایک اجنبی سرمایہ کی حیثیت سے استعمال کررہا ہے۔ دوسرے انتہائی کوشش و کاوش کے باوصف کوئی دوسرا شخص کسی زبان کے لب و لہجہ اس کے نوع ادا اس کے محاوروں اور ضرب الامثال پر وہ قدرت حاصل نہیں کرسکتا جو اہلِ زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے غیر اہلِ زبان سے کسی زبان کو سیکھنے کا عمل ناقص اور نامکمل تعلیم ہے۔ پھر اگر بدقسمتی سے غیر اہلِ زبان سکھانے والا ایسا ہے جس نے خود کتابوں سے کتابی زبان سیکھی اور پڑھی ہے تو اور بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ بولی جانے والی زبان میں بہت سے ایسے عناصر ہوتے ہیں جو تحریر میں نہیں آتے مثلاً لہجہ TONE اردو بولنے والے لہجہ کی اہمیت سے صرف اس قدر واقف ہیں کہ لہجہ بدلنے سے کبھی استفسار کبھی نفی کبھی تاکید کا ایسا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے جو اسی بات کو سادہ لہجہ میں ادا کرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ لہجہ کے فرق کو ادا کرنے کا کوئی ذریعہ یا وسیلہ عام طور پر زبانوں کی تحریر یا رسم الخط میں موجود نہیں ہوتا۔ البتہ لسانی تحقیق کرنے والوں نے اس کے اظہار کے بعض علامات اور نشانات مقرر کرلئے ہیں۔ جن سے لہجہ کے اتار چڑھاؤ کو تحریر میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ لہجہ کے اتار چڑھاؤ کی اہمیت ان زبانوں میں خاص طور پر بہت بڑھ جاتی ہے جن کو TONAL زبانیں کہتے ہیں۔ مثلاً معیاری چینی زبان میں جس سے ہماری مراد مندرینی Mandarin بولی ہے۔ ایک ہی لفظ کے چار مختلف لہجے ہوتے ہیں اور معنی کا تعین لہجے کے فرق سے ہوتا ہے۔ مندرینی چینی کے لہجے حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) بالاسطح (HIGH LEVEL)
(۲) بالا عروجی (HIGH RISING)
(۳) زیر عروجی (LOW RISING)
(۴) زیر نزولی (LOW FALLING)

ایک لفظ / FU / پہلے لہجہ میں مرد یا شوہر کے معنی دیتا ہے۔ دوسرے لہجہ میں قسمت مسرت تیسرے لہجہ میں نگرانی دیکھ بھال چوتھے لہجہ میں امیر۔ چین میں ہی کینٹن CANTON کے قریب فوکین FU-KIEN بولی میں چار کی بجائے آٹھ لہجے یا TONE ہوتے ہیں۔ تھائی زبان میں اس طرح کے دس لہجے پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کی کسی زبان کو محض کتابوں کی مدد سے یا محض ایسے استادوں سے نہیں سیکھا جا سکتا جنہوں نے براہ راست اہل زبان کو یہ زبان بولتے نہ سنا ہو۔

غیر زبانوں کے درس اور تدریس کے روایتی طریق کار میں ایک بڑی قباحت ہے۔ کسی زبان کے سیکھنے کے لئے بار بار لفظوں اور جملوں کو دہرانا ضروری ہوتا ہے۔ تاآنکہ ان کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی عادت راسخ ہو جائے۔ بچہ جو اپنی مادری زبان سیکھتا ہے دن رات یہ زبان سنتا رہتا ہے اور اس کی نقل کرتا ہے۔ پہلے یہ نقل ناقص ادھوری اور نامکمل ہوتی ہے۔ کثرت مشق سے اس میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے جس مرحلہ پر انسان غیر زبان سیکھتا ہے اس وقت نہ تو اس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ رات دن اس نئی زبان کو سنتا رہے۔ اس کی نقل کرتا رہے۔ اور اپنی نقل کو اصل کے مطابق بناتا رہے اور نہ کوئی ایسا استاد مل سکتا ہے جو بار بار اس کے لئے ایک ہی لفظ یا فقرے کو اتنا دہراتا رہے کہ طالب علم اس کی مکمل نقل کر سکے۔ یہ پورا عمل نہایت تھکا دینے والا ہوتا ہے اور یہ تھکاوٹ خود استاد کے طرز ادا اور لب و لہجہ میں تھکن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر استاد خود اہل زبان نہ ہو تو تکرار اور اعادہ نہ صرف غیر دلچسپ ہو جاتا ہے بلکہ درس و تدریس کی مختلف منزلوں میں اس میں فرق بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور طالب علم غیر زبان کو ایک مستقل مستند اور معیاری لب و لہجے سے سیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

جدید نفسیات اور جدید لسانیات نے زبانوں کی درس و تدریس کے نظریات اور طریقہ ہائے کار میں انقلاب آفرینی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اور اس سلسلے میں غیر زبانوں یا ثانوی زبانوں کی تعلیم و تحصیل پر بڑی تحقیق ہوئی ہے۔ بعض زبانیں غیر ملکیوں کو سکھانے کے لئے تربیت اساتذہ کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ان کے لئے خاص طور پر کتابیں اور امدادی کتب لکھی گئی ہیں۔ جدید سمعی اور بصری وسائل کو استعمال کیا گیا ہے اور اس طرح زبانوں کی تدریس کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو کے بہت کم اساتذہ زبانوں کی تدریس کے ان جدید طریقہ ہائے کار سے واقف ہیں۔ ہمارے کتب خانے ان کتابوں سے محروم ہیں اور لسانی تجربہ گاہیں یعنی — Language Laboratories ابھی تک ہمارے ملک میں ایک غیر ضروری تعلیمی عیاشی سمجھی جاتی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کا تو ذکر کیا۔ ہماری یونیورسٹیوں میں بھی جو اعلیٰ تعلیم کے مرکز ہیں اور جن کا کام علمی تحقیق کا فروغ درس و تدریس کے نئے تجربات اور نئے طریقوں کی دریافت ہے۔ اس کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ جس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہمارے جدید اور مقبول نظام تعلیم میں سائنسی علوم پر خالص مادی ترقی کے نقطۂ نظر سے اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ دیگر علوم و فنون بالخصوص زبانوں کی تحصیل اور تدریس ایک بیکار اور عبث مشغلہ سمجھی جانے لگی ہے۔ حالانکہ سائنسی علوم کی تعلیم بھی بغیر کسی نہ کسی زبان کے سہارے اور وسیلے کے ممکن نہیں ہے۔ اور ہماری بڑی بدقسمتی

یہ ہے کہ ہم ان جدید سائنسی علوم کی اعلیٰ تعلیم ملکی زبانوں میں دینے کے باب میں ابھی تصفیہ نہیں کر پائے اور انگریزی جو اب عوام تک رسائی کا وسیلہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں بھی ہمارے طالب علموں کی لیاقت کا معیار بلند ہونے کی بجائے گرتا چلا جا رہا ہے یہ اس لئے نہیں کہ اردو یا بنگالی کی حمایت نے انگریزی کی تعلیم یا تدریس کو صدمہ پہنچایا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ہم زبان کی تدریس کے جدید اصولوں سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ بات کس قدر افسوس کی ہے کہ بعض غیر ملکی اداروں کے تعاون اور مالی امداد سے ہماری ایک یونیورسٹی میں ایک LANGUAGE UNIT قائم ہوا۔ اس کے لئے لاکھوں روپے کا ساز و سامان منگایا گیا۔ نہایت لائق اور تجربہ کار اساتذہ درس و تدریس کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن چونکہ ہمارے ملک میں اس طرح کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ اور نہ بظاہر اس طرح تعلیم حاصل کرنے والوں کے سامنے کوئی اونچی اور یقینی مستقبل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ تین سال کی تجرباتی جد و جہد کے بعد بالآخر یہ مفید کام جس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا بند ہو گیا۔ اور نہایت قیمتی آلات کمروں میں بند زنگ خوردہ ہو رہے ہیں۔ ہماری ایک دوسری یونیورسٹی میں چھوٹے پیمانے پر ایک لسانی تجربہ گاہ پچھلے تین سال سے کام کر رہی ہے۔ لیکن مالی دقتوں کی وجہ سے اس میں بھی کوئی توسیع نہیں ہو سکی ہے۔

اس مختصر سی بحث میں میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ زبانوں کی تعلیم و تدریس کے جدید طریقہ ہائے کار کی پوری طرح وضاحت کر سکوں اس لئے میں صرف غیر زبانوں کی تعلیم و تدریس کے بعض جدید طریقوں کی طرف اشارہ کروں گا جو جدید لسانیات کے مطالعہ اور زبانوں کی تدریس کے سمعی اور بصری ذرائع اور وسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

جدید لسانیاتی طریقے میں زبان کے اقل صوتی اجزاء یعنی صوتیے یا PHONEMES کا تعین کسی زبان کے صوتی نظام کی تفہیم میں بڑا رہنما ہوتا ہے۔ اگرچہ انسانی آلات صوت لاکھوں آوازیں نکالنے پر قادر ہے۔ لیکن دنیا کی مختلف زبانیں ان بے شمار آوازوں میں سے صرف چند آوازوں کا استعمال قبول کرتی ہیں۔ اس اصول کو سامنے رکھکر غیر زبان سیکھنے والوں کی اپنی زبان کے صوتیوں اور غیر زبان کے صوتیوں کی الگ الگ فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ جو صوتیے دونوں زبانوں میں مشترک ہوتے ہیں انہیں سیکھنے کے لئے اپنی زبان کے یہ صوتیے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس طرح سیکھے جانے والے صوتیوں کی تعداد محدود ہو جاتی ہے۔ باقی اختلافی صوتیے رہ جاتے ہیں۔ ان کو استاد ادائی صوتیات (ARTICULATORY PHONETICS) کی تشریحات کو سامنے رکھ کر سیکھنے والے کو ان کے نقطہ ادا (Point of Articulation) اداکار (ARTICULATOR) اور طریق ادا (MODE OF ARTICULATION) سے پہلو تشریح کرتا ہے۔ یہ چونکہ نئے اور غیر مانوس صوتیے ہوتے ہیں اس لئے ان کو بار بار سننے اور بار بار ادا کرنے اور دہرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام عام طور پر آلۃ الصدا بندی (TAPE-RECORDER) کے ذریعے سے انجام دیا جاتا ہے۔ ایک جدید لسانیاتی تجربہ گاہ میں استاد اپنی میز پر بیٹھا بہت سے طالب علموں کے تلفظ کو بار بار سنتا اور اس کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ طالب علم معیاری تلفظ سے اپنے تلفظ کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اور اس وقت تک اعادہ کرتا رہتا ہے جب تک کہ اس کا تلفظ معیاری تلفظ کے عین مطابق نہیں ہو جاتا۔ اگر استاد چاہے تو معیاری تلفظ اور طالب علم کے تلفظ کے دقیق ترین اور خفیف ترین فرق کو بھی دریافت کر لیتا ہے۔ عام طور پر اس کے لئے سادہ قسم کے اہتزاز نگار OSCILLOGRAPH اور اس کے اعلیٰ سطح پر صوت نگار SONOGRAPH سے کام لیا جاتا ہے۔ آلات صوت کی صحیح حرکات کا مطالعہ عکس ریز شعاعوں X-RAYS کے ذریعے سے بھی کیا

جاتا ہے۔ ان سب کی مدد سے جدید طریقہ ہائے تدریس سے واقف استاد تلفظ کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

صوتیوں کی سادہ شکل جنہیں کسری صوتیے SEGMENTAL PHONEMES کہتے ہیں۔ ہماری زیادہ رائج اور عام اصطلاحوں میں حروف صحیح اور حروف علت ہوتے ہیں۔ دراصل یہ دونوں اصطلاحیں گمراہ کن ہیں۔ کیونکہ حرف کے ساتھ ذہن میں تحریر کا تصور آتا ہے اور صوتیات میں صوتی تجزیہ میں تحریر پر نہیں صرف آواز پر زور ہوتا ہے۔ اس لئے صوت صحیح اور صوت علت کہیں تو شاید یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی اردو بولنے والے پڑھے لکھے آدمی سے دریافت کرے کہ اردو میں حروف علت کی تعداد کتنی ہے تو بالعموم اسے جواب ملے گا تین یعنی و۔ ا۔ اور ی۔ شاید تھوڑے سے تامل کے بعد بعض حضرات ان میں تین حرکتوں یعنی زبر۔ زیر اور پیش کا اضافہ اور کر دیں گے۔ شاید کم لوگ ہوں گے جن کے ذہن میں یہ بات صاف ہوگی کہ اردو میں صحیح حروف علت تعداد میں دس ہیں۔

اصوات یا صوتیوں کی تحریر کے لئے بھی کسی زبان کا عام اور رائج املا اکثر و بیشتر صورتوں میں گمراہ کن ہوتا ہے۔ اس لئے طالب علم اور استاد دونوں عام طور پر بین الاقوامی صوتی علامات استعمال کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ادا کی بعض اور خصوصیات جنہیں اصطلاحاً بالاکسری صوتیے کہتے ہیں (یعنی) (SUPERA SEGMENTAL PHONEMES) جن میں لہجہ آواز کا اتار چڑھاؤ وغیرہ شامل ہیں اور جو عام طور پر تحریر کے ذریعے سے ظاہر نہیں کئے جاتے۔ ان کے لئے بھی خاص علامات اور نشانات مقرر ہیں۔ ان کے استعمال کے بغیر صوت کی تشریح تحریری علامات کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔

زبان کے اس صوتی نظام کی تعلیم اور تدریس کی مشق کے بعد دوسری منزل زبان کی ساخت کی تدریس ہے۔ یہاں جدید نظریات کے مطابق STRUCTURAL LINGUISTICS کے اصولوں پر زبان کی ساخت کا تجزیہ ہوتا ہے۔ بامعنی اقل ترین عنصر جیسے معینہ یا MORPHEME ہیں اس کی تشریح اور زبان میں آزاد FREE اور متسلک BOUND معینوں کا تجزیہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اقل اجزا IMMEDIATE CONSTITUENTS کی تحلیل ہوتی ہے۔ اور روایتی قواعد کی اصطلاحوں کی بجائے جملے کی ساخت کے مختلف عناصر اور ان کی ترکیب و ترتیب کا تجزیہ ہوتا ہے اور اس طرح زبان شناسی کی دوسری منزل یا مرحلہ طے ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر کثرت مشق اعادے اور مطالعے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس کے لئے زبان کے اہم ترین اور بنیادی سرمائے میں سے حسب ضرورت مناسب حصہ تدریجی اسباق کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ صرف طلبا بلکہ اساتذہ کی ہدایات اور رہبری کے لئے بھی رہنما کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اساتذہ ان کتابوں کے علاوہ (صوتی) آلات کی مختلف آلات سماعی اور متحرک تصاویر نقشوں، جدولوں اور خاکوں سے بھی مدد لیتا ہے اور غیر زبان یا ثانوی زبان کی تدریس ایک دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے جسے شاگرد اور استاد دونوں اعتماد کے ساتھ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس تعلیمی سرمائے اور ذرائع اور وسائل کی فراہمی کے لئے تربیت یافتہ ماہرین لسانیات کی ایک پوری جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہمیں اپنے ملک میں اس ملک کی زبانوں کی ترویج اشاعت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہے تو ہمیں اپنے تعلیمی نظام لسانیات کے جدید علم کو ضرور شامل کرنا پڑیگا اس سے صرف کسی ایک زبان کی تعلیم و تدریس کے مسائل کو حل کرنے میں مدد نہیں ملے گی۔ بلکہ قومی زبانوں کے علاوہ علاقائی زبانوں نیز غیر ملکی زبانوں کی تعلیم اور تحصیل بھی زیادہ سائنٹفک اصولوں پر ممکن ہوگی۔ موجودہ حالات میں ہماری یونیورسٹیاں اور پھر آگے چل کر ہمارے کالج اور اعلیٰ ثانوی اور ثانوی مدارس لسانی تعلیم و تدریس کے مفید اور موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

اداس نسلیں

اس ناول کا پہلا صفحہ پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مولوی عبدالحلیم شرر نے پھر سے جنم لیا ہے اور اب کے جنم میں وہ زبان دانی اور انشاپردازی سے جو ان کی ناول نگاری کی امتیازی صفات تھیں سخت انتقام لینے کے لئے نہایت غلط اردو لکھ رہے ہیں اور نہایت درجہ بناوٹی انشاپردازی کر رہے ہیں۔ ناول کے قصے، کردار اور ڈرامائی اثر سے وہ اتنے ہی بے نیاز ہیں جیسے پہلے جنم میں تھے۔ اور اس لئے اگر ان کی ناول کی کسی چیز میں دھیان الجھ کر رہ جاتا ہے تو وہ زبان اور بیان ہے۔ میں ناول کی زبان کی غلطیاں نکالنے کا عادی نہیں ہوا کیونکہ میں زبان اور طرز ادا کو فن ناول نگاری کے لئے ضروری نہیں بلکہ ضمنی صفت سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں کہ زیر نظر ناول نے اپنی زبان کی غلطیوں میں مجھے ایسا الجھایا کہ یہی میری توجہ کا مرکز بن گئیں۔ پہلے پیراگراف میں چوتھا جملہ "اس طرف کے دیہات میں آمد و رفت کا سلسلہ کون تانگوں پر یا پیدل چل کر طے ہوتا تھا" پڑھتے ہی میں چونک پڑا۔ "سلسلہ طے ہوتا تھا" اس کے کیا معنی؟ راستہ طے ہوتا ہے یا سلسلہ؟ خیر پانچواں جملہ پڑھا۔ "ٹوٹی پھوٹی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں (پگڈنڈیوں کے لئے ٹوٹی پھوٹی کے کیا معنی ہوئے) جو کثرت سے ایک دوسری کو کاٹتی تھیں (کثرت کا کیا یہ استعمال ہے؟) بہرحال پہلا پیراگراف ختم کیا اور دوسرے پر آیا۔ اس کے دوسرے جملے میں انشاپردازی کا یہ کرشمہ نظر آیا۔ "دھوپ کی ماری ہوئی وہ بڑی مسکین اور رصاف ستھری لیٹی رہتیں۔ مگر ان کی کمینگی اس وقت ظاہر ہوتی جب کوئی سواری ان کے اوپر سے گزرتی، تب وہ پگڈنڈیاں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھاتیں جو فضا میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور دور و نزدیک جو بھی انسان حیوان یا شجر اس کی زد میں آتا یکساں سب کی دل آزاری کا سبب بنتا۔" اس جملہ کا ایک ایک لفظ ایک ایک تصور عجیب طرح مجھے پریشان کرتا ہے اور اپنے قاعدے کے مطابق میں ناول سے اکتا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ ہر صفحہ طویل بیان سے پیا ہوا نظر آیا۔ کہیں کہیں مکالمہ بھی دکھائی دیا۔ مگر زیادہ تر ایک دو لفظ کا جو کسی طرح سے کوئی نفسیاتی تاثر نہ پیش کرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ مولوی شرر کی طرح اس ناول کے مصنف کا مقصد بھی بیان ہی بیان لکھنا ہے۔ کہیں کہیں چونک کر انہیں خیال ہوتا ہے کہ مکالمہ بھی آجائے اور وہ محض رسم ادا کرنے کے لئے ایک ایک دو دو لفظوں کی بات چیت بھی رقم کر دیتے ہیں۔ انیسویں صدی کی ناول نگاری میں جیسے والٹر اسکاٹ وغیرہ کے یہاں بیانات کی اس قدر فراوانی ہے کہ قاری پڑھتے پڑھتے تھک جائے۔ شاید زیر نظر ناول نگار کے لئے مشعل راہ ہے۔ خیر میں طویل بیانات سے بہت گھبراتا ہوں۔ اور جب وہ ایسی زبان میں ہوں جو کسی خوبی یا خامی کی بنا پر مجھے ہر ہر قدم پر الجھاوے تو انہیں پڑھنا میرے بس کی بات نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اس ناول کو میں نے فوراً واپس کر دیا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔

مگر آدم جی انعام ملنے کی وجہ سے اس ناول کی طرف بھی صاحبان ذوق کی توجہ ہو گئی ہے۔ اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نے جو انعام دینے

ملنے والے انعاموں میں سے ایک تھے۔ میری اس کے بابت رائے مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ یہ ان ناولوں میں سے ہے جس کو میں ایک صفحے سے زیادہ نہیں پڑھ پایا۔ اور ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ ناول نگاری کو بیانات اور مکالموں کے توازن سے بھی اسی قدر کم تعلق ہے جتنا کہ اردو زبان کی صحت سے اس سے آگے میں اس کے بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر سبزواری نے جو اس ملک کے ماہرین لسانیات میں فرد ہیں، زبان کی خامی کو مانا۔ مگر وہ عام پروفیسر نقادوں کی طرح اس میں کردار نگاری کی تعریف کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ جب میں اسے پورا پڑھ ہی نہ سکا تھا تو میں خاموش ہو جانے کے سوا اور کیا کرتا۔ مگر اس کی اس قدر بے ڈھنگی زبان کا خیال مجھے رہا۔ اور یہ بات کھٹکتی رہی کہ آخر زبان کے وہ الجھاوے جن کی وجہ سے میں ناول کو نہ پڑھ سکا کیوں ڈالے گئے ہیں۔ پھر ماہنامہ "نصرت" کا ایک شمارہ میرے سامنے آیا جس میں عبداللہ حسین صاحب کی تصویر اور ان کے خود نوشتہ حالات "میں" کی سرخی کے ماتحت تھے۔ ان کو پڑھنے لگا اور اس جملہ پر آیا۔ ان ہی دنوں نروس بریک ڈاؤن (NERVOUS BREAK DOWN) کا شکار بھی ہوا اور ایک ماہ تک لاہور کے اسپتال میں پڑا رہا۔ جب صحت یاب ہوا تو دو بڑے واقعات ہوئے۔ ایک اداس نسلوں کا پہلا باب لکھا۔ دوسرے محبت کی"۔ اس جملے کی زبان میں بھی کچھ الجھاوے ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے میرا خیال اپنے جوان لڑکے کی طرف گیا جو بھی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوا تھا اور کراچی سے لاہور چلا گیا تھا۔ میں نے اسے خط میں لکھا تھا کہ وہ بہن کی روٹیوں پر کیوں پڑا ہے اور کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ اس نے جواب میں جو خط لکھا تھا اس کا پہلا جملہ یہ تھا

"I am sorry for your abusive letter challenging my work and food

یہ نروس بریک ڈاؤن کی زبان ہے۔ یہ اسی طرح نروس بریک ڈاؤن کا فیض ہے۔ جیسے حافظؔ کے یہاں ع

"بفیضِ روح قدس نکتۂ سعادت رفت"

اداس نسلیں کیونکہ نروس بریک ڈاؤن کے فیض کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس میں طرز اور ترتیب کی وہ نوعیت جو مجھے الجھاوے قدرتی چیز ہے اور اس پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن "نصرت" کے اس شمارے میں خود نوشتہ سوانح کے ٹکڑے کے بعد ایک ریویو بالکل اشتہاری انداز میں نظر آیا جس میں ادھر ادھر کی اشتہاری باتوں کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ناول کی زبان کو خاص مقصد کے ماتحت بگاڑا گیا تھا۔ میں زبان کے روایتی طریقوں کا بالکل قائل نہیں ہوں اور جیمس جوائس کا مطالعہ کرنے میں دلچسپی لیتا ہوں۔ اس لئے میں نے اداس نسلوں کو زبردستی پڑھنے کی کوشش کی تاکہ زبان بگاڑنے سے مصنف کا کیا مقصد ہے معلوم کر سکوں۔ کیا اس کا تجربہ سچ مچ ایسا ہے کہ معیاری زبان اسے ادا نہیں کر سکتی۔ جوائس کے بابت مشہور ہے کہ اکثر جملوں میں الفاظ کی ترتیب پر دو دو دن غور کرتا رہا۔ کیا عبداللہ حسین بھی اسی طرح غور کرتے رہے۔ جوائس کی زبان کو اب بھی روایتی زبان کے ماننے والے نہیں نگل پاتے۔ مگر جوائس کے ہمدردوں نے تشفی بخش طریقہ پر یہ سمجھا دیا ہے کہ زبان کو بگاڑنے سے کیا جدید مقصد نکل آتا ہے۔ ذکی آذر صاحب صرف ایک جملہ جھاڑ کر عبداللہ حسین کو جوائس کے دوش بدوش کھڑا کر کے یہ اشتہار دے دینا چاہتے ہیں کہ اداس نسلیں اردو ناول نگاری میں عظیم جدت ہے اور انگریزی اور امریکی ناول نگاری کو مات کر دیتی ہے۔ کیا ایسی باتوں سے عبداللہ حسین مضحکہ ہو کر نہ رہ جائیں گے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ ذکی آذر صاحب ایک مضمون ایسا لکھیں۔ جیسے کہ جوائس کے دوستوں یا ٹی۔ ایس ایلیٹ کے طرف داروں نے ان لوگوں کی لسانی جدتوں کی شاعرانہ یا ادبی نوعیت کو ثابت کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ اگر وہ ایسا مضمون لکھ سکتے تو مان لوں گا کہ ان کا کلیہ صحیح ہے۔ ورنہ اداس نسلیں میرے لئے مبتدی کی تصنیف رہے گی جس سے یہ کہا جائے ع

پہلے پڑھئے پھر غزل گوئی کا سودا کیجئے

اور نروس بریک ڈاؤن کا میرا ذاتی مشاہدہ مجھے یہ کہلوانے پر مجبور کرتا رہے گا کہ اس ناول میں اردو زبان کے نروس بریک ڈاؤن کا کمال ظاہر ہے۔

بہرحال بقول شوکت سبزواری صاحب "زبان کو چھوڑیے اور ناول نگاری کی بات کیجیے" غرض اس ناول کو میں نے اس طرح پڑھنا شروع کیا جیسے پرانی انگریزی زبان کے کم یاب مسودے ریسرچ کے سلسلہ میں پڑھے تھے۔ کیا عام قاری بھی اسے یوں ہی زبردستی پڑھنے کی زحمت گوارہ کرے گا؟ ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جتنا عام مقبولیت حاصل کر سکے گا۔ اتنا ہی اچھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت پست اور سنسنی خیز ناول وجود میں آگئی اور خوب بکتی ہے۔ مگر ناول کے سچے فنکار وہ لوگ ہیں جو فن کو اس طرح برتتے ہیں کہ فن چھپ کبھی جائے اور عام آدمی اسے محض دلچسپ چیز سے آگے کچھ نہ دیکھے اور فن کو سمجھنے والا اور اس سے لطف اندوز ہونے والا فن کے رازوں سے کبھی شناسا ہو۔ ہنری جیمس کبھی جو ناول نگاری کے سلسلہ میں ان سب جدتوں کا موجب ہے۔ جو آج کل ناول کو معمہ بنائے ہوئے ہیں۔ اپنے معرکتہ آلارا مضمون "دی آرٹ آف فکشن" میں صاف کہتا ہے "جو ناول دلچسپ نہ ہو اسے وجود میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ انگریزوں کا قول تھا کہ ہندوستان کے لوگ ان کی اچھائیوں کے بجائے ان کی برائیوں کی نقل کرنے میں زیادہ تیزی دکھاتے ہیں۔ اردو ناول نگاری میں قرۃ العین کی جدت پر یہ قول صادق آتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے کہا تھا کہ جس ادب میں اب تک ڈکنز اور تھیکرے کا سا کوئی ناول بھی وجود میں نہ آئی ہو اس میں ہنری جیمس، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کے سے تجربے صدا بہ صحرا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال ہم اس لئے لکھتے ہیں کہ "ایک کہے اور دوسرا سمجھے"۔ شاعری تک تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ شاعر اپنی طرح پر بڑبڑاتا رہے۔ چاہے اسے کوئی سنے یا نہ سنے۔ مگر ناول بڑی طویل چیز ہے۔ یہ قصہ گوئی کے فن کی جدید نوعیت ہے اور وہ قصہ گو ہی کیا جس کے قصہ کو سننے کے لئے لوگ اس کے چاروں طرف جمع نہ ہو جائیں (CARRUTHER) کیروتھر نے اپنے مضمون "ناول کا مستقبل" میں جدیدیہ ہمائی ناول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہزادی شہرزاد کو یاد کیا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ ناول کے فن کو ختم ہونے سے بچانے کے لئے اسے پھر قصہ گوئی کی اس صورت پر واپس آنا ہے جس کی بنا پر شہزادی شہرزاد اپنے شوہر کی ظالمانہ عادت کو ترک کرانے میں کامیاب ہوئی"۔ انگلستان میں ناول کے سلسلے میں جدت طرازی یا معمہ بازی پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک ابال کی طرح اٹھ کر ختم ہو گئی۔ اس نے ہمیں کچھ سبق ضرور دے گئی۔ اور ناول کے ایک مخصوص فن کو وجود دینے کے سلسلے میں اہم مثال قائم کی۔ مگر ہمارے یہاں اس سبق کو حاصل کرنے کے بجائے اس تجربے کے محض ظاہری طریقوں کو برت کر ناک بھوں چڑھائی گئی اور اپنے کو انٹلکچول منوانے کی اشتہار بازی سے کوشش کی گئی۔ کیا "اداس نسلوں" کو بھی اس کوشش کی مثال سمجھا جائے؟ عبداللہ حسین کے ڈھول بجانے والے ان کو اسی دائرے میں لے آئے اور اسی طرح نمایاں کرنے کے قائل نظر آتے ہیں۔ آخر قرۃ العین کے سلسلے میں یہ ہوا تو عبداللہ حسین کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے۔ مگر "اداس نسلوں" کو کسی طرح سے پڑھ ڈالنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ صاحبزادے عبداللہ حسین سیدھے سادھے اور مخلص انسان ضرور ہیں۔ اپنے "نوٹ" میں بھی انہوں نے نہایت سادگی اور خلوص سے کہہ دیا ہے "لندن میں ٹی۔ ایس۔ ریلیٹ اور پیرس میں سارترے سے ملا۔ کیتز میں پکاسو کا ہوں۔ جزائیہ محض بطور ایک ٹورسٹ کے ان سے ملا۔ کوئی ادب یا آرٹ پیغیمگی کا مقصد نہ تھی اور نہ ہوئی"۔ معلوم ہوتا ہے کہ "اداس نسلوں" کو بھی انہوں نے محض بطور نروس بریک ڈاؤن کو تسکین دینے کے لئے لکھ ڈالا ہے۔ ادب یا آرٹ کا مظاہرہ کرنا نہ مقصود تھا اور نہ ہے۔ ان کی اب تک کی تعلیم اور مخصوص دلچسپی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ علم کیمیا میں یا کیمیکل انجنیری میں کوئی معرکتہ آلارا جدت پیدا کرتے تب کوئی بات بنتی۔ سائنس دانوں، طبیبوں اور انجنیروں کی ناول نگاری کی طرف آکر نمایاں کامیابی حاصل کرنے کی مثالیں بہت ہیں۔ مخصوص تعلیم کا جینیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ قول اٹل ہے کوئی بڑا تخلیقی ادب بغیر اتنے ہی بڑے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتا۔ "اداس نسلوں" میں خواہ مخواہ کی طوالت اور واقعات کی ترتیب کسی شعور کا پتہ نہیں دیتی۔ اس کے کردار کوئی ایسی بات نہیں کرتے نہ کوئی ایسی حرکت ہی کرتے ہیں اور نہ مصنف ان کے بابت کوئی ایسا انکشاف کرتا ہے کہ وہ زندہ ہو کر ہمارے حافظے پر ثبت ہو جائیں۔ نروس بریک ڈاؤن نہایت خلوص کے ساتھ انہیں ناول نگاری کی طرف لے آتا ہے۔ مگر مجھے ایک نہایت عمدہ کاتب کی یہ بات یاد آتی ہے "خلوص ہی سے کیا ہوتا ہے صاحب۔ آپ کتنے خلوص سے قلم اور کاغذ لے کر بیٹھیں مگر میری ایسی کتابت نہیں کر سکتے!"

سلیم احمد

پرانا مسئلہ، نیا سوال

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب ہم ان تمام مسائل کو ان کے نتائج کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں جنہوں نے ہمارے بزرگوں کو اتنا ستایا تھا۔ انگریزی تعلیم، مغربی معاشرت کی تقلید، آزادیٔ نسواں، کیسی کیسی بحثیں تھیں اور کیسے کیسے جوش سے ان کی مخالفت یا موافقت میں جہاد کیا گیا۔ وہ بالسیف نہ سہی، بالقلم ہی سہی، جہاد بالسیف کا زمانہ بھی کہاں تھا۔ غیر معروف لوگوں کو تو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہوگی۔ رات گئی بات گئی۔ تاریخ کا سانپ نکل گیا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ اس لئے ہمیں ان کی معروفیت کا اتنا احترام ضرور کرنا چاہیئے کہ انہیں نئی تاریخ کی تعمیر میں مصروف رہنے دیں۔ اور بقول شاہد احمد دہلوی چلتی میں روڑا نہ اٹکائیں۔

لیکن جن لوگوں کو کام نہ ملنے کے سبب سے ابھی تھوڑی بہت فرصت ہے یا جو کسی سبب سے نئی تاریخ کے عظیم مقصد میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ کیا مضائقہ ہے۔ اگر ہم انہیں تھوڑی دیر پرانی تاریخ کے کھنڈروں کی سیر کرائیں۔ آخر آثار قدیمہ سے دلچسپی بھی ایک چیز ہے — تو آیئے تھوڑی دیر [illegible] لائبریری کی سیر کرتے ہیں۔ یہاں کتنی ہی بد [illegible] ایک بات ہے۔ یہاں [illegible] عصمت، البلاغ، [illegible] اور اسی طرح کے دوسرے تہذیبی، سیاسی اور ادبی رسائل کی پرانی فائلیں تو مل سکتی [illegible] ؟

ایک [illegible] سلسلہ [illegible] کتاب کے صفحات الٹتے پلٹتے [illegible] تقریر پر [illegible] تعجب ہوا کہ مولانا حالی تو اصلاح پسند [illegible] سرسید کے مرید تھے اور جدیدیت کے حامی! پھر یہ [illegible] ملائوں جیسی قابل نفرت [illegible]۔ وہ تو کہیے ہمیں مولانا کی پیرانہ سالی اور خدمات کا کچھ لحاظ تھا۔ اور حافظہ بگڑنے کے باوجود اتنا یاد [illegible] پانی پت کا یہ بیچارہ بھلا مانس شاعر کبھی [illegible] کر سرسید کے پیچھے کہاں کہاں خراب ہوا۔ اس لئے حالی سے بدگمانی کے بجائے ہمیں پیر و مرید کے اختلاف [illegible] زیادہ عجیب معلوم ہوا۔ آخر کوئی تو بات ہوگی کہ جس وقت تحریک اصلاح کا بانی انگریزوں کی مخلوط سوسائٹی کو رشک اور حسرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اور اپنی دراز ریشی کے باوجود مردوں کے دوش بدوش شائستہ اور مہذب لیڈیوں کی گرمیٔ محفل پر لوٹ رہا تھا۔ اس وقت تحریک اصلاح کا یہ پرخلوص ترین سپاہی اپنے اعزّا اور اقربا کو جمع کرکے انہیں پردہ پر قائم رہنے کی تلقین کر رہا تھا؟

اچھا تو اب مولانا حالی کی تقریر اپنے سامنے رکھئے اور ہمارے ساتھ نوٹ کیجئے کہ مولانا حالی اپنی ابتدا ہی میں کچھ ڈرے ہوئے ہیں سرسید سے نہیں۔ انگریزوں سے نہیں۔ اس تصور سے کہ مسلمانوں نے سرسید کے اثر سے انگریزوں کی مخلوط سوسائٹی کے آئیڈیل کو قبول کیا۔

اور اس کی خاطر پردہ چھوڑ دیا تو کیا ہوگا؟

مولانا حالی کی تقریر صرف ایک بنیادی خوف سے پیدا ہوئی ہے۔ بے پردگی کے نتائج کا خوف۔ مولانا حالی بے پردگی کے نتائج سے اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دلی سے اپنی ساری محبت کے باوجود دلی میں مستقل قیام کو پسند نہیں کیا۔ اقبال نے یہاں بہت بعد میں بتایا کہ مشرقی تہذیب کا پردہ ہو یا مغربی تہذیب کی بے پردگی۔ وہ چیز جسے "نسوانیت زن" کہتے ہیں، اس کی نگہبانی صرف وہی کرتا ہے جو حقیقی معنوں میں مرد ہو۔ نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد لیکن جن سے ڈرے ہوئے حالی کی مردانگی خود ایک ڈانواں ڈول چیز تھی۔ اس لئے ان کی بزدلی اصلاح پسندی کی زبان سے کہتی تھی کہ شہروں میں انگریزی تہذیب کے اثر سے جس قسم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں وہ کسی طرح بھی کسی مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ واقعات ذرا شریفانہ لفظ ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہے آشنائیاں اور عشق بازیاں وغیرہ ہے۔ مولانا حالی اسے مسلم معاشرت کا انہدام تصور کرتے تھے۔

اچھا مولانا دلی میں تو مسلم معاشرت کا قلعہ منہدم ہو رہا تھا مگر پانی پت میں؟......

مولانا حالی کہتے ہیں کہ بعض صاحبوں نے مجھ سے دلی میں کہا تھا کہ قصبات کی حالت بھی شہروں سے بہتر نہیں ہے۔ دور کے ڈھول سہانے ذرا جا کر دیکھئے وہاں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قصبات کے لوگ مدت سے ایک جگہ جم کر رہ رہے ہیں اور ان کے خاندان ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی بات باہر نہیں نکلتی۔ بیچارے شہر والے اس لئے بدنام ہو کر رہ جاتے ہیں کہ آپس میں یک جہتی نہ ہونے کے باعث ان کی بات باہر نکل جاتی ہے۔ مولانا حالی کو اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے احباب، اعزہ اور برادری والوں کے سامنے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ پانی پت ان اثرات سے محفوظ ہے۔ پانی پت کا جاننے والا مولانا حالی سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مولانا کہتے ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ لیکن مولانا میرا سوال ایک اور ہے۔

......چلئے یہ تو ہم نے مان لیا کہ پانی پت کا پانی ابھی تک محفوظ ہے۔ لیکن مولانا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مغربی تہذیب کی جو آگ دلی تک آپہونچی ہے اس سے آپ کا پانی پت کب تک محفوظ رہے گا۔ اور ایک بات اور، مولانا آپ اس آگ سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ آپ نے دلی میں اپنا قیام تک پسند نہیں فرمایا۔ لیکن قبلہ جس میں یہ چنگاری کس نے ڈالی؟

افسوس کہ بی جمالو کی معصومیت اس قسم کے سوالوں پر کبھی غور نہیں کرتی۔ بزرگوں پر ہنسنا اچھی بات تو نہیں ہے۔ آدمی کو اپنے انجام سے ڈرنا چاہئے۔ لیکن عبرت کے سارے تقاضوں کے باوجود اس بات پر حیرت ضرور ہوتی ہے کہ مولانا اس قسم کا کوئی سوال کبھی خود سے پوچھتے ہی نہیں یہ مولانا کا نہیں اصلاح پسندی کا المیہ ہے۔ کوئی اصلاح پسند اس قسم کا سوال اپنے آپ سے نہیں پوچھ سکتا۔ اصلاح پسند کی بنیادی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو، تاریخ کو، تہذیبی اور معاشرتی عوامل کو من مانی کارروائیوں کا مجموعہ سمجھتا ہے اور انتہائی سادہ دلی سے یہ تصور کرتا ہے کہ وہ سارے عناصر جن سے انتہائی تقدیر کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے اپنے قابو میں ہیں۔ اور وہ ان کی ناک میں نکیل ڈال کر انہیں جدھر چاہے ہانک سکتا ہے۔ مولانا حالی بھی انتہائی سادگی سے جو ان کی بھولی بھالی صورت پر واقعی بہار بھی خوب دیتی ہے پہلے فرض کرتے ہیں کہ سر سید کے آئیڈیل کے مطابق مشرق کو مغرب سے ملا سکتے ہیں۔ پھر انہیں مغرب کی خوبیوں کے ساتھ مغرب کی برائیاں نظر آتی ہیں۔ تو اپنے آپ کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ مغرب کی جو باتیں پسند ہوں گی وہ انہیں اختیار کر لیں گے۔ اور جو ناپسند ہوں گی انہیں سات سمندر پار واپس پھیر دیں گے۔ ایکسپورٹ امپورٹ کا یہ اصول ممکن ہے۔ تجارت میں ممکن ہو اور منافع دیتا ہو لیکن زندگی میں؟

میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو۔ یہ مولانا حالی کا اصول ہے۔ اسے مولانا عربی میں بیان کرتے ہیں۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔ یہ بات نہیں کہ میں انسان کی "انتخابی قوت" کو تسلیم نہیں کرتا۔ انسان تو انسان ہے ہی صرف اس بنا پر کہ وہ انتخاب کر سکتا ہے۔ جبکہ انسان کے سوا کوئی اور چیز اس کی اہل

نہیں۔ لیکن انتخاب وہ کرتا ہے جسے معلوم ہو کہ کیا چیز انتخاب کرنے کی ہے اور کیا نہیں۔ اس کے لئے اصلاح پسندی سے کام نہیں چلتا۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو انسانی تقدیر کو جانتا ہو۔ لیکن حالی پر میرا اعتراض ذاتی نہیں ہے۔ یہ صرف مولانا حالی کی معصومانہ ذہنیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر اس شخص کی جو کسی طرح بھی سرسید تحریک سے متاثر ہوا ہو۔ چاہے وہ ڈپٹی نذیر احمد ہوں چاہے مولانا شبلی نعمانی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا شخص بھی جس کی فراست پر سادہ دلی کا گمان تک نہیں ہوتا ـــ اقبال ـــ ان سب لوگوں کے پاس پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کی اپنی اپنی فہرست ہے۔ اونٹ نے ان سے ان کے خیمہ میں آنے کی اجازت طلب کی ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ اونٹ اپنی گردن تو اندر ڈال دے مگر خود باہر رہے۔ لیکن اونٹ نے خیمہ میں گردن ڈالی ہے تو پھر انتخاب کا سوال نہیں۔ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو، جلد یا بدیر اونٹ تو پورا ہی آپ کے خیمہ میں آکر رہے گا۔

خیر ابھی تو ہم صرف اونٹ کی گردن دیکھ رہے ہیں،

مولانا حالی دلی میں مغربی تہذیب کی آمد آمد دیکھ چکے تھے۔ یہ ان کی اپنی کوششوں کا ثمر تھا، لیکن مشکل یہ آپڑی کہ انہیں اپنے بوئے ہوئے درخت کے سب پھل پسند تھے مگر ایک پھل ناپسند تھا ـــ مخلوط سوسائٹی ـــ جس کی پہلی منزل بے پردگی تھی۔ مولانا حالی دلی سے بھاگ کر پانی پت آئے تو یہ سوال اپنے ساتھ لائے کہ اس پھل کو چکھنا مسلمانوں کے لئے مناسب ہوگا یا نہیں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سوال مسلمانانِ پانی پت کے دل میں پہلے سے موجود تھا۔ اس لئے اس اہم مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی سوال پر غور و فکر مولانا کا انفرادی مسئلہ نہ رہا۔ بلکہ پانی پت کا اجتماعی مسئلہ بن گیا۔ اجتماعی مسائل پر غور و فکر بھی اجتماعی انداز میں ہوتا ہے۔ اس لئے پانی پت میں گویا باقاعدہ ایک "پردہ کانفرنس" منعقد ہوئی ہے۔ کانفرنس کے نفسِ ناطقہ، ظاہر ہے کہ ہمارے مولانا حالی ہی تھے۔ اب اس کانفرنس کی کارروائی کو غور سے دیکھتے چلئے۔ کیونکہ یہاں جو کچھ ہوگا وہ دیگ کے چاول کی طرح پوری قوم کے رویہ کی نمائندگی کرے گا۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کانفرنس میں مولانا حالی کا رویہ ایک اچھے خلصے بلکہ معقول جمہوری لیڈر کا رویہ ہے۔ جمہوریت کے اصول کے مطابق وہ ایوان کو سب سے پہلے اپنی ذاتی رائے بتاتے ہیں۔ اس کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ ان کی ذاتی رائے صرف "رائے" ہے، "فیصلہ" نہیں ہے۔ فیصلہ تو اکثریت کے ووٹ سے ہوگا جس پر مولانا بھی ہر سچے جمہوریت پرست کی طرح سرِ تسلیم خم کریں گے۔ پتہ نہیں منکرینِ زکوٰۃ سے جہاد کے مسئلہ پر صدیق اکبر نے اس جمہوری اصول کو پیشِ نظر کیوں نہیں رکھا تھا۔ لیکن اس وقت ہماری حیثیت صرف رپورٹر کی ہے۔ اس لئے ہم اس قسم کا کوئی سوال اٹھائے بغیر کانفرنس کی کارروائی نوٹ کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے مولانا کی ذاتی رائے ملاحظہ کیجئے،

مولانا نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پردہ قائم رہنا چاہئے۔ لیکن ذاتی رائے دلیل کے بغیر بے وزن ہوتی ہے۔ اس لئے مولانا اپنی رائے کے حق میں کئی قوی عقلی، جذباتی اور اخلاقی دلائل پیش کرتے ہیں۔ سب سے مضبوط دلیل مذہبی دلیل ہے۔ پردہ اس لئے قائم رہنا چاہیئے کہ یہ ہمارے مذہب کا حکم ہے۔ چنانچہ مولانا حالی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق کو حضرت عائشہ کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو پکار کر فرمایا "ابوبکر کیا شیطان سے بالکل غافل ہو گئے ہو کہ جوان بیٹی کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کر رہے ہو۔"

سنتے ہیں کہ رپورٹر ایک مشین ہوتا ہے۔ جس کے پاس اپنا دل نہیں ہوتا۔ لیکن پھر میرے سینہ میں یہ کیا چیز ہے جو یہاں پہنچ کر ایک نامعلوم اضطراب سے دھڑکنے لگی ہے۔ کیا مولانا کو اس حدیث پر یقین نہیں تھا۔ اور اگر یقین تھا تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس حدیث پر یقین کے باوجود مولانا حالی اسے اکثریت کے فیصلہ پر ترک کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ عقلی دلائل دوسرے قوی دلائل کے مقابلہ میں چھوڑے جا سکتے ہیں۔ جذباتی دلائل دوستی کی مروت اور قرابت داری کے لحاظ میں ترک کئے جا سکتے ہیں۔ اخلاقی دلائل اکثریت کے فیصلہ یا

عقلیت کی دلدہی کی خاطر قربان کئے جاسکتے ہیں۔ مگر کیا مذہبی عقائد اور احکام بھی ——— جمہوریت نے بھی مسلمانوں کو کہاں کہاں ڈبویا ہے۔۔

لوگ کہتے ہیں۔ حالات! زمانہ کا تقاضہ!!

لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ تنکوں سے کون پوچھے کہ دریا انہیں کہاں بہا کے لئے جارہا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے رپورٹر نے اپنے دل کے چکر میں بار بار اپنی حدوں سے تجاوز کیا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم اسے برخواست کردیں اور کانفرنس کی کارروائی میں خود شریک ہوں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کانفرنس کی کارروائی اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں تالیاں بجانے یا نعرۂ تکبیر لگانے والوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

لیجئے ہم کانفرنس میں اس وقت پہنچے ہیں جب مولانا حالی حدیث رسول بیان کرچکے ہیں۔ اس کے بعد مولانا اعلان کرتے ہیں۔ اے مسلمانانِ پانی پت اگر آپ لوگوں کا فیصلہ پردہ چھوڑنے کے حق میں ہوگا تو سب سے پہلے میں خود اپنے گھر والوں کو پردہ چھوڑنے پر مجبور کردوں گا (نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر) صرف اپنے گھر والوں ہی کو نہیں میں اپنے اعزا اور احباب کو بھی اس کے لئے مجبور کردوں گا (نعرۂ تکبیر اللہ اکبر)

ہم چونکہ کانفرنس میں ابھی شریک ہوئے ہیں اس لئے اپنے حصے کا سوال اب کرتے ہیں۔

ہمارا سوال:- مولانا آپ لوگوں کو کس قوت کے بل پر مجبور کریں گے۔ آپ کے پاس نہ پولیس ہے۔ نہ فوج۔ پھر آپ یہ کیسے کرسکیں گے۔

مولانا:- میں اعلان کرتا ہوں کہ آپ کے فیصلہ کے بعد جو اس فیصلہ پر عمل نہیں کریں گے ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا تعلق ختم کردوں گا۔

(نعرے مع تالیاں) اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولانا کا جواب ہمیں بھی ان کا قائل کردیتا ہے۔ اخلاقی اور جذباتی ہی سہی مگر جمہوریت کی حمایت میں یہ آمریت کتنی اچھی لگتی ہے۔ آگے چل کر جمہوریت کی ایسی آمرانہ حمایت کے بہت سے نمونے مسلمانوں نے دیکھے۔ ایک مزے کی بات اور ہے کہ اس مقام پر جمہوریت اور جمہوریت کی حامی آمریت کے ساتھ ساتھ مشروط جمہوریت کا نمونہ بھی ملتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا حالی نے جمہوریت کے احترام میں اکثریت کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا اعلان کیا۔ مگر یہ اعلان غیر مشروط نہیں ہے۔ مولانا حالی شرط لگاتے ہیں کہ مسلمانان پانی پت کو فیصلہ کی آزادی تو ہے مگر جو فیصلہ ہوگا وہ اسی وقت کیا جائے گا۔ اور فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔ پردہ چھوڑنا ہے تو چھوڑ دیجئے مگر اکا دکا نہیں اجتماعی طور پر۔ اور آہستہ آہستہ نہیں بلکہ فوراً ابھی، اسی وقت......

بہت زیادہ تفصیلات میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب ہم یہ نہیں بیان کریں گے کہ مولانا کی تقریر کے بعد پانی پت کے اس خانہ ساز جمہوری ایوان میں کس کس کی تقریر ہوئی۔ اور دلی سے اور پانی پت کے باشندوں کے نمائندوں نے کن کن خیالات کا اظہار کیا۔ ہمارے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ آخر میں پانی پت کے ایوان کا فیصلہ پردہ کو قائم رکھنے کے حق میں ہوا۔ دلوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کون جانے اس لئے کہ مولانا حالی کی ذاتی رائے کا احترام کرنا چاہتے تھے؟ یا اس لئے کہ انہیں حدیث رسول کو رد کرنے سے شرم آتی تھی۔ یا پھر اس لئے کہ وہ پردہ چھوڑنا تو چاہتے تھے مگر اک دم نہیں؟ وجہ کچھ بھی ہو مگر پانی پت کے اس معرکہ میں فتح اس بات کی ہوئی جسے مولانا نے اپنی ذاتی رائے کہہ کر پیش کیا تھا لیکن پردہ کا مسئلہ مولانا کا ذاتی مسئلہ نہیں تھا۔ نہ صرف مسلمانان پانی پت کا یہ مسئلہ ہندوستان کے پورے مسلمانوں کا تھا۔ اس لئے اب پانی پت پورے ہندوستان کا استعارہ ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک عجیب پہلو ہے کہ اس کی زندگی کے اہم ترین فیصلے بیشتر پانی پت کے میدان میں ہوئے ہیں اور ہمیشہ ہندوستان کی شکست کے حق میں۔ یہ پانی پت کی آخری لڑائی تھی جس میں ہندوستان پہلی چار تاریخی لڑائیوں کی طرح ایک بار پھر ہار گیا۔ ہندوستان ہار گیا؟ ہندوستان سچ مچ ہار گیا۔ ہار گیا۔ انگلینڈ حالی کی عارضی اور مقامی فتح کے باوجود۔ حالی کی عارضی اور مقامی فتح کے باوجود ہندوستان ہار گیا۔ ہندوستان ہار گیا اور مغربی بے پردگی کی وبا شہروں اور قصبوں میں یکساں طور پر پھیلتی چلی گئی۔ مولانا کی شرط کے مطابق اک دم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ...... شاید مولانا حالی کی عارضی فتح بھی ایک فریب تھی۔ شاید انہیں ریاکاری اور منافقت نے دھوکا دیا تھا۔ شاید وہ فیصلہ چھوڑنا تھا اور صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ مولانا کی شرط سے

بچا جاتے ۔ مولانا کہتے تھے اسی وقت ، ابھی ۔ پانی پت چاہتا تھا آہستہ آہستہ ۔ پچھلے سو سال سے آہستہ آہستہ کا یہی طریقہ کار ہماری ریاکاری اور بزدلی کا پردہ بن کر ہمارے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ ہم اخلاقی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان پر عقل ، جذبات ، اخلاق اور مذہب کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ پھر عقلی ، جذباتی ، اخلاقی اور مذہبی دلائل کی مدد سے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں ان چیزوں پر قائم رہنا ہے جو ہماری ہیں لیکن اس تمام شرمناک ڈھونگ کے بعد آہستہ آہستہ ہم اس طرف سرک جاتے ہیں جس کی تائید نہ ہماری عقل کرتی ہے نہ جذبات نہ اخلاق ، نہ مذہب ۔ آہستہ آہستہ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری بار بار کی غداری سے بیزار ہو کر عقل ، جذبات ، اخلاق مذہب سب نے ہماری رہنمائی سے منہ پھیر لیا ہے ۔ اے بنی اسرائیل تیرا حشر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔

مولانا حالی کا انتقال ایک سال کم نصف صدی پہلے ہوا تھا ۔ پچھلے ۴۹ سال میں ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ، حالی سے ، حالی کے پانی پت سے ، پانی پت کے فیصلے سے بہت آگے بڑھ آئی ہے ۔ اس طویل مدت میں ہم نے سیکڑوں سوال اٹھائے ۔ تحقیق اور تلاش کے سیکڑوں نئے دفتر کھلے ۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو نے قدم راؤ پدم راؤ کو ڈھونڈ نکالا ۔ مگر کسی صاحب نظر نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ یہ کم بخت دقیانوسی پردہ جس کی حمایت اور مخالفت کی جنگ برسوں ہمارے گھروں میں جاری رہی آخر ہے کیا ؟

ایک جاگیردارانہ رسم ؟ ایک مذہبی توہم ؟ مردوں کے ناپاک احساس برتری کا شاخسانہ ؟ عورتوں کی شرمناک غلامی کی یادگار ؟ نہیں ، سوال تو اٹھایا گیا ورنہ یہ جواب کہاں سے پیدا ہوتے ۔ تو یوں کہئے کہ سوال تو اٹھایا گیا مگر صحیح جواب اب تک نہیں دیا گیا ۔ اوپر جو جواب نقل کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ پردہ یہ سب کچھ ہو لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ اور بھی ۔ ایک ایسی چیز جو اچھی ہو یا بری بہرحال ہمارے اندر سے پیدا ہوئی ۔ اوپر دیئے ہوئے جواب اس لئے ناقص ہیں کہ ان میں اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا ہے ۔ اور پردہ کو صرف ایک خارجی چیز سمجھ کر اس پر حکم لگایا گیا ہے ۔ اچھا اب جو چیز ہمارے اندر سے پیدا ہوا ہے ہمیں کس طرح دیکھنا پڑتا ہے ؟ ہمیں اس کے بارے میں اچھائی برائی کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے ۔ ہاں یہ ایک جواب ہے لیکن قبل از وقت ہے ۔ اچھائی برائی کے فیصلے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ چیز پیدا کیوں ہوئی ۔ یہ جانے بغیر ہم اس کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ نہیں کر سکتے ۔ صوفیا کا ذکر ممکن ہے کہ بعض جدید لوگوں کو بے محل معلوم ہو اس لئے ادیبوں کے تجربات دیکھئے ، سینکڑوں ادیبوں نے ایسے بے شمار کردار پیش کئے ہیں جن کے دلوں میں کسی نیک کام کی خواہش پیدا ہوئی ، جبکہ اس خواہش کی تہ میں کچھ اور تھا ۔ "تائیس" کا راہب پفنوس اس کی ایک زندہ مثال ہے ۔ پھر ادیبوں ہی کی کیا تخصیص ہے ۔ یہ بات تو ہم ویسے بھی اپنے عام تجربات سے جانتے ہیں کہ ہماری اندرونی خواہش کیسے کیسے دل پسند روپ اختیار کرتی ہے ۔ نفسیاتی نظریہ بازی تو مجھے پسند نہیں ہے ۔ لیکن نفسیات کی عام معلومات ہمیں اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہے ۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ خیرات کے نیک کام کی خواہش کا اندرونی محرک صرف شہرت طلبی ہو ۔ یا ہمدردی کا نیک جذبہ دوسروں کی تعریف حاصل کرنے کی خواہش سے پیدا ہوا ہو ۔ معاف کیجئے شاید میں ایک پیش پا افتادہ حقیقت کے بیان کو خواہ مخواہ طول دے رہا ہوں ۔ اس لئے اب مثالیں چھوڑ کر اس اصول کو پردہ پر منطبق کر کے دیکھئے ۔

پردہ ، عام انسانی نفسیات کو دیکھتے ہوئے اس خوف کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ بے پردگی سے عورتوں کی عصمت محفوظ نہیں رہے گی ۔ عام انسانی نفسیات کی تخصیص یوں کی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک پردہ کسی خوف کا ردعمل نہیں ہے بلکہ بجائے خود ایک مثبت عمل ہے جس کے ذریعہ عورتوں اور مردوں کی بھرپور زندگی کے دھارے گنگا جمنا کی طرح اپنی اپنی حدود میں بہتے ہیں اور صرف سنگم پر ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ ضرور تسلیم ہے کہ عام انسانوں میں یہ مثبت عمل صرف ایک ردعمل کی حیثیت رکھتا ہے جو خوف سے پیدا ہوا ہو ۔ پھر ان عام انسانوں کے جدا جدا نظریہ ساز ہیں ۔ مثلاً نظریہ سازوں کا ایک گروہ اسے صرف مردوں کا خوف قرار دیتا ہے ۔ ممکن ہے یہ نظریہ صحیح ہو ۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ مردوں نے اپنے خوف کی بنا پر عورتوں پر پردہ کی پابندی عائد کی ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ خود عصمت کا

تصور مردوں کی ایجاد ہے جو انہوں نے عورتوں کو ذاتی ملکیت بنا کر رکھنے کے لئے پیدا کیا۔ اس لئے عصمت اور پردہ دونوں عورتوں کی غلامی کی نشانیاں ہیں۔ لیکن ایک دوسرے زاویہ سے غور کیا جائے تو عورتوں کو اس خوف سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ پر صحیح جنسی عمل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں عورت اپنی آمادگی سے شریک ہو۔ پھر اس آمادگی کے لئے ضروری ہے کہ یہ ہر قسم کے خارجی دباؤ یا لالچ کے بغیر ہو۔ نکاح اسی قسم کی آمادگی کی ایک قانونی شکل ہے۔ ورنہ خارجی دباؤ کے ذریعہ ہر جنسی عمل زنا بالجبر ہے۔ اور جو عورت کسی بھی لالچ کے لئے جنسی عمل پر تیار ہوتی ہے وہ طوائف ہے۔ خواہ اس خارجی دباؤ اور لالچ کو قانون کی رسمی شکلوں کا سہارا دے کر ہی کیوں نہ قائم کیا گیا ہو۔ ایجاب و قبول اسی بنیادی اصول کی شکلیں ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کسی عورت سے جنسی عمل صرف اس صورت میں ہونا چاہیئے جب جنسی عمل بجائے خود عورت کا مقصود ہو۔ اس شرط کو پورا کئے بغیر جنسی عمل کی ہر صورت عورت کی فطرت پر ظلم ہے۔ خواہ یہ ظلم خود عورت ہی نے اپنی فطرت پر کیوں نہ روا رکھا ہو۔ بہر صورت عام حالات میں عورتوں کا حقیقی خوف یہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی مرد ان کی جسمانی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی آمادگی کے بغیر ان کے ساتھ جنسی فعل کا مرتکب نہ ہو۔ مجرمانہ حملہ عورت کا بنیادی خوف ہے۔ اسی طرح عورت کے لئے عصمت کا حقیقی تصور یہ ہے کہ وہ صرف ایسے مرد کی جنسی رفیق ہو جس کے لئے خود اس کی فطرت میں آمادگی موجود ہو۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصمت کا تصور صرف مرد کی ایجاد نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچ جاتے ہیں کہ پردہ اگر خوف سے پیدا ہوا ہے تو یہ صرف مردوں کا خوف نہیں۔ بلکہ عورتوں اور مردوں کا مشترکہ خوف ہے۔ اوپر کی بحث اگر صحیح ہے تو اس کی مدد سے ہم ایک اور بڑے نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ پردہ عصمت کے تحفظ کی عملی شکل ہے اور عصمت کا تصور بجائے خود ایک اور تصور پر قائم ہے — یہ تصور کہ عورت اور مرد کا بنیادی رشتہ جنس کا رشتہ ہے۔ اس طرح پردہ کے پیچھے دو بنیادی تصورات کام کرتے نظر آتے ہیں۔

(۱) مرد اور عورت کا بنیادی رشتہ جنس کا رشتہ ہے۔

(۲) جنسی رشتہ عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے قائم ہونا چاہیئے۔

اس دوسرے تصور کی عملی صورت نکاح ہے۔ چنانچہ پردہ ان مردوں اور عورتوں کے درمیان قائم ہوتا ہے جن کے درمیان جنسی رشتہ قائم ہو سکے۔ جن مردوں اور عورتوں کے درمیان نکاح نہیں ہو سکتا وہ پردہ سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر یہاں بھی پہلے تصور یعنی مرد و عورت کے جنسی رشتہ کا اتنا لحاظ رکھا گیا ہے کہ حدیث رسول میں باپ بیٹی کو بھی تنہائی میں گفتگو سے منع کیا گیا۔ اور عملاً ہماری بڑی بوڑھیاں جوان لڑکیوں کو باپ اور بھائیوں کے بستر پر بھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ مولانا حالی شاید اس بات کو جانتے تھے لیکن یقیناً پوری طرح نہیں۔ پوری طرح جاننے والا جمہوری لیڈر نہیں بنتا۔

ممکن ہے کہ کسی پڑھنے والے کے دل میں خیال پیدا ہو، جیسے کہ خود میرے اپنے دل میں پیدا ہوا ہے کہ پردہ کے موضوع پر اتنا وقت ضائع کرنے کے باوجود اب تک اس امر پر کوئی بحث نہیں کی گئی کہ پردہ کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے یا نہیں یا اس سلسلہ میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اصلی ہیں یا وضعی یا یہ کہ پردہ کبھی عرب میں بھی رائج ہوا تھا یا صرف ہندوستان میں ہندوؤں کی دیکھا دیکھی شروع کیا گیا۔ پیارے قارئین کرام۔ میں ان مسائل پر بحث ضرور کرتا۔ لیکن یہ کئی دوسرے لوگوں کی حق تلفی ہوتی۔ اس لئے درخواست ہے کہ قارئین کرام ان تمام بحثوں کے لئے ماہنامہ عصمت کی فائلوں کی طرف رجوع کریں جو پاکستان میں نیشنل لیاقت لائبریری کے علاوہ خیری بلدران سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ جب تک ہم مسئلہ پر ایک اور نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں۔

بچپن میں حساب پڑھاتے ہوئے مولوی صاحب نے بتلایا تھا کہ سوال حل کرنے کے بعد دیکھ لیا کرو کہ جواب صحیح ہے یا نہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جواب سے سوال کی طرف چلا کرو۔ مسلمانوں کی اصطلاحوں میں باتیں کرتے مجھے دیر گزری۔ اس لئے طبیعت خود بخود منقبض

ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بالکل آؤٹ ڈیٹ باتوں میں وقت ضائع کیا جا رہا ہو۔ جواب سے سوال کی طرف چلنے میں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی اصطلاحوں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ اب ہم صرف اتنی بات پر غور کریں گے کہ عورت اور مرد کا بنیادی رشتہ اگر جنس کا رشتہ ہے اور دنیا میں اگر کوئی قوم ایسی موجود ہے جو اس رشتہ کو حیوانی رشتہ نہیں بنانا چاہتی تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ حیوانی رشتہ میں نے غلط کہا حیوانوں میں اعلیٰ نسل کے حیوان جوڑے بنا کر رہتے ہیں۔ بعض حیوان ایسے ہیں کہ جوڑے میں سے کسی ایک کی موت کے بعد جوڑا نہیں بناتے بعض ایسے ہیں کہ ایک موسم میں ایک بار جوڑا بناتے ہیں۔ بعض حیوانوں میں یہ تو دیکھا گیا ہے کہ ایک نر کے ساتھ ماداؤں کا پورا گلہ ہو۔ لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ ایک مادہ کے ساتھ نروں کی فوج ہو۔ شہد کی مکھیوں میں ایسا ہوتا ہے لیکن اس کی صورت مقابلہ کی ہے۔ ملکہ سے ہم بستری کا شرف اسی نر کو حاصل ہوتا ہے جو سب سے اونچا اڑ سکے۔ مادہ کے ساتھ نروں کی فوج جو آپس میں تعاون بھی کرتی ہو صرف کتوں میں دیکھی گئی ہے یا سوروں میں۔ میں بھولا، کتوں میں اور سوروں میں اور جدید مغربی تہذیب میں۔ میرا حیاتیات کا علم صفر کے برابر ہے۔ اس لئے میں حیوانوں کا حوالہ چھوڑ کر صرف انسانوں کی بات کرتا ہوں۔ کیا دنیا میں کوئی مہذب قوم ایسی موجود ہے جو ایک عورت کے لئے ایک ہی وقت میں ایک مرد کو بطور اصول کے تسلیم نہ کرتی ہو۔ اچھا یہ اصول اگر موجود ہے تو اس کی عملی صورت کیا ہوگی۔ شادی اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسے ماحول کی تشکیل جس میں لڑکے اور لڑکیاں عمر کی ایک خاص مدت تک جسے جسمانی اور ذہنی تربیت کا دور کہنا چاہئے ایک دوسرے سے الگ رکھے جائیں۔ جنس کا رشتہ ایک زندہ رشتہ ہے اس لئے اس علیحدگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس رشتہ کا احساس ختم کر دیا جائے۔ بلکہ درحقیقت اسے رشتہ کی تیاری کا دور ہونا چاہئے۔ یہ دور گذر جانے کے بعد رشتہ کے قائم ہونے کا وقت آتا ہے۔ لیکن رشتہ قائم ہونے کے بعد بھی ضروری ہے کہ ایسا ماحول برقرار رکھا جائے کہ ایک بندھن کے لوگ دوسرے بندھن کے لوگوں کی زندگی میں مداخلت نہ کر سکیں اور کسی وقتی کمزوری یا کمزوری یا عارضی کیفیت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ اب مسئلہ کے دو اہم بنیادی نکات ہوئے (۱) شادی سے پہلے تیاری کا دور اور تیاری کے دور میں عملی تجربہ سے پرہیز (۲) شادی کے بعد ہر قسم کے خارجی دباؤ یا ترغیب سے تحفظ۔ اب ہمارا سوال یہ ہوا کہ ایسا ماحول کیسے قائم کیا جائے؟

پردہ اس سوال کا ایک جواب ہے لیکن واحد جواب نہیں۔ کسی اور قوم کے پاس اگر اس کا کوئی بہتر جواب ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔ ہندوستان میں مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال تک پردہ کے اصول پر قائم رہے۔ اصول کتنے ہی اچھے، کتنے ہی اٹل، کتنے ہی مستقل کیوں نہ ہوں لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ان پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہر زندہ قوم کو پیش آتی رہتی ہے۔ خواہ اس کے بعد اصول کو قائم رکھا جائے یا ترک کر دیا جائے۔ فرد ہو یا قوم ایسے حالات اس کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج کے طور پر آتے ہیں۔ چیلنج کا جواب کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے قبول کرنا زندگی کا اولین تقاضا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد جس قسم کے حالات پیدا ہوئے وہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ایک ایسے ہی چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیا ہم نے اس چیلنج کو قبول کیا؟ اس کا جواب اگر اثبات میں ہے تو غلط ہے۔ غلط ہے۔ غلط ہے۔ ہم نے چیلنج نہیں قبول کیا۔ ہم نے صرف آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرنے والوں نے سب سے پہلے اس حقیقت سے انکار کیا کہ عورت اور مرد کا بنیادی رشتہ جنس کا رشتہ ہے۔ اس کے بعد دباؤ یا ترغیب سے تحفظ کی ہر شکل اپنے آپ باطل ہو گئی۔ آنریبل سر سید احمد خاں ستارۂ ہند کے نزدیک ان کی آئیڈیل مخلوط سوسائٹی کے مہذب اور شائستہ مردوں اور لیڈیوں کے درمیان صرف ہاتھ ملانے کا رشتہ ہے۔ پتہ نہیں جنس کے بغیر ان مہذب اور شائستہ مردوں اور لیڈیوں کو ہاتھ ملانے کے تکلف میں کیا مزا آتا ہوگا۔ خیر سر سید تو عمر سے اترے ہوئے آدمی تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے لئے اتنا ہی کافی ہو۔ لیکن کیا سب انسانوں کے لئے بھی؟ سر سید تحریک درحقیقت بڈھوں کی تحریک تھی۔ اس تحریک میں یہ چھوٹی بڑی داڑھیاں آپ کو بے سبب نظر نہیں آتیں۔ جوانی کے گناہوں پر نادم، گناہوں پر، غفلتوں پر، عارضی اور فانی لذتوں پر پچھتائے ہوئے وقت کے ضائع ہو جانے اور وقت کے کم رہ جانے کے شاکی۔ ضائع ہو جانے

والے وقت کے نوحہ خواں اور آنے والے وقت کے خوف سے لرزاں، روتے، آنسو بہاتے، جھنکتے بڈھے جو بستر مرگ سے اٹھا لگے تھے۔ اور اپنی زندگی صرف اسی میں دیکھتے تھے کہ اپنی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کو پوری قائم پھیلا دیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا "توبۃ النصوح" بڈھوں کی اسی نسل کا استعارہ ہے توبۃ النصوح ایک بار غور سے پڑھ لیجئے سرسید تحریک کی روح سمجھ میں آجائے گی۔ صرف سرسید تحریک کی روح ہی نہیں، اس ہندوستان کی روح بھی جو سرسید تحریک کے زیر اثر پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ آنکھیں بند کرنے والوں کی پہلی نسل "تہذیب الاخلاق" کی نسل تھی۔ دوسری نسل چند برسوں کے ہیر پھیر سے ماہنامہ "عصمت" میں ابھری۔ پردہ کے خلاف ماہنامہ عصمت کے اسلامی ترقی پسندوں کی بنیادی دلیل یہ ہے "بے پردگی کا مطلب آوارگی یا بے حیائی نہیں ہے" بے شک مطلب صرف اتنا ہے کہ عورت اور مرد جنسی تحریک کے بغیر مل سکتے ہیں۔ بلکہ ملنا چاہئے۔ ماں باپ کی بینائی کم ہو جائے تو بعض حالات میں اولاد اندھی پیدا ہوتی ہے۔ سرسید تحریک کی یہ اندھی اولاد بیسویں صدی کی کچھ دہائیاں گذرنے کے بعد پیدا ہوئی۔ ماہنامہ نگار لکھنؤ جواب نگار پاکستان کے نام سے کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ اندھوں کی اسی نسل کا ترجمان تھا۔ اس کے ساتھ ماہنامہ رومان کا نام اور لکھئے۔ ماہنامہ نگار کے جمالیات پرست اور ماہنامہ رومان کے رومان پرست جنہیں سے انکار کو جو ان کے بزرگوں کے لئے عقلی اور علمی انکار تھا، احساسات میں آثار دیتے ہیں۔ اس سے جو نسل پیدا ہوئی وہ جنس کا انکار استدلالی طور پر نہیں کرتی بلکہ محسوساتی طور پر۔ نیاز فتحپوری، اختر شیرانی اور ان کے گروپ کی ساری تحریریں ایک ایسے معاشرہ کی مخلوق بھی ہیں اور خالق بھی جو ساری کی ساری "سلوٹیں" دیکھ کر رومانی اور جمالیاتی وجد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ یہ وجد کسی بچی کھچی کیفیت کی آخری لرزش ہے۔ اس معاشرہ کو واقعی پردہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تفصیلات کے لئے راقم الحروف کا مضمون "ہم لوگ اور پرانا آدمی" ملاحظہ کیجئے۔ تہذیب اخلاق کے اجراء سے ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک تک ہم بینائی کے اسی عارضہ میں مبتلا رہے ہیں۔ آخر ۱۹۳۶ء کی تحریک جنس کو دوبارہ دریافت کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہماری بحث ایک نئے سوال کا خطرہ مول لیتی ہے۔

عورت اور مرد کا بنیادی رشتہ جنس کا رشتہ ہے۔ لیکن اگر ہم پردہ کو نہ قائم رکھنا چاہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ظاہر ہے کہ ۱۹۳۶ء کی تحریک اس کا صرف ایک ہی سچا جواب دے سکتی تھی — آزاد جنسی اختلاط.....

آزاد جنسی اختلاط؟

آزاد جنسی اختلاط۔ ہندوستان اس جواب پر خوف اور دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ ہاں اب آہستہ آہستہ دوسری طرف سرک جانے کا مزہ آگیا؟ ہاں اب آنکھیں بند کر کے جواب دینے کی حقیقت معلوم ہوئی۔ ہاں اب انتہائی معصومیت سے اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا دینے کا سال کھلا۔ ۱۹۳۶ء کی تحریک بزدل باپوں کے جیالے بیٹوں کی تحریک تھی۔ اس نے جھوٹ، بزدلی اور ریاکاری کا ہر پردہ چاک کر دیا۔ آزاد جنسی اختلاط پردہ کے خاتمہ کا صحیح اور سچا جواب ہے۔ تحریک اصلاح کے بزرگوں اور فرزندوں کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کی فہرستیں دھری رہ گئیں ۱۹۳۶ء کی تحریک نے بتا دیا کہ آپ جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ آپ نے ناگ پھنی بوئی ہے تو دعائیں، مناجاتیں، گریہ وزاری، نیک نیتی، خوش خیالی، امید پرستی کوئی چیز ناگ پھنی کو ناگ پھنی بننے سے نہیں روک سکتی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کی غلطی یہ تھی کہ وہ ناگ پھنی کو گلاب قرار دیتی تھی۔ آزاد جنسی اختلاط انسانوں کا نہیں کتوں اور سوروں کا کام ہے۔ کوئی انسانی معاشرہ اپنی مکمل بیخ کنی کے بغیر آزاد جنسی اختلاط کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے ۱۹۳۶ء کی تحریک اپنی "جسارت" کے باوجود غائب ہو گئی۔ ۱۹۳۶ء کی غلطی اپنی جگہ۔ لیکن اس کی "جسارت" قدر اول کی چیز تھی۔ یہ جسارت قائم رہتی تو ہم صحیح جواب بھی سوچ سکتے ہیں۔ مگر ۱۹۳۶ء کی تحریک غائب ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی جسارت بھی۔ جس طرح اندھیری رات میں جگنو کی روشنی چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔ اور اپنے پیچھے اندھیرا اور شدید احساس چھوڑ جاتی ہے۔ اس ۱۹۳۶ء کے بعد ہم اندھیرے میں ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ اندھیرا ہولناک سے ہولناک تر ہوتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاں ہمارے اندر اپنی حالت کو دیکھنے کی

آخری خواہش بھی کم ہو گئی۔ ہم اندھے ہیں اور اپنے اندھے رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہی اندھاپن ہے۔ چیزوں کو ان کے صحیح رشتوں میں دیکھنے نہیں دیتا۔۔۔ روشنی کہاں ہے؟

روشنی کہاں ہے؟ ۱۹۶۵ء میں ہمیں اسی سوال پر غور کرنا ہے۔ کیا ہمارے معاشرہ میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اندھے نہیں ہیں۔ یا کم از کم اندھے رہنے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ سوال انہیں سے تعلق رکھتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گھپ اندھیروں میں انہیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں جو سرسید کے لئے ایک آئیڈیلزم تھی اور ہمارے لئے حقیقت ہے۔ عورتوں اور مردوں کے روابط کس قسم کے ہوں اور کن بنیادوں پر قائم کئے جائیں۔ سوال پر صحیح انداز میں غور کرنے کے اس کے صحیح تاریخی مناظر میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔ اس لئے پچھلے سو سال میں اس سوال کے جتنے جواب دیئے گئے ہیں۔ ان پر ایک بار پھر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

(۱) انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں سرسید گروپ اور ماہنامہ عصمت کے اسلامی ترقی پسندوں کے نزدیک یہ ربط اچھی اچھی باتوں اور مصافحہ کا ہونا چاہیے جس کی بنیاد تہذیب اور شائستگی پر ہو۔

(۲) بیسویں صدی کی دو ڈھائی دہائیاں گزرنے کے بعد ماہنامہ نگار کے جمال پرستوں اور ماہنامہ رومان کے رومان پرستوں کے نزدیک یہ ربط شاعرانہ اور جمالیاتی محسوسات کا ہونا چاہیے جس کی بنیاد ذہنی مساوات اور جذباتی ہم آہنگی پر ہو۔

(۳) ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک کے نزدیک یہ ربط آزاد جنسی اختلاط کا ہونا چاہیے جس کی بنیاد عورتوں اور مردوں کی معاشی آزادی اور مساوات پر ہو۔

(۴) اور اب ۱۹۶۵ء میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۱۹۶۵ء کے جواب کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے)

ڈاکٹر وزیر آغا

اردو زبان کا پسِ منظر

ماہرینِ لسانیات نے متصرفہ زبانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے[1] ـــ سامی اور ہند یورپی! سامی گروہ میں ارامی، عبرانی، اور عربی شامل ہیں۔ اور ہند یورپی میں ٹیوٹانی، لاطینی، کیلٹک، یونانی، سلاوی، البانوی، ہند ایرانی اور آرمینی کو شمار کیا گیا ہے۔ مگر میکس مولر اور ریجات بیز وغیرہ نے زبانوں کے ایک تیسرے گروہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں منگولی، ترکی، فنی، کنڑی، تلیگو، تامل اور ملیالم وغیرہ شامل ہیں۔ گویا ان علماء کے خیال میں جنوبی ہند کی زبانیں سامی اور ہند یورپی زبانوں سے مختلف۔ اور "تورانی گروہ" سے متعلق ہیں۔

قدیم زمانے میں ہندوستان کے طول و عرض میں پروٹو آسٹرالائیڈ نسل کی ایک قوم آباد تھی۔ جو زبانوں کے اسی تیسرے گروہ سے منسلک تھی۔ گویا اس زمانے کے ہندوستان میں تورانی گروہ زبانیں رائج تھیں۔ اور چونکہ اس پروٹو آسٹرالائیڈ نسل کا تہذیبی ورثہ جنگل اور مذہب للارواح سے متعلق تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان زبانوں پر اس تہذیب کی چھاپ بھی ثبت ہوگی۔ پھر آریاؤں کی آمد سے کئی ہزار برس قبل بحرۂ روم کے علاقے کی ایک قوم نے ہندوستان پر یلغار کی اور پروٹو آسٹرالائیڈ قوم سے دست و گریباں ہوگئی۔ اس قوم کی زبان اس علاقے کی نسبت سے جہاں سے اس نے ہجرت کی، یقیناً سامی گروہ سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متعلق ہوگی۔ اس بات کے بارے میں ابھی وثوق کے ساتھ کچھ کہنا اس لئے ممکن نہیں کہ ان دونوں قوموں کے ربط باہم سے وادیٔ سندھ کی جس تہذیب نے جنم لیا، اس کی زبان کا رسم الخط ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ لیکن وادیٔ سندھ اور شنار کی تہذیبوں میں جو مماثلت دریافت ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنے والی قوم شنار کی تہذیب سے یقیناً متاثر تھی۔ ضرور ہے کہ اس کی زبان بھی سامی گروہ سے متعلق ہوگی۔

بہرحال اتنی سی بات بالکل واضح ہے کہ اس تصادم میں دیسی زبانوں نے عورت کا فریضہ سر انجام دیا اور آنے والی زبان نے مرد کا۔ چنانچہ ان دونوں کے ربط باہم سے ایک طرف تو وادیٔ سندھ کی تہذیب وجود میں آئی اور دوسری طرف وہ زبانیں پیدا ہوئیں جن کو جسم تو قدیم ہندوستانی قوم نے مہیا کیا تھا لیکن جن میں روح آنے والی خانہ بدوش قوم نے عطا کی۔

ایک ہزار پانچ سو قبل از مسیح کے لگ بھگ آریاؤں نے پہلی بار ہندوستان پر یلغار کی اور وادیٔ سندھ کی دراوڑی تہذیب سے متصادم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ آریاؤں کی زبان بھی دراوڑی زبانوں سے متصادم ہوئی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہیوم رنلے کا خیال ہے کہ آریائی قبائل

---

[1] اردو زبان کا ارتقاء ص ۵ از شوکت سبزواری

کی زبان تو صرف ایک تھی لیکن چونکہ وہ دو واضح لہجوں میں یہاں وارد ہوئے اس لئے لہجے کے فرق کی بنا پر اس زبان کے دو مختلف اسلوب منظرِ عام پر آئے۔ ان میں سے ایک ماگدھی اور دوسرا شورسینی تھا گویا آریاؤں کی زبان صرف ایک تھی۔ جسے ہند آریائی زبان کا نام دینا چاہئے (لسانیات کے بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ یہی ہند آریائی زبان ترقی کرنے کے بعد سنسکرت کہلائی، بعد ازاں صوتی تغیرات کے تحت اس زبان نے پراکرت یعنی پالی کا روپ دھارا اور پالی سے چار پراکرتیں — شورسینی، ماگدھی، مہاراشٹری اور اردھ ماگدھی نکلیں۔ یہ پراکرتیں روپ بدل کر اب بھرنشیں بن گئیں اور ان اب بھرنشوں سے بھارت اور پاکستان کی وہ تمام بول چال کی زبانیں پیدا ہوئیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔

ماہرِ لسانیات کا یہ خیال غالباً اس مفروضہ کی پیداوار ہے کہ یہ آریائی زبان ہی تھی جو سارے ہندوستان پر مسلط ہوگئی اور اسی نے بعد ازاں اسلوب بدل کر پراکرتوں اور بول چال کی دوسری زبانوں کی صورت اختیار کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب آریا ہندوستان میں آئے تو انہیں ایک اپنے سے بہتر اور ترقی یافتہ تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تھا — ایک ایسی تہذیب جس کے پاس نہ صرف اپنی زبانیں موجود تھیں بلکہ جس نے اپنی زبانوں کے لئے رسم الخط بھی ایجاد کر لیا تھا۔ دوسری طرف آریاؤں کے ہاں زبان کو لکھنے کا تصور تک موجود نہیں تھا۔ دراصل زبان کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ ایک ٹھہرے ہوئے تالاب کا منظر پیش کرتی ہے۔ پھر اچانک باہر سے کسی نئی زبان کا کنکر اس تالاب میں آگرتا ہے۔ یہ تالاب زمین سے وابستہ ہونے کے باعث مادری نظام کی ایک صورت تھا۔ باہر سے آنے والا کنکر تحرک کا علم بردار ہونے کی حیثیت سے پدری نظام کی علامت ہے۔ جب ٹھہرے ہوئے تالاب میں یہ کنکر گرتا ہے تو ایک لہر سی پیدا ہوتی ہے۔ جو دائرے کے روپ میں پھیلتی اور بتدریج تالاب کے کناروں تک چلی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر ایک ہی کنکر سے یکے بعد دیگرے کئی لہریں پیدا ہو کر کناروں کی طرف بڑھتی ہیں۔ مزید براں باہر سے آنے والی زبان ٹھہری ہوئی زبان سے متصادم ہو کر اپنی ہستی کو تو فنا کر دیتی ہے لیکن ٹھہری ہوئی زبان کو روح کا تحرک ضرور عطا کر دیتی ہے۔ یہ کہنا کہ نو وارد زبان دیسی بھاشاؤں کو ختم کر کے خود ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، حقائق کے بالکل برعکس بات ہے۔ خود تاریخِ تہذیب اس بات کی گواہ ہے کہ جب کبھی کوئی خانہ بدوش تہذیب کسی ایسے ملک میں وارد ہوئی جہاں پہلے سے ایک ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی تو نو وارد تہذیب ایک نہایت قلیل عرصہ میں اپنے چند سطحی اوصاف اس ارضی تہذیب کو عطا کرنے کے بعد خود ختم ہوگئی۔ دوسرے لفظوں میں نو وارد قبیلے کے افراد تو ٹھہرے ہوئے معاشرے میں جگہ جگہ نشٹ ہوگئے لیکن معاشرے کا جسم اسی طرح برقرار رہا۔ بالکل یہی حال باہر سے آنے والی زبان کا ہے کہ یہ اپنے الفاظ دیسی بھاشاؤں کو عطا کرنے کے بعد خود ختم ہو جاتی ہے اور یہ بھاشائیں پھلتی پھولتی چلی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ازمنۂ قدیم سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ بحرۂ روم کے علاقے کی قوم جس زبان کو اپنے ساتھ لائی وہ ہندوستانی زبانوں میں ضم ہوگئی۔ اس کے بعد آریا جس زبان کو اپنے ساتھ لائے اس نے بہت جلد دیسی بھاشاؤں سے ایک گہرا رابطہ استوار کر لیا۔ بلکہ حقیقت شاید یہ ہے۔ کہ آریاؤں نے کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی بھاشاؤں کو اس حد تک قبول کر لیا کہ خود ان کی باہر سے لائی ہوئی زبان ان بھاشاؤں میں ضم ہوگئی۔ یہ سلسلہ کئی سو برس تک جاری رہا ہوگا۔ تا آنکہ آریائی ذہن نے دراوڑی زبان اور تہذیب کے اس تسلط کے خلاف ایک شدید احتجاج کیا اور شعوری طور پر اپنی زبان کو بھاشاؤں کے چنگل سے آزاد کرنے اور اسے ازسرِ نو ایک منضبط صورت عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا نتیجہ سنسکرت کے روپ میں ظاہر ہوا۔ سنسکرت کا وجود ایک بڑی حد تک گرامر نویسوں کا مرہون تھا۔ چنانچہ پانینی سے قبل بہت سے گرامر نویس اس سلسلے میں زمین ہموار کر چکے تھے۔ پانینی نے سنسکرت کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے گرد بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ پھر کبھی باہر نہ آسکی۔ گویا سنسکرت کا رشتہ زمین سے منقطع ہوگیا۔ اور یہ عام بول چال کی زبان سے دور ہٹ گئی اور نیا خون نہ ملنے کے باعث آہستہ آہستہ ایک مردہ زبان میں تبدیل ہوگئی لیکن دراوڑی زبانوں کے تالاب میں جو کنکر آگرا تھا اس سے نہ صرف وہ زبان پیدا ہوئی جس میں سے سنسکرت کو کشید کیا گیا بلکہ وہ پراکرتیں بھی پیدا ہوئیں جو ادبی زبانوں میں ڈھل کر بتدریج اپنے مرکز سے دور ہٹتی اور مردہ زبانوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ یہ گویا مختلف لہریں تھیں جو آریائی زبان کے

تصادم سے پیدا ہوئیں. لیکن وہ مقام جہاں سے یہ لہریں پیدا ہوئیں زبان کی اب بھرنشں (یعنی بگڑی ہوئی) صورت تھی. بولی جانے والی زبان ہمیشہ کٹھالی میں ہوتی ہے اور ہر نیا قدم یا تجربہ اس کے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے اور اسے گویا اوپر کو اٹھاتا ہے. چنانچہ جب آریائی تحرک ختم ہوگیا تو مقامی بولیاں دوبارہ ایک ٹھہرے ہوئے تالاب میں تبدیل ہوگئیں پھر مسلمان آئے اور اپنے ساتھ فارسی زبان بھی لائے. جس کے تصادم سے دیسی بولیوں کے تالاب میں ایک بار پھر ایک کنکر آگرا اور وہ لہریں پیدا ہوئیں جو مختلف "ہند آریائی" زبانوں مثلاً اردو، پنجابی، برج بھاشا، بنگالی اور مرہٹی کی صورت میں ادبی طور پر پھلتی پھولتی چلی گئیں. یہ زبانیں آج بھی ارتقا کے مختلف مراحل سے گذر رہی ہیں.

ہندوستان کی پراکرتوں اور دیسی بھاشاؤں میں سنسکرت کے الفاظ کی موجودگی سے یہ خیال عام طور سے پیدا ہوا کہ سنسکرت نے اپنی یلغار میں تمام دیسی بھاشاؤں کو صفحۂ خاک سے مٹا دیا اور خود ان کے گھروں میں براجمان ہوگئی. یہ بات صرف اسی صورت میں سچ ہوسکتی ہے اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ آریاؤں نے ہندوستان کو دراوڑی نسل کے باشندوں سے بالکل پاک کردیا اور خود ہندوستان کے طول و عرض میں بس گئے. یہ بات حقیقت کے خلاف ہے بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ آریا، اور آریا سے قبل جو لوگ آئے اور پھر آریا کے بعد جو لوگ آئے ــ ہندوستان کے ارضی معاشرے میں ضم ہوتے چلے گئے. اور ان کا وجود ارضی تہذیب کو ایک ہنگامی تحرک عطا کرکے ختم ہوگیا. بالکل اسی طرح جب آریا ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتے اور بکھرتے چلے گئے تو ان کی زبان بھی دیسی بھاشاؤں کو الفاظ عطا کرکے ختم ہوگئی ہوگی. ہندوستان ایک وسیع خطۂ زمین ہے اور نیم بارانی خطے میں ہونے کے باعث یہاں افزائش، فراوانی اور تقسیم در تقسیم کا عمل بہت توانا رہا ہے جس طرح اس کے باشندے قدیم ایام سے ذاتوں، قبیلوں اور ٹولیوں میں منقسم ہیں بعینہٖ یہاں کی بولیاں بھی تعداد میں انگنت اور متنوع ہیں. فی الواقعہ اس برصغیر میں قدرتی حدبندیوں کی عدم موجودگی کے باعث ہر سنگ میل ایک ایسا مقام ہے جس پر چاروں اطراف کے اثرات مرتسم ہوئے ہیں. چنانچہ یہاں ہر سنگ میل پچھلے سفر کی منزل اور اگلے سفر کا مقام آغاز ہے. زبانوں کے ضمن میں اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں ہر بولی اپنے چاروں اطراف کی بولیوں سے متاثر ہے. اسی تاثیر و تاثر کے باعث زبانوں کی بوقلمونی اور تنوع وجود میں آیا ہے. آریا خانہ بدوش تھے اور ایک ایسی زبان بولتے تھے جو ایک بڑی حد تک یکساں اور غیر مخلوط تھی. لیکن جیسے جیسے وہ ہندوستان میں پھیلتے اور زمین پر آباد ہوتے چلے گئے تو ان کی زبان ہر دیسی بولی سے ٹکراتی اور اسے اپنے الفاظ عطا کرتی چلی گئی. بعض دور دراز مقامات محض اس لئے سنسکرت کے الفاظ سے بڑی دیر تک محفوظ رہے کہ خود آریا بہت دیر کے بعد ان علاقوں میں وارد ہوئے. بہرحال یہ طے ہے کہ ہندوستان میں بولی جانے والی دیسی بھاشائیں سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورتیں نہیں تھیں. بلکہ یہ وہ زبانیں تھیں جو آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی یہاں بولی جاتی تھیں. آریاؤں کی زبان جب باری باری ان بولیوں سے ٹکرائی تو وہ اپ بھرنشں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں. یعنی کٹھالی میں آگئیں اور ان کے اندر وہ تحرک اور تموج پیدا ہوا جو بعد ازاں ادبی زبانوں کو وجود میں لانے کا باعث ثابت ہوا.

دیسی بھاشاؤں کے مقابلے میں آریاؤں کی زبان کی کم مائیگی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ یہ زبان ایک طویل عرصہ تک محض بولی جاتی رہی، حروف میں نہ ڈھل سکی. چنانچہ رگ وید میں لکھنے کے عمل کے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا. اور ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ ویدوں کو نو سو یا ایک ہزار قبل از مسیح کے لگ بھگ لپی کے سپرد کیا گیا ہوگا. تاریخی لحاظ سے ہمیں ہندوستانی لپی کا پہلا نمونہ اشوک کے کتبوں میں ملتا ہے. یہ لپی دو طرح کی ہے. براہمی اور کھروشتی. لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ بعد کی تمام ہندوستانی لپیاں براہمی لپی ہی سے ماخوذ ہیں. لیکن دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب میں بھی ایک لپی موجود تھی اور قیاس غالب ہے کہ یہی لپی لفظوں اور آوازوں کو محفوظ کرنے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض میں عام طور سے رائج ہوگی. بعض علما کا خیال ہے کہ براہمی لپی دراصل وادیٔ سندھ کی لپی سے ماخوذ ہے. ممکن ہے کہ ہندوستان کی منڈلیوں میں جو لنڈا لپی رائج ہے وہ بھی وادیٔ سندھ کی اس لپی سے متعلق ہو. یوں بھی لنڈا اور سندھ میں بڑی صوتی مناسبت ہے. اور سندھ نہ صرف وادیٔ سندھ کی ایک بولی کا نام ہے بلکہ اس کا لغوی مفہوم بھی مغرب ہے جو اس برصغیر کے مغربی علاقے یعنی وادیٔ سندھ کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے. جس طرح جسم، روح کو اپنے برتن میں جکڑ کر رکھتا ہے. لپی زبان کی ہر کروٹ اور آواز کو گویا محفوظ کرلیتی ہے. خود آریا متحرک اور خانہ بدوش

تھے۔ اس لئے ان کی زبان بھی جسم کے جادو سے ناآشنا تھی۔ دوسری طرف ہندوستان جس پر وہ حملہ آور ہوئے ارضی تہذیب کا گہوارہ ہونے کے باعث ایک جسم کی طرح بوجھل اور ٹھہرا ہوا تھا اور یہاں لپی یعنی زبان کا جسم پہلے ہی سے ترقی یافتہ اور مضبوط تھا۔ آریاؤں کی زبان جب اس لپی میں منتقل ہوئی تو گویا اسے ایک جسم مل گیا جس میں اس کی بے قراری اور تموج کو آسودگی حاصل ہوگئی (یہ عورت اور مرد کے جنسی اتصال کی ایک صورت تھی) یوں دیکھیں تو وہ مفروضہ باطل ہو جائے گا جو سنسکرت کو تمام دیسی بھاشاؤں کی ماں قرار دیتا ہے۔

یہاں شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ برہمی لپی کی جہت تو بائیں سے دائیں جانب کو ہے جب کہ وادیٔ سندھ کی لپی دائیں سے بائیں جانب کو لکھی گئی ہے۔ اس لئے برہمی لپی کو خالص ہندوستانی تخلیق قرار دینا کہاں تک جائز ہے؟ اس سلسلے میں باشم کا خیال ہے کہ برہمی لپی بھی اپنی اولین صورت میں دائیں سے بائیں طرف کو ہی لکھی جاتی تھی۔ اور اس کے ثبوت میں اس نے اشوک کے بعض کتبوں اور مدھیہ پردیش سے نکالے گئے بعض سکوں کا حوالہ دے کر ایک نہایت اہم ثبوت مہیا کر دیا ہے[1]۔ برہمی لپی کی بعض دوسری خصوصیات بھی ہندوستانی مزاج کی عکاس ہیں۔ مثلاً یہ کہ وقت کی گزران کے ساتھ ساتھ اس لپی میں مینا کاری کا عمل تقویت حاصل کرتا رہا اور مینا کاری کا عمل براہ راست جنگل اور مندر سے متعلق ہے۔ مینا کاری کا یہ عمل اس قدر بڑھ گیا کہ لفظوں کی پوری سطر کے اوپر نشانات کو ملا کر ایک لمبی سی لکیر کھینچ دی گئی۔ دیوناگری لپی جو برہمی لپی سے ماخوذ ہے۔ اس لمبی لکیر سے چمٹنے کے عمل ہی کو پیش کرتی ہے۔ یہاں یہ بات شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ دیوناگری لپی کو ایک نظر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک لمبی شاخ سے درجنوں بندر لٹکے ہوئے ہیں۔ چونکہ لپی اور لپی کے علاوہ آوازیں اور دوسرے تہذیبی عناصر براہ راست ماحول سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ اس لئے دیوناگری لپی کی یہ صورت بھی ہندوستانی جنگل کی ایک تصویر ہی معلوم ہوتی ہے ۔ ایک ایسی تصویر جس میں حرکت کی بجائے چمٹنے اور لپٹنے کا عمل زیادہ واضح ہے۔ دوسری طرف بعض بدیسی لپیوں میں لکیر سے اوپر اور نیچے جانے کا عمل نمایاں ہے جو ایک اندرونی تموج اور تحرک کی نشاندہی کرتا ہے۔

اشوک کے کتبوں کا دوسرا رسم الخط کھروشٹی ہے۔ یہ آرامی رسم الخط سے ماخوذ ہے اور آرامی رسم الخط نہ صرف افریشیا کی قدیم ارضی تہذیب کی پیداوار ہے بلکہ اس کی جہت بھی دائیں سے بائیں جانب کو ہے۔ دراصل آریاؤں کی آمد سے قبل سارا افریشیا ارضی تہذیب ہی کا گہوارہ تھا بلکہ بعض مماثلتوں کے باعث اسے ایک ہی عظیم الشان تہذیب کا نام دینے میں بھی قطعاً کوئی حرج نہیں۔ اس ارضی تہذیب میں جہاں فرد زمین سے وابستہ تھا وہاں تبادلے کا رسم الخط سے منسلک ہو چکی تھی۔ گویا اسے جسم حاصل ہو گیا تھا۔ کھروشٹی یا برہمی یا موہنجو داڑو کی لپی اسی ارضی تہذیب کی پیداوار ہیں اور چونکہ ایک ٹھہرے ہوئے معاشرے سے متعلق ہیں اس لئے ان کا مزاج اور جہت بھی زمین ہی سے متعلق ہے۔ ان تمام لپیوں کی یہ مشترکہ بات کہ یہ دائیں سے بائیں طرف کو لکھی جاتی تھیں، اس ارضی تہذیب کے مزاج ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ آریاؤں کے آنے کے بعد بائیں سے دائیں طرف کی حرکت نمودار ہوئی جس نے ان میں سے بعض لپیوں کی جہت کو بھی بدل ڈالا۔ واضح رہے کہ مارچ کرتی ہوئی فوج لیفٹ رائٹ کے عمل میں مبتلا ہوتی ہے نہ کہ رائٹ لیفٹ کے عمل میں۔ یقیناً حرکت کا بائیں پاؤں سے کوئی گہرا تعلق ہے جس پر ماہرین کو مزید روشنی ڈالنی چاہیئے، تاہم دائیں سے بائیں جانب کی حرکت ہی اس دھرتی کی اولین جہت ہے۔ یوں دیکھیں تو اردو رسم الخط ہندوستان بلکہ افریشیا کی قدیم تہذیب کے مزاج سے نسبتاً زیادہ ہم آہنگ ہے۔

ہر چند رگ وید کی زبان اور ایران کی قدیم زبان اوستا میں مماثلت موجود ہے تاہم اس بات سے انکار مشکل ہے کہ مقدم الذکر کے مزاج میں ایسی تبدیلیاں یقیناً پیدا ہو چکی تھیں جو اسے موخر الذکر کے مزاج سے متمیز کرتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اوستا اور وید قدیم آریاؤں کی ایک ہی مشترکہ زبان کے دو روپ تھے تو پھر وید میں بعض بنیادی تبدیلیاں کس طرح نمودار ہوئیں؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ اوستا ایران تک محدود رہی اور اگر اس نے کچھ بیرونی اثرات قبول کئے تو وہ ایران کی دھرتی سے کئے ہوں گے لیکن ویدک دیسی بھاشاؤں سے ٹکرائی اور اس لئے اس پر بہت سی ایسی آوازیں

---

1 Basham: The wonder that was India., P. 396

اور دوسرے عناصر مسلط ہو گئے جو ہندوستان سے باہر آریاؤں کی زبان میں موجود ہی نہیں تھے۔ تمام ہندوستانی بولیوں (جن میں اردو کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے) کے لئے اگر "بھاشا" کا لفظ قابل قبول ہو تو پھر بھاشا کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں جو ویدک میں در آئیں۔ لیکن جو اوستا اور اوستا کے بعد پہلوی اور فارسی میں ناپید ہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ویدک میں تشدید موجود ہے جب کہ ایران کی زبانیں اس سے ناآشنا ہیں۔ زبان اپنی آوازیں ماحول سے اخذ کرتی ہے اور اس پر زمین کے اثرات پوری طرح مرتسم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پشتو میں جو گڑگڑاہٹ ہے اس کا تعلق واضح طور پر پہاڑ پر سے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سے قائم ہے۔ اس طرح بھاشا میں جو تشدید ہے اس کا بوجھل پن نرم زمین پر بھاری قدموں سے چلنے اور اس میں نصب ہو جانے کی صورت کو پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کی ماضی بعید میں نیم بارانی تہذیب کا بھاشا پر یہ اثر ایک بالکل قدرتی بات ہے چنانچہ بھاشا میں ٹھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ اور ایسی آوازیں اور حروف موجود ہیں جو اوستا اور فارسی میں موجود نہیں اور جو زبان کے زمین میں نصب ہونے کے عمل ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ فی الواقعہ فارسی یا اوستا میں تو حروف ٹ، ڈ، ڑ موجود ہی نہیں۔ جب کہ بھاشا کا یہ امتیازی نشان ہے اور بھاشا ہی کے ذریعہ ویدک پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ اسی طرح بھاشا میں غنّی نون زیادہ موجود ہے جب کہ اوستا اور فارسی میں اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔

ہندوستان کی اصل تہذیب میں زرخیزی کا تصور بہت نمایاں تھا اور یہ نیم بارانی خطے اور زراعت سے معاشرے کی وابستگی کا ایک نتیجہ تھا چنانچہ نہ صرف یہ کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب میں لنگ اور یونی کی پرستش کا چلن عام تھا بلکہ بعد ازاں بھی ہندوستانی آرٹ، فلسفے اور مذہب میں نر اور مادہ کو ساتھ ساتھ پیش کرنے کا رجحان ابھر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندوستان کے ہر شعبۂ علم میں جوڑے نظر آتے ہیں۔ اور "جمع" کا وہ تصور بھی نمایاں ہے جو ہندوستان میں اشیا کی فراوانی پر پر دال ہے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کے سلسلے ہی میں نہیں۔ بلکہ موسیقی ایسے فن میں بھی زرخیزی اور فراوانی کا یہ تصور موجود ہے۔ زبان پر اس کے اثرات یوں مرتسم ہوئے ہیں کہ بھاشا میں جمع کے صیغہ کو بطور خاص اہمیت ملی ہے۔ جیسے ع اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں۔ یہ بات اوستا یا فارسی میں موجود نہیں۔ پھر بھاشا میں جنس کی تخصیص بہت واضح ہے اور مذکر اور مؤنث کی نشان دہی کا رجحان جاندار چیزوں کے علاوہ بے جان چیزوں کے سلسلے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً گھوڑا اور مرد کے علاوہ مکان اور پتھر بھی مذکر ہیں اور عورت اور کونج کے علاوہ کرسی اور بیٹھک بھی مؤنث کے زمرے میں شامل ہیں پھر عام گفتگو میں بھی میں اور تو کی جنسی لحاظ سے تخصیص عام ہے جیسے میں جاتا ہوں، "میں جاتی ہوں" "وہ آتا ہے" "وہ آتی ہے"۔ یہ بات اوستا وغیرہ میں موجود نہیں۔ جوڑے بنانے یا دوسرے لفظوں میں نر اور مادہ کے وجود کو بطور خاص نمایاں کرنے کا رجحان بھاشا کی گرامر کا بھی ایک امتیازی نشان ہے۔ چنانچہ بھاشا میں حروف علت مختصر اور طویل ہیں اور ان میں کوئی بغیر جوڑے کے نہیں ہے۔ حروف صحیحہ کے سلسلے میں بھاپران (کھا، گھا) اور الپ پران (کا، گا) یہ سب بھی جوڑے ہیں۔ بہرحال زرخیزی، فراوانی اور جنس کی تخصیص کے رجحان نے ہندوستانی "بھاشا" کو بھی متاثر کیا اور اسے ایک ایسا مزاج ودیعت کیا جو ہندوستان سے باہر بولی جانے والی زبانوں میں موجود نہیں تھا۔ اگر یہ رجحان ہندوستان کی نام نہاد آریائی زبان "ویدک" میں موجود ہے تو یہ یقیناً بھاشا ہی کے طفیل ہے اور اسی زاویے سے اس سارے مسئلہ پر از سر نو تحقیقات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بھاشا کی چند اور خصوصیات بھی ہیں جو اوستا وغیرہ میں موجود نہیں مثلاً اوستا اور پھر فارسی میں PRE—POSITION رائج ہے۔ جیسے (در خانہ) جب کہ بھاشا اور اس کے طفیل اردو اور ہندی وغیرہ میں POST—POSITION جیسے (گھر میں) رائج ہے اور یہ ایک نہایت اہم فرق ہے۔ اس کے علاوہ بھاشا میں علامت فاعلی (نے) کا چلن عام ہے اور اگرچہ ویدک میں اس کی ایک ابتدائی صورت ملتی ہے۔ تاہم ہندوستان سے باہر علامت فاعلی کا تصور ناپید ہے۔ دوسری طرف فارسی وغیرہ

میں د۔ ی۔ ہ کی آوازیں عام ہیں[1] جب کہ بھاشا ان آوازوں سے ناآشنا ہے۔ اور اگر آج بھاشا میں یہ آوازیں موجود ہیں تو اس کا سبب محض یہ ہے کہ ویدک اور بھاشا کے تصادم میں جہاں ویدک نے اپنی بہت سی خصوصیات ترک کر کے بھاشا کے اوصاف کو اپنا لیا وہاں بھاشا پر ایک آدھ اپنا بنیادی اثر بھی مرتسم کیا۔ د۔ ہ۔ ی کی آوازوں کی آمیزش اس اثر ہی کی ایک صورت تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی ویدک نے بھاشا کو زیادہ تر الفاظ ہی عطا کئے۔ اس کے بنیادی مزاج اور ڈھانچے کو بہت کم چھیڑا[2]۔ چنانچہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی سب سے اہم بھاشا یعنی اردو میں اگرچہ فارسی الفاظ کی فراوانی ہے تاہم اس کا ڈھانچہ خالصتاً دیسی ہے۔ زبان جب تک اپنی زمین سے وابستہ رہتی ہے، اس کی حالت ایک عورت کی سی ہوتی ہے۔ اور اس لئے مرد سے وصال کے بعد بھی یہ اپنی ہستی کو برقرار رکھتی ہے۔ بلکہ فطرت کے اصول کے مطابق تو جنسی اتصال کے فوراً بعد نر مر جاتا ہے اور مادہ تخلیق کے عمل کو مکمل کرنے کے لئے زندہ رہتی ہے۔ زبان کے اس فطری مزاج کو ملحوظ رکھ کر سوچیں تو ویدک اور بھاشا کا رشتہ واضح اور عیاں نظر آئے گا۔ اور وہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی جو ایک غلط مفروضے کی پیداوار ہیں۔

اور اب کچھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں!

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں متعدد نظریئے پیش کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے برج بھاشا کو اردو کی ماں قرار دیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، کچھ لوگ دکن کو اس کی جنم بھومی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اسے مہاراشٹری سے اور شوکت سبزواری نے پالی سے ملایا ہے۔ اور فارغ بخاری صاحب نے صوبہ سرحد کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ غور کریں تو ان میں سے ہر نظریئے میں سچائی کا عنصر موجود ہے۔ واقعتاً اردو ان تمام علاقوں سے یکساں طور پر متعلق ہے۔ لیکن اسے کسی ایک علاقے سے منسوب کرنا شاید درست نہیں۔ فی الواقعہ ہر محقق نے اردو زبان سے محبت نیز ایک خاص علاقے سے اپنی جذباتی وابستگی کے باعث اسے اس علاقے کی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش بالکل فطری اور قابل تعریف ہے۔ تاہم اس سے وہ سارا وسیع پس منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں اردو زبان نے جنم لیا۔

دراصل اردو زبان کے آغاز کی کہانی وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کا علاقہ شمال کی پہاڑیوں سے گجرات کاٹھیاواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں پنجاب دہلی کا علاقہ، سندھ، راجپوتانہ اور بلوچستان شامل تھے۔ یہ سارا وسیع و عریض خطہ جس کے ایک بہت بڑے حصے کو سندھ اور اس کے معاونین سیراب کرتے ہیں ایک منضبط اور منظم تہذیب کا گہوارہ تھا اور اسی تہذیب نے زبان کے سلسلے میں اس قدر ترقی کر لی تھی کہ اسے رسم الخط بھی مہیا کر دیا تھا۔ جب ایک ہزار پانچ سو قبل از مسیح کے لگ بھگ آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو موسمی اثرات کے تحت وادیٔ سندھ کے باشندے جسمانی طور پر کمزور ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ آریاؤں کی یلغار کا سامنا نہ کر سکے۔ آریاؤں نے وادیٔ سندھ کے قلعوں (پوروں) کو یکے بعد دیگرے تہہ و بالا اور ان کے باشندوں کو قتل کیا (مہنجو داڑو کا آخری قتل اس کا ثبوت ہے) لیکن ظاہر ہے کہ آریاؤں کے لئے وادیٔ سندھ کے تمام باشندوں کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان کا ایک بہت بڑا حصہ داس، پانٹری اور بعد ازاں شودر کے نام سے آریاؤں کے ساتھ منسلک رہا۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے آریاؤں کے تابع رہنے کی بجائے ہجرت کرنا مناسب سمجھا۔ ہر بیرونی حملے کی صورت میں

---

[1] ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس سلسلے میں نہایت قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا مضمون "اردو کی زبان" نقوش سالنامہ ۱۹۶۲ء اور "اردو میں د، ی، ہ اور ہ کی حقیقت" "نقوش" نومبر ۱۹۶۱ء۔

[2] ایف۔ ڈبلیو تھامس نے دراوڑی زبانوں پر سنسکرت کے اثرات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ دراوڑی زبانوں کا بنیادی ڈھانچہ سنسکرت کے اثرات سے بالکل محفوظ رہا۔ THE LEGACY OF INDIA P:40

ایسے ہی ہوتا ہے۔ اور ملک کے نسبتاً غیور لوگ یا تو دشمن سے لڑ بھڑ کر مر جاتے ہیں اور یا وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ جب آریاؤں نے وادیٔ سندھ کو تاراج کیا تو ظاہر ہے یہاں کے کچھ باشندے نقل مکانی کر گئے ہوں گے۔ سندھ اور پنجاب کے نقشے کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب سے آریاؤں کے حملے کے وقت یہاں کے باشندوں کے لئے جنوب کی طرف آ جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ اس لئے کہ اس زمانے میں ابھی گنگا اور جمنا کا میدان گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جب کہ جنوبی ہند قریب اور محفوظ ہونے کے علاوہ نسبتاً صاف بھی تھا۔ چنانچہ قیاس غالب ہے کہ وادیٔ سندھ کے کچھ باشندوں نے دکن کی طرف ہجرت کی اور یوں ایک طویل عرصہ تک آریاؤں کی یلغار سے محفوظ رہے۔ دکنی زبان میں پنجابی زبان کے الفاظ کی فراوانی اس ہجرت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ ان الفاظ کے سلسلے میں عام خیال یہ ہے کہ علاؤالدین کی فتح دکن اور محمد تغلق کے دکن میں دارالخلافہ منتقل کرنے کے اقدامات نے بہت سے ایسے لوگوں کو دکن پہنچا دیا جن کی زبان میں پنجابی کے الفاظ موجود تھے۔ اور یوں یہ الفاظ دکنی میں داخل ہو گئے بے شک یوں بھی ایک حد تک پنجابی الفاظ کا دکنی میں داخل ہونا ممکن ہے۔ لیکن دکنی اور پنجابی کی مماثلت اس نوعیت کی ہے کہ اسے محض ایک حملے یا دارالخلافہ کی تبدیلی کے ہنگامی واقعہ کا رہین منت قرار دینا تاریخ تہذیب کے وسیع تر پس منظر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ فی الواقع دکنی میں پنجابی الفاظ کی موجودگی اس وجہ سے ہے کہ یہاں کے لوگ قدیم زمانے میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔

آریاؤں کی یلغار نے وادیٔ سندھ کی زبان کو اپ بھرنش یعنی بگڑی ہوئی صورت میں تبدیل کر دیا جب دو تہذیبیں یا دو زبانیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو بولنے کی زبان کٹھالی میں آ جاتی ہے تاہم اس میں غالب رنگ زمین سے وابستہ زبان ہی کا ہوتا ہے۔ آریاؤں کو (جو فاتح تھے) یہ صورت حال منظور نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے ویدک کو پوتر کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں سنسکرت نے جنم لیا۔ لیکن سنسکرت کا رشتہ زمین سے قائم نہ رہ سکا۔ ہرش کی حکومت کے خاتمے کے لگ بھگ آریائی تسلط میں انحطاط کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور وہ تحرک قریب قریب ختم ہو گیا تھا جسے آریاؤں کا امتیازی وصف قرار دینا چاہیئے۔ چنانچہ شمال میں مسلمانوں کی آمد سے قبل (اور یہ گیارھویں صدی کا واقعہ ہے) وادیٔ سندھ کے علاقے میں زبان کا ابال ختم ہو چکا تھا اور بولنے کی زبان ایک بار پھر ارضی سطح پر آ گئی تھی۔ اس سارے علاقے کو شورسینی پراکرت کا علاقہ بھی کہا گیا ہے۔ تاہم اگر یوں سوچا جائے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اس سارے وسیع و عریض علاقے میں بولنے کی ایک ایسی زبان رائج تھی جو اگرچہ لہجے کی تبدیلیوں کے باعث کئی ایک رنگوں میں ڈھل چکی تھی۔ تاہم جس کا بنیادی ڈھانچہ ایک ہی تھا۔ تو تصویر کے نقوش نسبتاً واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے اس زبان کو "ہندی" کا نام دیا۔ بعد ازاں ماہرین لسانیات نے علاقائی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے پنجابی، سندھی، ہریانی، برج بھاشا، دکنی اور دوسری بولیوں میں تقسیم کیا لسانی نقطۂ نظر سے اس کام کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ تاہم تہذیب اور ثقافت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان لسانی اختلافات کے باوجود ہمیں اس تمام علاقے کی ایک ایسی مشترکہ بولنے کی زبان بھی نظر آئے گی جو اس زمانے میں مسلمانوں کو دکھائی دی تھی اور جسے انہوں نے "ہندی" کا نام دیا تھا۔ جب اس "ہندی" سے مسلمانوں کی اپنی زبان فارسی متصادم ہوئی تو اس کے نتیجے میں زبان کی جو تیسری صورت وجود میں آئی وہ ریختہ یا اردو تھی۔ چنانچہ اردو کو جسمانی ڈھانچہ تو ہندی نے عطا کیا لیکن اس میں ابال اور تحرک فارسی کی وساطت سے آیا۔

شمیم احمد

ادیبوں کا مسئلہ

(۲)

عالم اپنے کلمۂ حق میں پہچانا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن دنیا کے تمام بڑے انقلابات اور ادوار کی تاریخ حق و صداقت کے اظہار سے پیدا ہوئی ہے اور صرف اظہار ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیدائش میں اُن قربانیوں اور شدید ترین صعوبات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جو مختلف ادوار میں پیغمبر، فلسفی، علماء، مورّخ اور مفکرین برداشت کرتے رہے ہیں۔ سقراطؑ، عیسیٰؑ، بدھ، اور حسینؓ کے چند نام اس بات کی گواہی کے لئے کافی ہیں۔ یہ سب اسی کسوٹی پر پرکھے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس سلسلہ کی گزشتہ قسط میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ آج ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھ بیچارے ادیبوں کے کمزور شانوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ جو اس اعزاز پر پھولا بھی نہیں سماتا اور دل ہی دل میں شرماتا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ حق کا اعلان تو بڑی چیز ہے۔ آج کے اردو ادیب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بن گیا ہے کہ وہ عوام اور پاکستان کے دس کروڑ باشندوں سے کٹ چکا ہے — اس کے لئے وہ سخت پریشان ہے کہ پھر سے یہ رشتے کیسے استوار کرے۔ یقیناً اس حقیقت کا جواز اور اس کے حل کے بہت سے موثر نسخے ہمارے "دانشوروں" کی جیب میں رکھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن مجھے جس سوال کے جواب کی تلاش ہے وہ یہ ہے کہ آج پیغمبروں اور فلسفیوں کے ان جانشینوں کے پاس کیا وہ کسوٹی موجود ہے جس کے لئے یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ کلمۂ حق کے اظہار میں پہچانا جاتا ہے — شاید میں یہ بات کہہ کر ان غریبوں کے ساتھ کوئی بڑی زیادتی کر رہا ہوں۔ کیونکہ اب یہ کسوٹی بدل چکی ہے۔ اور نیا معیار یہ مقرر ہوا ہے کہ وہ کون سا "دانشور" ہے جس کے پاس کار ہے۔ کوٹھی ہے بینک بیلنس ہے۔ اعلیٰ تنخواہ اور عہدہ ہے یا کم از کم اس کا رسوخ حکومت کی سب سے اونچی کرسیوں تک کتنا ہے — رہے مجھ جیسے بے نوا اور نااہل ادیب سو وہ ان حضرات کو اس لئے گالیاں دینے کے مشغلوں میں مصروف ہیں کہ ان کی جگہ لینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ چلئے معاملہ ختم ہوا۔ مگر اس بات کا کیا کیا جائے کہ ایک سوال اور ایک کسک ہم سب میں مشترک ہے کہ ہمارا رشتہ عوام سے کٹ چکا ہے — اب صرف اتنا پوچھنا رہ جاتا ہے کہ قصور کس کا ہے۔ عوام کا یا ادیبوں کا؟

اگر میری بے حیائی مجھے سہارا دے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سارا قصور عوام کا ہے۔ جو ہماری تحریروں کو نہیں پڑھتے۔ وہ تحریریں جو ہم اپنے خونِ جگر سے رات دن معاش کی چکی میں پستے ہوئے بھی اُن کے لئے لکھتے ہیں۔ غربت و افلاس کی مسلسل یورشوں میں بھی ہمارا قلم نہیں رکتا۔ لیکن یہ ہمارے عوام ہی ہیں جو اس سے بے اعتنا گزر جاتے ہیں۔ آج تک ہمارے لکھنے والے اپنے فن کو پیشہ بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس پیشے سے دو وقت کی روٹی بھی چلنی مشکل ہے۔ ہم اپنے ضمیر اپنے مزاج کے خلاف بھی معاش کی مشکلات میں گرفتار تخلیق سے باز

نہیں آتے — یہ قربانی ہے اور مسلسل قربانی — پھر ہم سے یہ شکوہ کہ ہم بہتر ادب تخلیق نہیں کر پاتے اس پر طرہ ہے — اگر ہم بھی ہیمنگوے کی طرح ایک ناول میں اتنا کما لیا کرتے کہ پھر اگلے ناول پر کام کرنے کے لئے سوائے سیر و سفر کے اور کچھ نہ کرنا پڑتا — تو یقیناً یہ شکوہ بجا تھا — مگر اردو ادب صرف قاری کے قحط کا نشانہ بن کر رہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیم پھیلنے سے ادب کی مانگ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کا اوسط پچھلے پندرہ سال میں برابر بڑھ رہا ہے۔ مگر ادب کا قاری اسی اوسط سے گھٹ رہا ہے — اسی پڑھے لکھے طبقے میں سے ہماری تحریروں پر عموماً یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اردو کی تیسرے درجہ کی تحریروں کو (جو یورپ کی کتابوں سے ماری ہوئی ہوتی ہیں) پڑھنے کے بجائے براہ راست یورپ کی تحریریں کیوں نہ پڑھ لیں گے — ایسی صورت میں کیا پاکستان کے ادیبوں کی قسمت میں سوائے افلاس اور گمنامی کے اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ یہ ہے ان تمام خیالات کا لب لباب جو ادیبوں کی طرف سے پیش کئے جاتے رہے ہیں اور یقیناً یہ ایک سنگین حقیقت بھی ہے لیکن ان تمام شکایات کو اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس میں صرف ایک احساس مشترک ہے کہ ہمارا رشتہ پڑھنے والوں سے کٹ چکا ہے — اور مجھے پھر اس بات کو دہرانا ہے کہ قصور کس کا ہے؟ کیا سرسید اور حالی کے دور میں تعلیم زیادہ تھی؟ یا قاری زیادہ سمجھدار تھا؟ پھر ان کو ملک اور قوم کے دماغ اور زبان بننے کی توفیق کیسے عطا ہوئی؟؟ یا ۱۹۳۶ء کی نسل کوئی جادوگری یا نٹ کا تماشہ دکھاتی تھی کہ معاشرہ پر اس کا اثر و نفوذ گہرا ہو گیا تھا — مجھے صرف اس سوال کا جواب چاہئے کہ انہیں یہ شکایت کیوں نہ ہو سکی کہ ان کو قاری نہیں ملتا۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہ کہہ سکوں کہ ہم سب نے عوام سے غداری کی ہے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ ہم ضمیر فروشی، خود غرضی اور مفاد پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہم نے حق کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس لئے کہ ہم نے خود کو عوام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کے بجائے ان سے فاصلے پیدا کئے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سترہ سال سے مسلسل خود کو عوام کی خواہشات، آرزوؤں اور امنگوں سے بیگانہ رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ہم نے اس مزاج اور ان تمناؤں کو نظر انداز کرنے کی ایک مہلک غلطی بھی کی ہے جو پاکستانی عوام کو ایک قوم میں ڈھالتے ہیں ہم نے اس قوم کی بنیادی خواہشات اور آرزوؤں کو ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا نام دے کر خود کو ان سے افضل اور ارفع سمجھنا شروع کر دیا اور ان تمام مسائل سے آنکھیں بند کر لیں جن سے اس ملک کے دس کروڑ عوام شب و روز نبرد آزما ہیں اس بیگانگی اور شرمناک غفلت سے ہم نے اپنے عوام اور فرد کے درمیان جو فاصلے پیدا کر لئے ہیں وہ کم و بیش وہی ہیں جو عہد غلامی میں حاکم و محکوم کے درمیان پائے جاتے تھے اس کے ساتھ ہی مجموعی طور پر ہم نے اپنی قوم کے تمام قومی تصورات اور ان آئیڈیلز کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا جن سے وہ ایک نئے ملک و قوم کی صورت میں پہچانے گئے تھے۔ ہم نے اپنے معاشرہ میں مغرب کی سطحی نقالی اور اس کے زوال آمادہ معاشرہ کی ناپاک خواہشات عام کیں اور پوری قوم کو نچلے درجے کے نفسیات کے تصورات میں مبتلا کرنے میں ہر امکانی مدد کی اور اس طرح سواد اعظم کی شاہراہ اس آئیڈیلسٹ سے بیگانہ بنانے کی کوشش کی جو آج بھی اس کی فطری خواہش اور مزاج ہے یہ وہ قوم ہے جس نے سترہ سال پہلے اپنی اس مجموعی قوت کے ذریعہ چند ناممکن تصورات کو ممکن بنا کے دم لیا تھا — اب مجھے آپ سے پھر یہ سوال کرنا ہے کہ قصور کس کا ہے۔ آپ کو عوام سے وہ شکایت کرنے کا حق کیسے پہونچتا ہے جس کے لئے آپ نے خود کو اہل ثابت نہیں کیا ہے — ہم میں سے خاصے ایسے بھی ہیں جنہوں نے عوام کی خواہشات کے مطابق کسی تبدیلی کو خوش آئند قرار دیا تھا لیکن آج وہ اپنے اس فعل پر شرمندہ ہیں اگر وہ تبدیلی ایک فریب تھی تو ان پر اخلاقی فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کر لیتے اگر یہ ہمت بھی نہیں ہے تو پھر یہ شکایت ایک سرے سے غلط اور فضول ہے کہ اردو ادب کو قاری نہیں ملتے —

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم تمام لکھنے والوں نے اپنے فرائض اور ضمیر کی آواز سے روگردانی کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم آج اپنے ہی معاشرہ میں ایک اجنبی اور اچھوت بن کر رہ گئے ہیں ان خواہشات کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اگر تجزیہ کیا جائے تو ہماری زندگیوں کا محدود مقصد صرف شہرت رہ جاتا ہے۔ خیال رہے۔ اصول نہیں — صرف شہرت۔ نئے ادیب شہرت حاصل کرنے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور پرانے

ادیب شہرت برقرار رکھنے کی تنگ و دو میں مبتلا ہیں۔ مگر یہ شہرت کہاں ہو رہی ہے۔ اس کا جواب ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ شہرت کی خواہش کوئی نئی اور بری چیز نہیں ہے۔ ازل سے فنکار اپنے فن کی صرف ایک قیمت وصول کرتا آیا ہے۔ شہرت۔ جلد یا بدیر۔ زندگی میں یا موت کے بعد۔ لیکن وہ شہرت چند اصولوں، چند معیار اور چند سچائیوں پر قائم ہوتی تھیں اس شہرت کے معنی صرف نام کی اشاعت ہی نہیں تھی۔ بلکہ کام کو دائمی حیثیت دینے کی ایک خواہش تھی اور یہی وہ معیار تھا جس سے ہر معاشرہ کا ہر طبقہ اپنا اور اپنے دور کے درمیان ایک رابطہ پیدا کرتا تھا۔ آج ہم میں سے بہت سے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ میرؔ صاحب نے نواب وقت سے سر بازار یہ کہکر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ "بازاری بات کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں" مگر اس کی داد کسی نے نہیں دی کہ نواب وقت کا ہاتھی روک کے ایک شاعر سے یہ سن لینا کس مرتبہ کی بات تھی۔ یہ بات شاید آج قابل تمسخر ہو مگر اس واقعہ میں یہ مضمر ہے کہ اس وقت معاشرہ میں چند سچائیاں اور چند ایسے معیار تھے جن سے نواب وقت اور قناعت پسند شاعر ایک ہی طرح وابستہ تھے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ہٹا دیا جائے تو دوسرا خود بخود بے معنی ہو جائے گا۔ آج کے ادیبوں کے پاس نئی باتیں تو بہت ہیں مگر وہ یا ان کی تحریریں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ وہ اپنے معاشرہ کے کس مشترک اصول یا معیار پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ وہ کلیت کہاں ہے جس میں یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں وہ مشترک سچائیاں کون سی ہیں جن کے نقدان کی وجہ سے ایک فریق کے ختم ہونے کے بعد دوسرا فریق خود بخود بے معنی ہو جایا کرتا ہے۔

مجھے بیحد حیرت ہوئی جب میں نے لاہور کے ایک نوجوان شاعر سے یہ سنا کہ کراچی کے رسالوں کو ادیبوں اور شاعروں کو پیش کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ بہت خلوص اور اپنائیت سے اس بات پر داد خواہ تھے کہ دیکھئے کیسا ہی نیا شاعر۔ کیسا ہی غیر معروف ادیب کیوں نہ ہو۔ لاہور کے رسالے اس کی پبلسٹی اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی رات میں مشہور ہو جاتا ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ کون سا فرق ہے جو ہم دونوں لکھنے والوں کے درمیان یہ حدِ فاصل پیدا کر رہا ہے۔ ہمیں آج بھی یہ یاد ہے کہ ۴۵ء تک جب کہ مجازؔ اپنی شہرت کی انتہا پر تھے اور لوگ صرف ان کو ایک نظر دیکھنے کے لئے مشاعروں میں جایا کرتے تھے تو ہم نے کسی سنجیدہ محفل میں جہاں میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ کا تذکرہ ہو رہا ہو مجازؔ کا ذکر کبھی نہیں سنا تھا۔ یہ ایک نا قابل معافی تقصیر تھی۔ آج کا شاعر یہ شکایت کر رہا ہے کہ کراچی والوں کو نئے لکھنے والوں کو پبلسٹی دینے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ اس سطح پر ادب کے زوال کے اسباب فوراً ذہن میں آجاتے ہیں کہ جس تیزی سے یہ پبلسٹی دی جاتی ہے اسی تیزی سے پڑھنے والوں کے ذہن سے اُن کا محو ہو جانا ایک فطری تقاضہ ہے۔ شہرت بہت اچھی چیز ہے مگر کس چیز کی اور کس کے لئے؟ حق کے اظہار کے لئے، کسی اصول کے لئے، کسی معیار کے لئے، یا عوام کی خواہشات میں شریک ہونے کے لئے؟ آخر کس کے لئے اور کیوں؟ ——

بنگالی ادب کا شاہکار ناول

جاڑے کی آخری رات

بہار کا پہلا دن

تحریر: —— علاء الدین الآزاد

ترجمہ: —— احمد سعدی

عنقریب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے

ڈاکٹر سید شاہ علی

نیاز کی ناولٹ نگاری

سب سے پہلے یہ سوال [illegible] کہ نیاز صاحب کے دو کتابچے شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگذشت ناولٹ ہیں یا طویل افسانے [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] شہاب کی سرگذشت بھی جو شاعر کا انجام سے طویل تر ہے، ان کی نظر میں طویل افسانے ہی کی حیثیت [illegible] ہے لیکن ناول اور افسانے کی درمیانی کڑی کے بارے میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ لہٰذا یہی خیال ہوتا ہے کہ ناولٹ ایک چھوٹا ناول ہے جس میں ناول [illegible] پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بعض [illegible] نے مختصر مختصر افسانہ، مختصر افسانہ، طویل افسانہ، ناولٹ اور ناول [illegible] اظہار خیال کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے۔

ایچ جی ویلز نے مختصر افسانہ اسے قرار دیا ہے جو دس ہزار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل نہ ہو، اور نصف گھنٹے میں پڑھا جاسکے۔[1] اس کے برعکس فاسٹر نے دو مختلف [illegible] کے قصہ کو ناول میں شمار کیا ہے۔ سمرسیٹ ماہم نے ناول اور مختصر افسانہ، دونوں میں نام پیدا کیا ہے لکھتا ہے کہ مختصر افسانہ کا کام ہے کہ وہ ایک لمحہ کو محفوظ کرلے۔ کہا جاتا ہے کہ دور جدید کی تیز رفتاری اور غیر معمولی مصروفیت مختصر افسانے کے وجود میں آنے کا باعث ہوئی ہے، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسی عہد میں بعض طویل ترین ناول بھی لکھے گئے ہیں لہٰذا طوالت سے زیادہ بنیادی فرق تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ناول اور افسانے میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے پلاٹ، کردار نگاری اور پس منظر۔ لیکن جہاں ناول میں کئی نسلوں کا ذکر شامل ہوسکتا ہے اس کا پس منظر قطب شمالی سے قطب جنوبی تک وسیع ہوسکتا ہے اور اس کا مرکزی موضوع متعدد ذیلی مسائل میں الجھا ہوا ہوسکتا ہے وہاں افسانہ تواریخ سے نہیں واقعات سے متعلق ہوتا ہے۔ عموماً وہ یہ دکھاتا ہے کہ ایک فرد یا ایک چھوٹے سے حلقہ افراد پر ایک محدود دور اور ایک محدود دائرہ عمل میں کیا بیتی۔ اس طرح افسانہ، قدیم نظریہ وحدت ثلاثہ یعنی زمان، مکان اور عمل پر کسی اور صنف ادب کے مقابل زیادہ پورا اترتا ہے، افسانے کو اس سے سروکار نہیں کہ اس کے کرداروں پر اس سے پہلے یا بعد کیا گذری۔ لیکن اس بات کے مدنظر کہ افسانہ چند گھنٹوں کے موٹر کار یا ریل کے سفر تک بھی محدود ہوسکتا ہے یا برسوں تک پھیلے ہوئے ایک واحد جذبے کی بھی عکاسی کرسکتا ہے، یہ بہتر ہوگا کہ موضوع یا تاثر کے اتحاد پر زیادہ زور دیا جائے۔ ناول نگار حسب خواہش سڑکوں کا جال بچھا سکتا ہے لیکن افسانہ نگار کو صرف ایک سڑک کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک ناول بسا اوقات اپنی کہانی کو فراموش کرکے نفسیاتی تجزیئے، سائنس کی دنیا یا عالم خیال یا قیاس و موعظت میں منہمک ہوسکتا ہے، لیکن

---

[1] MODERN SHORT STORIES BY A. J. MERSON INTRODUCTION - MACMILLAN - 1957

افسانہ نگار کے لئے اپنے متعلقہ موضوع کی پابندی ضروری ہے[1]۔ افسانے کا اختصار اسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ وہ پلاٹ، کردار اور منظر میں سے کسی ایک پر اپنی توجہ مبذول کرے اور دوسرے عناصر کو ضمنی حیثیت دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے کے برعکس ناول کا اتحاد بھی پہلودار ہوتا ہے۔ ناول کہانی کے تینوں عناصر کو پوری طرح نشو و نما دے سکتا ہے۔ پلاٹ کے دھاگے بھی متعدد، مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں، کردار بھی مرکزی اور ضمنی ہو سکتے ہیں۔ بیان بھی تفصیلی ہو سکتا ہے[2]۔ افسانہ ایک تجربہ کا نتیجہ ہوتا ہے لہذا افسانہ نگار کو ترک و انتخاب کے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن موضوع کے تنوع کے لحاظ سے افسانے کو ناول سے زیادہ وسعت حاصل ہے۔ H. E. BATES کے الفاظ میں افسانہ "ایک گھوڑے کی موت سے لے کر ایک دوشیزہ کے پہلے معانقہ تک یعنی دنیا کے کسی موضوع پر طبع آزمائی کر سکتا ہے۔" اور اب تو افسانہ پلاٹ اور [illegible] کے [illegible] سے بھی آزاد ہو گیا ہے اور تاثرات اور ماحول کی ترجمانی کے ذریعے بھی ایک کامل اثر پیدا کر سکتا ہے۔ اور سوا افسانے کے اقتضا اور افسانہ نگار کی [illegible] کے لئے کوئی قید و بند نہیں ہے۔

[illegible] J. R. GONER [illegible] THOMAS A. GULLASON نے مختصر افسانہ کے لئے NOVELLA کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، ناولٹ ایک ذاتی سی ترکیب ہے[5] اور گویا ناول کا اسم تصغیر ہے۔ ان حالات میں، ڈاکٹر فاروقی[6] کی دوربین اور پہاڑی کی تشبیہ کی طرح یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جس طرح [illegible] اس کا بالائی حصہ پھر پورا سماں اور پھر [illegible] منظر ہمیں نظر آتا ہے۔ اسی طرح افسانہ کسی انسان کی زندگی کی ایک مختصر [illegible] ناولٹ ایک [illegible] اور ناول [illegible] زندگی کو نمایاں کرتا ہے۔ یا بلوہ دسائز کی شاعرانہ اصطلاح میں اس معمورہ کی تمام حیات انسانی کو [illegible] قرار [illegible] افسانہ، ناولٹ اور ناول کا نام دے سکتے ہیں۔ شاید اسی پیمانے کے مدنظر، باوجود مصنف کے لمبے ناول بتلانے کے [illegible] کو [illegible] قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی ساقی کے ناولٹ نمبر میں ناول کی تکنیک سے متعلق جو مضمون سپرد قلم کیا ہے اس [illegible] ناولٹ اور افسانہ" وہ لکھتے ہیں "اصل میں ناول زندگی کے نقشے اور کردار کے مکمل حالات دیتا ہے اور یہ کام محض ایک [illegible] نہیں ہوتا۔ [illegible] ایک ہی [illegible] کے بابت سب کچھ بتا دیں یعنی کردار کی پوری زندگی ہمارے سامنے لے آئیں تو ناولٹ بن جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ناول، ناولٹ، طویل افسانہ اور افسانہ چار الگ الگ اصناف ہو گئیں۔ ایک قطب پر ناول ہے دوسرے پر افسانہ۔ ایک زندگی کا مکمل جال ہے، دوسرا زندگی کا محض ایک تاگہ ہے۔ اگر تاگے کی نوعیت رہے، مگر اس کے ساتھ ایسے ہو جائیں کہ افسانہ طویل ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ہو تو وہ طویل مختصر افسانہ ہوا۔ اگر فقط تاگے کی صورت بدل کر جال کی صورت میں آ جائے، مگر پھر بھی جال نہ بن جائے، تو ناولٹ ہوا۔ طویل مختصر افسانہ زندگی کی خوردبین ہے اور ہمیں زندگی کا ایک چھوٹا پہلو بڑا دکھا کر رہ جاتا ہے۔ ناولٹ دوربین ہے اور ایک زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک اور مضمون نگار کا خیال ہے کہ ناولٹ نگار غزل گو کی طرح ہے وہ اپنی شخصیت کو بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات و محسوسات خود بخود باہر آ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے ساقی کے تازہ ترین ناولٹ نمبر ۱۹۶۲ء میں افسانہ کو ایک نقطہ، ناولٹ کو ایک لکیر اور ناول کو ایک جال قرار دیا[9]

---

[1] SHORTSTORIES OF THE 20th C. BY R.W. JEPSON- INTRODUCTION.
[2] THE WORLD OF FICTION. INTRODUCTION.
[3] ساقی۔ سالنامہ ناولٹ نمبر جون ۱۹۶۲ء۔ ناولٹ اور طویل افسانہ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی [4] ناولٹ از پروفیسر ٹی، سی، طاہر، نگارش ناولٹ نمبر
[5] نقوش۔ ناولٹ نمبر۔ طلوع از وقار عظیم۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ناولٹ میں ایک ہی جوڑے کا مکمل قصہ ہوتا ہے۔ وہ غالباً بھول گئے کہ وہ اپنی کتاب ناول کیا ہے میں پلاٹ کے سادہ اور مخلوط ہونے کی بحث میں سادہ پلاٹ والے ناول کی یہی تعریف کر چکے ہیں۔ موضوع اور مواد کی اس حد بندی کے مدنظر نیاز صاحب کی ان تصانیف کو ناولٹ ہی قرار دینا چاہئے۔ نیاز صاحب کے ان دو ناولٹوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا انجام پہلے لکھا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۹۱۴ ہے۔ اور شہاب کی سرگذشت پر کوئی سنہ نہیں لکھا ہوا ہے لیکن اس پر تبصروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۹۱۳ء یا سنہ ۱۹۱۴ء کا ہے ۔ دونوں کی زبان کے فرق سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ شہاب کی سرگذشت کی زبان اتنی دقیق نہیں ہے جتنی شاعر کا انجام کی۔ شاعر کا انجام کے سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ نیاز صاحب کے "ادبی شہ پاروں" کے مجموعہ جمالستان میں، یونانی دیومالا سے متعلق ۶ مضمونوں کے، ایک افسانوی مضمون کا عنوان بھی یہی ہے۔ البتہ اس میں "ایک" کا اضافہ کیا گیا ہے، یعنی ایک شاعر کا انجام گو بظاہر ان دونوں میں کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔

شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگذشت میں، ہر لحاظ سے نمایاں فرق ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اول الذکر میں کھٹکتی ہے وہ اس کی معرّٰی و مفرّس زبان ہے۔ تقریباً ہر صفحہ اور ہر پیراگراف اس بات کا شاہد ہے، بلکہ ابتدا میں تہ۔ یہ کے الفاظ ہی سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے دوسری چیز یہ ہے کہ مصنف کے اپنے قول کے مطابق، اس میں تسلسل بھی کم ہے اور گستاخی معاف ہمیں تو اس میں کوئی فطری یا منطقی ربط بھی نظر نہیں آتا، بلکہ متعدد مقامات پر تناقض نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف کو بکھرے ہوئے موتی پسند ہوں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ قاری بھی اسی مذاق کا آدمی ہو۔ غیر ضروری ابہام اور انتشار، اور وہ بھی نثر میں، کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ لیکن جیسا کہ تمہید سے معلوم ہوتا ہے، یہ عرض نغمہ (ملحوظ رہے کہ نیاز صاحب نے ٹیگور کی گیتان جلی کے اپنے ترجمہ کا نام بھی عرض نغمہ ہی رکھا ہے) ٹیگور کے گیتان جلی ہی کے منتشر خیالات و نغمات کا جواب ہے۔ ابتدائی صفحات میں، کتاب کے ہیرو انفعال کی پھولوں سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ، جب تک وہ پھولوں کو سونگھ کر دس پانچ ٹھنڈی سانسیں نہ بھر لیتا اسے نیند نہ آتی۔ اور اس کا دوست اکثر اس کے لئے پھول خرید کر لایا کرتا تھا لیکن جس دن اس کا دوست اس کے لئے کلیاں خرید کر لے گیا، انفعال جو خدا جانے اپنے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے دوست کے زینہ پر چڑھ کر اندر پہنچ جانے تک، اس کی آمد کی خبر نہیں ہوئی۔ صرف یہ دیکھ کر کہ دوست دامن میں کچھ لئے ہوئے ہے اک جست کے ساتھ اس تک پہنچ گیا اور یہ کہہ کر کہ "یہ آپ کیا لے آئے" بے اختیار دونوں مٹھیوں میں کلیاں بھر لیں، گویا اسے دامن میں چھپی ہوئی کلیوں کا علم، پہلے سے تھا، یا ایک نگاہ میں ہو گیا۔ اسی طرح حمیدہ کی سہیلی زبیدہ کا حمیدہ کے انفعال سے لگاؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنا اور اس سلسلے میں نہایت بھدی منطق چھانٹنا، جاسوسی ناولوں، خصوصاً کانن ڈائل کی تصانیف "شرلاک ہومز" (سنہ اشاعت ۱۸۹۲ء) کے اثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اخبارات میں انفعال کی گمشدگی کی اطلاع اور حمیدہ کی لکھنؤ کو واپسی پر، انفعال کے لئے اشتہار۔ ان کا بیباک انداز ایسا لگتا ہے جیسے ہندوستان نہیں انگلستان کی بات ہو اور پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسا اخبار ہوگا جو لکھنؤ اور بمبئی میں اس قدر مشترک ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے میزبان مولوی مظفر بیرسٹر کا اس سے فوری انس اور ان کی لڑکی رقیہ کا اجنبی انفعال سے تقریباً پہلی ہی نظر میں عشق، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو انفعال اس سے پہلے پردہ کرتا تھا۔ یا اہل لکھنؤ کور ذوق تھے، یا بمبئی پہنچ کر اس کا رنگ روپ نکھرا ہوگا۔ اس کے علاوہ رقیہ کا اظہار شوق میں اس بیباکی سے پہل کرنا اور انفعال کے کسی اور سے عشق کے اندازے اور پھر اعتراف کے باوجود، رقیہ کا خود غرضی سے انفعال کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے پیہم اصرار کرنا، رقیہ کے والد کا اخباری اشتہار دیکھنے اور سب کچھ سمجھ جانے کے بعد بھی، ایک انجانے شخص انفعال کو موزوں ترین سمجھ کر اس سے اپنی لڑکی کے رشتے کے لئے تحریری تجویز پیش کرنا اور شام کو اس سے ملاقات طے کرنا، اور ان کے بجائے ان کی صاحبزادی کا ملاقات کرنا، اور دونوں کے سینوں کے ایک دوسرے سے مس ہوتے ہی، انفعال کا بے ہوش ہو جانا اور پھر آنکھیں کھلتے ہی نہایت ہوشمندی سے کہنا کہ "آپ کیوں مجھے مجبور برباد کر رہی ہیں"۔ اور رقیہ کا جواب "جس شخص کی جان اور ساری زندگی آپ برباد کر دیں، کیا اس کو اس قدر مجبور کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے" (جو شاید رسوا کی امراؤ جان بھی نہ کہہ سکتی) اور پھر اپنے مقصود و محبوب حمیدہ کی خاطر لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر بمبئی

چلے آنے والے افضال کا رقیہ کے لبوں سے اپنے لبوں کو ملا دینا اور حمیدہ کو فراموش کر کے رقیہ سے شادی رچا لینا، پھر جب وہ حمیدہ کی امانت کی واپسی کے لئے لکھنؤ آتا ہے، تو حمیدہ کا اس سے ہاتھ ملانا (لوگوں نے خواہ مخواہ سرشار کے فسانۂ آزاد کی حسن آرا بیگم کو ملعون کیا ہے) اور نہایت مہذب اور رسمی فقرات استعمال کرتے کرتے بے تکلفی کی خاطر جواب دینا "اگر یہ سب الجھنیں آپ ہی کے دم سے ہوں تو۔" افضال کا، جس کی حمیدہ سے یہ ملاقات رقیہ سے شادی کے بعد ہوتی ہے اور جو سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اظہار افسوس کرتا ہے کہ اس نے کیوں اس کی امانت (حمیدہ کا گرا ہوا خط) اس سے پہلے بذریعہ ڈاک واپس نہیں کر دی، اپنی سرد مہری پر نادم ہو کر کہنا "اگر کسی نوع کا کوئی گمان آپ کو ہوا تھا، تو وہ غلط نہ تھا، اس لئے آپ مجھے حکم دیں۔ اگر تعمیل ارشاد میں مجھے کوئی عذر ہو تو بے شک واقعات قابل الزام ہیں۔" حمیدہ کا افضال کی شادی سے ناواقف ہونے کے باوجود اس ذہانت سے کام لے کے جو نیاز صاحب کے کرداروں سے مخصوص ہے، سمجھ لینا کہ یہ ہمدردی تھکی ہوئی اور سست ہے، اور عالم الغیب کی سی خود اعتمادی سے کہنا "اور نہ آپ کو ایسی بات پر اصرار کرنا چاہئے جس کے لئے فی الحقیقت آپ تیار بھی نہیں۔ ایسے ہی بکھرے ہوئے ہوتی ہیں۔"

ایک اور چیز جو شاعر کا انجام میں کھٹکتی ہے وہ اس کے اتفاقات ہیں۔ قصے کے آغاز میں حمیدہ کا شاعرانہ وجود اس کے شاکی ... چچا کے ہاتھوں ایک مرغ زریں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، جو اس کے خوابوں اور تصورات کے منافی ہے۔ دوسری طرف افضال، ہر تاثر سے تڑپ جانے والا افضال، ہر حسین شے پر مٹنے کے لئے آمادہ و منتظر افضال، "جیسا شاعر اور نکہ مغنی شعر و موسیقی کے عمان بے پایان کی مچھلی" (لطف یہ ہے کہ پوری داستان میں اس کی زبان سے کوئی شعر موزوں نہیں ہوا) ہر دوسرے تیسرے، کالر اور ٹائی بدلنے والا شاعر افضال، ایک مختصر تفریحی ادبی سفر کے بعد، یکایک اداس ہو جاتا ہے۔ اتفاق کی بات کہ حمیدہ کا ایک گرا ہوا خط افضال کے ہاتھ لگ جاتا ہے جسے پہنچانے کے لئے وہ خود الٰہ آباد پہنچا ہے۔ اتفاق ہے، اس کے مذکورہ پتہ پر پہنچنے سے دو گھنٹے پہلے، وہ ایک اور جگہ منتقل ہو جاتی ہے، پھر اتفاق ہی سے مولوی مظفر بیرسٹر، جو اخبار میں اعلان دیکھ چکے ہیں، اس کو بمبئی میں کسی جگہ پا کر، اپنی کوٹھی میں لے آتے ہیں اور انہیں اس سے اس درجہ انس ہو جاتا ہے، کہ اس کی جدائی کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ (حالانکہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں دکھائے گئے ہیں) اتفاق سے وہ بہت ہی روشن خیال واقع ہوئے ہیں، اور ان کی ایک علاوہ مستحکم ارادے کی شادی کے قابل لڑکی بھی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جب رقیہ سے شادی کے بعد افضال کی حمیدہ سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کی سہیلی زبیدہ کا طلبی کا تار حمیدہ کو افضال سے فوراً جدا کر دیتا ہے، اور وہ تقریباً ایک ہفتے کے لئے باہر چلی جاتی ہے۔ مزید اتفاق یہ ہے کہ رقیہ یکایک کسی نامعلوم بیماری میں مبتلا ہو کے، تین ہی چار دن میں انتقال کر جاتی ہے۔ اتفاق سے اس کے ایک ہفتے بعد افضال اخبار میں شاہجہاں پور سے آنے والی حمیدہ نامی ایک خاتون کے، اسٹیشن سے امین آباد جاتے ہوئے راستے میں قتل کر دیئے جانے کی خبر پڑھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے (بجائے اس کی فکر یا تفتیش کرنے کے) اتفاق سے بمبئی میں اس کی ملاقات ... (کوئی کو بھی آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ کیسے) اسٹیج کی ایک نامور اداکارہ مس گوہر سے ہو جاتی ہے، جو اتفاق سے محبت میں بدل جاتی ہے اور مس گوہر شادی کی پیشکش کرتی ہے (حالانکہ اس سے پہلے محبت کے نام پر، افضال سے شہاب کی ڈانٹ کھا چکی ہے) اس سے بڑا اتفاق یہ پیش آتا ہے، کہ ناگہاں ایک برقعہ پوش عورت (پہلی ہی ملاقات میں ہاتھ ملانے والی حمیدہ) آ کر نقاب الٹ دیتی ہے، اور افضال پھر ایک چیخ کے ساتھ، کرسی کے نیچے پہنچ جاتا ہے، (کہیں برقعے کے جواب میں کرسی کی آڑ تو نہیں تلاش کرتا!) ہوش میں آنے ... پر بجائے خوش ہونے کے اور حمیدہ سے اظہار ناراضگی کرتا ہے، کہ وہ کیوں اس کی جان کی لاگو ہو رہی ہے، جس کے صدمے سے حمیدہ زہر کھا لیتی ہے اور افضال پاگل ہو جاتا ہے۔ المختصر یہ اتفاقات اس ناولٹ کو اردو مثنویوں اور پاکستانی فلموں سے قریب کر دیتی ہیں۔ کاش کوئی پاکستانی فلم کاروں کو خبر کر دے!

شاعر کا انجام کے ہیرو کا کردار بھی عجیب و غریب ہے۔ ہیرو باوجود مرد ہونے کے رونے کے لئے، بہانے کی تلاش میں رہتا ہے، اور ہر نازک موقع پر بے ہوش ہو جاتا ہے، وہ اتنا خود غرض، خود پرست اور غیر ذمہ دار ہے، کہ اسے اپنے سوا، کسی کی فکر نہیں ہے۔ رقیہ اس سے بھی زیادہ خود غرض ہے۔ اس کے والد مولوی مظفر بیرسٹر بھی اس سے کچھ کم نہیں ہیں۔ باوجود خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے، اور افضال کے اپنی تعلیم میں ہرج ہونے کے عذر

پیش کرنے کے، وہ اسے کلکتہ واپس جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ حمیدہ کی مرغ زریں کے چنگل سے رہائی کی نوعیت پہیلی الجھی روشنی جیسی ہے، نبیلہ زیب داستان کے لئے بھی ہے بارہ نظر نہیں آتی۔ مکالمے میں بھی، جو شہاب کی سرگزشت کے مقابلے میں، بہت کم ہیں، کوئی تنوع یا انفرادیت نہیں۔ سب کے سب بقول ڈاکٹر محمد حسن وہی سجائی اور بے حد ادبی بلکہ "معرب و مفرس" زبان بولتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیاز صاحب تھامس ہارڈی، ٹیگور، ہندی شاعری، کانن ڈائل، ابوالکلام آزاد وغیرہ سے بے حد متاثر ہیں۔ دوران مطالعہ، ہارڈی کے افسانوں کے مجموعہ LIFE'S LITTLE IRONIES اور کانن ڈائل کی شرلاک ہومز ADVENTURES OF SHERLOCK HOLMES کا بار بار خیال آتا ہے۔ ٹیگور اور ہندی شاعری کا اثر، بکھرے ہوئے رمیئر اور عورتوں کی طرف سے اظہار عشق، اور اصرار بہم، سے نمایاں ہے۔ گویا ان کا ہیرو مرلی دھر کرشن بھگوان ہے، جس پر گوپیاں پروانہ وار، فدا ہوتی جا رہی ہیں؟ چاہے وہ رئیس زادیاں ہوں یا ایشیا کی تتلیاں، اور شاید اسی لئے اس کے (افضال کے) مذہب میں، جنس لطیف کے مغموم کرنے سے زیادہ اور کوئی گناہ نہ تھا۔ نیاز صاحب کا خیال ہے کہ عورت معاملات محبت میں بہت جلد نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ مسلمات کے خلاف ہے۔ خود ہارڈی کی رائے ہے کہ (A WOMAN NEVER INITIATES SHE ONLY RESPONDS) عورت کبھی پہل نہیں کرتی، وہ محض جواب دیتی ہے، ایک اور ادیب کا خیال ہے کہ معاملات عشق میں عورت قدم قدم بڑھتی ہے لیکن مرد چھلانگ لگاتا ہے۔

طرز بیان پر ابوالکلام آزاد کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے، حالانکہ کہیں کہیں ایسے جملے بھی مل جاتے ہیں۔ "جب وہ اس قسم کی باتوں سے تھک گیا تو اٹھا اور بار موتیم لے کر ادھر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔"[1] اس دور کے دیگر نثر نگاروں، خلیقی، یلدرم، مہدی وغیرہ وغیرہ کی طرح، نیاز کے یہاں بھی رومانوی عناصر غالب ہیں۔ قصہ کا راوی شروع اور آخر میں افضال کا بے نام دوست ہے۔ اور درمیان میں مصنف خود۔ نیاز صاحب نے بزعم خود، یا تو شاعر کی فطرت کی عکاسی کی سعی کی ہے یا تلون مزاجی کا انجام دکھانے کی، لیکن اس میں تصنع اور بناوٹ کی، ضرورت سے زیادہ ملاوٹ نے اسے مضحکہ خیز بناکے رکھ دیا ہے۔

ناولٹ کی حیثیت سے شاعر کا انجام جتنی خام تصنیف ہے، اتنی ہی پختہ اور کامیاب شہاب کی سرگزشت ہے، زبان و بیان اور خیالات کے لحاظ سے بھی اور تکنیک کے اعتبار سے بھی۔ یہ وہ شاہکار ہے، جسے سرت چندر چٹرجی کی دیوداس اور بھگوتی چرن ورما کی چترلیکھا کے ساتھ، ایک طاق پر رکھا جا سکتا ہے۔ ان تینوں شہ پاروں کا موضوع عشق ہے۔ دیوداس کا عشق، جذبات پرستانہ لیلیٰ مجنوں کا سا مختل دماغ اور فنافی العشق قسم کا ہے، چترلیکھا کا تیاگ یعنی بانٹ دو اور واپسی کی توقع نہ رکھو، والا اور شہاب کا نیم افلاطونی۔ یہ صحیح ہے کہ نیاز صاحب نے شاعر کا انجام کے خاتمہ پر عشق و محبت کی بحث چھیڑی ہے۔ اور اسے "ایک جذبات فانی کا انعکاس، داعیات شباب کا ایک فوری جوش سیلاب خواہشا کا ایک موقت مد، قرار دیا ہے اور نیاز کے علاوہ، ان کے معاصرین کے یہاں بھی، اسی قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خلیقی دہلوی کے یہاں یہ جملہ ملتا ہے۔ "محبت و عورت شاعری کے لئے نہیں شاعری کے لئے ہے۔" (صفحہ ۲۱، ادبستان[2]) لیکن شہاب کی سرگزشت میں جس تفصیل اور ترتیب کے ساتھ، اس نظریہ کی وضاحت اور تجزیہ کی سعی کی گئی ہے، وہ ایک نادر چیز ہے۔ اور افلاطون کے ان مکالمات کی یاد دلاتی ہے، جو مجموعہ زیم (SYMPOSIUM) کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ افلاطون کے سارے مکالمات میں یہ سب سے زیادہ متنوع اور مکمل ہے۔ اس میں افلاطون نے تاریخی، حقیقی اور رنظری پہلو کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور اپنے نظریئے کو آسانی ترین پیرائے میں انتہائی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ لیکن یہ قابل لحاظ ہے کہ نیاز فتحپوری نے، باوجود اس کی ڈرامائی مکالمات (DRAMATIC DIALOGUE) کی ہیئت

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک ص۲۳ [2] ایضاً ص۲۱

لو اپنانے کے ، موضوع کے اعتبار سے ، صرف اس کے مرکزی خیال کو لیا ہے ۔ اور خصوصاً ہم جنسی رجحانات کا ذکر تک نہیں آنے دیا ہے ، جو یونانیوں کے نزدیک جائز تھے ۔ افلاطون نے عورت اور مرد کے عشق کو انتہائی کم درجہ اور محض جذبہ تولید کی خواہش کا نتیجہ بتایا ہے ۔ لیکن نیاز نے یہ بار یکی پیدا کی ہے کہ جس سے عشق ہو ، اس سے شادی نہ کی جائے ، ورنہ ساری گرم جوشی ختم ہو جائے گی ، جو عشق کی موت کے مترادف ہے ۔ افلاطون طبقۂ نسواں کو حقیقی عشق کا نا اہل ، اور محض گھریلو زندگی کے قابل ، بتاتا ہے ۔ افلاطون کی رائے میں عشق انسان میں خودداری اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے افلاطون مرد کے ، چاہے وہ عورت سے ہو یا مرد سے ، جسمانی اختلاط کو قابل مذمت سمجھتا ہے ۔ سمپوزیم کے ایک مقرر ارسٹافینس کے مطابق ، ابتدا میں انسان میں تین جنسیں شامل تھیں ، مرد ، عورت اور مشترکہ جنس ۔ خداؤں نے ، انسان کے غرور کی سزا کے طور پر ، ان کو کاٹ کے دو صنفوں میں تقسیم کر دیا ۔ اتحاد اور وصل کی فطری خواہش ، اسی اصل کی طرف مراجعت کی آرزو پر مبنی ہے اور انسانی عشق ، گم گشتہ مسرت کی بازیابی کی تمنا پر مشتمل ہے ۔ اگیتھان کی تقریر جو لفاظی سے پُر ہے ، سقراط کے فلسفہ سے مقابلے کا کام دیتی ہے ۔ سقراط کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عشق حسن اور سچائی کا متلاشی ہے ، عشق ، مادی اور روحانی دنیا کی درمیانی کڑی ہے ۔ عشق کی ماں افلاس ہے ، لیکن باپ کی طرف سے ، اسے جدوجہد ورثہ میں ملی ہے ۔ سچا عاشق وہی ہے ، جو فلسفی ہے ، یعنی دانائی کا عاشق ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے ، کہ عاشق بلکہ عام انسان بھی دونوں دنیاؤں سے تعلق رکھتا ہے ۔ افلاطون کا ، سقراط کی زبانی یہ تجزیہ ، مذہبی تجربہ سے بھی مطابقت رکھتا ہے ۔ زندگی ایک دور دراز لیکن دھندلی اچھائی کے لئے کوشاں ہے ، جس کا حصول باعث مسرت ہے ۔ اگر انسان کو یہ شے حاصل ہوتی ، تو وہ انسان نہ ہوتا ۔ اور اگر اس کی تڑپ نہ ہوتی تو وہ جانور رہ جاتا ۔ جو چیز سقراط اور افلاطون کے نزدیک جہل یا نادانی ہے ، وہ مذہبی نقطۂ نظر سے گناہ ہے ۔ ان فلسفیوں کی رائے میں غلط روی نادانی ہے اور کامل کردار ، کامل آگہی کا لازمی نتیجہ ۔

لیکن عرف عام میں ، عشق محض جنس سے متعلق ہے ۔ یہ اچھائی کا صرف ایک پہلو ہے ، اور لوگ چاہتے ہیں کہ اچھائی ہمیشہ ان کے تصرف میں رہے ۔ لہٰذا اس قسم کے عشق کی بقائے دوام کا ذریعہ ، جنسی اختلاط ہے ۔ جو نسل انسانی کی بقا کا بھی ذریعہ ہے ، لیکن جسمانی اختلاط عشق کا پست ترین عمل ہے ۔ اس سے کچھ برتر وہ لوگ ہیں ، جو اس اختلاط کا نتیجہ تو ہیں لیکن یونانی ہیروؤں کی طرح ، کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ۔ روحانی اختلاط اس سے بلند تر ہے ، جس پر فن تہذیب اور سماج کی ترقی کا دارومدار ہے ۔ یہ ترقی اعلیٰ دماغوں کے ازدواج سے منسلک ہے ۔ جب انسانی روح کسی تخلیق یا انکشاف کی حامل ہوتی ہے تو وہ ایک ساتھی کی طالب ہوتی ہے ۔ تاکہ اپنی روحانی اولاد کو جنم دے سکے ۔ ساتھی کے انتخاب کے معاملہ میں جسمانی حسن اثر انداز ہوتا ہے ، لیکن جب تک روحانی حسن موجود نہ ہو ، یہ ازدواج زرخیز نہیں ہو سکتا ۔ لیکن یہ ملحوظ رہے ، کہ افلاطون کی رائے میں ، طبقہ نسواں غیر جسمانی تخلیقی عمل کا نا اہل ہے ۔ لہٰذا یہ عمل مردوں تک محدود ہے ۔ دانائی کا عاشق یا فلسفی ، مادی دنیا سے بلند ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ، اور اس کی ترقی کے مراحل یہ ہیں ۔ جسمانی حسن کے خاص نمونوں سے عام تک ، پھر روحانی حسن تک ، گو وہ جسمانی حسن سے معرّیٰ ہو ، اور اس طرح اخلاقی حسن کی جانب ، اور آخر کار علم و آگہی کے حسن تک ، جس کی مختلف شاخوں کے ذریعہ ، اس حسن مجسم کے تصور تک ، رسائی حاصل ہوتی ہے ، جو کل کائنات کے بارے میں ، سچائی کی مکمل اور منفرد آگہی بخشتا ہو ۔ یہ مراحل ، ذہنی ، روحانی اور عاشقانہ سفر میں درپیش ہوتے ہیں اور مذہبی تجربات اور صوفیانہ الہامات کی طرح ، ناقابل بیان و ابلاغ ہوتے ہیں ۔ البتہ سقراط کا سا رہنما ، ہر مضطر تصورات اور انکشافات کی ولادت میں مدد دے سکتا ہے ۔ ان مراحل سے گزر جانے کے بعد ، دانائی کا عاشق ، مادی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے اور فانی نہیں بلکہ حقیقی دنیا میں ، زندگی بسر کرتا ہے ۔ افلاطون کی جمہوریت کا مسافر بھی ، اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوتا ہے ۔

عام تصور کے برعکس ، افلاطونی محبت کا اصل مفہوم ، ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ، دو ہم جنس افراد ، کی سچائی اور حسن کی تلاش

ہے۔ افلاطون کا اس طرح جذبۂ عشق کو فلسفی کی سچائی کی جستجو کے جذبے کے مترادف قرار دینا، عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن افلاطون کا، توانین ہمواروں کے حسین ہونے کا ذکر، علم النفس کے جدید نظریات کے مدنظر، جو غیر متوقع میدانوں میں، جنسی جذبے کی کارفرمائی اور جسمانی خواہش کے ترفع (SUBLIMATION) کو نمایاں کرتے ہیں، اس قدر نمایاں نہیں معلوم ہوتا، خصوصاً جب کہ مذہب اور تصوف میں بھی، اسی قسم کی عاشقانہ اصطلاحات کا، استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً روح اور کلیسا کو حضرت عیسیٰ کا محبوب کہنا) افلاطون نے سقراط کو، دانشمندی کے عاشق کی حیثیت سے، کامل ترین نمونہ قرار دیا ہے۔ سقراط کے یہاں بدصورتی اور روحانی حسن کا امتزاج ہوا ہے، باوجود السیباڈس (ALCIBIADES) کو پسند کرنے کے، سقراط اس کے حسن ظاہری سے اس قدر متاثر نہیں ہے، جس قدر السیباڈس سقراط کے روحانی حسن کا دلدادہ ہے۔

افلاطون کے نظریہ عشق کے اس سرسری جائزے کے بعد، جو کچھ طویل سا ہو گیا ہے، اگر ہم شہاب کی سرگزشت پر نظر ڈالیں تو یہ محسوس ہوگا کہ نیاز صاحب نے، اسے جوں کا توں اپنی تصنیف میں پیش نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے ذاتی تاثرات، تجربات، مطالعات اور مشاہدات کا خلاصہ بھی اس میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک شہاب کا تعلق ہے، اس کا نازک اندام، قوی اعصاب اور بلند خیالی (الہامات کا مجموعہ ہونا، بدصورت و بدہیئت سقراط کے بجائے، نزاکت مجسم گبن اس کی فوجی تربیت اور مشہور تاریخی شاہ کار زوال روما کی یاد دلاتا ہے۔ البتہ محبت اور شادی کے موضوع پر اس کی اپنے دوست محمود سے بحث، بالکل سقراطی انداز کی ہے۔ اگرچہ محمود، شہاب کا ایسا ہی مستقل مصاحب ہے، جیسا ڈاکٹر واٹسن شرلاک ہومز (SHERLOCK HOLMES) کا تھا، لیکن اس کا شہاب سے لگاؤ، ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ السیباڈس کا سقراط سے، یعنی ایک ناقابل بیان مقناطیسی کشش کا نتیجہ۔ البتہ اختر سے گفتگو میں وہ شہاب کو، سب سے زیادہ محبت خلوص اور ایثار کرنے والا اور دانشمند مشیر قرار دیتا ہے (ص۱۰۲) ایک اور صریح مشابہت جو سقراط اور شہاب میں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح غیر معمولی سقراط اگیتھان کے یہاں عشق و محبت کے موضوع پر مذاکرے، مے نوشی اور رت جگے کے بعد، صبح کو تازہ دم، دوسرے دن کے معمولات حیات میں منہمک ہو جاتا ہے، اسی طرح شہاب بھی جو کبھی سونے کا معمولی وقت گذر جانے کے بعد نہیں سوتا تھا، جاگتا رہا۔ اپنے کمرے میں دیر تک کرسی پر دراز ہو کر، رات کے واقعات تماشہ کی کیفیات۔ وہاں کے کوائف و حالات پر غور کرتا رہا۔ اور طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل، محمود کے لئے یہ تحریر میز پر رکھ کر "آٹھ بجے تک سال جیج گیٹ پر انتظار کروں گا" باہر نکل کھڑا ہوا" (ص۴۹) شہاب کی مناظر قدرت، مصوری، موسیقی، رقص، مشاہدات حیات وغیرہ سے دلچسپی اور ان کا تجزیہ، افلاطون کی اس ابتدائی منزل عشق کو ظاہر کرتا ہے جب عاشق معشوق کے حسن ذاتی کے علاوہ، عام حسن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ جس طرح افلاطون نے اپنے مذاکرے کو فطری اور تاریخی رنگ دینے اور مقرروں کے انتخاب میں بڑا اہتمام کیا ہے، اسی طرح نیاز صاحب نے اپنے کرداروں کو منتخب کرنے میں مختلف شعبہ ہائے حیات کی نمائندگی کو ملحوظ رکھا ہے، اور بمبئی کی رنگا رنگ اور رواں دواں زندگی کو پس منظر بنا کے اپنے خیالات، نظریات اور تصورات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے کردار یہ ہیں: رمتین اور سنجیدہ فلسفی شہاب، اس کا دوست محمود، جس کا "حسن فطرت صرف تجرد و بے تعلقی ہی کی حالت میں قائم نہ سکتا ہے" (ص۸۱) خیامی فلسفہ عیش و عشرت کا قائل طفیل، اختر جو ایک اداکارہ ہے اور شہاب کی رائے میں بدتربیت کے باعث خطرناک ہے اور جو بالآخر اس کی تعلیمات کے زیر اثر، اپنے پیشے سے توبہ کر کے ایک زنانہ مدرسہ کھول لیتی ہے اور محمود کی بیوی سکینہ جو ایک تعلیم یافتہ، لیکن گھریلو اور وفادار سرشت کی خاتون ہے۔ ان میں سب سے غالب آواز شہاب کی ہے، جس کے سامنے سب لاجواب ہو جاتے ہیں اور حقیر نظر آتے ہیں، شہاب کے قوی اعصاب اور مضبوط قوت ارادی کو تو سقراط کی سیرت سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اختر کے ساتھ اس کی سخت کلامی اور محمود سے برہمی، گویا اس انسانی عنصر کی نفی ہے، جس کو ہر انسانی کمال خصوصاً فلسفہ کی بنیاد ہونا چاہئے۔ سقراط کا اپنی بدمزاج بیوی سے شگفتہ مزاجی کے ساتھ نباہ، اس کے برعکس اوصاف کو ظاہر کرتا ہے۔ شہاب کو فلسفی ظاہر کرنے کے لئے، اس کے مختلف موضوعات پر

مباحث کے ساتھ ساتھ، اس کی تصنیف "الہامات" کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس کے ناشر کی رائے میں، خلل دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کہیں افلاطون یا سقراط کے فلسفہ کی جھلک نظر نہیں آتی۔

نیاز صاحب مشہور امریکی فلسفی ایمرسن کے خیالات (ESSAYS "LOVE" "FRIENDSHIP" (136-141) سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں، لیکن اپنے مخصوص نظریے کے تحت، اس سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ ایمرسن محبت اور دوستی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دوستی کو محبت پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ محبت میں ناکامی، انتقام کی آگ بھڑکاتی ہے اور دوستی بے غرض ہوتی ہے۔ نیاز صاحب نے شہاب کی زبانی اس موضوع پر یہ کہلوایا ہے "ہاں وہ محبت جس سے میں اب بالکل بیزار ہو گیا ہوں، اس قدر سالوم الانسانیت ہے کہ دوستی کا وجود میرے نزدیک بہترین جذبہ انسانی ہے ۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ تباہیاں محبت سے پیدا ہوتی ہیں، دوستی سے نہیں۔ محبت ہماری بصارت سلب کرتی ہے اور دوستی ہماری روح کو منور بنا دیتی ہے ۔۔۔ لیکن میرا مقصد محبت سے وہ محبت ہے جو آج کل سمجھی جاتی ہے ورنہ محبت و دوستی ایک چیز ہے" (ص ۲۸، ۲۹) لیکن ایمرسن کی فکری بحث، موجودہ اور مثالی محبت میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ ایمرسن بھی افلاطونی تعلیمات سے بے حد متاثر ہے، چنانچہ وہ بھی افلاطونیت اور اپنے مذہب (عیسائیت) کے امتزاج کی کوشش کرتا ہے۔

شاید نیاز صاحب نے اپنے ہندوستانی فلسفہ اور عربی شاعری کے مطالعہ سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ ص ۱۸-۱۹ اور ۹۱ پر بلحاظ محبت میں ناکامی کو روحانیت، شاعری اور ترقی کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ نیاز صاحب کی نظر سے ویدکی یہ عبارت گذری ہو۔ "خواہشات کے دریا دل کے سمندر کے تلاطم کے لئے ضروری ہیں، ان کی تسکین کر کے انہیں خشک نہ کرو"۔ اسی طرح محبت کی شادی کے خلاف نیاز صاحب نے عرب تہذیب میں محبت کی شادی کی، چاہے وہ بنت عم ہی سے کیوں نہ ہو، سخت معیوب سمجھے جانے اور خصوصاً انشائے راز پر لڑکی کی کسی اور جگہ شادی کر دیئے جانے کا ذکر کیا ہے (ص ۱۲۴)، نیاز صاحب نے شہاب کی زبانی، مناظر قدرت (ص ۵۰، ۵۳ - ۶۲) ایک انگریزی رسالہ کی تصویر (ص ۳۸، ۳۹) تصویروں کی نمائش (ص ۱۱۱، ۱۱۵) رقص و سرود (ص ۱۲۳ تا ۱۲۶) ایک حسینہ کی بے لوثی کے عالم (ص ۱۲۵، ۱۴۶) وغیرہ کا نہایت اعلیٰ تجزیاتی بیان کیا ہے، گویا نثر میں شاعری کی ہے اور خود کو بھی جوش کی طرح الفاظ کا بادشاہ ثابت کیا ہے۔ اس میں مختلف غیر معمولی کیفیات اور تاثرات کی نہایت کامیابی سے مرقع کشی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے عدم مساوات (ص ۱۶۹) فرد اور سماج (ص ۱۷۰، ۱۷۱) تعدد ازدواج (ص ۱۴۱) وغیرہ مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، گو ان کے یہاں وہ وسعت اور گہرائی نہیں ہے جو سرت چندر چٹرجی کے ایک اور ناول میں ہے، جس میں اس نے ادارہ ازدواج، خاندان، جنسی مزاج وغیرہ بنیادی انسانی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

شہاب کے کردار میں اس کی نسوانیت اور نزاکت کے ذکر کے ساتھ ساتھ، اس کی متانت، فلسفیانہ رجحان، خودداری، اعصاب کی مضبوطی، قوت ارادی اور ہنسی سے اجتناب کی عادت (ص ۱۳۴) وغیرہ کے علاوہ سخت مزاجی (مثلاً اختر سے عشق کے باوجود، سماج کی خاطر اس کی زندگی کو ختم کر دینے کی کوشش اور خواہش) کی طرف اشارات بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ سقراط نے اپنے زمانے کی ایک مشہور طوائف کو اپنے کاموں سے نرمی اور ملائمت سے پیش آنے کی تلقین کی تھی، کیونکہ وہ زمانے کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام کی اونچ نیچ، دکھ درد، انتشار اور معاشی مواقع کے فقدان کے مدنظر، اس ادارے کو ملعون کرنا کوئی دانشمندی کی دلیل نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کو جنم دینے والے اسباب کا خاتمہ نہ کیا جائے، جیسے کہتے ہیں کہ سرزمین چین میں کیا گیا ہے۔ شہاب کا، چاندنی میں سمندر کے مدوجزر کو، ایک مقناطیسی کشش وصل سے، جو ایک سیل نور کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے، تعبیر کرنا، نہایت حسین تخیل ہے، لیکن خواتین کے ساحل اپالو کی طرف کشاں کشاں جانے کو، محض نمائش حسن اور دعوت نظارہ کی خاطر قرار دینا، بمبئی کی نسوانی آبادی کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے، جس کا ایک قوی محرک، گنجان فلیٹوں کی گھٹن سے عارضی سہی، نجات کی خواہش بھی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت سے بعید ہے کہ ان عورتوں کے اہل خاندان کا ذکر نہ کیا جائے، جن میں بچوں کے علاوہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ نسوانی نفسیات کو جاننے والے جانتے ہیں کہ

آرائش و زیبائش کی نمود کے اس کھیل کی تہ میں مردوں کی داد تحسین حاصل کرنے کی تمنا سے زیادہ، عورتوں کے مابین جذبۂ مسابقت کارفرما رہتا ہے۔ گو اس کا اثر مردوں پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ داد، علت نہیں معلول ہے، شبلی کی آنکھیں دیکھے ہوئے نیاز صاحب کا یہ نیم رومانی اور نیم کلاسکی ہیرو شہاب، اس حسین فرانسیسی رقاصہ کو کیا کہے گا، جس نے حسن متناسب سے عام محرومی کے مدنظر، عریانی کے جلوہ اور مشاہدے کو جائز قرار دیا تھا۔ بعض جگہ شہاب کے کردار کے بارے میں متضاد جملے بھی ملتے ہیں مثلاً ص ۲۱ پر وہ اپنے دوست محمود سے یہ کہتا نظر آتا ہے "دیکھو آج ہمیشہ کے لئے تم کو جان لینا چاہئے کہ میں کبھی کسی سے برہم نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص جو کبھی کسی سے کوئی توقع قائم نہ کرے نہ اس کو عالم کی کوئی چیز ناخوش نہیں کر سکتی" اب ص ۰۰ کی عبارت ملاحظہ ہو: "شہاب کو معلوم تھا کہ محمود پر اس تحریر کا کیا اثر ہوگا، لیکن وہ اپنی تمام عمر میں کسی سے برہم ہو کر پھر کبھی خوش نہیں ہوا اس لئے وہ اس مسئلہ میں بھی اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ من چہ می سرائم و طنبورہ من چہ می سراید"۔ اسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا بلند خیال فلسفی، جو اکثر نسوانی حسن کو ناقص و ناکمل اور ایک لمحے کے لئے بھی توجہ کا غیر مستحق، لہٰذا ہنگامۂ حسن و عشق کو ناقابل فہم سمجھتا ہے" (ص ۲۷) وہ ساحل اپالو پر بیٹھ کر، ایک ایک عورت کی ساری کے رنگ اور آرائش گیسو کے انداز سے ان کی وضع و مشترک معلوم کرنے کی دھن میں کیوں مگن ہے (ص ۲۷)

مصنف کے نزدیک غالباً یہ بھی ایک بڑا ہی اہم عمرانی مسئلہ ہے۔ کہیں شہاب سے ایسے اقوال و خیالات منسوب کئے گئے ہیں جو غیر حقیقی ہیں۔ مثلاً اختر شہاب اور محمود نے ایک دوسرے کا صرف ایک جھلک دیکھی ہے "لیکن شہاب اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اختر کیا سوچ رہی ہے" گویا وہ عالم الغیب بھی ہے۔ شہاب کا یہ خیال بھی کہ "نکاح کا تعلق محبت سے بالکل نہیں ہے، صرف معاشرت سے ہے، اس لئے وہ معاشرتاً کسی دوسرے کی ہو سکتی ہے لیکن روحانی لحاظ سے وہ تمہاری ہے اور ہمیشہ تمہاری رہے گی۔" شاید نیاز، اعتزاد رجبگر ہی کے لئے قابل عمل ہوگا۔

انگلستان میں بھی گبن اور مل کی زندگی میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن گبن کی شادی میں اس کا باپ آڑے آیا تھا۔ اور مل نے اپنی محبوبہ کے شوہر کی وفات پر، اس سے شادی کر لی تھی۔ اس کے علاوہ شہاب ایک بیوہ سے شادی کے بغیر بھی، اس کی مدد کر سکتا تھا خصوصاً جبکہ وہ شادی ایک عارضی مدت کے لئے تھی۔ فرد اور سماج، ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کی قربانی طلب کریں۔ دیگر کرداروں میں محمود کا کردار متضاد سا ہے۔ اس کی محبت کی شادی جو اپنے عزیز ترین دوست شہاب کی مخالفت کے باوجود کی جاتی مشترکہ خاندان کے مسائل کے مدنظر تحلیل ہو نے لگتی ہے، حالانکہ مشترکہ خاندان کا رواج اس زمانے میں عام سا تھا۔ اور پھر وہی محمود اپنے عزیز ترین دوست بلکہ ہیرو شہاب کی محبوبہ سے دھوکے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ شاعر کا انجام کے ہیرو افضال کی طرح، یہ بھی رونے کا بڑا شائق ہے۔ شہزادہ اطارہ اختر اس قدر خام، کمزور، بے بس اور بے سہارا ہے کہ وہ پہلی ہی نظر میں شہاب پر عاشق ہو جاتی ہے، اور ٹھکرائے جانے پر، شادی شدہ محمود سے نکاح کی کوشش کر کے دھوکا کھا جاتی ہے۔ کہیں وہ مجسم حیا بتائی جاتی ہے اور کہیں بری تربیت کے باعث، سماج کے لئے مہلک خطرہ، جس کی موت ہی سے سماج محفوظ رہ سکتا ہے (ص ۱۳۱) حالانکہ وہ آخر میں سماجی کارکن ثابت ہوتی ہے۔ شہاب کی سرگزشت کے مکالموں میں بھی، ادبی شاعر کا انجام والا زبان کا نقص موجود ہے۔ مثلاً سولہ، سترہ سالہ بمبئی کی اداکارہ، "بے دست تطاول" اور "فکر اندمال" اور "داعیات شباب" کی نیاز دالی ثقالت میں مبتلا ہے۔ مکالموں کی طوالت پر بھی شدید اعتراض ممکن ہے۔ کیونکہ وہ قصے کو بہت سست رفتار کر دیتے ہیں۔ معشوق کو اگر عاشق کا انتظار ہے تو ان طویل مکالموں کے باعث قاری کو بھی اسی ہجر و فراق کے عالم سے گذرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن شاید اسی باعث ان کے کرداروں کو بے عمل بتاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے مذاکرہ نما قصوں میں شاید یہ ناگزیر ہوں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، ڈرامائی مکالمات کی تکنیک نیاز صاحب نے افلاطون سے اخذ کی ہے۔ اور قصے کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ گویا یہ اس عہد کے جرمنی کے اس عام رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو تمام علوم کو افسانوی شکل میں پیش کرنے میں کوشاں تھا۔ اتفاقات اس میں بھی ہیں لیکن کمتر، مثلاً اختر کا شہاب اور محمود کے اتفاقاً بہت ہی قریب بیٹھنا، ان کی باتیں سننا، پہلی نظر میں عاشق ہو جانا، طفیل کی دوست ہونا، اور محمود کا بیوی کو چھوڑ کر واپس آنا وغیرہ۔

زبان و بیان اس میں نیاز کے پہلے ناولٹ (شاعر کا انجام) کے طرزِ بیان سے بہت بہتر ہے۔ گو کہیں کہیں جملوں کی انگریزی ساخت کھٹکتی ہے۔ مجموعی طور پر شہاب کی سرگزشت اردو ادب کے شاہکاروں میں شمار ہو سکتی ہے۔ بقول بعض یہ نیاز صاحب کی آپ بیتی ہے۔ بعض اسے نیاز صاحب کی نفسیاتی خودکلامی کا مجموعہ بتلاتے ہیں۔ کیننگ کالج (CANNING) بمبئی کے قیام اور اداکارہ کا بار بار ذکر دونوں ناولٹوں میں مشترک ہے۔ اور کچھ حد تک نیاز صاحب کی حسرتوں اور تجربوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف اور تصنیف کے درمیان آپ بیتی کا یہی رشتہ، درد و اثر کا باعث ہوتا ہے، گو یہ مصنف کی اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا بھانڈا بھی پھوڑ دیتا ہے۔ نیاز سے متاثر ہونے والوں میں نمایاں نام مجنوں گورکھپوری کا ہے۔ جن کا افسانہ "زیدی کا حشر" اسی اثر کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے نیاز کے مرکزی کردار شہاب کو سنکی قرار دیا ہے۔ اور انسانیت کے لئے غیر صحت مند۔"

ڈاکٹر سہیل بخاری

تلفظ اور اشتقاق

زبان آوازوں کا وہ بامعنی نظام ہے جس سے ہم اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے میں مدد لیتے ہیں لیکن بطون تک رسائی حاصل کرنے کے لئے آوازوں کا براہِ راست پردۂ گوش سے ٹکرانا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان کا منشائے دلی اس کے حقیقی سامع سے بھی مخفی رہ جاتا ہے جس کی وجہ کبھی متکلم کا لب و لہجہ اور تلفظ کی خامیاں ہوتی ہیں اور کبھی خود سامع کے ذہنی پس منظر کا عدم توافق بھی افہام و تفہیم میں سدِ راہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس صورت میں جبکہ اس قسم کے کوئی مزاحم حائل نہیں ہوتے۔ متکلم کی آواز کانوں میں پہنچتے ہی سامع کو اس کے خیالات و جذبات پر مکمل وقوف و آگہی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ آواز ہر جاندار کی باطنی کیفیات کو کسی نہ کسی حد تک ظاہر کرتی ہے لیکن قدرت نے آوازوں کی تفریق و تقسیم کے لئے انسانی حلقوم کے تاروں کو جو کمال بخشا ہے اور ذہنِ انسانی کو معنی آفرینی کی جو بے مثال صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس سے دنیا کے تمام ذی روح محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے آوازوں کا ایک ایسا ضابطہ مدون کیا ہے جس کے ذریعہ اس کے خیالات کا ذرا ذرا سا فرق بھی سامع پر نہایت قطعیت و صراحت کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے۔ آوازوں کے زیر و بم اور طول و اختصار وغیرہ کے علاوہ مخارج کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی جہاں صوتی عضلات و اعصاب کی قابلِ تعریف ہم آہنگی پر دال ہے وہاں ذہن کی موشگافی، فہم کی دقیقہ سنجی اور پردۂ گوش کی ذکاوتِ حس کا بھی ایک محکم ثبوت ہے۔

جس طرح آج یہ بتانا ناممکن ہے کہ فلاں زبان فلاں وقت پیدا ہوئی اسی طرح رائج الوقت لسیوں کی پیدائش کا پتہ لگانا اور ان کے آغاز پر مکمل آگہی حاصل کر لینا بھی آسانی سے ممکن نہیں۔ محققین اس وقت تک اس سلسلے میں صرف افسانے کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے ہی میں مشغول ہیں کیونکہ ان میں مختلف زبانوں کی جو آوازیں قلم بند ہوئی ہیں ابھی ان پر بھی پورے طور سے دسترس حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ سچ پوچھئے تو حروف کے ذریعے آوازوں تک پہنچنا اور پھر کسی تحریر کے مطالب سے واقفیت حاصل کرنا گویا دو مشکلات کا بیک وقت سامنا کرنے کے مترادف ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ قدیم تحریروں میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں ان سے قدیم زمانے میں وہی آوازیں مراد نہیں لی جاتی تھیں جو آج ہم لوگ عام طور پر سمجھ رہے ہیں۔ ان حالات میں کسی ایک لفظ کے صحیح تلفظ کا سراغ لگا لینا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ آوازوں کو سمجھنے کے لئے ان کا پردۂ گوش سے ٹکرانا ازبس ضروری ہے لیکن جب ان کو حروف کے پردوں میں

ملفوظ کر دیا جاتا ہے تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ میرے نزدیک جب تک آوازیں سنی نہیں جاتیں یعنی سننے کا عمل واقع نہیں ہوتا یا کم از کم اس عمل کی نقل نہیں کی جاتی ذہن ان کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ بعض اصحاب ایسے بھی مل جاتے ہیں جو تحریروں کو سمجھنے کے لئے انہیں بآواز بلند پڑھتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے علمبرداران پر ذہن کی نابختگی اور تربیت کی ناشائستگی کا کتنا ہی الزام کیوں نہ لگائیں، حقیقت یہ ہے کہ آواز کی فطرت کا اقتضا اسے سمجھنے سے پہلے سننے پر مجبور کرتا ہے چنانچہ یہ لوگ بھی کسی تحریر کو سمجھنے سے بیشتر اپنے آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

ایسے لوگوں سے قطع نظر جن کے یہاں سنانے کا عمل بالکل ظاہر اور واضح ہوتا ہے، پڑھے لکھوں کی بہت بڑی تعداد خاموشی سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کو پڑھتے دیکھ کر کم از کم ناظرین کو یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ سننے سنانے کے عمل سے بے نیاز تحریر سے افہام مطالب پر پوری طرح قادر ہیں اور ان کے یہاں حروف کے دیکھنے اور معانی کے سمجھنے میں براہ راست تعلق قائم ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بہیم مشق و مزاولت کے ذریعے وہ سخن فہمی کے لئے حروف کو بآواز بلند پڑھ کر تلفظ دل میں تبدیل کرنے سے بڑی حد تک آزاد ہو چکے ہیں تاہم وہ اس عمل کے ذہنی اعادے سے ابھی تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ یعنی وہ تلفظ جو وہ کبھی اپنی زبان سے ادا کیا کرتے تھے اور پڑھتے وقت جن مقامات پر زور دیتے تھے اب اپنے ذہنوں میں ان کی صدائے بازگشت سنتے اور اپنے حافظے کی مدد سے وہی عضلاتی اور اعصابی تحرک اور جذباتی مد و جزر محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ان کے یہاں داخلی عمل نے خارجی عمل کی جگہ لے لی ہے اور اب انہیں آوازوں کو جو کبھی انہوں نے اپنے کانوں سے سنی تھیں گوش دل سے سن کر سخن فہمی کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ تلفظ کے بغیر الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا جا سکتا، تلفظ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے اور یہ ثابت کر دیتی ہے کہ حرف پر آواز کو اور لپی پر تلفظ کو تقدم و ترجیح حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیات میں تلفظ مقصود بالذات اور یہی حصول مقصد کا محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ جو لپی حق لپی پر صرف اسی حد تک بھروسا کرتا ہے جہاں تک وہ تلفظ کا ساتھ دیتی ہے لیکن جیسے ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی زبان کے مسلّم اصولوں سے انحراف کر کے تلفظ کو مسخ کرنے والی ہے وہ اس کا کڑا محاسبہ کر کے اس کی خامیاں اور کوتاہیاں سامنے لے آتا ہے۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا ہے کہ آوازیں خطا نہیں کرتیں۔ بلکہ خطاکار صرف حروف ہوتے ہیں جو آنے والے زمانے میں کثیر تعداد غلط فہمی کے رحم و کرم سے ابتدائی تلفظ کو بدلتے بلکہ بعض اوقات ایک بالکل ہی نیا لفظ وضع کر دیتے ہیں۔

یہاں اس خیال کی تشریح کے لئے میں سامنے کے چند الفاظ پیش کرتا ہوں جن کی کتابت نے ان کے ابتدائی تلفظ کو بدل دیا ہے اور اب ہم بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ گل خپ کی اصل گل کھپ، آخروٹ کی اصل اکھروٹ۔ چھینٹا کی اصل چیکنا، غلیل کی اصل گلیل۔ غلہ کی اصل گلا۔ بغدا کی اصل بگدا۔ غناغٹ کی اصل گٹ گٹ۔ زرپانا کی اصل جھپاٹا، زق زق بق بق کی اصل جھک جھک بک بک۔ تالاب کی اصل تلاو، سرتا کی اصل سرتانا، غناغٹ کی اصل پھٹا پھٹ، قصائی کی اصل کسائی۔ قند کی اصل کنلا، کترن، قلا قلابازی کی اصل کلا، جھبرا، قلابہ کی اصل کلاوا، رکول یعنی پانی کی نالی سے) اور اہالی موالی کی اصل ہلی مالی ہے۔

جب آریہ ہندوستان میں آئے اور انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کو اپنایا تو ان کے الفاظ کو بھی ضبط تحریر میں بھی لانے لگے اور یوں ان کی تحریروں میں ان کی آبائی زبان ایرانی کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی زبانیں بھی جا برا جمان ہوئیں۔ اس ابتدائی مخلوط زبان کو ویدک کہتے ہیں جس میں رفتہ رفتہ ہندوستانی الفاظ کی تعداد زیادہ ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آگیا کہ یہ زبان ہندوستانی الفاظ کی کثرت کے باعث اپنی ابتدائی شکل سے بہت کچھ مختلف نظر آنے لگی اور یہ اختلاف کچھ اس قدر واضح ہو گیا کہ اس نئی شکل کو سنسکرت کا نام دے دیا گیا۔

ان دونوں زبانوں یعنی ویدک اور سنسکرت میں نہ صرف ایرانی بلکہ ہندوستانی الفاظ بھی حروف بدل بدل کر تحریر کئے گئے ہیں چنانچہ جب لفظ اینچ، اینچنا، اگنا کو جو ہماری زبان میں قبل دور آریہ سے رائج چلا آرہا ہے سنسکرت زبان میں داخل کیا گیا تو اس کے ابتدائی پیش کو

ات سے اور "پیچ" کے جیم کو دال سے بدل کر "اتپاد" بنا لیا گیا۔ میں نے اردو کے ابتدائی پیش کو سنسکرت اور ویدک میں "اُد" یا "اُت" اور "اُد" وغیرہ کئی سابقوں سے لکھا ہوا دیکھا ہے مثلاً اردو "اُگال" سنسکرت "اُدگار"۔ اردو "اُگھاڑنا" کھولنا، سنسکرت "اُدگھاٹن"۔ اردو "اُترنا" سنسکرت "اُدترن"۔ اردو "اُبھرنا" سنسکرت و ویدک "اُدبھرت"۔ اردو "اُٹھا" سنسکرت "اُتھتا" وغیرہ۔

غرض سنسکرت میں لفظ "اُپج" اپنی اصلی صورت میں بھی قائم رہا اور "اُت پاد" کی شکل میں بھی رائج ہوا۔ آگے چل کر سنسکرت والوں نے اردو "اُپج" کے حامیہ آغاز "اُپج" (پیدا کیا جانے والا۔ پیداوار) کو سنسکرت کا جامہ پہنایا تو اس کے ابتدائی پیش کو "اُت" سے بدل کر اور "پج" کو "پدیہ" بنا کر "اُت پدیہ" پیش کر دیا کیونکہ پراکرت گرامر نویسوں کے اصول کے مطابق سنسکرت دال اور یے کا مرکب پراکرت کے جیم مشدد کا بدل ہوتا ہے جیسے پراکرت "بجّن" (بجلی) سنسکرت "ودیت" وغیرہ۔ غرض اصول کتابت کی بدولت اردو کے لفظ "اُپج" سے سنسکرت کا ایک اور لفظ "اُت پدیہ" وجود میں آگیا۔ آج بعض محققین یہ تو کہتے ہیں کہ سنسکرت "اُت پدیہ" سے اردو "اُپج" بنا لیا گیا ہے لیکن وہ اس بات کی تشریح سے قاصر ہیں کہ سنسکرت میں اردو کا لفظ "اُپج" اپنی اصلی حالت میں کیونکر رائج ہوا۔ یعنی وہ سنسکرت سے اردو کو مشتق ثابت کرنے کی کوشش میں الٹی گنگا تو بہا رہے ہیں لیکن اس گفتگو کو کسی نتیجہ تک پہنچانے سے پہلے درمیان میں ہی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ انہیں یہ علم نہیں ہے کہ اردو کا لفظ "اُپج" خود مادہ "پج" بمعنی گرنا اور لاحقہ "اُ" الف مضموم بمعنی ضد یا برعکس سے بنا ہے جس کے معنی گرنے کے ہوتے ہیں۔

جس طرح ہماری زبان کے بہت سے الفاظ کا ابتدائی تلفظ آج ہمارے حیطۂ علم سے خارج ہو چکا ہے۔ اسی طرح محض لپی کی بدولت اردو کی دوسری معاصر زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ کا تلفظ بھی بدل گیا ہے۔ لیکن محققین سب کے سب ان کے ابتدائی تلفظ کا سراغ لگانے کے بجائے ان کے مکتوبی روپوں سے جو سنسکرت کی قدیم و جدید تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان کا تلفظ متعین کرتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے شمال میں جو ملک واقع ہے اسے ہر شخص کشمیر کہتا ہے حالانکہ اس کا ابتدائی اور اصلی نام "کیتر" یا "کامیر" تھا۔ پراکرت کے مشہور گرامر نویس لکشمی دھر نے اپنی کتاب "شڈ بھاشا چندر کا" کے سوتر نمبر ۱۔ ۴۔ ۹ میں سنسکرت لفظ کشمیر کے مقابل پراکرت کے دو الفاظ "کھا سوا" اور "کمہار" لکھے ہیں جو محض فرضی ہیں اس لئے کہ ہندوستانی (دراوڑی) زبانوں کے مشدد میم کو سنسکرت میں "شم" کے مرکب حرف سے بھی تحریر کیا گیا ہے۔ چنانچہ "کیر" یا "کامیر" کشمیر۔ اس تلفظ کی تائید میں اسی علاقہ کے دوسرے ناموں کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے ایک "بامیر" آج بھی زبان زد خلائق ہے۔

رگ وید میں ایک لفظ "سم" اور "سمیہ" دو روپوں میں نظر آتا ہے (دیکھئے سوتر نمبر ۹۔ ۰۔ ۲۔ ۲ اور ۲۔ ۳۔ ۲۱۔ ۱۱ اور ۹۔ ۵۔ ۱۵۔ ۴ وغیرہ) جہاں یہ کل یا تمام کے معنی دے رہا ہے۔ کلاسیکی سنسکرت میں اس کا ایک اور مکتوبی روپ "سمو" بھی نظر آتا ہے۔ اور اس قدر فروغ پا چکا ہے کہ برج کے علاقے میں "سبتو" کے نام کے ساتھ آج جا بجا سنا جا سکتا ہے۔ لکشمی دھر نے سوتر نمبر ۱۔ ۲۔ ۴ میں اس کا ایک فرضی پراکرت روپ "سمتو" دیا ہے جو اس نے یقینی طور پر سنسکرت روپ "سمستو" سے اپنے گھر میں بیٹھ کر تراشا ہے اور اس حقیقت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققین قدیم زمانے سے آج تک علی التواتر سنسکرت کے مکتوبی روپوں سے ہماری بھاشاؤں کے بول وضع کرتے اور ان لفظوں کے ابتدائی تلفظ پتہ لگانے کے بجائے لپی پر زور دیتے چلے آ رہے ہیں۔ پانچ سو قبل مسیح کا پاسک منی بھی اگرچہ ویدک لفظ "سم" کے وہی معنی دے رہا ہے جو اوپر بیان کئے گئے لیکن وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہے کہ یہ ہماری بھاشا کا لفظ "سبھ" (سب) ہے (ویدک میں بھاشا کے بھ اور ب کو میم سے بھی تحریر کیا گیا ہے) اس کا دوسرا ویدک روپ "سمیہ" جو کلاسیکی سنسکرت میں "سمست" ہو گیا ہے (کیونکہ ویدک میں ی اور ت بھی باہم متبادل بھی ہوتے ہیں) دراصل بھاشا ہی کا دوسرا روپ "سبھی" ہے اور جہاں شری ابولاے کے متوک ہستی "اُن" کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس سلسلے میں محققین کا ایک مشہور اشتقاق وہ ہے جس میں انہوں نے سنسکرت کے ایک ہی لفظ "سمبھو" سے ہماری بھاشا (بول چال) کے دو فرضی الفاظ "کھبو" اور "تھبو" تراشنے کی کوشش کی ہے (دیکھئے لکشمی دھر سوتر ۱۔ ۴۔ ۱۱ اور ۱۔ ۴۔ ۱۲ اور چنڈ سوتر ۲۔ ۱ وغیرہ) اور یہ صورت حال نہ

صرف پر لطف بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ علاوہ ازیں بھاشا کا مزاج یہ بتاتا ہے کہ اس کے الفاظ میں ب یا بھ سے پہلے میم - نون بالاعلان اور نون غنہ نہیں آسکتے۔ اور اس کے ثبوت میں کافی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً سنبھل کا ابتدائی تلفظ سمھل تھا۔ ویدک امبھو (پانی) کا اصل روپ امّ (آمّ انتھا جس سے راجستھان کے ایک مقام کا نام آمیر (موجودہ مکتوبی روپ آنبیر) بنا ہے کہ وہ ایک جھیل کے کنارے آباد ہے۔ سنسکرت کا لفظ امب (فارسی انبہ) آمّ۔ آم کا اور سنسکرت امبا (ماں) دراصل امّا (ماں) کا مکتوبی روپ ہے اور اردو کے لمبا یالانبا کی اصل پنجابی تلفظ لمّا رہا ہے۔ میں ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ پراکرت کے گرامر نویسوں کے دیئے ہوئے دونوں روپ کھمبھو اور تھمبھو جو آج ہماری زبانوں میں بھی کھمبا اور تھمبا کی آواز سے ادا ہو رہے ہیں۔ ابتدا میں کھمّ، کھمّا اور تھمّ تھمّا (تھمنا۔ تھامنا) بولے جاتے تھے۔ میں نے ان کو رگ وید میں سکمبھو اور ستمبھو لکھا ہوا دیکھا ہے جس میں بھاشا کے کھ کو سک کے مرکب سے اور تھ کو ست کے مرکب سے تحریر ہوا ہے اور میم مشدد مبھ کے مرکب سے لکھا گیا ہے۔ لیکن گرامر نویس ان میں سے صرف ایک ہی لفظ ستمبھ سے واقف ہیں اس لئے اسی ایک لفظ سے پراکرت کے دو لفظ مشتق کرکے ایک پتھر سے دو چڑیاں مار رہے ہیں۔

دیشی لفظوں کے بیان میں لفظ "سنسکرت" کا حال بھی سن لیجئے جس سے آج کل عام طور پر محض زبان مراد لی جاتی ہے۔ اس لفظ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ زبان کے معنوں میں پہلی بار بالمیک کی رامائن میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کے معنی "شستہ و رفتہ"، "منظم و مربوط" اور "لوگ پلک سے درست" وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں لیکن اس کا ابتدائی تلفظ کیا تھا۔ یعنی یہ کس لفظ کا بدل ہے یہ آج تک نہیں بتایا گیا البتہ لکشمی دھر نے سوتر نمبری ۱۔ ۴۔ ۹ میں اس کا فرضی پراکرت روپ "سکمّ" دیا ہے جو مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں کبھی نہیں بولا گیا لیکن لفظ "سنسکرت" رگ وید کے سوتر نمبری ۱۔ ۸۔ ۳ میں ملتا ہے اور زنجیر کے معنی دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے "اشواس ایشام سوسنسکرتا ابھی شو" (تمہارے رتھوں کے دھرے پائدار ہو جائیں اور ان (رتھوں) کے گھوڑے اچھی "سنسکرت" والے ہو جائیں) اس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لفظ (سنسکرت) بھاشا کے لفظ "سانکل" کا بدل ہے جس کی ر دی حسب دستور حشوی ہے اور کاف سے قبل کا س بھی ایزادی ہے۔ جیسا کہ سنسکرت کے اکثر مرکبات میں نظر آتا ہے اور جس کے ایزادی ہونے کا یاسک منی بھی قائل ہے مثلاً سرسوتی۔ سرد در (مثلاً مان سرد در جھیل وغیرہ) اس کے علاوہ آخری ت بھی ل کا بدل ہوتا ہے جیسے کرتالی کلانی (کلادن یعنی فنون کا) وغیرہ۔ لفظ سانکل ہی سے ایک اور لفظ "شرنکھل" بھی سنسکرت کے آگے پیچھے بنایا گیا ہے اور لکشمی دھر صرف اسی سے واقف ہے کیونکہ وہ سوتر نمبری ۱۔ ۲۔ ۱۲ میں شرنکھل کو سانکل کا ماخذ قرار دیتا ہے۔

جس زمانے میں لفظ "سنسکرت" (سانکل بمعنی مربوط) کو مکتوبی زبان کے لئے استعمال کیا گیا اسی زمانے میں اس کے مقابلے پر ہندوستان کی بھاشاؤں کو پراکرت (بھانکل بمعنی بھانک بھانک۔ غیر مربوط) کا نام عطا کیا گیا لیکن لکشمی دھر سوتر نمبری ۱۔ ۱۔ ۲۹ میں اس کے مقابل پراکرت کے دو متبادل روپ "تمّ" اور "تامّ" اور میم چندریتیم اور رپایم دیتا ہے جو سب کے سب فرضی ہیں اور جو ہندوستان کی کسی بھاشا میں اور کسی عہد میں بھی نہیں بولے گئے۔

یہ بیان ان چند دیسی الفاظ کا ہے جنہیں ویدک و سنسکرت میں محض اصول کتابت کی رو سے حروف بدل بدل کر تحریر کیا گیا جس سے ان کا تلفظ بالکل بدل گیا اور جب محققین نے ان کے سنسکرت روپوں سے انہیں دوبارہ بھاشا کے روپوں میں ڈھالا تو یہ اپنے ابتدائی تلفظ سے اتنی دور جا پڑے کہ اب ان کی دونوں شکلوں میں کوئی نسبت ہی نہیں رہی۔ مختصر طور پر ان کے اشتقاق کی تاریخ یوں مرتب ہوتی ہے۔

(۱) بھاشا ایک۔ سنسکرت ایج اور ات پدیہ۔
(۲) بھاشا کیتر یا کامیرہ۔ ویدک و سنسکرت کشیرہ۔ پراکرت کھار وا اور کمبھار وہ۔
(۳) بھاشا سمھل۔ ویدک سمبیہ۔ سنسکرت سمت۔ کتابی پراکرت سمتو۔
(۴) بھاشا کھم۔ کھمّا۔ تھمّ۔ تھمّا۔ ویدک سکمبھ۔ ستمبھ۔ سنسکرت ستمبھ۔ کتابی پراکرت کھمبو۔ تھمبو۔
(۵) بھاشا سانکل۔ ویدک سنسکرت۔ سنسکرت۔ شرنکھل۔ کتابی پراکرت سکمّ۔

(۶) بھاشا بھانگل۔ سنسکرت پراکرت۔ کتابی پراکرت پتمؑ، پاتمؑ، پتیمؑ، پاپیم

اب میں دیسی الفاظ کا بیان ختم کر کے چند ایرانی الاصل الفاظ پیش کرتا ہوں۔ جن کے اشتقاق میں محققین کی کوششوں نے عجیب و غریب گل کھلائے ہیں یعنی ان سے انہوں نے ہماری بھاشاؤں کے الفاظ تو متخرج کر ڈالے لیکن دونوں کے تلفظ میں جو فرق ملتا ہے اس پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ نتیجے میں ایسے انمل بے جوڑ الفاظ کے جوڑے ہمارے سامنے آ گئے ہیں کہ ان میں کسی سنجیدہ انسان کو کوئی مادرانہ یا پدرانہ رشتہ نظر نہیں آتا۔ ان روپوں پر غور کرنے سے پیشتر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ لاطینی اور ویدک یا سنسکرت زبانوں کی کوئی زندہ روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے یعنی یہ زبانیں آج دنیا کے کسی علاقے میں نہیں بولی جاتیں جبکہ زبان ایرانی (فارسی جدید) ہمارے سامنے زبان کی ایک زندہ روایت کے طور پر آج بھی موجود ہے۔ لامحالہ ان کے مشترک الفاظ کا صرف وہی تلفظ جو ایرانی میں پایا جاتا ہے ان کا حقیقی اور ابتدائی تلفظ تسلیم کرنا ہوگا۔

محققین کا خیال ہے کہ اردو زبان کا لفظ "ہم" سنسکرت کے لفظ "اہم" سے نکلا ہے لیکن یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ سنسکرت کی ابتدائی ہمزہ اردو کے لفظ سے غائب ہے۔ اس کے لئے ان کا کہنا ہے کہ کثرت استعمال سے گھس گھسا کر جھڑ گئی ہے۔ جب دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سنسکرت "اہم" واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اردو "ہم" جمع کے لئے تو جواب ملتا ہے کہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ یہ گڑبڑ بھی ہو گئی ہے۔ لیکن اس بات کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ اوستا میں اس لفظ کا تلفظ "ازم" نظر آتا ہے۔ یعنی سنسکرت کی "ہ" قدیم ایرانی کے "ز" کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ یونانی میں اور لاطینی میں "اگو" لکھا ہوا ہے یعنی اوستائی "ز" یونانی لفظ کے گاما اور لاطینی کے "جی" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس بات کے ثبوت میں کہ یونانی گاما ایرانی "ز" کی آواز دیتا ہے، چند مزید مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ سنسکرت جن (زن۔ نسل) لاطینی جنس (زنس) یونانی گنس (زنس)۔ ویدک گنا (زنا)، فارسی جدید زن۔ یونانی گنے (زنے) وغیرہ۔ چنانچہ تلفظ کے اعتبار سے مختلف ہند یورپی زبانوں میں اس لفظ کے روپ یوں ہوں گے۔ اوستا ازم (میں)، سعدی بولی ازد۔ یونانی ازد۔ لاطینی ازد۔ سنسکرت و ویدک ازم۔ ایسی صورت میں اس لفظ کو اردو "ہم" کا ماخذ کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

عام طور پر پراکرت کے تمام گرامر نویس اور موجودہ زبانوں کے محققین اردو "ہاتھ" (پراکرت ہتھ) کو سنسکرت کے "ہست" سے مشتق دکھاتے ہیں (دیکھئے لکشمی دھر سوتر ا۔۴۔۴ اور کیلاگ ص ۳۴ اور سبزواری ص ۱۴۳) حالانکہ اوستا میں سنسکرت "ہست" کا تلفظ "زست" ملتا ہے (دیکھئے اوستا پرائمر جیکسن قاعدہ نمبری ۱۶۹) یعنی سنسکرت کی ہائے ہوز ایرانی "ز" کی بدستور نمائندگی کر رہی ہے۔ فارسی قدیم میں اسے "دست" لکھتے تھے۔ جہاں سے یہ فارسی جدید میں منتقل ہوا ہے۔ اتھرب وید میں بھی اسے "دہست" لکھا گیا ہے لیکن اس لفظ کے صحیح تلفظ کی چھان بین کئے بغیر گرامر نویسوں اور محققوں نے سنسکرت کے مکتوبی روپ کو سامنے رکھ کر اس سے اردو کے لفظ کا اشتقاق دکھا ڈالا۔ لیکن اس کی اصلیت چاہے "زست" ہو چاہے "دست" اسے اردو ہاتھ یا پنجابی ہتھ کا ماخذ نہیں مانا جا سکتا۔

لکشمی دھر پراکرت "سوم" کو سنسکرت "سرد" سے مشتق بتاتا ہے (سوتر ا۔۸۔۸۶) اور اردو "سب" کو کیلاگ (ص ۱۲۷) اور سبزواری (ص ۱۲۳۔۲۶۵) بھی "سرد" سے ہی ماخذ دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ اوستا میں "ہرُوم" اور یونانی میں "ہولس" لکھا ہوا ملتا ہے۔ ان تمام روپوں میں سین یا ہائے ہوز کے بعد یا اس کا بدل ل بنیادی آواز ہے۔ لیکن یہ آواز اردو لفظ "سب" سے یکسر مفقود ہے۔ اس کی جگہ اردو لفظ میں سین کے بعد ب بنیادی آواز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اس لفظ کا صحیح اور ابتدائی تلفظ سرد۔ ہرُوم۔ ہولس میں سے کسی کو مان لیا جائے اردو "سب" کا اس سے اشتقاق بالکل بے معنی سی بات ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اردو "سب" رگ وید میں جا بجا "سم" کے روپ میں ملتا ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

سونے کے معنوں میں "سوپ" اور اس کا حاصلیہ تمام "سوپن" (خواب) سنسکرت و ویدک کے کثیر الاستعمال الفاظ ہیں۔ "سوپن" سے وررو دچی سوتر ا۔۳ میں پراکرت کے الفاظ "سوونے"۔ لکشمی دھر سوتر ا۔۴۔۱۰۲ میں "سوسنے" اور "سیمنے"۔ ہیم چندر سوتر ۲۔۱۰۰ تا ۱۱۵ میں "سوونو" اور چنڈ سوتر ۲۔۱۵

میں "بھیتے" اور "بھینے" مشتق دکھاتا ہے۔ اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب کے ص ۲۸۹ پر "سوپ" سے اردو "سو" اور ص ۱۲۰ پر "سوپن" سے اردو "سونا" کو اخذ کرتے ہیں۔ لیکن "سوپن" کا ایرانی تلفظ اوستا میں "خوفن" اور "ہوفن" لکھا ہوا ہے۔ جو آج بھی فارسی جدید میں خواب، خوابیدن اور خفتن کے روپوں میں دکھائی سنائی دے رہا ہے۔ ایسی صورت میں "خوف" سے "سو" اور "خوفن" سے "سونا" کا اشتقاق کیونکر درست مانا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سنسکرت لفظ "شُشک" جس کا صحیح تلفظ فارسی جدید میں "خشک" سنائی دیتا ہے اردو کے لفظ "سوکھا" کا ماخذ نہیں ہو سکتا لیکن لکشمی دھر سنسکرت "شُشک" سے سوتر ۱۔ ۴۔ ۸۶ میں پراکرت "سُکو" اور سوتر ۱۔ م۔ ۱۱ میں "سُوکو" اور "سُوکھو" کا اشتقاق دکھاتا ہے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۲۰ پر "سوکھا" اور ص ۲۸۹ پر "سوکھ" کو اس سے ماخوذ بتاتے ہیں بلکہ ایک وہی کیا سنسکرت کا ہر ڈراما نگار پراکرت "سوکھ" یا "سکھ" کو سنسکرت "شُشک" ہی سے نکالتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ سنسکرت میں اس کا فعل بھی کثیر الاستعمال ہے۔ مثلاً "شوشیتی" (وہ خشک کرتا ہے) اور فارسی جدید میں بھی مادہ "خش" یا "خوش" سے کچھ الفاظ مثلاً "خوشتہ" وغیرہ بنتے ہیں چنانچہ "خش یا خوش" سے اردو "سوکھ" یا "سوکھا" کا اشتقاق قطعاً نادرست ہے۔

ویدک و سنسکرت "بھراتر" یونانی میں "پھراتر"، لاطینی میں "فراٹر"، ڈچ میں "برودر"، انگریزی میں "برودر" اور فارسی جدید میں "برادر" بولا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا مادہ "بر" اور اس کا لازمی و بنیادی حرف "ر" ہے جو کسی زبان میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔ لیکن وررچی سوترہ۔ ۴۴ میں سنسکرت "بھراتر" سے پراکرت کا ایک فرضی روپ "بھار" تراش رہا ہے جو ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں بولا جاتا بلکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۱۵ پر اسی سے اردو کا "بھائی" بھی براہ راست مشتق بتا رہے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ لفظ "بھائی" اردو کے ایک آزاد مادہ "بھا" سے مشتق ہے جس سے اردو کے اور بھی بہت سے الفاظ مثلاً بھانا، بھاوَن (بھین، بہن)، بھلا (بھلا، بھلائی) وغیرہ نکلے ہیں۔ اور جس کا سنسکرت مادہ "بھر" یا فارسی مادہ "بر" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اردو کے لفظ "دودھ" کو (پراکرت دودھ) کو سنسکرت کے تمام ڈراما نگار اور پراکرت کے تمام گرامر نویس سنسکرت کے لفظ "دُگدھ" سے نکالتے ہیں (دیکھئے لکشمی دھر، سوتر ۱۔ ۴۔ ۸۶) انہیں کی بات ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی ص ۱۵۹ پر دہرائی ہے لیکن "دودھ" کا "دُگدھ" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ "دُگدھ" ہند یورپی زبان کا حالیہ تمام ہے جس کا مادہ "دوغ" فارسی جدید میں عام طور پر مستعمل ہے۔ اس اعتبار سے سنسکرت "دگدھ" کا حقیقی تلفظ "دغد" اور سنسکرت "مگدھ" (مادہ مح بمعنی مخمور ہونا) سے اکا تلفظ "مغد" ہے لیکن اس "مغد" سے ڈاکٹر سبزواری ص ۱۱۵ پر اردو لفظ "بھوندو" کا اشتقاق دکھا رہے ہیں۔ بلکہ ص ۲۷۹ پر اردو "جوڑنا" کی اصل سنسکرت "یکت" بتلاتے ہیں۔ جس کا حقیقی تلفظ "یغد" یا "یخت" ہے اور جو ایرانی زبان کے مادہ "یوغ" (ایل کا جوا) کا حالیہ تمام ہے اور یہ "یوغ" وہی ہے جسے یونانی میں "زگن"، لاطینی میں "جگم"، گاتھک میں "جوک" اور انگریزی میں "یوک" لکھتے ہیں چنانچہ "یغد" یا "یخت" سے اردو "جوڑ" کا اشتقاق دکھانا مشرق و مغرب کے دو سروں کو ملانے کے مترادف ہے۔

ہماری زبان کے لفظ "گھی" کو تمام گرامر نویس سنسکرت کے لفظ "گھرت" سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکشمی دھر سوتر نمبر ۱۔ ۲۔ ۴ میں "گھرت" کا پراکرت روپ "گھیم" اور چنڈ نے سوتر نمبر ۲۔ ۵ میں "گھتم" لکھا ہے۔ اور یہ دونوں روپ فرضی ہیں۔ جو کہیں بولے نہیں جاتے۔ ڈاکٹر سبزواری نے ص ۱۱۵ پر سنسکرت "گھرت" سے اردو "گھی" کا براہ راست اشتقاق دکھایا ہے حالانکہ سنسکرت لفظ "گھرت" کا صحیح تلفظ ایرانی زبان میں "غرت" ہے۔ اور "غرت" اور "گھی" کے تلفظ میں کوئی ایک آواز بھی مشترک نہیں ہے۔ سنسکرت کے ہر ڈرامے میں ایک ایسے ہی لفظ "گرت" کا پراکرت متبادل "گڈ" (گاڑی) ملتا ہے۔ جبکہ سنسکرت لفظ کا صحیح ایرانی تلفظ "غرذ" ہے۔ ادھر "گھی" سے مشابہ بھاشا کا ایک لفظ "دھی" (دہی) ہمارے یہاں عام طور پر رائج ہے جسے ڈاکٹر سبزواری ص ۱۲۲ پر سنسکرت "دھتر" سے مشتق گردان رہے ہیں جبکہ سنسکرت کے لفظ کا صحیح تلفظ فارسی "دغز" میں ملتا ہے جسے یونانی میں "تھغتیر" گاتھک میں "دوھتر" اور انگریزی میں "دوغتر" لکھتے ہیں۔ پھر یہ تضاد اشتقاق بھی قابل غور ہے کہ اردو "گھی" کا ماخذ تو سنسکرت "گھرت" بتایا جاتا ہے اور اردو "دھی" کی اصل سنسکرت "دھتر" بیان کی جاتی ہے یعنی اردو الفاظ ہم قافیہ ہیں لیکن ان کے نام نہاد ماخذات میں ایسا کوئی اشتراک نہیں ملتا۔

اردو "آٹھ" کی اصل پراکرت "اٹھ" ہے۔ جسے پراکرت کے تمام گرامر نویس اور سنسکرت داں بلا استثنا سنسکرت "اشٹ" سے ماخوذ کہتے ہیں لیکن سنسکرت "اشٹ" کو اوستا میں "اشت" اور فارسی جدید میں "ہشت" بولتے ہیں، اس کے علاوہ یونانی میں اسے "اکتو" لاطینی میں "اوکٹو" آرش میں "ادجٹ"، جرمن میں "اچٹ"، گاتھک میں "احتن" اور انگریزی میں "ایٹ" لکھا جاتا ہے اور ان سب کے تقابل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ہند یورپی زبان کا حالیہ تمام ہے جس کا مادہ فارسی "ہش" ہے۔ ادھر پراکرت "اٹھ" کو بھی اگر حالیہ تمام مان لیا جائے تو اس کا مادہ "اٹھ" رہ جاتا ہے لیکن "ہش" اور "اٹھ" میں کوئی نسبت نہیں۔

لوگ عام طور سے سنسکرت "تاپ" (گرمی) کو اردو "تاؤ" کا ماخذ بتاتے ہیں (دیکھئے اردو زبان کا ارتقاص ۱۲۷) لیکن یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ دونوں دو الگ الگ اور آزاد مادوں سے بنے ہوئے لفظ ہیں۔ اردو "تاؤ" اردو ہی کے مادہ "تا" (تانا۔ گرم کرنا) سے مشتق ہے اور سنسکرت "تاپ" (فارسی تاب۔ تاف) کا مادہ ایرانی تلفظ کے مطابق "تپ" یا "تف" ہے اور یوں "تا" اور "تپ"۔ "تف" میں دور کا علاقہ بھی نہیں ہے۔

مشہور پراکرت گرامر نویس وررچی نے سنسکرت "جاماتر" سے پراکرت کے دو الفاظ "جامائرم" (سوتر ۵۔ ۴۴) اور "جاماآ" (۵۔ ۳۵) ترلشتے ہیں اور دونوں کے دونوں آج کی زبانوں میں غیر مستعمل ہیں البتہ ہمارے یہاں "جنوائی" کا لفظ عام طور پر رائج ہے جس کے ابتدائی جیم پر پیش بولا جاتا ہے۔ اس لئے "جامات" سے "جنوائی" کا اشتقاق درست نہیں مانا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس اشتقاق میں بھی حسب معمول تلفظ کی بہت بڑی رکاوٹ آپڑتی ہے۔ یعنی سنسکرت "جامات" کا صحیح تلفظ ایرانی "داماد" ہے جسے اوستائی لہجے کے مطابق زیادہ سے زیادہ "زامات" کہہ دیا جائے لیکن "زامات" اور "جنوائی" میں پھر بھی بعد المشرقین رہے گا اور یہ اشتقاق نادرست ہی مانا جائے گا۔

اب میں ذیل میں مندرجہ بالا ایرانی الفاظ کے اشتقاق کو مختصر طور پر ترتیب وار پیش کرتا ہوں۔

(۱) ویدک اہم۔ اوستا ازم۔ فارسی قدیم ادم۔ یونانی ازو۔ (جسے آج کل اردو میں ایگو یا ایغو بولتے ہیں) سغدی ازو = اردو ہم

(۲) رگ وید ہست۔ اتھرب وید دہست۔ اوستا زست۔ فارسی قدیم دست = اردو ہاتھ۔

(۳) ویدک سرو = اوستا ھرُوم۔ فارسی جدید سرون = اردو سب

(۴) ویدک سوپ۔ سوپن = اوستا خوفن۔ خوفن = اردو سو۔ سونا۔

(۵) ویدک شُشک = فارسی جدید خشک = اردو سوکھا۔

(۶) ویدک بھراتر = فارسی جدید برادر = اردو بھائی۔

(۷) ویدک دگدھ = ایرانی دغد (دوغ سے) = اردو دودھ (لفظ دودھ رگ وید میں دوہر لکھا ہوا ملتا ہے)

(۸) ویدک مگدھ۔ ایرانی مغد (مغ سے) = اردو کھوندو

(۹) ویدک گھرت = ایرانی غرت = اردو گھی

(۱۰) ویدک گرت = ایرانی غرده = اردو گاڑی۔

(۱۱) ویدک دھتر = ایرانی دختر = اردو دری۔

(۱۲) ویدک اشٹ = اوستا اشت۔ فارسی جدید ہشت = اردو آٹھ

(۱۳) ویدک تاپ = فارسی جدید تاب۔ تاف = اردو تاؤ

(۱۴) ویدک جامات = اوستا نامات۔ فارسی جدید داماد = اردو جنوائی۔

ان اشتقاقی کوششوں کو دیکھکر کہ جن کے ماخذات و مشتقات کے تلفظ میں زمین آسمان کا فرق نظر آرہا ہے کون ذی ہوش ایسا ہوگا جو

بوہنچا کا نہیں رہ جائے گا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققین نے از منہ قدیم سے آج تک ویدک و سنسکرت الفاظ کے مکتوبی روپوں ہی کو پیش نظر رکھا اور ان کے حروف سے وہی آوازیں مراد لیں جو آج علی العموم متصور ہوتی ہیں۔ یعنی انہوں نے ان کے حقیقی تلفظ کو نظر انداز کر دیا اور سنسکرت الفاظ سے ملتے جلتے بھاشا کے الفاظ تلاش کر کرکے لکھتے چلے گئے اور اسے اشتقاق کا نام دے دیا۔ اس سلسلے میں پراکرت کے گرامر نویسوں کو ایک حد تک معذور سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ نہ انہیں زبانوں کے اس بڑے خاندان کا علم تھا جسے آج ہند یورپی کہا جاتا ہے۔ اور نہ تقابلی لسانیات کی امداد ہی حاصل تھی البتہ حیرت دور حاضرہ کے محققین پر ہوتی ہے جنہیں قدما کی بہ نسبت بہت زیادہ سہولتیں حاصل ہیں اور پھر بھی وہ تحقیق کے اسی طرز فکر کو اپنائے ہوئے ہیں جو محدود وسائل رکھنے والے متقدمین نے مجبوراً اختیار کر لیا تھا۔

آج کا محقق اپنے پیشروؤں کی طرح زبان کے صرف مکتوبی روپوں کو مقدم جان کر ان کی اصل کا سراغ لگائے گا۔ وہ انہیں کی طرح ناکام رہے گا۔ کیونکہ آج لسانیات میں تلفظ کو جو مقام حاصل ہے کل تک وہ اس سے محروم تھا اور زبان کا مطالعہ جسے لسانیات کہا جاتا ہے۔ صرف صوتیات اور تلفظ کے اصول دریافت کرنے اور سمجھنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم تحریروں اور قدیم زبانوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں لپیوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں ابتدا میں کہہ آیا ہوں ہمیں لپیوں کی صحت و عصمت پر سو فی صدی ایمان نہیں رکھنا چاہئے کہ یہاں خطا کار و فریب کار بھی ہوتی ہیں۔ بلکہ کم از کم ہندوستانی زبانوں کی قدیم تحریروں کے سلسلے میں تو یہاں تک کہہ دینے میں بھی کوئی ہرج نہیں ہے کہ ان کی فریب کاری ہی مطالعہ زبان میں ہمیشہ سے سد راہ رہی ہے۔

اس مقالے میں جن کتب کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) لکشمی دھر۔ شڈبھاشا چندرکا مطبوعہ نرنے ساگر پریس بمبئی ۱۹۱۶ء
(۲) وررو چی۔ پراکرت پرکاش۔ مرتبہ پی۔ ایل۔ ویدیہ شائع کردہ اورینٹل بک ایجنسی پونا ۱۹۳۱ء
(۳) چنڈ۔ پراکرت لکشن۔ مرتبہ ہورنلے مطبوعہ بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۸۰ء
(۴) ہیم چندر۔ پراکرت گرامر مرتبہ پی۔ ایل۔ ویدیہ مطبوعہ ۱۹۲۸ء
(۵) بیلیس۔ گرامر آف دی ہندوستانی مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ۱۹۴۱ء
(۶) کیلاگ۔ گرامر آف دی ہندی لینگویج مطبوعہ امریکن پریسبٹیرین پریس الہ آباد ۱۸۷۶ء
(۷) ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا مطبوعہ دی سٹی پریس ڈھاکا ۱۹۵۶ء

مزید جن کتابوں سے مدد لی گئی ان کی تفصیل یہ ہے،

(۸) ولیم جیکسن۔ اوستا گرامر مطبوعہ اشٹ گارڈ ۱۸۹۲ء
(۹) جوزف رائٹ۔ یونانی زبان کی تقابلی گرامر مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۱۲ء
(۱۰) ہڈسن ولیمس۔ تقابلی گرامر کے مطالعے کا مختصر تعارف مطبوعہ یونیورسٹی آف ویلس پریس کارڈف ۱۹۳۵ء

صفیہ نسیم

کرشن چندر کا فنی شعور

اردو افسانہ نگاری کے عہد جدید میں کرشن چندر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ غیر فانی عظمت اور لازوال شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت اہم ادبی خصوصیات سے مالا مال ہے۔ اور وہ اس دور کے سب سے بلند، ہر دلعزیز اور مقبول فن کار ہیں۔ انہوں نے ایک عہد آفریں شان کے ساتھ افسانہ کے میدان میں قدم رکھا اور اب ان کی اپنی حیثیت بھی ایک عہد ہی کی سی ہوگئی ہے۔ ان کے افسانوں نے جس قدر نئی نسل کے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔ اتنا پریم چند کے علاوہ اور کسی نے نہیں کیا۔ اور وہ جگہ کرشن چندر نے حاصل کرلی، جو پریم چند کے لئے مخصوص تھی۔ اردو افسانہ میں اصلاح پسندی کے رجحانات اور ادب میں سماجی شعور کی آواز پریم چند اور ان کے دور نے بلند کی تھی۔ افسانہ کا موضوع شہزادوں اور محلوں کی داستانوں کے بجائے، دیہاتوں و شہری عوام اور نچلے طبقے کے لوگوں کے درمیان پہونچ گیا تھا۔ اردو افسانہ رومانی مادرائیت سے نکل کر چند ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی عہد میں کرشن چندر نے افسانہ کے میدان میں قدم رکھا اور ان کے زیر اثر ہمارے افسانے پر رومانیت کی چھاپ گہری ہوگئی۔ پھر بھی تمام افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند اپنے آخری دور میں ترقی پسند تحریک کی طرف رجوع ہوگئے تھے۔ یہ اس تحریک کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ کیونکہ پریم چند کے ہی اثر سے ترقی پسند افسانے میں ہمت اور حقیقت نگاری کی وہ صلاحیت پیدا ہوگئی جو ترقی پسند ادب کا سب سے اہم اور کامیاب پہلو ہے۔ اگر پریم چند اس تحریک سے وابستہ نہ ہوتے تو ہمارے وہ افسانہ نگار جنھوں نے ان کے افسانوں کو مشعل راہ بنایا ہے، کیا کرتے۔ پریم چند کی قائم کردہ روایات کو زندہ رکھنے اور ان کے فن کو زیادہ نکھار، سنوار کر پیش کرنے والوں میں پہلا نام کرشن چندر کا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی انسان دوستی اور خلوص ہے جو ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہے۔ اور جس پر ان کے تخیل اور فن کا دارومدار ہے۔ ان کے اسی پرخلوص طرز تحریر اور انسانیت نوازی کی وجہ سے ان کی ترقی پسندی اور حقیقت کی عریاں عکاسی دل آزاری کا باعث نہیں بنتی۔ بلکہ دل کو متاثر کرکے اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ ترقی پسندوں میں یہ خصوصیت ذرا کم ہی ملتی ہے اور جو غیر معمولی مقبولیت کرشن چندر کے افسانوں کو حاصل ہوئی، ان کی کہانیوں کے ترجمے بہت سی غیر ملکی زبانوں کے علاوہ اپنے ملک کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی شخصیت غیر محدود ہے۔ وہ صرف ایک زبان یا ایک ادب میں نہیں سمیٹی جاسکتی۔ بلکہ اس کا تعلق پورے ملک اور ساری انسانیت سے ہے۔ اسی لئے ان کی کہانیاں، اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ ہر زبان میں یکساں مقبول ہیں۔ زندگی کے بارے میں کرشن چندر کا نظریہ اشتراکی ہے۔ اور اشتراکیت کو ہی وہ ہر دکھ کا مداوا سمجھتے ہیں لیکن اشتراکیت کے مخالف بھی کرشن چندر کو پسند کرتے ہیں اور ان کی کہانیوں کو احترام و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کرشن چندر کا فنی خلوص

ہے۔ اپنی انسانیت اور انسان دوستی ہی نے کرشن چندر کے دل میں مظلوموں سے سچی ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ وہ جو کچھ لکھتے، بہت خلوص کے ساتھ اور بالکل بے جھجک ہو کر، ان کے خلوص و ہمدردی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کے افسانوں کا موضوع مظلوم انسان ہے اور اس سے ہمدردی، جس کی بنیاد ایک طرح کی رومانیت پر ہے، اس ہمدردی کی مستحق ان کی نظر میں مزدور مرد سے زیادہ مزدور عورت ہے اس لئے کہ ہمارے ملک میں صرف جنسی لحاظ سے نہیں بلکہ طبقاتی لحاظ سے عورت کے ساتھ بڑا ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ایسے سینکڑوں افسانے لکھے ہیں جس میں ہندوستانی عورت کی مظلومیت تباہی و بربادی کی داستانیں سنائی ہیں۔ یہ کرشن چندر کا محبوب موضوع ہے۔ اور ان کے سحر طراز قلم نے بڑی جدت و تنوع کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے۔

کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو پڑھنے والا اپنے ہی دل و دماغ کی کاوش سمجھنے لگتا ہے۔ اور سب کچھ بھول کر اپنے کو اسی کا ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ ان کے انداز کی دلکشی قاری کو محو کر دیتی ہے۔ خیال و بیان کی لطیف رعنائیوں کے ساتھ انہوں نے اپنی انفرادیت کو افسانہ کے پیکر میں نمایاں کیا ہے، زندگی کے تلخ حقائق پر ان کی نگاہ بہت گہری پڑتی ہے۔ اور بڑے فکری انداز میں وہ سماجی کش مکش کی مصوری کرتے ہیں۔ انسانی زندگی و سیرت کے مختلف پہلو وہ بڑے مؤثر پیرایہ میں اجاگر کر دیتے ہیں۔ ان کا فن پر تاثیر ہے اور اس کے اثرات نہ مٹنے والے ہیں جو ان کے افسانوں میں صاف ظاہر ہے۔ اور جس کا اثر کوئی بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھلا سکتا۔ کردار نگاری کا کرشن چندر کو بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ انسانی فطرت کے وہ بہت بڑے نباض ہیں۔ اور زندگی کا ایک بلند اخلاقی تصور رکھتے ہیں۔ ان کا دردمند دل ہر طرح کے تعصبات سے پاک ہے اگر کوئی تعصب ہے تو اچھے اور برے کا۔ وہ ہر اس واقعہ کو اپنا موضوع بنا لیتے ہیں جس میں ان میں انسان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ قحط بنگال، یہ ان کی کہانیوں کا موضوع رہا ہے۔ فسادات پر بھی انہوں نے افسانے لکھے۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں وقتی تقاضوں ہی کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ مگر ان کا خلوص اور شدت احساس نے ان کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اپنا افسانہ پڑھنے والوں کو دنیا کی تلخیوں سے دوچار کرا دینا کرشن چندر اپنا فرض سمجھتے ہیں، مگر ان کے افسانہ کی فضا رومانی ہوتی ہے، رومان کو انہوں نے اپنے فن میں بنیادی جگہ دی اور ابھی تک ان کی کہانیوں پر رومانیت کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ افسانہ کی فضا اور مناظر کی آراستگی ہے۔ منظر نگاری میں کرشن چندر کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ مناظر قدرت کے رنگ و بو ہی سے عموماً وہ اپنے افسانوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں، دوسرے وہ مناظر اور اس کی ہر چیز رومانیت کی تہہ میں لپٹی نظر آتی ہے۔ ان کے کردار ہر واقعہ سے متاثر ہو کر شاعری کرنے لگتے ہیں۔ ان کی تقریریں بالکل جذباتی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کے افسانے میں شاعری، جذباتی تقریریں، مناظر قدرت کی آراستگی، سرو شمشاد اور شمالو کے درخت انار کی کلیاں، انہی چیزوں کی باتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ رومانی عناصر کی چھاپ ان کے یہاں گہری ہے۔ اور رومان و حقیقت کا بڑا دلکش امتزاج ان کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے افسانوں کے لئے رومان کا لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے جو اصلیت سے دور ایک تخیلی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں بھی وہ حقیقت سے دور نہیں ہوئے تھے۔ حالانکہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز انہوں نے رومانویت ہی سے کیا۔ زمانہ کے ساتھ ان کا سماجی شعور زیادہ بیدار اور حقیقت کا ادراک زیادہ واضح ہوتا گیا۔ لیکن ایک رومانی کی حیثیت سے ان کا فن اب بھی رومانیت کے زیر اثر ہے۔ ان کا سماجی شعور ان کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ بڑے جذباتی ہیں اور ذرا سے واقعہ پر تقریر کرنے لگتے ہیں۔ موجودہ سماج اور معاشی نظام سے انتہائی نفرت کا جذبہ، تنگ نظر سماج کی ناانصافیاں، دلکش رمزیہ نگاری اور انسانی نفسیات کا عمیق مطالعہ ان کے افسانوں کی خاص خوبیاں ہیں، سماج کے ظلم و ناانصافی، جھوٹی مذہب پرستی اور سرمایہ داروں کی خود غرضی کو کرشن جی نے اپنے فن میں رومان و حقیقت سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں شعریت، رومان، خوشنما رنگوں اور خوبصورت نغموں کی شکل میں زندگی کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مگر

دیہات اور کسان کے بارے میں کہتے وقت بھی وہ شاعری کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کے دوسرے جُزو وہ تفصیل سے نہیں بیان کرسکتے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسم خیال" ہے۔ اس کے افسانے رومانی فضا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس جگہ کرشن چندر کی نظر زندگی سے زیادہ تخیل و رومان پر ہے۔ یہ افسانے زندگی سے قریب ضرور ہیں مگر بعد کے افسانوں کی طرح زندگی میں رچے بسے نہیں ہیں۔ مگر اس دور میں حقیقت کا وہ بیباک اظہار جو "جہلم میں ناؤ پر" اور "گلفروش" وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ وہی آگے بڑھ کر زیادہ گہرا اور تیز ہوگیا ہے۔ اس دور میں کرشن چندر کا طرز بیان اور افسانوں کے پلاٹ و موضوعات سب رومانیت کے زیر اثر تھے۔ ان کے ہیرو کی زندگی میں آرزومندی اور حسرت ناکی ہے۔ ان کے کردار جذباتی ہیں۔ وہ فلسفہ بولتے ہیں۔ اور عمل سے زیادہ سوچنے کے قائل ہیں۔ وہ سعی ناتمام بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مایوسی کا قائل ہے۔ اپنی زندگی کی محرومیوں کا شکوہ کرتا ہے لیکن اس کو سنوارنے کی ہمت اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ زندگی کے حقائق سے زیادہ جذبات کی رنگینی اور اپنی آرزوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ عشق و محبت کا بیان زیادہ جذباتی ہے۔ اور افسانہ نگار اپنی ہی تخیلی دنیا کے طلسم میں کھویا ہوا سا ہے، مگر حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہونے پایا۔ اور یہاں بھی چھوٹے بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ کا فرق ظاہر ہوجاتا ہے۔ پھر "خونی ناچ" "شاعر فلسفی اور کلرک" اور "ٹوٹتے ہوئے تارے" تک پہونچتے پہونچتے کرشن چندر بہت بڑے حقیقت نگار بن گئے، حالانکہ حقیقت کا مشاہدہ انہوں نے قریب سے نہیں کیا۔ اس کو انہوں نے دور سے اور ایک فلسفی کی حیثیت سے دیکھا۔ پھر بھی تاثر، احساس، جذبہ، شعور اور ادراک یہ مختلف منزلیں کرشن چندر کے یہاں ملتی ہیں۔ ہمارے افسانے کو انہوں نے جوش، ولولہ، گرمی اور کردار نگاری سے آشنا کیا۔ ان کا اسلوب بیان اور افسانوں کے پلاٹ بھی سراسر رومانی ہیں۔ وہ بات بھی بہت سجا بنا کر کہتے ہیں۔ لیکن محبت کے پاکیزہ نغموں اور حسن و لطافت میں درد و حزن کا پہلو بھی ہر جگہ کرشن چندر نے تلاش کرلیا ہے۔ وہ اس رومانیت کے خلاف ہیں جو زندگی سے دور لے جاتی ہے۔ اس لئے ان کے رومانی افسانہ بھی کسی نہ کسی سماجی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انہوں نے فن کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے بڑی حسن کاری اور چابکدستی کے ساتھ اپنے آرٹ کو زندگی اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بنالیا۔ آہستہ آہستہ ان کی حقیقت پسندی میں پختہ کاری اور تجربہ کاری شامل ہوتی گئی اور کرشن جی کا قلم حقیقت کے تلخ اظہار کے واسطے بھی تیار ہوگیا۔ ان کے افسانوں کی رومانی فضا تو قائم رہی۔ اپنا تخیل بھی ان کو بہت عزیز ہے۔ لیکن اس دور میں ان کی نظر میں کافی تیزی پیدا ہوگئی، ان کی دوررس نگاہ نے ان کو بتایا کہ دنیا میں رومان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے اس لئے اگر انسان کو زندہ رہنا ہے تو دنیا میں ہر طرف چھائی ہوئی تلخیوں کو اپنانا ہی اس کا سب سے بڑا فریضہ ہے کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا یہ دور ایک کشمکش کا ہے۔ ایک طرف تو ان کے سامنے وہ خوبصورت رومان ہیں جن میں ڈوب کر دنیا کی تکلیفوں کو انسان تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتا ہے، پھر یہ بھی انہوں نے محسوس کیا کہ رومان ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چیزیں ہیں، زندگی کے دکھ درد اور حزن و الم جن سے گریز کسی صورت میں ممکن ہی نہیں جن میں پھنس کر جنت بھی جہنم بن جاتی ہے، ان دونوں رنگوں پر کرشن جی نے پورا عبور حاصل کرلیا۔ پہلا رنگ ان کے جذبات سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اسے تو وہ کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ "نظارے" کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کرشن چندر کو غزل کی جستجو بے چین کئے ہوئے ہے۔ ان افسانوں میں عورت، محبت، رومان، حسن، موسیقی، سبھی کچھ ملتا ہے۔ لیکن اس میں محبت اس درجہ بے تاب و بے قرار ہے کہ صبر مشکل ہے، یہ محبت ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جو تصور کو زندگی کی حدود سے بہت دور کردیتی ہے۔ ان کے یہاں وہی رومانی نقطۂ نظر کارفرما نظر آتا ہے جو زندگی اور اس کی جہد و عمل سے محبت کرسکنے پر موت اور مایوسی سے ہمکنار کردیتا ہے۔ ان کا شیوہ ایک رومانی انسان کا ہے جس کی نظر میں زندگی کے حقائق سے زیادہ اپنے جذبات کی دلکشی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل بسی رہتی ہیں۔ ایسی بھی کہانیاں ہیں جن میں رومان کے ساتھ زندگی کی تکلیفیں بھی شامل ہیں۔ سماج کے بھیانک و تاریک رخ کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ تخیل کی رنگین، حسین و رومانی فضا میں حقیقت کی سرخی کی جھلکیاں دکھلاتی ہے، ان کا احساس حقیقت

شدید ہوتا گیا۔ زندگی کی تلخیوں و دکھوں سے بیگانہ رہنا ان کے لئے ممکن نہیں رہ گیا۔ اور کرشن چندر بہت بڑے حقیقت پسند بن گئے۔ یہی سبب ہے کہ رومان کی شیرینی میں حقیقت کی تلخی موجود ہے۔ اس کی نمایاں مثال "خونی ناچ" ہے یہاں پر محسوس ہوجاتا ہے کہ کرشن چندر کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں اور اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے دل کا درد اور جذبہ کی تڑپ شامل کر کے اسے افسانہ کا روپ دیدیتے ہیں، وہ ایک مصور کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں جس کو ہر قسم کی رنگ آمیزی میں کمال حاصل ہے، ان کے فن میں فکر کی سنجیدگی و گہرائی ہے تخیل کی رنگینی و مشاہدہ کی باریک بینی ہے، احساس کی شدت ہے انداز بیان شیریں، لطیف و پر خلوص ہے۔ ان کی تیکھی طنز معنی خیز فقرے و جملے، شاعرانہ انداز میں کی ہوئی بات کو زیادہ پر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ ان کی خطابت اور طنز پڑھنے والے کو دعوت فکر دیتی ہے۔ یہیں انسان سب کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ان کے افسانہ کے ایسے ہی مؤثر زندگی کے بہت سے مسائل سامنے لے آتے ہیں، اور قاری افسانہ نگار کا ہم خیال بننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

کرشن چندر نے افسانوں میں تازگی ہے شگفتگی ہے۔ زبان کی لطافت، تشبیہوں کی جدت، اسلوب کا اچھوتا پن، موضوع اور طرز بیان کی ہم آہنگی ہے، انسانیت کا درد اور اس کی ترقی کی امید ہے۔ ان سب چیزوں کو ان کے افسانوں سے کوئی علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اور وہ ہر جگہ موجود رہتی ہیں۔ موضوع پر کرشن چندر کو بحد اعجاز قدرت حاصل ہے، بظاہر بہت سی غیر مربوط چیزوں کو یکجا کر کے وہ افسانہ کا روپ دیدیتے ہیں۔ اپنے موضوع سے ان کو گہری واقفیت ہے اور خلوص کی شدت ان کو بھٹکنے نہیں دیتی۔ تفصیل اور جزئیات نگاری سے پڑھنے والا سب کچھ دیکھتا اور چشمہ رواں کی لہروں پر بہتا چلا جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کی دلکش محویت سی طاری ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ نتیجہ کو اشاروں میں واضح کرتے ہیں۔ مگر ان کے اشارے بھی مبہم نہیں ہوتے۔ منزل کا پتہ صاف بتلا دیتے ہیں، اپنے غیر معمولی فنی ادراک کی مدد سے کرشن چندر کو افسانہ کی تکنیک میں کوئی دشواری نہیں معلوم ہوتی ان کے کردار اسی دنیا کے ہوتے ہیں۔ اور جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس کی صفات ان میں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار جس حقیقت کو پیش کرتے ہیں وہ عملی زندگی کی ہے ان کے کردار چند خاص قسم کے مردوں اور عورتوں تک محدود نہیں۔ بلکہ ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور خود کرشن چندر سب کو جانتے بھی ہیں۔ امیر، غریب، بوڑھے بچے۔ جوان، مزدور، کسان، حکام، مذہبی پیشوا، بے روزگار، مظلوم، کمزور، نادار سب ان کے یہاں اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ آتے ہیں جو ان کے کردار کو عیاں کردیتی ہیں۔ ان خصوصیات میں تنوع ہے اور رومانی ہوتے ہوئے بھی کرشن چندر ان حقائق سے دور نہیں ہوئے جن کی ترجمانی وہ کرتے ہیں اور جن کی خوبیوں و برائیوں پر وہ تنقید کرتے ہیں۔ کرشن جی کا مقصد ان کے فن پر اثر انداز نہیں ہونے پاتا اور ان کی صناعی مقصد کو پیچھے کی طرف چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ادب کی کتنی قابل قدر صفت ہے جو کرشن چندر کے بیشتر افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانہ میں صداقت و خلوص کا رنگ بھرا اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھ کر اس کی خوبصورتی و بدصورتی دونوں کو نگاہ میں رکھ کر بے واقعہ نگاری کا سا مشکل فرض انجام دیا ہے، انہوں نے چلتے پھرتے مرقعے پیش کئے ہیں، جو ترقی پسند افسانہ کی سب سے بڑی صفت کہی جاتی ہے۔ وہ ترقی پسندی کے عام مفہوم میں کھونے کے بجائے اس کی اصلیت تک پہنچ گئے اس لئے ان کی ترقی پسندی کبھی دل آزاری کا باعث نہیں ہوتی۔ انہوں نے سرمایہ دار کا ظلم و زبردستی دکھائی بے بس و مظلوم مزدور کی پر درد آہیں سنائیں، بھوک سے تڑپتے بلکتے بچوں کی بے چین کر دینے والی صدائیں سنائیں۔ اور مظلوم و لاچار عورتوں کی دبی دبی چیخوں اور گھٹی ہوئی آہوں کے دلخراش افسانے سنائے، پھر ان سب کو سرمایہ دار کے پھندے میں گھرا ہوا دکھایا، عورتوں کے کردار کے کرشن چندر نے بڑے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ عورت کی فطرت کا انہوں نے ہر طرح مطالعہ کیا ہے اور مزدور مرد سے زیادہ مزدور عورت کو موضوع بنایا ہے۔ "جنت و جہنم" "ٹوٹے ہوئے تارے"۔ "اندھا چھتر پتی" اور اسی قسم کے کئی افسانے عورت کی تباہی و بربادی کی داستان ہیں۔ ان کا نظریہ صرف مزدوروں تک ہی محدود نہیں رہ جاتا۔ متوسط طبقہ کی المناک زندگی کو بھی انہوں نے بڑی خوبصورتی

سے اپنے افسانے میں جگہ دی ہے، اگر وہ تیرہ و تار گلیوں کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ساتھ ہی ان تیرہ و تار مناظر سے نکال کر ایک روشن راہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مصنف حقیقی ہمدرد ہے۔

جنس بھی کرشن چندر کا موضوع ہے۔ مگر جنس پر لکھتے وقت ان کے لہجہ میں لذت اندوزی کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ پاکیزگی نظر آتی ہے وہ تقدس ہے جو اس انسانی جذبہ کی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ مزدور عورت اپنے تمام اختلافات کے باوجود اپنی سماجی مسرت کے واسطے اور خوش آئند مستقبل کی امید میں ہر طرح کی مشکلیں برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ کامیابی کی صورت میں کرشن چندر کو بے پایاں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور ناکامی کی صورت ان کے قلم میں نشتر کی تیزی پیدا کر دیتی ہے جس کو اپنے مخالفین کے لئے استعمال کر کے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اپنا نقطہ نظر ذہن نشین کرنے کے لئے وہ اکثر طنز کو بھی آلہ کار بناتے ہیں جو بہت موثر ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کو کرشن جی کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اسے کیونکر سنوارنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں ان کا افسانہ "زندگی کے موڑ پر" لاجواب ہے۔ موجودہ سماج کی کاروباری زندگی کے بے تکے پن پر وہ گہرے وار کرتے ہیں اور ایک بہتر و برتر مستقبل کی خوشخبری سناتے ہیں۔ ان کا دل بہت حساس و دردمند ہے۔ اسی دردمندی نے ان کو بہت سے نشیب و فراز دکھائے اور حسن نظر نے ان کو زندگی کے حسین و خوبصورت پہلو دکھائے اسی نے اور بہت کچھ دکھایا۔ کسان، مزدور، مزدوری کی تلاش میں اس کا دربدر پھرنا، نمبردار، زمیندار، ان کا ظلم و جبر، غریبی، سیٹھ، طوائف، شاعر، کلرک، عورت کا حسن اور اس پر للچائی ہوئی نگاہیں، ان سب کو کرشن جی نے اپنے افسانے میں جگہ دی ہے۔ دیہاتی زندگی کی معصومیت کا عکس، شہری زندگی اور اس کی تلخیاں و مشکلات کی تصویریں پیش کیں، غرض زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی کتنی ہی تصویریں ہیں جو ہمیں کرشن چندر کے افسانوں میں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ زندگی کے بیکراں حسن کو کرشن چندر نے دیکھا، اور اسے اپنے دل میں جگہ دی، مگر اس حسن کو خراب کرنے والے عیوب پر ان کی نگاہ بہت گہری پڑتی ہے۔ یہ حسن ان کو عزیز بھی بہت ہے۔ اس لئے جب وہ اسے مصائب میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کا زخمی دل چیخ اٹھتا ہے۔ اسی کو وہ افسانہ کی شکل دیدیتے ہیں سب سے زیادہ غصہ ان کو اس دھوکے بازی پر آتا ہے جو ہماری دنیا میں تہذیب و انسانیت کے نام پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس دھوکے بازی کے علمبرداروں یعنی جاگیرداروں و سرمایہ داروں کے خلاف ان کا نفرت کا جذبہ شدید ہے۔ وہ نظام جو انسانیت کے نام پر دھبہ ہے، جہاں زبردست کمزور کے جسم پر ہی نہیں دل و دماغ اور روح تک پر حاوی ہوتا، جہاں ہر چیز کی قیمت لگائی جاتی ہے اس کو مٹا دینے کی زبردست خواہش کرشن چندر کے دل میں ہے۔ اور اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرا ہے مہاجن، ساہوکار، مذہبی پیشوا، ملک و قوم کے لیڈر، پولیس والے غرضیکہ اس نظام کے سارے بانیوں کو وہ نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور شدت احساس سے مغلوب ہو کر کبھی خطابت پر اتر آتے ہیں کہیں پر لطیف مزاح کے چھینٹے کستے ہیں کبھی طنز و تمسخر سے کام لیتے ہیں۔ ان کا طرز بھرپور ہوتا ہے اور رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اکثر ان کی ہمدردی دوسروں کے لئے بے رحمی ثابت ہوتی ہے۔ اور ان کا طنز نشتر چبھوتا، زخموں پر نمک پاشی کا کام کرتا ہے، کیونکہ جس جمود بے حسی کے خلاف کرشن چندر بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ایسے ہی تیکھے و تند طنز کی ضرورت ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں قاری کو کچھ سیکھنے کی دولت ملتی ہے۔ طنز کی مثالیں بہت جگہ ملتی ہیں۔ "ان داتا"، "اردو کا نیا قاعدہ"، "یورپ دیس ہے دلی"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "شاعر فلسفی اور کلرک"۔ ایسے بہت سے افسانے ان کی طنز نگاری کے بڑے اچھے نمونے ہیں، جن میں سماج، سیاست، محبت، اخلاق، تہذیب و تمدن سب پر گہرا طنز ملتا ہے۔ کرشن جی کے احساس کی شدت اور جذباتی خلوص نے ان کے طنز و مزاح میں کافی بلندی پیدا کر دی ہے۔ اس طرح کے افسانوں میں بھی رومانی طرز تخیل اور انداز بیان کا مظاہرہ ہے اور ان افسانوں ہی سے ان کے ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد کرشن چندر کے افسانوں کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، اس موضوع پر "ہم وحشی ہیں" ان کا شاہکار ہے، تقسیم کے بعد رونما ہونے والے ہولناک واقعات اور خون ریزیوں پر ان کی یہ تخلیق ایک یادگار ناصر کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے سارے افسانے

کے فسادات سے متعلق ہیں۔ ان افسانوں میں کرشن چندر نے انسانی وحشت و درندگی کے جو مظاہرے ہوئے ہیں ان کو بے نقاب کیا ہے۔ مگر نیکی کی ان قوتوں کو بھی ابھرنے و ظاہر ہونے کا موقع دیا جو برائی کے تلے دبی ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر ہر افسانہ نگار نے افسانہ لکھے اور نیکی کی قوتوں کو ابھارنے کی کوشش بھی کی۔ ہر طرف سے اس ہنگامی موضوع پر لکھا گیا، بعضوں نے ایسا لکھا کہ لوگ اس موضوع سے اکتا سے گئے۔ یوں بھی یہ ایک عارضی و ہنگامی موضوع تھا، اس پر لکھی جانے والی چیزیں دیرپا کیونکر ہو سکتی تھیں۔ مگر کرشن چندر نے اس عارضی موضوع کو بھی دوامی کر دیا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت مستقل ہے۔ فن کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے ذہن فکر اور تخیل کی بلندی سے انہوں نے اس کو ایک تجربہ کی شکل دیدی۔ اپنی تخلیقات کو جاندار بنانے کے لئے کرشن چندر نے فنی صناعی سے کام لیا۔ احساس و جذبہ کی مدد سے اس صناعی کو نکھارا سنوارا اس میں دلکشی بھر دی۔ اسی لئے اس کی تاثیر بھی دو چند ہوگئی۔ اور افسانہ نگار کا اخلاقی مقصد بھی واضح ہوگیا۔ "ہم وحشی ہیں" کے کئی افسانوں میں یہ بات ہے۔ یہ افسانے کرشن چندر نے کسی ایک مذہب کو مخصوص کر کے نہیں لکھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب ہی کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن خود کرشن چندر ہر جگہ ایک انسان کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ان افسانوں میں درد کی کسک ہے، بیان کی شگفتگی ہے، لطافت ہے، اعتدال توازن کو انہوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ طنز و مزاح کی بھی ہلکی سی چاشنی ملتی ہے۔ "شکست" کے بعد "تین غنڈے"، "پانی کا درخت" وغیرہ ان کے اسی قسم کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

اس ہنگامی دور کے ختم ہو جانے پر کرشن چندر نے اس طرح کے افسانے لکھنے بند کر دیئے اور اپنے محبوب مسلک کو اپنا لیا۔ ان کو ہر بات نئے انداز سے کہنے کا شوق ہے۔ اپنے ہر افسانہ میں وہ کوئی نئی بات ضرور رکھتے ہیں۔ یہ جدت ان کے فن کو تازگی بخشنے کے ساتھ ہی تھوڑی سی آورد بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر جگہ وہ شگفتگی نہیں دکھائی دیتی جو کرشن چندر کا خاص جوہر ہے۔ ان کے فن کی دلکشی کو قائم رکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ معاون ہوئی وہ ہے زندگی کے متعلق ان کا واضح و صحت مند نظریہ۔ اقتصادی و معاشرتی مسائل نے زندگی میں جو الجھنیں پیدا کر دی اس کا احساس ان کو ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہماری زندگی کی طبقاتی کشمکش، کمزور پر طاقتور کا دباؤ، معاشی پریشانیاں جو ذہن و روح تک کو گھائل کر دیتی ہیں، ان ساری چیزوں کو کرشن چندر نے اس دور میں بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس دور میں جو رنگ انہوں نے اختیار کیا ہے اس میں لکھنے والا تخیلی دنیا کو چھوڑ کر مشاہدہ کی دنیا میں آجاتا ہے۔ حسن کے پس منظر میں زندگی کی بدصورتیوں کو اور بھی بھیانک بنا دیتے ہیں۔ اور درد و حزن کا پہلو شامل کر کے اپنے مشاہدہ کو افسانہ کا رنگ دیدیتے ہیں۔ جذبات نگاری میں کرشن چندر کو بڑی مہارت حاصل ہے، خاص کر المیہ جذبات کی عکاسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے انداز بیان میں غضب کی تاثیر بھری ہوئی ہے۔ اس کی وجہ شاید وہ دردمندی و غم آشنائی ہے جو ازل سے کرشن چندر کی ملکیت ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ زندگی سے قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے افسانوں میں زندگی اور اس کی جدوجہد کی ہمہ رنگی نظر آتی ہے۔ پلاٹ ہموار اور سادے ہیں، قصے میں شروع سے آخر تک ایک ربط قائم رہتا ہے۔ جو بیچ میں کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ پلاٹ کی ہمواری دریا کے بہاؤ کے مانند ہوتی ہے جو اپنی راہ کے حالات کو ہٹاتا ہوا مسلسل بہتا جاتا ہے۔ تخیل، فکر، انداز بیان ان تینوں چیزوں پر کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو قدرت حاصل ہے۔ ان کے طرز بیان میں طنز، تشبیہ اور زبان سب کا دخل ہے ان کی زبان میں شیرینی، لوچ ہے، نرمی ہے، ایک گھلاوٹ ہے جو سامع کو فرحت بخشتی ہے۔ اور کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کو زبان پر بہت زیادہ عبور حاصل ہے، موقعے کے لحاظ سے، نرم، شیریں، تلخ، تند اور خوبصورت الفاظ کا استعمال ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی زبان میں ایک دل آویز سادگی و سنجیدگی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ خود بخود امڈتے چلے آتے ہیں اور جس جذبہ کو بیان کرنا ہو اسی کے مطابق اپنی جگہ خود ہی تلاش کر لیتے ہیں۔ تخیل و مشاہدہ میں ان کے یہاں ایسا گہرا ربط پیدا ہو جاتا ہے اور سیاست اور رومان کو وہ اس طرح باہم آمیز کر دیتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو ذہن و دل دونوں سے قریب کر دیتی ہے۔

دوسری اہم خصوصیت ان کا کبھی نہ جھکنے والا انداز ہے۔ کائنات میں پھیلے ہوئے بے اندازہ حسن سے انہوں نے لذت بھی حاصل کی اور انسانیت کے شدید کرب کو دیکھ کر اپنے جذبات میں تڑپ پیدا کی۔ سینکڑوں افسانے اور کہانیاں لکھیں۔ لیکن ایک بھی افسانہ ایسا نہ ہوگا جس میں خلوص، نیک نیتی، دردِ دل اور خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو۔ اسی لئے ان کے افسانے زندگی سے قریب ہیں کیونکہ وہ زندگی کو بھی سمجھتے ہیں۔ افسانے کے فن سے بھی واقف ہیں اور ان دونوں کے رشتہ کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اکثر کرشن جی کا افسانہ پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے جیسے فطرت نے ان کو حسن و جمال کی مصوری کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دردمند دل دنیا کے دکھوں کو اور زیادہ شدید بنانے کے لئے حسن کا پس منظر تلاش کر لیتا ہے۔ یہ پس منظر کشمیر کی جھیلیں اور وادیاں ہیں۔ پنجاب اور ہندوستان کے شہر و دیہات ہیں اور ان کا ہیرو تباہ حال و مظلوم انسان ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ہمدردی، طنز اور تشریح ہے۔ ان کا موضوع انسان اور فطرت ہے۔ وہ بدنصیب انسان جو اپنی دنیا کا برا چاہتا ہے۔ منظر نگاری میں کرشن چندر دوسروں سے بہت آگے پہنچ گئے ہیں۔ مناظر کا بیان بھی ان کی حقیقت پسندی کا ایک جزو ہے اور افسانہ کا ایک جزوِ خاص معلوم ہوتی ہے۔ کشمیر کے لالہ زاروں، پہاڑوں، قصبوں اور دیہاتوں کی ایسی رنگین تصویریں شاید ہی کسی نے کھینچی ہوں۔ ان کی منظر نگاری کہانی میں رنگ و بو پیدا کر دیتی ہے اور کرشن چندر کی نگاہ کو وسیع و معیاری بناتی ہے وہ معیار جس سے وہ انسان کو خود اس سے اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں۔

اپنے فن پر کرشن چندر کو زبردست قدرت حاصل ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت لطیف، جاندار اور انوکھا ہے۔ رومانیت اور انسان پرستی نے طرزِ تحریر کو زیادہ دلکش و جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ ان کے اسلوب میں ذرا بھی سختی نہیں اور اگر کہیں اس کی ضرورت ہو تو طنز اس خدمت کو انجام دیتا ہے۔

اردو میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری ارتقائے فکر کی ترقی اور پختگی تحریر کی بہت عمدہ مثال ہے جو افسانہ نگار شروع میں ایک جذباتی و رومانی افسانہ نگار تھا جس کے زیرِ اثر ہمارے افسانوں پر رومانیت کی ایک گہری دھند چھا گئی جس نے رومانوں کو فن میں بنیادی جگہ دی اور جس کے افسانہ کی فضا رومانیت کی تہہ میں لپٹی نظر آتی ہے۔ اس نے آپ اپنا اور اپنے فن کا سب کو اس قدر گرویدہ کر لیا ہے کہ افسانہ نگاروں کی صف میں اس کا مرتبہ سب سے بلند ہو گیا ہے۔ اس دور میں بھی وہ انسان، انسانیت کی محبت، وطن کی محبت اور اس کے روشن مستقبل کے پیامی ہیں۔ اپنا فن ان کو بہت عزیز ہے اور فنی حیثیت سے بھی ان کی افسانہ نگاری کا معیار بہت بلند ہے۔ فن کی اسی محبت نے ان کو افسانہ نگاری کا امام بنا دیا۔ اپنے افسانوں کو زندگی کے گہرے رنگا رنگ سے سجا کر اور اس میں جان ڈال کر کرشن چندر اس درجہ تک پہنچے ہیں۔ ان کا افسانہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور زندگی کے تمام حقائق کا پرتو اس میں ملتا ہے۔ جن سے انسانی فطرت ہمیشہ گریز کرنا چاہتی ہے۔ افسانہ کے فن میں شاید ہی کوئی ان کا ہمسر ملے۔ اس فن کے حربوں پر کرشن چندر کو جتنا عبور حاصل ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصہ میں آیا ہو۔

پریم چند کے بعد افسانہ کی دنیا میں کرشن چندر ہی کا نام سامنے آتا ہے۔ اگرچہ ان کے مجموعوں کی تعداد پریم چند تک ابھی نہیں پہنچی۔ کرشن چندر کی بے پناہ مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ رومان، افسانویت اور شعریت کو ہم آہنگ کر کے زندگی کی مصوری کرتے ہیں، ان کے افسانوں میں زندگی کی رنگینیاں، مایوسیاں، حسن، بدصورتی سبھی کچھ ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ بدصورتی میں بھی حسن تلاش کر لیتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے افسانے اور ناول لکھے۔ ان سبھوں میں انسان سے محبت اور اس کی ترقی و بہتری کی خواہش اجاگر رہی۔ امن و سکون کی تلاش ہے اور خود بھی وہ امن و سکون کے پیامی ہیں۔ لکھنے کا ڈھنگ اس درجہ مؤثر اور دھیما ہے جیسے کوئی زخم پر مرہم رکھ رہا ہو۔ یہی بے لوث انسانیت ان کی ہر تحریر سے ظاہر ہے۔ مظلوم انسان سے کرشن جی کو سچی ہمدردی ہے۔ انہوں نے سماج کی اصلاح کا بہت بڑا فرض پورا کیا ہے۔ سوسائٹی پر انہوں نے بڑے کاری وار پیدا کئے ہیں۔ وہ ہر مظلوم کے دوست اور ہر ظالم کے دشمن ہیں۔ جابر قوتوں کو وہ فنا کر دینا چاہتے

ہیں، اور مظلوم کے دکھ کا حل تلاش کرنے کے لئے ہر قوت سے ٹکرانے کو تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے اس عہد کی حقیقتوں کی ترجمانی کی ہے اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ رواداری، بے تعصبی ان کے فن کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ وہ اس رواں دواں زندگی کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ اور زندگی کے بنیادی مسائل سے واقف ہیں۔ ان محرکات کو بھی انہوں نے سمجھا ہے جو افراد پر اثر انداز ہوا کئے ہیں۔ فن اور زندگی کے تعلق کو بھی انہوں نے خوب سمجھا، ان کا شعور بہت تیز، لطیف اور رچا ہوا ہے، ان کی قوت مشاہدہ غیر معمولی ہے۔ شعور کی یہی تیزی ان کو انحطاط کی طرف کم مائل ہونے دیتی ہے۔ ان کے افسانے زندگی کی سچی تفسیر ہوتے ہیں۔ اور مواد کی شگفتگی ان کے طرز میں ہمیشہ نمایاں رہتی ہے۔ موضوع کی گہرائی اور کہانی کی لطافت پڑھنے والے کو کسی اور طرف کم متوجہ ہونے دیتی ہے۔ موضوع اور مواد کو انہوں نے اس طرح سے اپنے اسلوب کے سانچے میں ڈھال لیا اور وہ دلکشی پیدا کردی جس کو خاص و عام سب ہی بے انتہا پسند کرتے ہیں۔ مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے کرشن چندر زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ ناول بھی انہوں نے لکھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ان کا ناول "شکست" ہے۔ لیکن ناول کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں صرف کی، افسانہ ہی سے انہوں نے زندگی کا بہت بڑا اہم کام لیا اور فن کی تمام نزاکتوں و باریکیوں کو مد نظر رکھ کر اسے انجام دیا ہے۔

غزلیں

فراقؔ گورکھپوری

چار راتیں

پہلی رات

یہ بھی کوئی سفر میں سفر ہے کہ — زندگی زندگی سے منفجر
رشکِ معراج اے دلِ بشر ہے — اسکی بنیاد گو خاک پر ہے
داستانِ جہاں سنتے جاؤ — مبتدا ہے نہ کوئی خبر ہے
دل کی چھوٹی سی اس رزم گہ میں — جنگ ہر قوتِ خیر و شر ہے
یہ زمانے کی بے مہریاں آہ — اے مرے مہرباں تو کدھر ہے
یہ ترانے یہ نغمے مبارک — بلبلو کچھ چمن کی خبر ہے
بام سے اس نظر کا اترنا — مہر سے اک کرن کا سفر ہے
اک اترتا ہوا خواب سیمیں — چاند سے چاندنی کا سفر ہے
ہاں سنبھل کر پیو بادۂ شعر — ایک پگھلا ہوا نیشتر ہے
ہوش میں گو ہے شہرِ تمدن — ایک کو ایک کی کب خبر ہے
کاش اے دلِ بشر اسکو سمجھے — جبر ہی اختیارِ بشر ہے
اس غزل کو زمیں دے اٹھی لو — لفظ لفظ اک لپکتا شرر ہے
عقل فرزانہ بے خبر اور — عشق دیوانہ باخبر ہے
ہے شبِ غم بھی اک پہلوئے صبح — ایک کروٹ میں یارو سحر ہے
جیسے بیکس کی اک چشم امید — عشق کی عرضِ غم مختصر ہے
عشق راز آشنا زندگی کا — عقل نقادِ عیب و ہنر ہے
عقل فرزانہ بے خبر اور — عشق دیوانہ باخبر ہے
دورِ حاضر میں فن شاعری کا — ایک بھولا ہوا سا ہنر ہے

تیرے بعد اے فراقؔ غزلخواں
بزمِ شعر و سخن بے جگر ہے

دوسری رات

ناصحا تجھ کو یہ بھی خبر ہے — عشق کا عیب نازک ہنر ہے
اے مسافر یہ رازِ سفر ہے — جو ہے منزل وہی رہ گذر ہے
بیکراں خامشیٔ دو عالم — داستاں کس قدر مختصر ہے
کون سنتا ہے ایسے میں حق بات — سب اُدھر ہیں وہ کافر جدھر ہے
آدمی ہے خدائے دو عالم — یہ خدائی مگر دردِ سر ہے
کس سے پوچھیں خبر زندگی کی — زندگی آپ سے بے خبر ہے
مرکزِ کششِ جہات ابنِ آدم — پھر زمانے میں کیوں دربدر ہے
کس نے کھینچیں طنابیں زندگی کی — زندگی آج زیر و زبر ہے
بزمِ ہستی سرِ پردۂ شب — دوستو زندگی رات بھر ہے
دیکھ اس کا دلوں میں اترنا — میرا ہر شعر تیری نظر ہے
اب یہ تجھ پہ ہے آئے نہ آئے — یار ہر سینہ تیرا ہی گھر ہے
دورِ آفاق میں عشق کی ذات — مقتدر ہے میاں مقتدر ہے
تو ہے باہوش و باعقل لیکن — زندگی تجھ کو اپنی خبر ہے
میری تنہائیوں کا یہ عالم — اب نہ تو ہے نہ تیری نظر ہے
غور سے سُن کہ روح الامیں کی — میرا ہر شعر آواز پر ہے
بزمِ احباب سے مجھ کو رخصت — سانس میری چراغِ سحر ہے
فاتحِ کائنات اس کو کہئے — شاعری مالکِ بحر و بر ہے
رازِ الفت میں کیسے چھپاؤں — کیا کروں دوستوں کو خبر ہے

کس سے پوچھیں فراقؔ اس کی روداد
باخبر بھی یہاں بے خبر ہے

تیسری رات

زندگی گرچہ گرمِ سفر ہے کون جانے کہ وہ راہ پر ہے
صاف یہ قولِ قلب و نظر ہے عشق بھی اک مقدس ہنر ہے
کیا کروں کیا تری ہر نظر ہے اک نئی زندگی کی خبر ہے
یہ سمجھ کے کر اے دوست مایوس زندگی قائم امید پر ہے
فرق دیکھو کہ ہر آدمی کی مختلف کائناتِ نظر ہے
خطِ تقدیرِ عالم ہے یارو اختیاری کب اسکی نظر ہے
کیا ترنم ترنم ہے گفتار کیا تبسم تبسم نظر ہے
اس نظر کی کرے کون تشریح جو نظر در نظر در نظر ہے
میری پامالیاں رشکِ معراج میری ہستی تری رہ گذر ہے
ہوں اسیرِ رسوم و روایات آہ اے زندگی تو کدھر ہے
منتظر اک اشارے کے افلاک تا کجا اختیارِ نظر ہے
کھائیں کب تک فریبِ مسرت اے غمِ زندگی تو کدھر ہے
دشتِ عالم میں وحشت زدہ دل ایک صیدِ کمندِ نظر ہے
مست کے ہاتھ میں جیسے تلوار اپنے آپے میں کب وہ نظر ہے
کو بہ کو پھرتی ہے ماری ماری اے محبت کہاں تیرا گھر ہے
سات رنگوں کی نازک پھواریں رقصِ قوسِ قزح ہر نظر ہے
دوستی ہو کہ وہ دشمنی ہو ان میں ہر ایک نازک ہنر ہے
یہ علوم و فنون و تمدن آدمی کا نظامِ نظر ہے
کیا خطاؤں پہ اے دل کروں ناز ہر خطا پہ وہاں درگذر ہے
دور رس ہے کمندِ تبسم یوں تو وہ اپنے مرکز ہی پر ہے

تو کدھر ہے کہ وہ سب طرف ہیں
اے فراق ایک عالم ادھر ہے

چوتھی رات

اک شبِ تار آٹھوں پہر ہے
زندگی انتظارِ سحر ہے

جو تجھے خاک ہے مجھکو زر ہے
آدمی آدمی کی نظر ہے

صرف نیکی سے چلتا نہیں کام
حُسنِ اخلاق نازک ہُنر ہے

ہر کرم دم میں ہے اک چمک سی
دردِ دل ہے کہ دردِ جگر ہے

اہلِ طبل و علم کا یہ انجام!
قبر پر خامشی نوحہ گر ہے

ہر فسانے کا ہے ایک انجام
ایک ہر ملت کی خبر ہے

شعلہ زارِ حیات اور یہ دل
قطرۂ سیماب کا آگ پر ہے

محفلِ ناز میں اس کا آنا
تھا جو سنجیدہ سنجیدہ تر ہے

اے خوشا نازکی رنگِ گل
مسکراتی ہوئی اک نظر ہے

آکے صحرا میں بھی والئے وحشت
پوچھتا ہوں کہ جنگل کدھر ہے

چلتی پھرتی یہ لاشیں ہر اک سمت
زندگی تو کہاں ہے کدھر ہے

ان حدوں سے بہت بڑھ گیا ہوں
اے جنوں اب نہ سودا نہ سر ہے

پوچھتے ہو کدھر ہے سیاست
وہ اُدھر آدمیت اِدھر ہے

جس نے تہذیب کو دی تھیں قدریں
وہ ترا غم کہاں ہے کدھر ہے

رونے دھونے سے کیا کام غم کو
یاد رکھو کہ غم اک ہنر ہے

تیرے جانے کا اے دل ہر اک کو
ہے الم اور الم کس قدر ہے

ہے وہ آغاز و تجدید پیہم
عشق اک مبتدا بے خبر ہے

اہلِ غم طولِ شامِ ابد کیا
وہ تو اک وقفۂ مختصر ہے

رات کیا ہے فراق اس کی فرقت
اس کا دیدار نورِ سحر ہے

غلام ربّانی تاباںؔ

تاباںؔ کسے شریکِ غمِ رہ گزر کہوں
اک گمرہی ہے جسکو رفیقِ سفر کہوں

رنجِ شکست بھی ہے غرورِ شکست بھی
اس زندگی کو درد کہوں یا اثر کہوں

پیہم ہے جس کا لطفِ تغافل مرے لئے
میں اور خدانکردہ اُسے بے خبر کہوں

وابستہ ہو گئی ہے تری انجمن کے ساتھ
وہ روشنی جسے شبِ غم کی سحر کہوں

ہونے کو ہر ادائے ستم لاجواب ہے
اُترے جو میرے دل میں اُسے نیشتر کہوں

جل جائے آشیاں تو سپاس نمو لکھو
رقصِ شرر کو موسمِ گل کا اثر کہوں

تاباںؔ ہجومِ درد میں جو مسکرا سکے
پھر کیا کہوں اُسے جو نہ آشفتہ سر کہوں

مصطفےٰ زیدی

آندھی چلی تو نقشِ کفِ پا نہیں ملا
دل جس سے مل گیا وہ دوبارہ نہیں ملا

ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں ملا

آواز کو تو کون سمجھتا، کہ دور دور
خاموشیوں کا درد شناسا نہیں ملا

قدموں کو شوقِ آبلہ پائی تو مل گیا
لیکن بہ ظرفِ وسعتِ صحرا نہیں ملا

کنعاں میں بھی نصیب ہوئی خود دریدگی
چاکِ قبا کو دستِ زلیخا نہیں ملا

مہرووفا کے دشت نوردو جواب دو
تم کو بھی وہ غزال ملا یا نہیں ملا

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا

فارغ بخاری

کسی سے بھی غمِ حالات کا گلہ ہی نہیں
سب آشنا ہیں کوئی غیر اب رہا ہی نہیں

ترے کرم سے کبھی احتیاجِ غم نہ ہوئی
غلط ہے یہ کہ کوئی یار باوفا ہی نہیں

تری نگاہ کی بیگانگی غنیمت ہے
کہ اب نجات کا پہلو کوئی رہا ہی نہیں

گلوں کو چھوڑ کے خوشبو سے پیار کرتے رہے
ہماری سادہ دلی کی بھی انتہا ہی نہیں

کوئی مرے بھی تو موسم کی کس ادا پہ مرے
گھنیرا ابر نہیں سر پھری ہوا ہی نہیں

کچھ آج ہم ہی نہیں ہیں اسیرِ لیل و نہار
غمِ زمانہ سے فارغ کوئی ہوا ہی نہیں

وزیر آغا

پہلا ہی گرم لُو کا تھپیڑا نہ سہہ سکی
کہنے کو کشتِ دل تھی ازل سے ہری بھری

کرتے ہو اب تلاش اُسی سوکھے پیڑ کو
کترا کے جس سے مثلِ صبا تم نے راہ لی

دیوار گر نہیں ہے تو چادر ہی اوڑھ لو
ننگے بدن کی ڈھال تو کاغذ کی ہے بنی

جنگل کی سمت آئے ہو صحرا کو چھوڑ کر
گھر کا یہ راستہ تمہیں بھولا نہ تھا کبھی!

ہوتا ہے ذکر گلیوں میں اب آسمان کا
اندھوں کے اس نگر میں یہ کیسی ہوا چلی

موجوں نے چاک چاک کیا ساحلِ مراد
کن پاگلوں کے ہاتھ تمہاری قبا لگی!

وہ عہدِ ابر و باد تو پل بھر کا کھیل تھا
نکلا جو آفتاب تو گرمی بہت پڑی

سیپ کراچی

شمس زبیری

ہم اُن کا ذکر اگر ان کے روبرو کرتے
ہر ایک بات بہ عنوانِ رنگ و بو کرتے

مزاج حسن میں ہوتا جو التفات کا رنگ
تو اھلِ ذوق کوئی اور آرزو کرتے

سبب ہماری خوشی کا پوچھتے ہو بتائیں؟
زبانِ غیر سمجھتے تو گفتگو کرتے

جب اُسکو یاد کیا ہے تو اشک بھی آئے
ہم اور ذکر کسی بُت کا بے وضو کرتے

بغیر اُن کے بہاروں کا رنگ پھیکا ہے
وہ کاش آکے بہاروں کو سُرخ رو کرتے

اسی اُمید اسی آرزو میں گزری عمر
کہ ایک بار کبھی اُن سے گفتگو کرتے

شہریار

وہ بے وفا ہے ہمیشہ ہی دل دکھاتا ہے
مگر ہمیں تو وہی ایک شخص بھاتا ہے

نہ خوش گمان ہو اس پر تو اے دلِ سادہ
سبھی کو دیکھ کے وہ شوخ مسکراتا ہے

جگہ جو دل میں نہیں ہے مرے لئے نہ سہی
مگر یہ کیا کہ بھری بزم سے اٹھاتا ہے

ترے کرم کی یہی یادگار باقی ہے
یہ ایک داغ جو اس دل میں جگمگاتا ہے

عجیب چیز ہے یہ، وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

دریا چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
حادثے سارے گذر جاتے ہیں

راتیں کیسی بھی ہوں، ڈھل جاتی ہیں
زخم جیسے بھی ہوں بھر جاتے ہیں

کوئی ماتم نہیں کرتا ان کا
پیدا ہوتے ہی جو مر جاتے ہیں

یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لئے
دن تو آتے ہیں گزر جاتے ہیں

جانے کیا ہو گیا اہلِ غم کو
دل دھڑکتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

شہریار

کاش پوچھے یہ چارہ گر سے کوئی
کب تلک اور یونہی ترسے کوئی

سارا عالم ہے جو خفا ہم سے
ہو گئی کون سی خطا ہم سے

کون سی بات ہے جو اس میں نہیں
اس کو دیکھے مری نظر سے کوئی

وقت کو کیوں بُرا بھلا کہئے
تجھ کو ہونا ہی تھا جدا ہم سے

یہ نہ سمجھو کہ بے زبان ہے وہ
چپ اگر ہے کسی کے ڈر سے کوئی

تیرے دم سے تھے سارے ہنگامے
کوئی روٹھا نہ پھر منا ہم سے

سچ کہے جس کو سن کے سارا جہاں
جھوٹ بولے تو اس ہنر سے کوئی

ہم تجھے پوجنا نہ چھوڑینگے
کوئی خوش ہو کہ ہو خفا ہم سے

ہجر کی شب ہو یا وصال کی شب
شب کو نسبت نہیں سحر سے کوئی

زندگی سے ہیں بدگماں جو لوگ
سیکھ لیں جینے کی ادا ہم سے

شاہد عشقی

جاں شمع ساں پگھلتی رہی ہم نہ سو سکے
جب سے ہوئے در دِ پلی ہم نہ سو سکے

بجھنے لگا ہے دل کی طرح شہرِ ہوشاں
ویراں ہوئی ہر ایک گلی ہم نہ سو سکے

دلِ قطرہ قطرہ رستا رہا جب تلک رہا
شب لمحہ لمحہ ڈھلتی رہی ہم نہ سو سکے

ہاں اک تعلق اپنا دلِ خوں شدہ سے تھا
اُس ہاتھ میں حنا جو رچی ہم نہ سو سکے

یاد آگیا شکستگیٔ دل کا سانحہ
چٹکی کہیں بھی کوئی کلی ہم نہ سو سکے

جب تک رہی بہار جلے ہم قفس نصیب
جب سے چمن میں آگ لگی ہم نہ سو سکے

اپنے ہی بختِ خفتہ پہ آتا ہے اب تو رشک
اے دوست اس طرح بھی کبھی ہم نہ سو سکے

احمد ہمدانی

کوئی دل میں رہتا ہے   دھوکا کیسا اچھا ہے
کچھ جلتا ہے گھر کا دیا   زخم بھی کچھ کو دیتا ہے
کچھ بھی کہو۔ ان کا کرم   ایک ہوا کا جھونکا ہے
آؤ بیٹھیں دور تلک   رنج کا سایہ پھیلا ہے
اُن سے کوئی کہہ دیتا   آج اک دنیا تنہا ہے
صبر ہے یوں بھی مشکل ہی   زخم بھی تازہ تازہ ہے
بات چھڑی تو کہتے ہیں   دکھ تم ہی سے پہنچا ہے
باہر سنگِ طفلاں کچھ   گھر میں بھی جی گھٹتا ہے
کس پہ نہیں اب اپنا بھی   چہرہ ہم نے دیکھا ہے
رنگ کا جادو پھیل گیا   ذکر یہ کس کا نکلا ہے
آؤ ہم ہی بات کریں   آج بہت سناٹا ہے
ہم سا مسافر تیرے گھر   بھولے سے آ ٹھہرا ہے
تجھ کو ظالم سمجھا تھا
خود کو ظالم پایا ہے

یاد کیا کیا لوگ دشتِ بیکراں میں آئے تھے
رنگ لیکن کب یہ چشمِ خونفشاں میں آئے تھے

صورتیں کیا کیا نگاہِ شیشہ گر میں بس گئیں
ہم سے بے صورت بھی تو بزمِ جہاں میں آئے تھے

یہ گلِ تر کی سی خوشبو کس طرف سے آ گئی
ہم بگولے تھے بھلا کب گلستاں میں آئے تھے

کس تمنا سے تمہیں دیکھا تھا کس چاہت سے ہم
رقص کرتے حلقۂ وارفتگاں میں آئے تھے

سادگی سے ہم نے سمجھا تھا ہمارا ذکر ہے
تذکرے کچھ اور ہی ان کے بیاں میں آئے تھے

ہر نئی مشکل پہ ہم سوچا کئے ہیں دیر تک
لوگ پہلے بھی تو کچھ شہرِ بتاں میں آئے تھے

کیوں ہمارے سانس بھی ہوتے ہیں لوگوں پر گراں
ہم بھی تو اک عمر لے کر اس جہاں میں آئے تھے

مظہر امام

جسم وجاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
دل کے پھپھولے وقت آنے پر اک دن پھوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت میں ہی آخر تم آئے تو منزل تک
راہِ وفا میں ورنہ اکثر ساتھی چھوٹ ہی جاتے ہیں

دل کو پتھر کر لینے کا ہم نے کچھ فن سیکھا ہے
ایک ذرا سی ٹھیس پہ ورنہ شیشے ٹوٹ ہی جاتے ہیں

طوفانوں میں کود پڑیں ہم کشتی کا غم کرنا کیا
ساحل سے ٹکرا کے سفینے یوں بھی ٹوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہشیار رہو، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے!
لوٹنے والے دل کے نگر کو اک دن لوٹ ہی جاتے ہیں

ادیب سہیل

بے سری گفتگو کا عادی ہے — اس میں پردہ کوئی دوادی ہے
ذہن سے دوسروں کے سوچتا ہے — اپنی معنوں میں انفرادی ہے
کوئی مطلع نہ کوئی منزل ہے — بے سوادی سی بے سوادی ہے
کل جو محبوب تھا نگاہوں کو — آج حد درجہ وہ فسادی ہے
چڑھتے سورج سے روشنی لے کر — خانۂ فکر کو جلادی ہے
آج تک بس یہی کیا ہم نے — صاحبِ وقت کو دعا دی ہے
نفرتوں کے رہے ہیں پشت پناہ — بغض کی آگ کو ہوا دی ہے
خوشبوؤں میں نہا گئی کلیاں — لمس میرا بڑا افادی ہے
آپ کی برہمی سر آنکھوں پر — میرا چھو جانا غیر ارادی ہے
صحن در صحن رقصِ خوشبو ہے — موج میں شب کی شاہزادی ہے
نازبردارِ غم ہوں اس باعث — درد کا لہجہ انفرادی ہے
اس میں سجتے ہیں رنگ رنگ کے گل — دل انہی آئینوں کی وادی ہے

ہو رہا ہوں اسی کا دل سے سہیل
پیار سے جس نے بھی صدا دی ہے

ہے ابھی تو ابتدا اور ڈھونڈتا ہے انت اور
باورے من لمبی ہوتی ہے بہت چاہت کی ڈور

بکھری زلف، افسردہ بار آنکھوں میں دردِ انتظار
پیار کے ساحل پہ آئی تھی نظر اک ایسی بھور

لوٹتی ہے جب کسی شانے پہ زلفوں کی گھٹا
من کے مدھ بن میں خوشی سے ناچنے لگتا ہے مور

برگِ دل پر مثلِ شبنم جو چکاں تھے رات بھر
چاند کے مہجور آنسو تھے کہ رویا تھا چکور

اس پرندے کو بھی شاید لگ گیا میرا ہی روگ
ڈال پر بیٹھا کیا کرتا ہے جو پی پی کا شور!

رس کے سو جادو جگا جاتی ہے دل میں بانکپن
اچھی صورت کی پرستاری ہے میرے دل کا چور

انتہا درجہ اذیت کوش ہے خود اس کا شوق
ورنہ میرا پیار پہلے کب تھا اس درجہ کٹھور

جرأتِ رندانہ کو کیا ہو گیا اس پل سہیل
جب کوئی گھونگھٹ میں تھی مندری سجی تھی پور پور

سلطان زبیری

غم سے مرا دل پگھل گیا ہے
اشکوں کی لڑی میں ڈھل گیا ہے

منزل کا پتہ نہیں ہے کو سوں
رستہ تو نہیں بدل گیا ہے

زندانِ چمن میں ہے بہاراں
پھولوں کا فریب چل گیا ہے

ہیں روح کے بام و در منوّر
فانوسِ خیال جل گیا ہے

شہکارِ تصوراتِ آدم
سانچے میں خدا کے ڈھل گیا ہے

یہ چاند بھی ہے بس اک کھلونا
انسان کا دل بہل گیا ہے

دنیا کا خیال ہے کہ تیرا
اک دیپ سا دل میں جل گیا ہے

آبلہ پا چل پڑے صحراؤں میں
ان کی یادوں کی مہکتی چھاؤں میں

دل میں ارمانوں کا میلا لگ گیا
بس گیا اک شہر اجڑے گاؤں میں

پھر ہواؤں کا دباؤ بڑھ گیا
پھر بھنور پڑنے لگے دریاؤں میں

زندگی کی کھوج میں ہم آ گئے
شہر سے تپتے ہوئے صحراؤں میں

راستوں کے جال ہیں پھیلے ہوئے
کتنی زنجیریں پڑی ہیں پاؤں میں

جب سوا نیزے پہ آیا آفتاب
سو گئے ہم گیسوؤں کی چھاؤں میں

عہدِ ماضی خواب، مستقبل خیال
حال حدِ فصل ان دنیاؤں میں

خلیل رامپوری

دھرتی کو آسمان سے اُونچا بھی دیکھئے
پانی میں جھانک کر کبھی ایسا بھی دیکھئے

تپتی ہوئی زمیں کو کبھی چاٹیئے ضرور
اور اس کے بعد پھول کا چہرہ بھی دیکھئے

کیا صورتِ صدف پڑے رہنے سے فائدہ
بستر کو چھوڑ دیئے ذرا دنیا بھی دیکھئے

شب تھی کہ جیسے دشت میں تنہا تھا ہر کوئی
دن ہے اب احتیاط سے سایا بھی دیکھئے

چلتا ہوں تو زمین سے آتی ہے یہ صدا
اُڑتا ہے کس سلیقے سے پتہ بھی دیکھئے

روتے ہیں دشت شہر کے لوگوں کے شور کو
جو ہو سکے گذر کے دوبارہ بھی دیکھئے

توفیق دے خدا تو کبھی دل کی آنکھ سے
اوجھل ہے جو نظر سے وہ دنیا بھی دیکھئے

انساں ہی پانیوں کا شناور نہیں جناب!
کھیتا ہے خود کو آب میں تنکا بھی دیکھئے

جعفر شیرازی

مہکے چمن نہ آئی صبا میرے سامنے
اب کیا بھرم گلوں کا رہا میرے سامنے

تو اور میرے حال کی تجھ کو خبر نہ ہو
اے دردِ ہجر آنکھ اٹھا میرے سامنے

بیتی ہوئی بہار پہ گریاں ہوا جو میں
اک پھول کھلکھلا کے ہنسا میرے سامنے

رویا نہ حالِ زار پہ جس کے کبھی کوئی
برسے گی کھل کے اب وہ گھٹا میرے سامنے

دل کو جلا کے میں ابھی بیٹھا تھا مطمئن
یہ کیا دھواں سا اٹھنے لگا میرے سامنے

اٹھتی ہے اب نہ گرد نہ ریگِ رواں کا زور
خالی پڑا ہے دشتِ وفا میرے سامنے

جعفر جو بھر رہے ہیں مری دوستی کا دم
ان دوستوں کو لاؤ ذرا میرے سامنے

رنگِ سحر کی طرح اڑا لے گئی مجھے
میں موجۂ ہوا تھا ہوا لے گئی مجھے

کیسا کراں سے تا بہ کراں زیست کا بہاؤ
کیا دل کی موج تھی کہ اچھالے گئی مجھے

دن بھر میں دن کے ساتھ پھرا گھر سے دور دور
دن چھپ گیا تو رات چھپا لے گئی مجھے

آئی خزاں تو پائے خزاں سے لپٹ گیا
مہکے چمن تو مست ہوا لے گئی مجھے

سن کر محبتوں کے چڑھے پانیوں کی بات
اک لہر آئی اور بہا لے گئی مجھے

جعفر کہاں تلاش وہ ساعت کروں کہ جو
کر کے اداسیوں کے حوالے گئی مجھے

اختر ہوشیارپوری

اُن کا غم تو رُخِ ہستی کو جِلا دیتا ہے
تُو بتا اے غمِ جاں تو ہمیں کیا دیتا ہے

کیا خبر قافلۂ زیست کہاں سے گذرا
دل کسی جلتے بیاباں کا پتہ دیتا ہے

یہ کہیں تم تو نہیں۔ عمرِ گریزاں تو نہیں
کوئی راتوں کو درِ دل پہ صدا دیتا ہے

جب سرِ شام چراغوں کا دھواں پھیلتا ہے
شوق بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے

رات ڈھلتی ہے تو ویران جھروکوں سے کوئی
میری آواز سے آواز ملا دیتا ہے

آسماں بھی دہلے لے پرِ پرواز کہیں
کہتے ہیں شوق یہ پہلے بھی اُٹھا دیتا ہے

جانے کیا چیز ہے ہنگامۂ عالم اختر
آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے

کیلاش ماہر

سنائے ہیں گوش پہ آواز ذرا آہستہ
موسمو! آج کی شب ذکرِ وفا آہستہ

چاند کے پاؤں رکے تھم گئے اترتے تھا دل
ذکر کس عارض و گیسو کا چلا آہستہ

کتنے مہ جبیں آئے کفن اوڑھے ہوئے خوابوں کا
شب نے کھولی تری یادوں کی قبا آہستہ

کیا خبر اگلے برس اجنبی ہو جائیں ہم
ٹوٹتے جاتے ہیں پیمانِ وفا آہستہ

آج پھر زخمِ تمنا سے مہک اٹھتی ہے
کوئی پیغام لئے آئی صبا آہستہ

آنکھ نے دیکھا نہ ہو دل تو مگر جانے ہے
کون دیتا ہے دریچوں پہ صدا آہستہ!

اقبال متین

ذرا ٹھہر کے، تم اتنا تو سوچ سکتے تھے
گزر رہے تھے جہاں سے وہ دل کے رستے تھے

عجیب چیز ہے لالہ تنی و گل بدنی ۔
کہ تیرے جسم پہ سب پیرہن مہکتے تھے

ترے خیال سے گزرے تو کون یاد رہا
ہم اپنے آپ کو پہچان بھی نہ سکتے تھے

جناب شیخ، سلام، میکدے کے قریب
نظر پڑے ہوئے اول فول بکتے تھے

دیارِ دل میں عجب روشنی سی ہوتی تھی!
تمہاری یاد کے جس وقت دیپ جلتے تھے

ندی کے پانی میں جس وقت چاند اترا تھا
بہت سے پیڑ کھڑے راستے کو تکتے تھے

تمہاری آنکھوں نے دنیا بدل دی ہے ورنہ
یہ آئینے تو کبھی ہم بھی دیکھ سکتے تھے

ہم اس کی قبر پہ یوں سر جھکائے بیٹھے تھے
کہ جیسے زیست کے مارے ہوئے سسکتے تھے

صبح کو شورش دوراں نے وہ بھی چھین لئے
وہ تیرے سائے جو خوابوں میں ساتھ رہتے تھے

افضل منہاس

آؤ دیوانو، زمانے سے یہ پوچھا جائے
تا بہ کے لب نہ کھلیں درد سے تڑپا جائے

چاند جب کوچہ و بازار میں دیکھا جائے
کیسے ممکن ہے کہ پھر اس کو نہ پوجا جائے

آنکھ کے بحر میں آیا ہے تلاطم یارو
کوئی بتلاؤ کہ کس سمت دریا جائے

زندگی راہ میں کھو جائے گی اس کو روکو!
اس سفر پہ کوئی صحرا کا بگولا جائے

چند لمحوں کے لئے یاد کا جگنو چمکا
کھوج میں کس کی یہ مہمان اجالا جائے

آج ہو جائے منقّش در و دیوارِ چمن
اس طرح خونِ رگِ جاں کو اچھالا جائے

دل کے ویران جزیرے سے گزرنے والو
ایسی برسات میں کیسے تمہیں روکا جائے

فکر و احساس کی ہر شمع فروزاں کر کے
شب کی ظلمت میں نئی صبح کو ڈھونڈا جائے

دھوپ بھی کتنی کڑی کیسے بتائے افضل
کوئی سایہ ہو تو یہ بیٹھ کے سوچا جائے

بات کریں تو کیسے ان سے راہنما شرمیلے ہیں
منزل بھی ہے دور، ابھی تک رستے بھی پتھریلے ہیں

جانے کون چرا لیتا ہے انکی خوشیاں، انکے رنگ
کل بھی یہ چہرے تھے پھیکے آج بھی پیلے پیلے ہیں

طوفانوں کی شدّت کا اندازہ اس سے کر لیجئے!
آنکھ کا دریا خشک ہے لیکن ساحل ابتک گیلے ہیں

سانسوں کا بازار سجا ہے، بھیڑ لگی ہے لوگوں کی
اک جینے کی خاطر یارو کیسے کیسے حیلے ہیں

ہستی کے صحرا میں جانے والو ہم سے پوچھ تو لو
ہم تو جا کر دیکھ چکے ہیں راہ میں کتنے ٹیلے ہیں

دشمن تو دشمن ہیں! ان کی تلخی کا ہو شکوہ کیا!
لیکن جو احباب ہیں کیا ناگ سے کم زہریلے ہیں

ہم دیوانے لوگ یہی کچھ سوچ کے ابتک زندہ ہیں
ظلمت کے ماحول میں اپنے آنسو تو چمکیلے ہیں

افضل لگتا ہے گا ہے ان کا ذکر غزل میں ہو جائے
جن کو لوگ حسیں کہتے ہیں جنکے نین نشیلے ہیں

تابؔ اسلم

خیالِ خواب کی گلپوش رہگذار میں تھا
خوشا وہ دن کہ کوئی چشمِ انتظار میں تھا
نہ پوچھ دشتِ تمنا کی داستانِ دراز
جو قافلہ بھی ملا سرتا پا غبار میں تھا
کسی کی چشمِ غزالیں نے وہ بھی چھین لیا
سکونِ دل جو کبھی جذبۂ فرار میں تھا
یہ اور بات تجھے کچھ خبر نہیں ورنہ
میں خاکِ پا کی طرح تیری رہگذار میں تھا
ہزار بار یہ سوچا کہ بھول جاؤں مگر
ترا خیال کہاں میرے اختیار میں تھا
ہجومِ ماہ وشاں سے فضا بھی عطر فشاں
نہ جانے رات میں کس اجنبی دیار میں تھا
مجھے نہ بادِ صبا اس طرح نہ روند کے چل
وہ پھول ہوں جو کبھی دامنِ بہار میں تھا
اٹھا جو ابر تو اک بوند کو ترستا رہا
میں ایک خاک کا ذرہ کہ ریگزار میں تھا
ہر ایک لفظ کے ہونٹوں پہ تابؔ جاگ اٹھا
نہاں جو درد مرے قلبِ سوگوار میں تھا

حدِ نگاہ تک ہیں فضائیں دھواں دھواں
نکلا ہے ماہتابِ تمنّا مگر کہاں!!
صد حیف آج تک نہ بیاں کر سکا کوئی
اتنی طویل تھی غمِ جاناں کی داستاں
دستِ خزاں نے اُس کا نشاں تک مٹا دیا
وہ شاخِ گل کہ جس پہ ہمارا تھا آشیاں
شاید نویدِ فصلِ بہاراں ہوں دوستو!
دوش ہوا پہ پیرہنِ گل کی دھجیاں
تیزی سے بڑھ رہا ہوں ہر اک رہگذار پر
شاید بہت قریب ہے اب شہرِ دلبراں
لفظوں میں ڈھل رہی ہے لبِ سرخ کی چاندنی
کس نے یہ دل کے ساز پہ رکھی ہیں انگلیاں
نظروں کے اک تصادمِ موہوم کے طفیل
کیا کیا نہ دوستو نے بنا لیں کہانیاں!
یوں آ رہے تھے ذہن میں پیہم حسیں خیال
جیسے میں رات بھر تھا ستاروں کے درمیاں
اب وہ بھی تابؔ زلفِ نگاراں کا ہے اسیر
اک دل کہ مدتوں سے ہمارا تھا رازداں!

طلعت اشارت

یورشیں زمانے کی اور دل و جگر تنہا
حسرتوں نے چھانی ہے خاک دربدر تنہا

اس ہماہمی میں دوست اکون ساتھ دیتا ہے
چھوڑ ہی گئے مجھ کو میرے ہمسفر تنہا

فاصلے دلوں کے کب قربتوں سے مٹتے ہیں
راہِ دل پہ ہوتا ہے روح کا سفر تنہا

ایک راز کی خاطر، دردان گنت پائے
میری آرزو زخمی، آپ کی نظر تنہا

یہ نشانِ منزل ہے زعمِ آبلہ پائی
پاؤں سے لپٹتی ہے تیری رہگذر تنہا

ہم زباں ملے کتنے آشنا ملے کتنے
کارگاہِ ہستی میں ہم رہے مگر تنہا

شمیم حنفی

اے روحِ عصر تجھ سے یہی التماس ہے
مجھ کو خوشی نہ دے کہ مجھے غم کا پاس ہے
اب تک جنوں کے شہر میں رقصاں ہے زندگی
اب تک لبوں پہ خونِ جگر کی مٹھاس ہے
چاندی پگھل کے نیل کے ساگر میں مل گئی
بس اک متاعِ داغِ الم دل کے پاس ہے ٹ
صحرا میں چار سو نظر آتی ہیں پتیاں
لے دے کے ایک زرد سا خالی گلاس ہے
سونے کے چند ٹکڑے ہیں پیالے میں شام کے
کالی سیاہ رات کا چہرہ اُداس ہے
سنکی ہوا تو درد کی کلیاں بکھر گئیں
تنکا ہمارے گھر کا مگر خود شناس ہے
ہیں آسمان پر ترے آنچل کے قمقمے
گل میں رچی ہوئی ترے جوڑے کی باس ہے
خونِ شفق ہے غازۂ رخسار و لعلِ لب
خنکیٔ نور تیرے بدن کا لباس ہے
نمکین سی شراب کا اک جام دوستو
آنکھوں کو کتنی دیر سے اشکوں کی پیاس ہے

کیا جانے پچھلی رات سے کیوں جی اداس ہے
دنیا کا خوف ہے نہ خود اپنا ہراس ہے
تم نے ہزار درد کے تحفے دیئے مگر
اس دل کو کیا کریں کہ بہت ناسپاس ہے
چھائی ہوئی ہیں سر پہ اداسی کی بدلیاں
ساری فضا پہ دل کا مرے انعکاس ہے
خود آپ اپنی گرد بھی دنیا نہ پا سکی
دعویٰ یہ ہے کہ خود نگر و خود شناس ہے
غنچے کی بات آئی تھی اس پر بھی رو دیئے
ہر لمحہ زندگی کو ترے غم کا پاس ہے
دل کر رہا ہے ماتمِ یک شہرِ آرزو
چاروں طرف ہجومِ تماشائے یاس ہے
محرومیٔ الم ہے مرے دل کو تیغِ تیز
آ! اے غمِ حیات مجھے غم ہی راس ہے
دیکھیں تو اک زمانہ جنوں پر ہے خندہ زن
سوچیں تو تار تار خرد کا لباس ہے
آنکھوں سے چند پھول لہو کے گرے تھے رات
اس وقت سے چمن کا چمن بدحواس ہے

ٹ THE MOON HAS ALL HER LIGHT IN THE SKY; HER DARK SPOTS TO HERSELF JAGORE

بشیر بدر

خفتہ شجر لرز اٹھے جیسے کہ ڈر گئے — کچھ چاندنی کے پھول زمیں پر بکھر گئے

پایا جو مسکراتے ہوئے کہہ اٹھی بہار — جو زخم پچھلے سال لگائے تھے بھر گئے

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات — ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

وہ خشک ہونٹ ریت سے نم مانگتے رہے — جن کی تلاش میں کئی دریا گذر گئے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں — ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے

تلووں میں نرم دھوپ نے جب گدگدی سی کی — پلکوں میں سوئے چاندنی کے خواب ڈر گئے

آنکھوں کی جھیلیں کانپ رہی ہیں چھلک نہ جائیں — سوئے دکھوں کے دل میں سمندر بپھر گئے

ہونٹوں کے پاس چاند کی قاشیں لرز گئیں — آنکھوں پہ جیسے رات کے گیسو بکھر گئے

ساحل پہ رک گئے تھے ذرا دیر کے لئے — آنکھوں سے دل میں کتنے سمندر اتر گئے

جن پر لکھی ہوئی تھی محبت کی داستاں
وہ چاک چاک پرزے ہوا میں بکھر گئے

اشعار لائے بے بندھے موتی سے پاک تر — دریائے غم میں جب ذرا گہرے اتر گئے

کیفؔ انصاری

تجھ بن میرا جسم ہوا — سُونا رستہ جنگل کا
پتھر کھائے طعن سُنے — چپ ہو کر بھی دیکھ لیا
گونج رہا ہے کانوں میں — سناٹا، آواز نُما
راہ میں لاکھوں کانٹے تھے — جانے والا رک نہ سکا
مردہ پتّے بول اُٹھے — جب میں جنگل سے گزرا
دل ہے ان کا میرے ساتھ — آنکھیں ان کی لاپروا
ایسے ایسے شخص ملے — نیچے ریت اُوپر دریا
زردی مائل نیلا رنگ — ماضی ہے یا کوئی خلا
تیز ہوائیں دیتی ہیں — تیرے آنے کا دھوکا
سب کے ہاتھ میں پتھر تھے — کس نے، کوئی زخم گِنا
کتنا پُراسرار تھا جسم — بھیگی آنکھیں راز کھلا
جنگل سے آواز سُنی — پیچھے چھوڑا شہر بھرا
چاند بھی کتنا بزدل ہے — پانی دیکھ کے کانپ اٹھا
جسم کے باہر گلشن ہے — جسم کے اندر ہے صحرا

کب تک یہ پتھریلی چپ
اے میرے خاموش خدا

آیا نظر کے سامنے آئینۂ جفا
چہرہ کسی کا اور بھی نکھرا ہوا لگا

تاریکیوں میں تو مری پلکوں کی سمت دیکھ
اُگتے ہیں ماہتاب سرِ عرصۂ وفا

وہ دن گئے کہ ہم تھے سماعت کے آس پاس
تیرے بغیر ہو گئے ہم رات کی صدا

ہم چل رہے تھے اپنے خیالوں کے شہر میں
چپکے سے اس نے دل کے کناروں کو چھو لیا

کب تک رہے گی راہ میں ناواقفی کی دھوپ
اک دن تعلقات کا سایا بھی آئیگا

چمکا مری نظر میں کراچی کا ماہتاب
جب آسماں پہ رات کا ہر زخم وا ہوا

اے کیفؔ کیوں غزل میں نہ جدت کا عکس ہو
شاگرد ہوں میں حضرتِ احمد ندیم کا

شیر افضل جعفری

دورِ یزداں پہ رسا ہو کے دلا!
عدل و انصاف کی زنجیر ہلا

سوز کو اشکوں سے نمدار نہ کر
آگ میں اوس کی ٹھنڈک نہ مِلا

دل کو بجھ بجھ کے ہے جلنے کی چسک
اِس "اگن نوش" کو "برتاب" پِلا

ہو لیا چاک تو بخیے کا رفو
زخم دل کا مگر اب تک نہ سِلا

اے شبِ قدر کی جو بنجال سحر
مری تقدیر کا غنچہ بھی کِھلا

شدتِ درد سے بے تاب نہ ہو
درد کردار کو دیتا ہے جِلا

گُن تو گاتے ہیں تہی دست فقیر
اغنیا کرتے ہیں رزّاق کا گِلا

روحی کنجاہی

وہ جا رہا تھا کوئی اُسے روکتا بھی کیا
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

تصویرِ زندگی پہ جمی تہ وہ گرد کی
کوشش سے بھی نہ کوئی کبھی نقش اُبھر سکا

آنکھوں کے راستے ہی نہ ہو جائیں بے نشاں
مدّت ہوئی کہ کوئی بھی گزرا نہ قافلہ

یارو! دلوں کے فاصلے بڑھنے لگے بہت
ڈھونڈھو کسی طرح کوئی رستہ قریب کا

محفل جمی بلند ہوئے قہقہے مگر
کوئی کسی کے سینے کے اندر بھی جھانکتا

سینہ دہک رہا ہے غمِ روزگار سے
گیتوں کا شہر راکھ نہ ہو جائے دیکھنا!

عمریں گزار دی ہیں کھلے آسماں تلے
دھوپ اور مینہ نے تنگ ہمیں کب کیا دِکھا

جانے کدھر چلا ہے ستاروں کا کارواں
چاروں طرف سیاہ دھواں چھوڑتا ہوا

بجلی سی اک جھلک ہے یہ اُسکے مزاج کی
مشرق کو میں چلا تو وہ مغرب کو چل پڑا

اُس کے شریکِ راہ ہے سورج اور چاند
تنہا گیا ہوں میں تو جدھر بھی کبھی گیا

روحیؔ غمِ زمانہ، غمِ دوست کیا کہوں
پُر کر سکا نہ کوئی مری زیست کا خلا

اختر حمیدی

غمِ زنداں کے فسانے کا جو فنکار بھی ہے
اس میں احساس بھی ہے پھول بھی ہے خار بھی ہے
کوئی جھانکے تو سہی رات کی گہرائی میں
چاند کا پھول یہاں نقش بہ دیوار بھی ہے
میری پلکوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو
ایک مہتاب اندھیروں میں ضیا بار بھی ہے
یہ مقدر کوئی آئے نہ آئے ورنہ
دل کی بستی میں ہرے زخم کا بازار بھی ہے
اب تو ہر حال میں ہم پیاس بجھا سکتے ہیں
یہاں قطرہ بھی ہے دریا بھی ہے منجدھار بھی ہے
ہر جگہ اپنے قدم سوچ کے رکھو یارو
وقت کے زہر میں ڈوبی ہوئی تلوار بھی ہے
اب کے بہروپ جو بدلے ہیں خدا خیر کرے!
کوئی گلچیں کے ارادوں سے خبردار بھی ہے
ہم کو معلوم ہے نغمات کی چھاؤں میں کوئی
تیری آواز کی لہروں کا طلبگار بھی ہے
یہ مقدر ہے کہ شاعر کا قلم ہے اونچا
ہر غزل میں تیری پازیب کی جھنکار بھی ہے
اس بھرے شہر میں تم گھوم کے دیکھو اختر
کوئی زنجیر کے نغموں کا پرستار بھی ہے

رات کا زخم ابھرتا نہ اندھیرا ہوتا
تم جو آجاتے نگاہوں میں اجالا ہوتا

دل کے صحرا میں شگوفے بھی ہرے ہو جاتے
تیری یادوں کا اگر ابر یہ برسا ہوتا

تہمتیں آپ لگاتے ہیں وفاداروں پر
پہلے اپنے تو گریباں کو دیکھا ہوتا

تم نہ آتے جو خیالوں کو اجاگر کرنے
میری پلکوں پہ ستاروں کا جنازہ ہوتا

یہ خیالات کے ساغر جو کھنکتے ہوتے
چاندنی رات کا منظر بھی سہانا ہوتا

بادِ صرصر نہ اگر زہر اگلتی یارو
آج پھولوں کا کہیں زرد نہ چہرہ ہوتا

ہر طرف زخم کی دیوار کھڑی تھی اختر
ایسی حالت میں کہاں اپنا بسیرا ہوتا

سیپ کراچی

اختر امام رضوی

دنیا بھی پیش آئی بہت بے رُخی کے ساتھ
ہم کو بھی کوئی اُنس نہ تھا زندگی کے ساتھ

اک مشتِ خاک، آگ کا دریا، لہو کی لہر
کیا کیا روایتیں ہیں یہاں آدمی کے ساتھ

جنگل کی دھوپ چھاؤں ہی جنگل کا حُسن ہے
سایوں کو بھی قبول کرو روشنی کے ساتھ

سارے چمکتی رات کے قدموں پہ سو رہے
اک زہر گھل رہا ہے کہیں چاندنی کے ساتھ

تم راستے کی گرد نہ ہو جاؤ تو کہو
دو چار گام چل کے تو دیکھو کسی کے ساتھ

اپنوں کی چاہتوں نے بھی کیا کیا دیئے فریب
روتے رہے لپٹ کے ہر اک اجنبی کے ساتھ

کوئی دھواں اُٹھا نہ کوئی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ

کُتب خانہ

سیپ کراچی

انیس خورشید

کتب خانوں کی اہمیت

جس طرح اُردو غزل میں "ساقی" کا لفظ مانوس اور جانا پہچانا ہے۔ اسی طرح ہماری روزمرہ کی زندگی میں کتب خانے کی اصطلاح بھی اب اجنبی نہیں رہی۔ البتہ کتب خانوں کے نقوش ہمارے ذہن میں کہیں واضح ہوتے ہیں اور کہیں غیر واضح۔ ان کے ذکر سے کبھی تلخ یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو کبھی بھولے بسرے نغموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کتب خانوں کا تصور اکثر ہمیں ابتدائی درسگاہوں کے ان چھوٹے چھوٹے کمروں کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں چند بوسیدہ الماریوں میں غیر ضروری کتابیں مقفل پائی جاتی تھیں اور جہاں کتابوں کے استعمال پر پہرے بٹھائے جاتے تھے۔ ایسے ہی کتب خانوں کو مولانا صلاح الدین مرحوم نے کتابوں کے "قبرستان" سے موسوم کیا ہے۔ یا پھر ایسے کتب خانوں کی تصویر ہماری نظر کے سامنے کھنچ آتی ہے جن سے کالج کی زندگی میں طلبا کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں کالج کے علاوہ شہر کے چھوٹے بڑے عوامی کتب خانے اور بستی کی آنہ لائبریریاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ کالج کے کتب خانوں کا تصور زیادہ ناخوشگوار نہ سہی۔ لیکن کتابوں کے وہ انبار ضرور یاد آجاتے ہیں جنہیں مقفل الماریوں میں یا تو سجا کر رکھا جاتا تھا۔ یا فرش پر ڈھیر کے ڈھیر اس طرح لگا دیئے جاتے تھے کہ ان تک رسائی مشکل سے ہوتی تھی اور کتابیں بھی بیشتر مانگے کی ہوتی تھیں، جن کا دور دور تک کالج کے تعلیمی پروگرام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان میں کچھ کتابیں نصاب سے متعلق بھی ہوتی تھیں تو ان کے پرانے ایڈیشن ہوتے تھے۔ نئے اور اضافہ شدہ اشاعتوں کا بھلا وہاں کیا گزر ہوتا؟ اس ضمن کے بعض ایسے کتب خانے بھی یاد آجاتے ہیں جو اپنی تنظیم اور کارکردگی کے اعتبار سے اٹھارہویں صدی کے ان جرمن کتب خانوں کی یاد تازہ کرتے تھے جو لائبریرین کے بیمار ہو جانے پر اکثر مقفل ہی رہا کرتے تھے۔

عوامی کتب خانے تو ہمارے معاشرے کا ایک گہرا المیہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ کتب خانے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں موجود ہیں اور ہر سال ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ ان میں بعض کتب خانے ایسے بھی ہیں جو ۱۸۳۶ء سے اب تک قائم ہیں۔ لیکن بجز چند کے اکثر میں گرد سے اٹی ہوئی بوسیدہ کتابوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ ان کتب خانوں کی سرکردگی ایسے لوگوں کے ذمے ہوتی ہے جنہیں کتابوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن ان کو طویل دفتری خدمات کے عوض انہیں کلرک بنا کر کتابوں کی دیکھ بھال سونپ دی جاتی ہے۔

ان تلخ یادوں میں کچھ یادیں ایسی بھی ضروری ہوں گی جنہیں تنہائی میں دہرانے کو اکثر جی چاہتا ہوگا۔ ایسی ہی یادوں میں آ نہ

لائبریری سے مستعار لی ہوئی ناولوں کا چوری چھپے پڑھنا بھی شامل ہوگا۔ اب ان باتوں کا پردہ بھی کیا یہ کتب خانے تو اب ہماری زندگی میں عام ہوتے جا رہے ہیں۔ خود کراچی میں اس وقت تقریباً دو سو ایسے کتب خانے موجود ہیں اور لاہور میں بھی ان کی تعداد خاصی بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ ہمارے کتب خانوں کی داستان غم ضرور ہے لیکن اس کے بیان سے ان غلط تصورات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ جو کتب خانوں سے متعلق عام طور پر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان ہی تصورات کی بنا پر جو بھی اچھے کتب خانے اس وقت موجود ہیں۔ ان کی کارکردگی سے فائدہ اٹھانے میں بھی گریز کیا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے عوامی کتب خانے کی تحریک کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ ان رجحانات کے عام ہونے میں ہمارے کتب خانوں کی بے سروسامانی اور کم مائیگی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ لیکن بے سروسامانی کے اسباب پر خود کتب خانوں کو کوئی دخل نہیں۔

اور نہ ہی یہ بات قرین قیاس ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں کتب خانوں کی اہمیت کا صحیح احساس بھی پیدا نہیں ہوا۔ اس باب میں اب تک جو کام ہوا ہے اس کے نتیجہ کے طور پر کتب خانوں کے عام پھیلاؤ کے سلسلہ میں ایک واضح اور مستحکم تحریک [illegible] چکی ہے۔ لائبریرین کی تربیت کے بہتر اور اعلیٰ مراکز کھل چکے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے تربیت حاصل کئے ہوئے لائبریرین کی تعداد بھی اب خاصی ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس وقت ہمارے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بہتر اور اعلیٰ درجہ کے کتب خانے موجود ہیں۔ اور ان کی کارکردگی کا معیار بھی خاصا بلند ہے۔ اسی طرح بعض کالجوں، درسگاہوں اور تحقیقی اداروں کے کتب خانے بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ان کی ترقی اور بہبود کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ تعلیمی اور سائنسی کمیشن کی رپورٹوں میں بھی کتب خانوں کے بارے میں سفارشات کی گئی ہیں۔

لیکن جو بھی اچھے اور بہتر کتب خانے اس وقت موجود ہیں وہ عوام کی زندگی سے تقریباً خارج ہیں۔ یونیورسٹیوں تک ان کی پہنچ ناممکن ہے اور اگر کالج تک رسائی بھی ممکن ہو تو جیسے کتب خانے عام طور پر ان کے لئے موجود ہوتے ہیں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے اسکولوں میں تو درسی کتابوں کے علاوہ خال خال ہی کوئی ڈھنگ کی کتاب دیکھنے کو ملتی ہوگی۔ اور اگر ان درس گاہوں سے بھی محرومی حاصل ہو تو کتاب بس زندگی کا ایک خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ اور یوں زندگی کو حسین تر بنانے اور معاشرے کی نوک پلک درست کرنے کی آرزوئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ دیتی ہیں۔

اس المیہ سے ہمارے معاشرے کو اسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں عوامی کتب خانوں کا جال پھیلا دیا جائے۔ جہاں کتابوں کے استعمال اور ان کے اجرا کی بلا روک ٹوک اجازت ہو یہاں کتب خانوں کی کارکردگی کو بھی بہتر بنانا ضروری ہوگا کیونکہ صرف کتابوں کے جمع کر لینے ہی سے لائبریری کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے از بس ضروری ہے کہ کتابوں کے بہتر اور زیادہ استعمال کے مواقع فراہم کئے جائیں یہی وہ کتابیں ہیں جن میں ہمارے آباد اجداد کے تجربات اور مشاہدات کی روح سموئی ہوئی ہے۔ اور یہی تو کتابیں ہیں جن کے علم کی جلا سے آج چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

یہی کتابیں عوامی کتب خانوں میں کہکشاں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ان کی خنک روشنی میں علم سے شغف حاصل ہوتا ہے۔ اور زندگی سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ملک اور معاشرے کے مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور بین الاقوامی امور سے آگاہی۔ اس کے علاوہ صحت مند تفریح کے مواقع بھی عوامی کتب خانوں میں مہیا کئے جاتے ہیں۔ جہاں ایک طرف تعلیمی فلموں کی نمائش کا بندوبست ہوتا ہے تو دوسری طرف نغمہ و رباب سے ہمہ تن گوش ہونے کے بھی مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس طرح کے تعلیمی اور تفریحی مشاغل مہیا

ہوجانے سے ہمارے عوام نہ صرف وقت کا صحیح استعمال کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی علمی استطاعت میں بھی قابل قدر اضافہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر وہ اپنی معاشی بہبود کے لئے بھی راہ ہموار کر لیتے ہیں ان کی بالغ نظری انہیں شہری حقوق کے صحیح استعمال کی طرف راغب کرتی ہے جس سے معاشرے کے دوسرے افراد کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور اس طرح ملک کی خوشحالی اور ترقی میں بھی ان کا حصہ ہوتا ہے۔ بچوں کی صحیح تربیت اور نشوونما بھی عوامی کتب خانوں کے ذریعہ کچھ بہتر ہی ہوتی ہے اور انہیں بہتر شہری بننے کی رغبت بھی یہیں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لئے دلچسپ کہانیوں کے پروگرام بنائے جاتے ہیں اور خوشرنگ کھلونوں کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔

لیکن عوامی کتب خانے صرف انہی لوگوں کے لئے نہیں ہوتے جو کتب خانے میں آکر کتابیں حاصل کرتے ہوں بلکہ ایسے افراد کے لئے جو دور بستے ہیں، گشتی کتب خانوں کے ذریعے کتابیں پہنچائی جاتی ہیں۔ جہاں گشتی گاڑیوں کا بھی گزر نہ ہو سکے وہاں ڈاک کے ذریعہ کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ ان افراد کو رجوع کرنے کے لئے جو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی طرف مائل نظر نہیں آتے، مختلف سماجی اداروں کے تعاون سے خود ان کی بستیوں میں ایسے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں جن سے وہ لوگ کتابوں اور کتب خانوں سے قریب آسکیں۔

اس طرح یہ کتب خانے عوامی درسگاہوں کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کی کارکردگی کا یہ پہلو آج ہی اجاگر نہیں ہوا ہے۔ بلکہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ان کی یکساں طور پر ضرورت سمجھی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جب کہ کاغذ اور طباعت کا تصور عام نہیں ہوا تھا، کتب خانوں کے چلنے پھلنے کے نقوش کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں پیپرس، مٹی کی تختیوں، چرمی اوراق اور پتوں پر تحریر کی ہوئی کتابیں اکٹھا کی جاتی تھیں۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے برطانیہ میں جب محنت کش طبقہ مشینوں کی گھن گرج اور گھر کی بے سروسامانی سے فرار کی راہیں اختیار کرنا چاہتا تھا۔ تو تفریح گاہوں کی کمی اسے سستے شراب خانوں تک لے جاتی تھی۔ یوں شراب کا کثرت سے استعمال ہونے لگا تھا اور معاشرے میں ان کے اثرات مختلف جرائم کی صورت میں ظاہر ہو رہے تھے۔ اسی طرح فحش اور سستے ناولوں کی طرف لوگ مائل ہونے لگے تھے۔ جن کے پڑھنے سے عوام کے کردار اور اخلاق پر نمایاں اثر ہونے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں عوامی کتب خانوں ہی نے معاشرے کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا دیا تھا اور اچھی کتابیں اور مطالعے کے بہتر مواقع فراہم کرکے لوگوں کو شراب خانوں اور سستے ناولوں کی لعنت سے بچا لیا تھا۔ اسی طرح جب دیس دیس کے لوگ اپنی مختلف زبانوں اور ثقافتوں کو سینے سے لگائے ایک آدرش کی تلاش میں امریکہ جا بسے تو انہی عوامی کتب خانوں کے ذریعہ قومی یکجہتی کا جذبہ ان میں پیدا ہوا۔

آج ہمارے معاشرے میں بھی ایسے ہی کتب خانوں کی ضرورت ہے جو قومی مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ناخواندگی کو دور کرنے کا ہے۔ اس باب میں کتب خانے تعلیم بالغان کے اداروں کے ساتھ بہتر تعاون کر سکتے ہیں۔ کتب خانوں کے ذریعہ ایسے اجتماعات کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ جہاں عام فہم زبان میں لکھی ہوئی منظوم کتابوں کو عوامی لحن میں گا کر سنایا جا سکے۔ حرف شناسی کی منزل تک پہنچانے کے بعد اکثر ادارے اپنا کام ختم کر دیتے ہیں اس وقت یہی کتب خانے مناسب کتابیں عوام تک پہنچا کر ان کے ذوق مطالعہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ قومی یکجہتی کا ہے۔ اس باب میں بھی ہمارے کتب خانے کتابوں اور ثقافتی پروگراموں کے ذریعے عوام کو ایک دوسرے سے قریب لا سکتے ہیں۔ قومی مسائل کا احساس بھی انہیں کتب خانوں میں مطالعے سے پیدا ہو سکتا ہے اور جب یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے تو عوام خود بخود حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتے ہیں۔

عوامی کتب خانے اسی لئے آج ہماری قومی زندگی کا اہم جزو قرار دئے جاتے ہیں۔ جس طرح مفت جبری تعلیم ایک صحت مند معاشرے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح عوامی کتب خانوں کا قیام بھی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ انسانی ذہن میں درسگاہوں سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی پختگی کے اسباب کتب خانوں میں ہی فراہم ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے اچھے اور بہتر کتب خانے ایک خوشحال معاشرے کی ضمانت ہوتے ہیں۔

مدبّر رضوی

تعلیم اور کتب خانے

ہر نظام تعلیم میں کتب خانے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس موضوع پر بحث کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی تعریف و ماہیت اور اس کے اغراض و مقاصد مختلف نقطہ ہائے نظر سے اجمالاً بیان کر دئے جائیں تاکہ آگے افہام و تفہیم میں آسانی ہو۔

مسئلہ تعلیم بادی النظر میں بہت آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں۔ یہ فکر و عمل کا ایک پیچیدہ سلسلہ ہے۔ جس کو سمجھنے کے لئے بہت سے عوامل اور عناصر کو نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی یہ ژولیدگی اور پیچیدگی اہل نظر کے لئے خاصی پریشان کن رہی ہے اور اسی کے سبب تاریخ فلسفہ کے مختلف ادوار میں اس پر نت نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور طرح طرح سے سوچا سمجھا گیا ہے۔

عہد قدیم میں تعلیم و تدریس پر غور کرنے والا پہلا عظیم مفکر "افلاطون" ہے جس کی کتاب "ریاست" کو روسو جیسا تعلیمی نظریہ ساز سیاسی کارنامہ کہنے کی بجائے "تعلیم کے موضوع پر ایک بے مثال تصنیف" کہتا ہے۔ افلاطون ریاست اور تعلیم کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے۔ اس کا ریاست کو تعلیمی ادارہ کہنا آج کے انسان کے لئے بھی خیال انگیز ہے۔ اس کے نزدیک ریاست کے تمام امور تعلیم کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور تعلیم کو نظر انداز کر کے کوئی مملکت مثالی "ریاست" کہے جانے کی مستحق نہیں۔

بعد کے یوں تو کم و بیش وہ تمام فلاسفر جنہوں نے معاشرتی علوم اور ان سے متعلقہ مسائل پر غور و فکر کیا تعلیمی نظریے بھی پیش کئے ہیں، ان تعلیمی نظریہ سازوں میں انفرادی طور پر روسو، پسٹالوزی، فروبل، پرسی نن، جیمس روس، ڈیوئی، مارکس وغیرہم کے نام نمایاں ہیں۔ کوئی تعلیم کو عقل و ورزش سے تعبیر کرتا ہے، کوئی تعلیم کی غایت محض تربیت حواس سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک تعلیم کا مدعا صرف مادی خوشحالی اور آسودگی ہے۔ کسی کی رائے میں تعلیم کے اصل عناصر ترکیبی عمل اور تجربہ ہیں اور اس کا مقصد فرد کو معاشرہ کا باسلیقہ اور کامیاب رکن بنانا ہے۔ بعض مفکرین کے خیال میں ہر فرد میں کچھ خفتہ اور پوشیدہ صلاحیتیں موجود ہیں ان کو بیدار کرنے اور بروئے کار لانے کا نام تعلیم ہے۔ مداخلتی فلسفہ کے حامی تعلیم کو معاشرہ کے منفی اثرات سے بچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ انتخابی دبستان فلسفہ کا کہنا ہے کہ تعلیم اہل اور نا اہل کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے، اور حد و د و قیود قائم کر دیتی ہے۔ یہ ایک آسان کسوٹی ہے جس پر کھرا کھوٹا پرکھ کر الگ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ مفکرین تعلیم فرد کو اپنا اصل موضوع سمجھتے ہیں، کچھ لوگ اس کو ماحول کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ماحول کو تعلیم سے الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں بلکہ اس کو بھی تعلیم کے اصول اور معیار ہی سے جانچتے ہیں۔

فکر و نظر کے دیگر اُمہات مسائل کی طرح کوئی واحد نظریۂ تعلیم ایسا جامع و مانع نہیں جسے حرفِ آخر کہا جا سکے یا جس پر تمام مفکرین متفق ہوں۔

ع شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

والا معاملہ ہے۔ تعلیم کے نظریات کا اختلاف دراصل انسانی زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی پر مبنی ہے۔ یہاں ہمیں مفکرین تعلیم کے افکار و آرا جمع کرنا مقصود نہیں نہ متفرق اقوال اور متضاد نظریات پیش کرکے خود اس بارے میں اپنی رائے یا فیصلہ دینا ہے۔ اس لئے کہ یہ ہمارا منصب ہے نہ مدعا۔ تعلیم کو سب بیداری تصور کرتے ہیں اس کو ہمیں کثرتِ تعبیر سے خواب پریشاں نہیں بنانا چاہئے۔

تعلیم کے تاریخی رول کو اگر دیکھا جائے تو یہ اظہر من الشمس ہے کہ اقوامِ عالم میں اہم ترین وہ ہیں، جنہوں نے علم و عرفان کی نشو و نما کو اولیت کا درجہ دیا ہے۔ کوئی اجتماعی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ علمی ترقی سے مدعا یہ نہیں کہ اس کو چند مخصوص افراد یا طبقہ تک محدود کر دیا جائے بلکہ اس کی ترویج و اشاعت ساری قوم کے لئے ہونی چاہئے۔ اس کا اجالا جمہور کے تاریک ماحول تک پہنچنا چاہئے۔ ہماری جیسی قوموں کے لئے علم کی قدر و منزلت اور اس کی ضرورت کا تصور پیدا کرنے کے لئے اولاً عام خواندگی اور ثانیاً عام تعلیم کی فوری ترویج و اشاعت کی تدابیر اختیار ناگزیر ہیں۔ ورنہ جوہری توانائی اور خلائی سفر کے اس عہد میں علوم و فنون کا تنوع اور برق رفتاری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پس ماندہ قومیں جب تک غیر معمولی تدابیر اختیار نہ کریں یا منصوبوں پر فوری عمل درآمد نہ کریں۔ وہ کبھی دیگر ترقی یافتہ قوموں کی موجودہ ذہنی سطح تک نہیں پہنچ سکیں۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انہیں ہمیشہ پیچھے رہنا پڑے گا۔ یہ خواندگی سے تعلیم اور تعلیم سے علم و عرفان تک کی منزلیں چیونٹی کی چال سے طے نہیں کی جا سکتیں ان کے لئے ایک بے تحاشا الگن اور راکٹ کی رفتار کی ضرورت ہے، متواتر اور مسلسل تگ و دو اور جد و جہد درکار ہے۔

ہماری نسل کا ایک بہت بڑا مسئلہ حصولِ خواندگی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال پہلے اس پر عوام کی توجہ نہ تھی۔ اور نہ واقعی اس دور میں اس کی خاص ضرورت تھی۔ خواندگی سے لے کر منزلِ علم و عرفان تک پہنچنا صرف خواص کا حق تھا۔ وجہ ظاہر ہے صنعتی انقلاب سے پہلے انسان کی زندگی سیدھی سادی تھی۔ پیشے مخصوص اور معدودے چند تھے۔ ان کے لئے معمولی لکھت پڑھت کافی تھی۔ بعض دفعہ اس کی بھی حاجت نہیں تھی۔ علم کی شاخیں تعداد میں کم تھیں اور جو تھیں وہ اس قدر وسیع نہ تھیں کہ آدمی کسی ایک کا ہو رہے۔ مادی اعتبار سے علم کی نشر و اشاعت اس لئے محدود تھی کہ ہر شخص تقسیمِ محنت کی بنا پر مطمئن تھا اور تعلیم یا علم کو مادی وسیلہ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مشینی عہد میں تیسری مملکت "رفتہ رفتہ وجود میں آئی۔ زندگی کے تقاضے بدلے۔ کرۂ ارض پر زبردست سیاسی اور ثقافتی تغیر و تبدل ہوئے۔ سائنس نے انسان کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ محنت و سرمایہ کی بین الاقوامی کشمکش ہونے لگی علم شاخ در شاخ پھیل گیا اور اس قدر پیچیدہ اور بسیط ہوتا گیا کہ پچھلے زمانے کے جامع الکمال اور ہر فن مولا قسم کے علما کا تصور خواب و خیال ہو گیا۔ اب ہر علم کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پہلو اتنا ہمہ گیر اور وسیع ہے کہ اس کے حصول اور تحقیق کے لئے عمر بھی ناکافی ہے۔ اب زندگی کے نظریات میں ترمیم و تنسیخ ہوئی۔ اقدار میں رد و بدل ہوا ہر نظریہ اس عہد کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ منجملہ دیگر تبدیلیوں کے تعلیم کے تصور میں بھی انقلاب برپا ہوا۔ اس عہد کا تقاضا تھا کہ تعلیم عام ہو، مفت ہو، لازمی ہو اور اعلیٰ معیار کی ہو۔ اور ہر شعبہ میں ہو۔ جو ممالک آج ترقی یافتہ کہے جاتے ہیں انہوں نے وقت کی آواز پر لبیک کہا اور انفرادی کوششوں سے خواندگی اور علم کے قابلِ رشک معیار تک پہنچ گئے کسی ملک کی ترقی کی رفتار ناپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے۔ وہاں کتنے فیصدی روپیہ سالانہ بجٹ میں تعلیم کے لئے رکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب نو آزاد ممالک کے آگے معاشرہ کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ ہوتا ہے تو تعلیم کی ترویج و اشاعت سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں۔ کسی قوم کے مستقبل کی ضمانت اس کے اسلحہ جات اور افواج نہیں، جو جلد یا بدیر کند اور بے سود ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ضمانت اس کا عقلی اور ذہنی سرمایہ ہے۔ تعلیم کی قلت بسا اوقات معاشرہ کی ساری عمارت کو منہدم کر سکتی ہے۔ خواہ سماجی اور معاشی حالات قابلِ اطمینان ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے تعلیم کا مسئلہ آج کل انفرادی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ بلکہ ہر جگہ ایک قومی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کارخانے، مِل، فیکٹریاں ضرور تعمیر ہونا چاہئیں۔ زراعت اور کاشت کاری کی ترقی بہت ضروری ہے۔ سماجی حالات کو سدھارنا بھی لازمی ہے۔ لیکن ان میں سب سے افضل اور نتیجہ خیز سرمایہ وہ ہے جو انسانی دماغوں کو صیقل کرنے اور نکھارنے میں لگایا جاتا ہے۔ خاص طور ہمارے ملک پاکستان میں جہاں خواندگی صرف تیرہ فی صدی ہے۔ جارج ایلیٹ نے The Mill on the Floss میں ایک جگہ کہا ہے۔ "اپنے لڑکے کو وصیت میں سو دو سو ٹکہ کر مرنے سے بہتر ہے کہ وہ رقم اس کی تعلیم میں خرچ کر دی جائے، تعلیم ایک قرضہ ہے جو مستقبل کی طرف سے حال کی نسلوں پر واجب الادا ہے۔ اور بقول کسے تعلیم قوموں کا ارزاں ترین دفاع ہے۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک فوجی افسر کسی پروفیسر سے بحث میں الجھ گئے اور جھلا کر کہنے لگے۔ "دیکھئے ہم دوسروں کی خاطر اپنی جانیں دیتے ہیں اور کتنی قابل احترام بات ہے کہ تہذیب و تمدن کو بچانے کے لئے ہم لوگ ہی سینہ سپر ہوتے ہیں۔ بتلائیے۔ آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔؟" پروفیسر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "عزیز من! جس تہذیب و تمدن کو بچانے کے لئے آپ جانیں قربان کرتے ہیں وہ ہم ہی تو ہیں۔"

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس پس منظر کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

خواندگی اور تعلیم کے بغیر کتب خانوں کی ضرورت پر زور دینا یا ان کی اہمیت جتانا یا ان کا تعلیمی اداروں سے ارتباط دکھانا نالائقی ہے۔ اسی لئے عرض حال کے لئے اتنی طولانی تمہید باندھنی پڑی۔

پرانے نظام تعلیم اور موجودہ نظام تعلیم کا فرق اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں ظاہر کرنا چاہیں تو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قدیم نظام تعلیم معلم اور نصاب کو سب کچھ سمجھتا ہے اور موجودہ نظام تعلیم نے معلم اور نصاب کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے متعلم کی اہمیت کا اس میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان باتوں کو شرح و بسط سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال اشارہ کافی ہے۔

کتب خانہ کی منجملہ دیگر تعریفوں کے ایک تعریف تعلیمی اداروں کی حیثیت سے یہ ہے۔ "آزادی کی فضا میں نشو و نمائے ذات" اور اسی کے مقابلہ میں اسکول کی تعریف بحیثیت تعلیمی ادارہ کے یہ ہے: "منظم اور منضبط فضا میں تربیت اور عرفان ذات" کالج اور اسکول میں بہر طور معلم کی بالادستی ہے اور اس کے مقرر کردہ تنظیمی اور تعلیمی لائحہ عمل پر متعلم کو چلنا پڑتا ہے۔ لیکن کتب خانہ میں اس کو آزادی میسر آتی ہے۔ وہاں وہ اسکول میں بیدار شدہ اور تربیت شدہ طاقتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اور اپنی تعلیم کی مشعل سے کتابوں کی مخزن میں ہزاروں راستے تلاش کر سکتا ہے۔ تعلیم کسان کو ہل اور بیج دیدیتی ہے اور کتب خانہ اس کو زمین مہیا کر دیتا ہے۔ بونے جوتنے سے ہری بھری فصل لہلہانے لگتی ہے۔

باضابطہ تعلیم سے کتب خانہ کا تعلق اس وقت تک رہتا ہے جب تک تعلیمی مشین چلتی رہتی ہے۔ لیکن کتب خانہ اس وقت بھی غیر رسمی تعلیم کو جاری رکھتا ہے جب ہر پڑھنے والا کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ نہ ہو اس لئے کہ کتب خانہ کا رشتہ فی نفسہ ساری سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی سے ہے۔ تعلیم ختم ہو جانے سے تعلیم ختم نہیں ہو جاتی، وہ جاری رہ سکتی ہے۔ اور اس کا واحد سرچشمہ کتب خانہ ہے۔ تعلیم آدمی کو تیرنا سکھا سکتی ہے، وہ چاہے تو علم و فضل کے بحر ناپیدا کنار سے انمول موتی نکال سکتا ہے۔ اور آدمی تیرنا سیکھ کر زمین کا بوجھ بنا رہے اور پانی میں غوطہ نہ لگائے تو یہ اس کی محرومی اور بدقسمتی ہے۔ تعلیم، علم کی منزل کا ایک راستہ ہے۔ اگر کوئی راستہ کو ہی منزل سمجھ بیٹھے تو کیا کیا جائے۔ تعلیمی ادارے تعلیم دیتے ہیں اور کتب خانے اس علم کو استعمال کرنا سکھاتے ہیں، ترقی دینا سکھاتے ہیں۔ ورزش جسمانی کا کوئی معلم کسی نوآموز پہلوان کو چستی اور قوت نہیں بخش سکتا ہاں وہ چند ورزشیں اور رگ پٹھوں کو حرکت دینے کے طریقے ضرور بتلائے گا۔ جس سے جسم کی نشو و نما اور ارتقا ہو۔ ہاتھ اور پاؤں نوآموز پہلوان

سلہ یہاں یونیورسٹیاں زیر بحث نہیں۔ یونیورسٹی اور کتب خانہ کا تعلق اور ربط ایک علیحدہ اور سیر حاصل بحث کا متقاضی ہے۔ گو بعض اصول و ضوابط بعینہ وہاں بھی منطبق ہوتے ہیں۔

کو خود ہی ہلانے پڑیں گے۔ ایک سنگتراش اپنے شاگرد کو ہتھوڑی چھینی دے کر اپنی نگاہوں کے سامنے مجسمے ترشواتا ہے۔ بار بار ہتھوڑی چھینی کو پکڑنے اور صحیح طور پر استعمال کرنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ اور جب ایک مرتبہ شاگرد ان پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ہتھوڑی چھینی ہونے اور ان کا صحیح استعمال جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ شاگرد بے خطر لاتعداد مجسمے تراش سکتا ہے۔ یہی مثال طالب علم پر صادق آتی ہے جو اپنے استعمال سے سنگتراشی کے رموز سکھاتا ہے اور کتب خانہ کے اسٹوڈیو میں آکر بے شمار پیکر تراش سکتا ہے۔ گویا کتب خانہ تعلیمی ادارہ کا متبادل نہیں بلکہ اس کا ملحقہ اور لازمی جزو ہے۔

نظریاتی طور پر آج کل تعلیمی اداروں میں کتب خانوں کے وظائف یہ ہیں کہ ان کے وسیلے سے طالب علم اپنی شخصیت اور صلاحیت کو دریافت کرتا ہے۔ سائنٹفک انداز میں سوچنے سمجھنے کی عادت پڑتی ہے۔ کتابوں کے ذریعہ مستند و معتبر مواد اکٹھا کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ کتابوں سے محبت اور جذبہ رفاقت پیدا ہوتا ہے۔ بندھے ٹکے نصاب اور نظام الاوقات سے ہٹ کر علم کی وسعت، ہمہ گیری اور اہمیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی عائد کردہ مختلف مضامین کی مصنوعی تقسیم ختم ہو جاتی ہے۔ علم ایک اکائی کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جذبۂ تحقیق کو تقویت ملتی ہے۔ سماجی تربیت ملتی ہے۔ کتب خانوں میں پڑھانے سے زیادہ پڑھنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سکھانے سے زیادہ سیکھنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ذہنی سکون اور تفریح کا سامان بہم ہوتا ہے۔ آزادی اور خود شناسی کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

مطالعہ یا کتب بینی کے بارے میں ایک عام اور بے بنیاد تصور بہت سے لوگوں میں یہ راسخ ہے کہ کتاب انسان کو نکما کر دیتی ہے۔ اور اس کی فطری ذہنی صلاحیتوں کو گمراہ کرتی ہے۔ پڑھنے والے کے حق میں مطالعہ ایک غیر تخلیقی اور انفعالی عمل ہے۔ لیکن اس صدی میں جب نفسیات نے انسانی دماغ اور اس کے اعمال و افعال کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں، اور اوہام و قیاسات کے لات و منات کو توڑ ڈالا ہے۔ یہ کہنا کس قدر مہمل اور احمقانہ ہے۔ مطبوعہ صفحہ پڑھتے وقت کوئی قاری، جامد بے حس، منفعل مشین نہیں ہوتا۔ کتب بینی کے وقت ہر شخص کے ذہن میں نفس مضمون کی بابت ایک خاکہ بنتا جاتا ہے۔ جس میں وہ اپنی ذاتی پسند کے رنگ بھرتا جاتا ہے۔ یہ طے شدہ ہے کہ اس کے اپنے ذہن کی رنگین تصویر بعینہ وہ ہرگز نہیں ہوگی جو مصنف کتاب کے ذہن میں ہے۔ وہ اس سے مختلف ہوگی، خواہ بہتر ہو یا بدتر۔ کوئی کتاب پڑھنے والے کے لئے فلم کے منظر نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کو ہر شخص اپنی صلاحیت، ہدایت کاری اور طبیعت کے رجحان کے مطابق فلمائے گا اور ہر شخص کی فلمائی ہوئی تصاویر منظر نامہ یکساں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔ کتاب کا مصنف پڑھنے والے بچے کو الفاظ کے گٹکے دے دیتا ہے۔ جس میں اس کی زبان کے حروف تہجی۔ الف تا ی نقش ہوتے ہیں۔ جتنا ذہین بچہ ہوگا وہ ان گٹکوں سے اتنے زیادہ الفاظ بنائے گا۔ اور انہی حروف کے گٹکوں سے لغت کے تمام الفاظ بھی مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہر شخص اپنی فرہنگ اور لغت دانی کے مطابق الفاظ بنائے گا۔ یہ الفاظ سازی، یہ شبیہ سازی کیا تخلیقی عمل نہیں ہے، اس کو کس طرح سے غیر تخلیقی یا انفعالی عمل کہا جائے گا۔ شیکسپیر نے جو ہیملٹ لکھا تھا وہ اس کا اپنا تھا۔ میں اور آپ جو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، وہ دوسرا ہے، وہ میرا اور آپ کا ہے۔ اسی طرح فردوسی کا شاہنامہ یا دیوان غالب جو ان شعراء نے لکھا تھا وہ اپنے دماغوں میں محفوظ کر کے قبروں میں چلے گئے۔ اب جو ہم یہ کتابیں پڑھتے ہیں، لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ہماری اپنی شبیہ سازی ہے، رنگ آمیزی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جتنا بڑا مصنف ہوگا اس کے یہاں تخیل آفرینی اور رنگ آمیزی کے تہ در تہ امکانات ملیں گے۔ اور یہی اس کی مقبولیت اور ہمہ گیر اپیل کا راز ہوتا ہے۔ قاری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ معمار کی طرح صرف اسی سامان کو کام میں لا سکتا ہے جو اسے مہیا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی اختراعی صلاحیتوں پر ایسی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی کہ وہ انہیں کام نہ لا سکے۔ اس میں وہ قطعاً آزاد ہے۔ زمانہ حال کے مشہور فلسفی اور مفکر تعلیم ڈیوئی کا یہ قول کہ "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ مزید تعلیم حاصل کی جائے" اپنی جگہ اہم ہے اور دعوت فکر دیتا ہے۔ اگر اس پر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے تو یہ مقصد صرف اس وقت پورا ہوتا نظر آتا ہے جب تعلیمی ادارہ کے ساتھ کتب خانہ کا تصور وابستہ ہو۔ اور تعلیمی ادارہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی کتب خانہ سے وابستگی اور دلبستگی رہے۔

پہلے ہمارے پاس تعلیم کا تصور روایت پر منحصر تھا۔ لیکن اس میں نمایاں تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ تعلیم کو تخلیقی صلاحیتوں کے ابھارنے کے کام میں بھی لایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کتب خانہ تعلیمی ادارہ کا لازمی جزو ہے۔ تعلیم بچوں کو انگلی پکڑ کر چلانا سکھاتی ہے۔ اور غیر نصابی کتابیں اس کو زمین پر دوڑنا اور ہوا میں اڑنا سکھاتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ روایتی عناصر اور عوامل کے بغیر کوئی تخلیقی کام ممکن نہیں۔ کوئی ریاضی داں حساب کا کوئی مشکل مسئلہ اس وقت حل کر سکے گا، جب اسے گنتی آتی ہو۔ موسیقی میں سُر، تال، لے سے ابتدائی واقفیت نہ رکھنے والا شخص نایک ہونے کا دعویٰ کرے تو پاگل سمجھا جائیگا۔ بنیاد کا پتھر ہلا دینے سے ساری عمارت گر پڑتی ہے۔ مروجہ طریقوں سے بغاوت کرنے والا فنکار بھی دراصل پرانے نظریوں کی بنیاد پر ہی اپنے مخصوص فن کی اینٹیں چنتا ہے۔ بغاوت کی صورت محض یہ ہوتی ہے کہ طرز تعمیر اور نقشہ عمارت اس کا سب سے انوکھا ہوتا ہے۔

روایت کا سب سے بڑا خزینہ، کتب خانہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں گستاؤلی بان کا قول "زندہ نہیں، مردے ہم پر حکومت کرتے ہیں" معنی خیز ہے۔ مردے ان تجربات، افکار اور نوشتوں کے ذریعہ ہم پر حکومت کرتے ہیں جو ہمیں وہ ترکہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ اس ترکہ کا ایک حصہ ہمارے جسموں، دماغوں اور ذہنوں کی صورت میں ہمیں ملا ہے اور دوسرا حصہ کاغذ پر تحریر شدہ کتابوں کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ انسان کی تہذیب و تمدن دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک جسمانی صورت اور دوسری کتابی صورت۔ زندگی اور کتاب میں خط تفریق کھینچنا کیا معنی؟ کتابیں براہ راست جزو زندگی ہیں۔ یہ ہمارا "زندہ ماضی" ہیں۔ ماضی سے کٹ کر ہم سانس بھی نہیں لے سکتے۔ زندگی کی ہماہمی اور مدرسہ کا درمیانی پل کتب خانہ ہے۔ مدرسہ کے کنواں سے نکل کر اگر آدمی کتب خانہ کے میدان میں آئے تو اسے دنیا کی وسعت اور کشادگی اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ کتب خانہ ان قوائے ذہنی کے دروازے کھول دیتا ہے جنہیں عام تعلیم جامد بے لوچ اور غیر متحرک کر دیتی ہے۔ آج کی دنیا میں تعلیم کا جو نصب العین ہے کتب خانہ اسکی تکمیل کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تعلیمی ادارے "تعلیم" دیتے ہیں۔ اور کتب خانے "علم" کی راہ دکھاتے ہیں۔ "علم" بہر کیف رسمی تعلیم سے برتر اور افضل ہے۔ تعلیمی اداروں کے ساتھ کتب خانوں کا وجود لازمی اور ناگزیر ہے۔ تاکہ طالب علم جب سند تعلیم لے کر نکلیں تو علم کے حصول کی لگن ان کے دلوں میں موجود ہو۔ اور نصاب کے علاوہ کتابیں ان کے لئے اجنبی نہ ہوں۔ اور وہ جہالت سے لبریز ہو کر تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔ تعلیم کو خواندگی سے مخلوط کرنا غلط ہے۔ لیکن پہلا مرحلہ خواندگی، دوسرا حصول تعلیم اور تیسرا علم کے بحر گراں سے مستفیض ہونا ہے۔ تیسری منزل بہت بعد کی ہے لیکن نصب العین اسی منزل پر پہنچنا ہے۔ معمولی خواندگی کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن اس کے بغیر آگے بڑھنا محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ پڑھنے والے پیدا کیجئے۔ ان میں سے بڑی تعداد میں جویان علم بھی نکل آئیں گے۔ کتب خانے خود بخود معرض وجود میں آجائیں گے۔ کسی ملک میں چند سند یافتہ متعلمین کی تعداد کام نہیں آتی۔ بلکہ ان علماء و فضلاء و دانشوروں کی تعداد اصل سرمایہ ہوتی ہے جو علم کے سرچشمے ہوں۔ اس لئے کہ دنیا بھر کے لیمپوں کی روشنی بھی آفتاب کی روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ رات کے اندھیرے میں اگر بقدر ضرورت ان سے کچھ اجالا ہو بھی جائے۔ تب بھی یہ سورج کی روشنی کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ نہ اس سے دن نکل سکتا ہے۔ سطحی علم کی نمائش تو کی جا سکتی ہے لیکن اس سے قوم کا مستقبل نہیں سنور سکتا۔ ملک و قوم کی آبرو صرف گنے چنے دانشور، محقق عالم، فاضل ہی ہوتے ہیں انہیں کوئی تعلیمی ادارہ پیدا نہیں کرتا۔ یہ صرف اپنے ذہن کی براقی، ذوق تحقیق اور وسعت مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں ان کو آگے بڑھانے میں کسی تعلیمی ادارہ کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اور اگر چھان بین کی جائے تو ان کتابوں کا ہاتھ ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ جو نصاب میں شامل نہیں تھیں۔ اس بات سے نصابی کتابوں کی اہمیت نہیں گھٹتی۔ لیکن غیر نصابی کتابوں کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ تعلیمی ادارہ میں غیر نصابی کتابوں کا مخزن کتب خانہ ہونا چاہئے۔ کتب خانہ کے بغیر تعلیمی ادارہ نامکمل اور بے مقصد ہے۔ اور اس کی حیثیت بے روح سندیں ڈھالنے کے کارخانے سے زیادہ نہیں۔ لیکن تعلیمی اداروں کے مکمل اور بامقصد ہونے سے پہلے خواندگی اور تعلیم کی ترویج و اشاعت ممکنہ طریقوں سے ہونا لازمی ہے۔

چراغ تلے

کے بعد

ملک کے مشہور طنز و مزاح نگار

مشتاق احمد یوسفی

کے مضامین کا نیا مجموعہ

خاکم بدہن

(زیر طبع)

جدید شاعری کا

عہد آفریں شاعر ـــــــ!

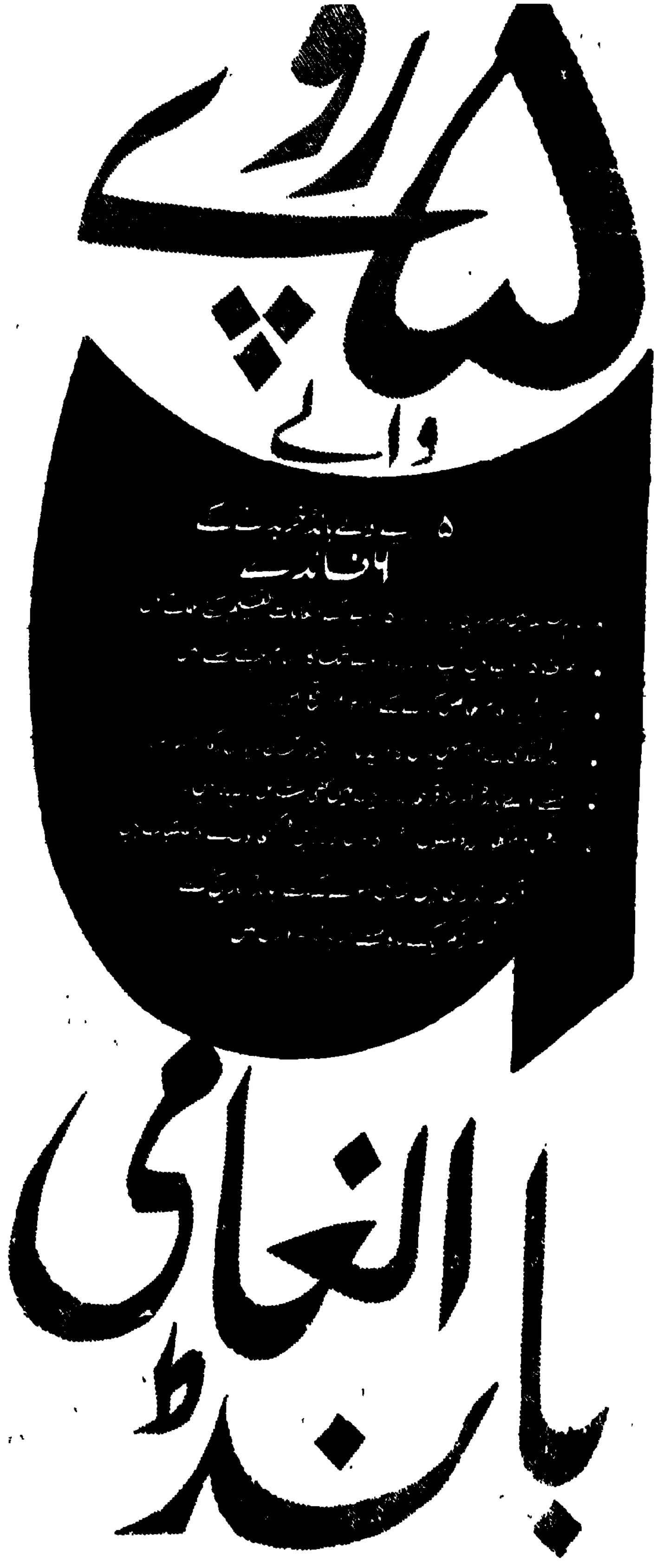
اخترالایمان

کا نیا شعری مجموعہ

بنت لمحات

(زیر طبع)

۲۷۔ ریبلو روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی ۵۰ (بھارت)


کپڑے
والے
۶ فائدے
انعامی
بانڈ

تبصرے

ادب اور تنقید

مصنف — ڈاکٹر سید شاہ علی

صفحات ۲۳۶

قیمت .... چار روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- مشتاق بک ڈپو، خداداد روڈ، کراچی ۱۶

ڈاکٹر سید شاہ علی کا مجموعہ مقالات "ادب اور تنقید" مکتبۂ اسلوب کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نو علمی، ادبی اور لسانی مقالات پر مشتمل ہے، جو زیر نظر مجموعے میں شامل ہونے سے پہلے ملک کے مقتدر ادبی رسالوں میں شائع ہو کر اہل نظر سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ عام طور سے اس نوع کے مجموعوں کو ایک مستقل آزاد تصنیف کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی، اور مقالات جو ان مجموعوں میں شریک کئے جاتے ہیں، مستقل تصنیف کے ابواب و فصول کی سی ترتیب کا عموماً فقدان ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر شاہ علی کے مجموعے کے ابتدائی تین مقالات "انگریزی مضمون نگاری"، "سرسید کے ادبی مضامین" "نثر کے انشائیوں پر ایک نظر" میں ایک مرتب کتاب کے ابواب کی سی ترتیب پائی جانے کی وجہ سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔

مقالات قریب قریب سب ادبی اہمیت کے حامل ہیں، جن میں صاف ستھری زبان میں اہم ادبی اور تنقیدی نکات و لطائف بیان ہوئے ہیں۔ مقالات کے سرسری مطالعے ہی سے ڈاکٹر سید شاہ علی کے ادبی ذوق اور تنقیدی درک کا پتہ چلتا ہے، جن کی کمی عموماً آج کے لکھنے والوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ میں "ادب اور تنقید" کو اردو کے تنقیدی ادب میں اضافہ سمجھتا ہوں۔

—————— ڈاکٹر شوکت سبزواری

شام اور سائے

مصنف .... وزیر آغا

صفحات ۱۲۰

قیمت .... دو روپے

ناشرین :- جدید ناشرین، چوک اردو بازار، لاہور

۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعری نے آگے بڑھنے کے لئے مختلف راہیں اختیار کیں۔ کچھ شاعر ماقبل شعور کی کیفیت میں گم ہوئے اور بعض ذاتی علامتوں کی بھول بھلیوں میں جا کر اپنی ذات تک بھول بیٹھے اور کچھ نے علامتوں سے کائنات کو مسخر کرنے کی ٹھانی۔ اس کائنات کو جو صرف ان کے

سیپ کراچی

اپنے ذہن کی پیداوار تھی۔ اور اس تلاش میں ہر دو گروہ شاعری کے اس مقصدِ اولین کو بھی بھول گئے جو شعور ذات بھی بخشتی ہے اور حیات و کائنات پر بھی محیط ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے ان چند جدید شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے ذاتی علامتوں سے بھول بھلیاں نہیں بنائیں بلکہ ان سے ایک جہان تازہ کی تعمیر کی ہے۔ جن کا ادراک اور ابلاغ واضح بھی ہے اور کنایہ آمیز بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابہام اور غیر واضح پن کا شکار نہیں ہوتے ان کے موضوعات زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اپنے موضوعات کے لئے وہ ایسا علامتی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو دلکش ہی نہیں بلکہ اردو کی آزاد نظموں کو ایک نئے آہنگ اور تاثر سے روشناس بھی کرتا ہے۔ وہ الفاظ کو ان کی پوری وسعت سے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ ان کے ایک جامد حقیقت نہیں بلکہ ایک متحرک خیال بن کر ابھرتے ہیں جن کا پھیلاؤ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ الفاظ اور موضوع اور علامتوں سے ایک ایسا طلسماتی دائرہ بناتے ہیں جن کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے اور جو اس طریقہ پر زندگی کے تسلسل اور حرکت کی علامت بن جاتے ہیں۔

صرف چمکتے لمحے ہی کو لے لیجئے جس کو وزیر آغا نے اس طرح الفاظ میں مقید کرکے ایک بیکراں پھیلاؤ دیا ہے۔

"یہ لمحہ کہ خود ان گنت ساعتوں سے مرتب ہوا ہے
یہ لمحہ کہ صورت بدل کر شب و روز میں ڈھل گیا ہے
شب و روز ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے
مہ و سال کی ایک لمبی سی مالا بنے ہیں۔
وہ مالا تیری نرم گردن میں ایک طوق سا بن کے اب جھولتی ہے"

اور یوں "چمکتا لمحہ" وزیر آغا کی شاعری میں آکر ایک پوری داستان بن جاتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز، تیرگی و روشنی آلام و آسائش سب پر محیط ہے۔ یہ لمحہ ایک پوری داستان ہے جو حرکت، نور، آگ، پانی، اور مٹی کا بہترین اظہار ہے۔ جو اپنے آپ میں تخریب بھی ہے تخلیق بھی۔

وزیر آغا کی نظموں کا یہی موضوعی پھیلاؤ اور وسعت ان کی نمایاں صفت ہے اور جو ان کو دوسرے جدید نظم گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے شام اور سائے ان کی کتاب کا نام نہیں ان کی شاعری کا نام ہے۔

——— افسر آذر

پاکستانی کلچر

مصنف .... جمیل جالبی

صفحات ۲۴۴

قیمت .... ۸ روپئے

ناشر.. مشتاق بک ڈپو، شلڈن روڈ کراچی ۱

اقبال نے شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کے لئے خون جگر کو ضروری قرار دیا ہے۔ شاعری میں تو ہمیں ایسی مثالیں پھر بھی مل جاتی ہیں مگر نثر میں خون جگر کی نمود کی غالباً یہ پہلی مثال ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کا مصنف کتاب لکھتے وقت کس قدر شدید ذہنی کرب میں مبتلا رہا ہے۔ مصنف نے اپنے قارئین سے صرف یہ توقع کی ہے "اگر آپ اس کتاب کو پڑھ کر سوچنے کی طرف مائل ہو سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری بھی اپنے دل میں وہی کرب محسوس کرتا ہے جو مصنف کے دل کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ کامیاب ابلاغ اسی کا نام ہے۔

جمیل جالبی نے اس کتاب میں بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ موضوع کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ اس کتاب میں جہاں کہیں بھی مصلحت نے بے باکی اور صداقت پر غالب آنے کی کوشش کی ہے نفس مضمون الجھ کر رہ گیا ہے۔

پاکستان کے لئے کلچر کا سوال اس لئے زیادہ اہم ہے کہ یہ عجیب و غریب قسم کا ملک ہے۔ عام طور پر قوم سے ملک بنتا ہے۔ مگر یہاں ملک پہلے وجود میں آیا۔ اور بقول مصنف خلا کے ساتھ وجود میں آیا۔ یہ اس برصغیر کی بدنصیبی تھی کہ یہاں سیاست کی ابتدا ہی نفرت اور تنگ نظری سے ہوئی۔ تقسیم کے بعد سے آج تک یہ دونوں ممالک اس سے آزاد نہ ہو سکے۔ کانگریس اور مسلم لیگ بظاہر نظریات پر منحصر نظر آتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک نفرت کا جواب دوسری نفرت سے دیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تقسیم کے بعد اقلیتی صوبوں سے آنے والے مہاجر بقدر آدرش لے کر پاکستان آئے تھے۔ مگر خود اس آدرش کی تہ میں نفرت کارفرما تھی۔ یہی حال ہندوستان کا تھا۔ دونوں ممالک میں اس نفرت کے سہارے مختلف علاقے کے لوگوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی۔

ملک کی تقسیم کے ساتھ اپنے تہذیبی سرمایہ اور تاریخ کو تقسیم کرنا اسی تنگ نظری کا مظہر ہے۔ برصغیر کی ثقافت ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے اختلاط کا نتیجہ تھی۔ یہ ثقافت جسے مصنف نے ہند مسلم ثقافت کہا ہے۔ قدرتی طور پر ابھری تھی۔ یہ ہمارے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی۔ حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی واقع ہونا قدرتی بات تھی۔ مگر اس تبدیلی کو قدرتی طور پر واقع ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے اپنے ماضی کو اس طرح فراموش کرنا چاہا جیسے ہم بڑی اہم قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں نے اپنے تسلط کی بقا کے لئے طرح طرح کے بے معنی اور پُرفریب نعرے لگائے۔ ایک گروہ ایسا تھا جو ہر چیز میں اسلامی نعرہ لگاتا تھا۔ ایک کانفرنس میں ایک صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا۔ اسلامی معاشیات' اب آپ بتایئے معاشیات کو اسلام، عیسائیت اور ہندوئیت سے کیا واسطہ ہے، معاشیات تو محض علم ہے۔ اسی طرح یہاں اسلامی ادب کے نعرے بھی لگائے گئے۔ حالانکہ ادب ہمیشہ ادب رہا ہے اور اب بھی رہے گا۔ یہ نعرے یا تو حماقت کی پیداوار ہیں یا عوام کو خرافات میں الجھا کر اقتدار کو مضبوط تر کرنے کا وسیلہ۔

ہمارے یہاں جب اسلام کا نعرہ لگایا جاتا ہے تو ہم چونک پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ بیشتر یہ نعرہ عوام کو فریب دینے کے لئے لگایا جاتا رہا ہے۔ اختلاط پذیر معاشرے میں اہل مذہب کا یہی کام رہ جاتا ہے کہ وہ برسر اقتدار طبقہ کا آلہ کار بن کر عوام کو ان کے حقیقی مسائل کی طرف سے غافل رکھیں۔ مذہب بلاشبہ ایک فعال قوت ہے۔ مگر صرف اس صورت میں جب یہ اخلاق کا جزو بن جائے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص اس لئے رشوت لیتے ہوئے ڈرتا ہے کہ وہ قانون کی گرفت میں نہ آجائے۔ دوسرا شخص خوف خدا کی بنا پر رشوت سے گریز کرتا ہے۔ تیسرا شخص اخلاقی جرم سمجھ کر رشوت سے نفرت کرتا ہے۔ مذہب کی اعلیٰ ترین صورت یہی ہے۔ بقول مصنف ہمارے یہاں مذہب صرف رسوم و عبادات کا نام ہے۔ زندگی اور عبادت الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ چور بازاری کرنے والا سرمایہ دار مسجد بنوا کر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے گناہ دھل گئے۔ حالات نے اس کے سوچنے کے انداز کو اسی طرح ڈھال دیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح حکام کو رشوت دے کر اپنا کام نکالا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نعوذ باللہ خدا کو بھی رشوت دی جا سکتی ہے۔

ہماری تمام ترخرابیاں اسی بنا پر ہیں کہ زندگی میں ہمارا کوئی اصول اور نصب العین نہیں۔ اصول اور نصب العین بھی دراصل ثقافتی روایات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ثقافتی روایات نہ ہونے کی بنا پر ہم قوم اور حب الوطنی کے تصور سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اگر آپ تجزیہ کر کے دیکھیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کے ذمہ دار عوام نہیں بلکہ خواص ہیں۔ شروع شروع میں یہاں کی سیاست پر زمیندار طبقہ چھایا ہوا تھا۔ اب جبکہ یہ ملک صنعت و حرفت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے یہاں کی سیاست پر صنعت کار بھی اثر انداز ہونے لگے۔ موجودہ صورت حال مصنف کے الفاظ میں یہ ہے۔ "اب اقتدار دولت اور زمین سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں جس کے پاس دولت ہے وہ اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے اور جس کے پاس اقتدار ہے وہ دولت حاصل کرنا چاہتا

ہے: اس تاجر طبقہ کا کوئی اصول نہیں۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی قدر دولت ہے۔ جب اقتدار طبقہ کا رویہ دیکھ کر یہاں کا ہر انسان دولت جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا۔ صنعت کار اور ارباب اقتدار بقول مصنف روپے کا ہالکر ہا کرنے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ طبقہ عوام کو بے وقوف بنانے اور غفلت میں مبتلا رکھنے کے لئے وہ تمام حربے استعمال کر رہا ہے جن کا ذکر اقبال نے "خضر راہ" میں کیا ہے۔ برسر اقتدار طبقہ نے تمام سماجی اداروں کو اس مقصد کے تحت اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ لکھا ہے "مذہب، سیاست اور معیشت جیسے ادارے اپنی ساری قوت ناہمواری کے نظام کو زندہ و برقرار رکھنے پر صرف کر رہے ہیں۔" اس کے بعد صورت حال یہ ہوتی ہے "ہمارے معاشرے میں قومی اصول اور قومی مقاصد ذات کو سامنے رکھ کر صرف سہولت کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ذات کی ضروریات اور مفاد کے تقاضے بدلتے جاتے ہیں۔ اصول بھی بدلتے جاتے ہیں۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اس ملک کا ہر انسان بے اطمینانی میں مبتلا ہے۔ ہر انسان کی زندگی ان مسائل سے گھری ہوئی ہے کہ وہ اپنی ذات سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ہر شخص خود حفاظتی میں مبتلا ہے۔ خیر و شر کا امتیاز ہماری زندگی سے بالکل اٹھ گیا ہے۔ ہر انسان مفاد پرست ہو گیا ہے۔ جو اس کے مفاد کو تقویت بخشے وہ خیر ہے اور جو اسے نقصان پہنچائے وہ شر ہے۔ ہمارے یہاں انسان کو اس کے کردار، اخلاق اور انسانیت کے پیمانے سے ناپنے کے بجائے روپے کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ جب حالات یہ ہوں تو قومی یکجہتی اور حقیقی حب الوطنی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ سیاست داں زبان سے تو قومی یکجہتی پر زور دیتے رہتے ہیں، مگر عمل کے ذریعہ علاقائی تعصب پھیلاتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بنگالی اور پنجابی کا فاصلہ بارہ سو میل کے بجائے ہزاروں میل ہو گیا ہے۔ ایک علاقہ دوسرے علاقہ کو غالب اور حریف سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ سیاست کا کارنامہ ہے اس لئے ارباب سیاست اس پر پشیمان تک نہیں۔

قومی یکجہتی پیدا کرنے کے سلسلے میں زبان سب سے اہم چیز ہوتی ہے، یہ ہماری سیاست کا کارنامہ ہے کہ یہاں دو زبانوں کو قومی زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ انہیں سرکاری زبان بنانے کے لئے بیس سال کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس مدت کی ابتدا کب سے ہو گی۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی شاید یہ بیس سال پورے نہ ہوں۔ حکومت اگر خلوص سے دو زبانوں کو ہی سرکاری زبان بنانا چاہتی تھی تو اسے ان دونوں زبانوں کو تعلیمی نظام میں داخل کر دینا چاہئے تھا۔ جب ہم انگریزی سیکھ سکتے ہیں تو کیا مشرقی پاکستان والوں کے لئے اردو سیکھنا اور مغربی پاکستان والوں کے لئے بنگلہ سیکھنا ناممکن تھا۔ مگر یہاں تو تعلق کا منشا انگریزی کو برقرار رکھنا تھا۔ اس لئے کہ اقتدار کے بقا کی یہ بھی ایک تدبیر تھی۔ دو زبانیں جب اس طرح لائی جاتیں تو دونوں کا مزاج بدلتا اور دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جاتیں کہ پھر ایک ہی زبان یہاں رائج ہو سکتی تھی۔ ایک زبان کے بغیر حقیقی یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ قومی کلچر اسی یکجہتی کا دوسرا نام ہے۔ کلچر میں اہم ترین حصہ زبان ہی کا ہوتا ہے۔ زبان کی یکسانیت کی بنا پر ہی منشی سجاد حسین رائد پٹرادہ پنچ سے پنڈت رتن ناتھ سرشار بمقابلہ دکن یا سندھ کے مسلمان کے زیادہ قریب تھے۔ زبان کی یکسانیت کی بنا پر ہی بنگال کے دل کی دھڑکن پنجاب اور سندھ کا انسان سن سکے گا۔" مشترک مقاصد، مشترک معیار اور مشترک انداز نظر پیدا کرنے کے لئے زبان کا ایک ہونا بہت ضروری ہے۔ زبان کے عنصر پر جس قدر زور دینے کی ضرورت تھی وہ جمیل جالبی نے نہیں دیا۔ مصنف کا مطمح نظر تھا "قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ" اس سلسلے میں انہوں نے ان عوامل سے بحث کی ہے جو کلچر کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کی کئی سو سال کی فکری تاریخ آ گئی ہے۔ خصوصاً شاہ ولی اللہ اور سرسید نے قومی یکجہتی پیدا کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا بڑی عمدگی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ کلچر کی تشکیل میں مذہب کا اثر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ جمیل جالبی نے تسلیم کیا ہے کہ محض مذہب کی یکسانیت مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں میں قومی یکجہتی پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مذہبی عنصر اور مذہب کی تاویلات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ ہماری موجودہ پستی کی وجہ محض مذہب کی گمراہ کن تاویلات نہیں ہیں۔ مذہب کی تو ایسی مٹی پلید کر دی گئی ہے کہ جو کوئی بھی احمقانہ نعرہ لگاتا ہے اس کا سند مذہب سے ضرور تلاش کرتا ہے۔ یہاں کے علما اور سیاست دانوں کا وہی حال ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا۔ ع

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اسی طرح تصور حقیقت پر بھی مصنف نے غیر ضروری زور دیا ہے۔ تصور حقیقت کو نظام زندگی میں بڑا دخل حاصل ہوتا ہے مگر شفیق خیال کے اس دور میں اگر عام کا تصور حقیقت گمراہ کن ہو تب بھی معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام مباحث جو مصنف نے اٹھائی ہیں محض فکری ہیں عملی نہیں۔ "مذہب اور کلچر" اور "مادی ترقی اور کلچر کا ارتقا" والے ابواب کی غیر ضروری طوالت نے علمی انداز تو ضرور پیدا کر دیا ہے۔ مگر مصنف کے مطمح نظر کی شدت تاثر میں اس سے کافی کمی آ گئی ہے۔ غزل کے شعر اور افسانے کا وار نظم اور ناول کے مقابلہ میں زیادہ کاری ہوتا ہے اور اس لئے دیرپا بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے وقت مصنف کو اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تھا۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مصنف نے قومی کلچر کے لئے کوئی لائحہ عمل یا کوئی خاکہ تجویز نہیں کیا۔ قومی کلچر کا لائحہ عمل مرتب کرنا کسی فرد واحد یا جماعت کا کام نہیں ہے۔ یہ کوئی جمہوری تماشہ نہیں ہے کہ سب کو خوش کرنے کے لئے ایک معجون مرکب تیار کر دی جائے۔ کلچر کی تشکیل ایک سماجی عمل ہے۔ ارباب اقتدار کا کام صرف ایسے حالات پیدا کرنا ہے جو قومی یکجہتی پیدا کر سکیں۔

جمیل جالبی نے دیدہ بیناے قوم بن کر قوم کے اہم ترین مسئلہ پر بڑے دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب کون ہیں۔ اس کا مخاطب وہی طبقہ ہے جس کے متعلق جمیل جالبی نے لکھا ہے "ہمارے ہاں دانشور کی وہ اہمیت بھی نہیں ہے جو ایک عام دستکار، لوہار یا بڑھئی کی ہوتی ہے" وہ طبقہ جو ہماری تمام خرابیوں کی علت العلل ہے شاید اس کے گوش مبارک تک یہ درد ناک صدا پہنچ بھی نہ پائے۔

——— عبدالسلام

پیاسی بیل

مصنف .... مانک ٹالہ

قیمت .... چار روپیہ

صفحات ۱۷۶

ملنے کا پتہ۔ جیو پیٹر پبلشرز، ادم نواس، وڈالا، بمبئی ۳۱

ایک اچھی کہانی کی تخلیق ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن میں تجسس کے ساتھ اپنے ارد گرد کی چیزوں سے گہری وابستگی اور ہمدردی کا احساس موجود ہے۔ مادی اشیاء کو پرکھنے اور غیر مادی اشیاء کو محسوس کرنے کی قوت، مزاج، محبت اور نفرت کا واضح احساس، تجربے کی وسعت، مطالعے کی گہرائی، سوچنے کے عمل میں تسلسل، صحت مند تصور، الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ بڑی آسانی سے ایک اچھی چیز کو جنم دیتے ہیں۔ میرے نزدیک کہانی ایک زندہ اور متحرک شے کا نام ہے۔ پڑھتے وقت اگر زندگی اور زندگی سے متعلق چیزوں کا احساس متحرک نہ ہو تو وہ افسانہ نہیں حنوط شدہ لاش ہے۔

افسانے (Fiction) میں اپنی کمزوریاں چھپا لینے کی بڑی گنجائش نکلتی ہے۔ چنانچہ آج کل اس کے دو سیدھے سادے اصول ایسے ہیں جنہیں اپنا کر ہر لوبانا ایڈیٹریوں کے زور پر سارتر، کامیو کا قد نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اصول ۱۔ وہ چار الٹی سیدھی علامتیں اندھے کی بٹیر کی طرح ہاتھ لگ جائے تو کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے افسانہ لکھنے والے افسانہ نگاروں کی ذمہ داری تو بس اتنی ہوتی ہے کہ وہ "آنکھوں دیکھا حال" کچھ اس انداز سے نشر کرے کہ پڑھنے والا الو بن جائے۔ اظہار و بیان میں خوب الجھاوے اور پیچیدگیاں ہوں۔ بات وہاں سے شروع کی جائے جہاں عموماً بات ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ نظموں کی طرح افسانے میں بھی جدیدیت کے علمبردار البرکامیو، سارتر، فرانز کافکا کے نام بے خوف و خطر ذہن پر طلب ڈنڈے برساتے ہیں۔ اگر ان پر کبھی غلطی سے آپ نے رکافی بازرس میں انگلی اٹھا دی تو وہ شبہ سے بچے ہوئے انداز سے اپنے بونے پن پر جدیدیت کا لحاف ڈالتے ہوئے کہتے ہیں، افسانہ نگار نہ مسجد کا ملا ہے اور نہ پرائمری اسکول کا معلم، ادیب بس ادیب ہے۔ درس و تدریس اس کا پیشہ نہیں چلے بیچنی ہوئی۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"۔

اصول نمبر ۲۔ یہ نسبتاً زیادہ آسان اور سہل ہے۔ یعنی افسانہ لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ کچھ اور رہ جائے مگر افسانہ نہ ہونے پائے۔ احتیاطاً افسانے کے ہر تیسری چوتھی سطر میں افادیت، مقصدیت، انسانیت جیسے الفاظ گرہ چمک کے ساتھ آتے رہنا چاہیئے اس سے ہوتا یہ ہے کہ پڑھنے والا آخر میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی یہ ضرور کہے کہ "کچھ تو ہے"۔

اس تمہید کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ مانک ٹالہ بھی اپنے افسانوں میں یہی مجرب نسخہ آزماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ایک سیدھے سبھاؤ کے انتہائی ایماندار ادیب ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے اپنے مجموعے میں اپنے بڑے ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پندرہ سال کے طویل عرصے میں صرف اٹھارہ کہانیاں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ افسانہ نگار نے اپنے فن کو سطحی جذباتیت کی بھینٹ چڑھنے دیا۔ بلکہ اپنے تجربے اپنی زندگی اور اپنی فکر سے حاصل کی ہوئی کہانیوں میں بڑی چھان پھٹک سے کام لیا ہے۔

خالص مقصدیت کے سلسلے میں ان کا نظریہ واضح ہے کہ "ادب میں مقصدیت کا قائل ہوں مگر مقصدیت کا راستہ کسی ازم کی قربان گاہ سے ہو کر نہیں گزرتا۔"

رہ گئی علامتوں کی بات تو وہ اس "فراڈ" میں پڑ کر .... ہونا پسند نہیں کرتے۔ "اپنی کہانی" کا "مانک ٹالہ" "پیاسی بیل" کے ہر افسانے میں جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ سیدھا سادا پرخلوص، گمبھیر اور انسانیت دوست۔ وہ اپنی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہنا چاہتا ہے اور کہہ ڈالتا ہے۔ "ست جگ کا انسان" کا خدا بخش، "پونم کا اشوک"، "شیطان بھی فرشتہ" بھی کا ہانڈسے ہر جگہ ان کی نیکی ایک الگ شخصیت کا روپ بھرے ظاہر ہوتی ہے۔ اور زندگی کی صحت مند قدروں کی طرف ہی لے جانا چاہتی ہے۔ بعض دوسرے افسانے بھی خاصے اچھے ہیں۔ مگر مانک ٹالہ کے متعلق ابھی سے کوئی رائے قائم کر لینا خود ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ انہیں اپنے فن میں ابھی اور ڈوبنا ہے۔ اور جذباتی سطح سے ہٹ کر خالص فکر کی بنیاد پر سوچنا اور لکھنا ہے۔ اچھائی یا برائی، کوئی دائمی قدر نہیں ہے۔ اصل میں انہیں ان حالات اور محرکات سے بحث کرنی ہے جس کی وجہ سے ایک انسان حیوان اور حیوان انسان کے درجہ تک پہونچتا ہے۔

کتابت اور طباعت بس گوارا ہے۔ سرورق افسانے کے مزاج پر اچھا اثر نہیں ڈالتا ہے۔

——— نعیم آروی

بادبان (انتخابی سلسلہ)

مدیر .... سبط نبی صمیم
ناشر: بادبان پبلیکیشنز، نشتر بازار، راولپنڈی
قیمت فی شمارہ .... ایک روپیہ

"بادبان" انتخابی سلسلے کے دو شمارے نکلے ہیں۔ پہلا، جو یوم پاکستان کے موقعہ پر شائع ہوا تھا۔ اور اسی مناسبت سے اس کے جتنے مضامین ہیں وہ آزادی سے متعلق ہیں جو اپنے اندر کافی اہم مواد رکھتے ہیں۔

مدیر نے کوشش کی ہے کہ بادبان میں نمائندہ افسانے اور غزلیں نظمیں وغیرہ پیش کرے۔ اور اس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں لیکن ابھی ان کو اپنے انتخاب میں اور سخت ہونا پڑے گا۔ بہت سے اچھے افسانے، غزلیں، نظمیں وغیرہ اس عرصہ میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کمی کو وہ آئندہ شماروں میں پوری کریں۔

بادبان کے دونوں شمارے اس بات کے غماز ہیں کہ مدیر ادب کے نصب العین سے واقف ہیں اور اس واقفیت کی بنا پر ان سے آئندہ بہتر سے بہتر کی امید کی جا سکتی ہے۔

——— صبیحہ آذر

فارقلیط

مصنف .... عبدالعزیز خالد
صفحات ۲۹۵
ناشر۔ ایوان پبلشرز نزد سیفی محمد فتح علی روڈ پاکستان چوک کراچی
قیمت .... آٹھ روپے

عبدالعزیز خالد اُن شاعروں میں ہیں جو فنِ سخن کو ایک طرح کی ریاضت تصور کرتے ہیں، ان کا تذکرہ نہ کسی مشاعرہ کے ضمن میں سنا جاتا ہے نہ وہ کسی ادبی محفل میں نظر آتے ہیں، وہ ایک شاعرِ گوشہ نشین ہیں۔ اور اس گوشے میں شعری مکاشفوں اور مجاہدوں سے گزرتے رہتے ہیں، وہ کئی سال سے فکرِ سخن کر رہے ہیں، اور انہوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ وہ بہت زود گو ہیں اور اتنے ہی پُرگو بھی۔ انہوں نے عربی اور فارسی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اور یونانی و عبرانی ادب کا بھی، اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ کبھی یونان کی قدیم شاعرہ سیفو کے نغمے سناتے ہیں، اور کبھی ہیکلے کے نوحے، انہوں نے گیتا انجلی بھی منظوم کر دی ہے اور سلومی بھی، اور عہد نامہ عتیق کا نغمہ سلیمان، غزل الغزلات بھی، وہ داستانوں، قصوں، ڈراموں اور واقعات کو بڑے اہتمام سے نظم کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں عربی و فارسی کی خوبصورت تشبیہیں اور تلمیحیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اور یونانی، عبرانی اور عربی کے وہ قدیم نام جو عام طور پر اردو دانوں کے لئے مانوس نہیں ہیں، فراوانی سے نظر آتے ہیں اور بڑے پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔

ابتک ان کے کئی ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور انہیں میں سے ایک تازہ مجموعہ فارقلیط کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ بائبل کی انجیل میں حضور اکرمؐ کے متعلق حضرت عیسٰیؑ کی پیشین گوئی "فارقلیط" کے نام سے درج ہے اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے بشارت دی تھی کہ "میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد ہوگا" فارقلیط کے معنی "احمد" کے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا اگر عربی ترجمہ کیا جائے تو "احمد مجتبٰی" ہوگا۔ یہ کتاب ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ اور سات ابواب میں تقسیم ہے۔ نظم شروع سے آخر تک غزل کے انداز سے قوافی و ردیف کی پابند ہے۔ عبدالعزیز خالد نے یہ نظم بڑے جذبے سے لکھی ہے، اردو فارسی، عربی اور ہندی کی ترکیبیں اور بندشیں امڈتی چلی آتی ہیں۔ اک سیلِ رواں ہے کہ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی، کہیں پوری پوری آیت اور کہیں فقرے اور جملے مصرعوں کی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کچھ مشکل پسند بھی ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے بھی ان کے مجموعے بوجھل معلوم ہونے ہیں کہ قدیم اسماء والقاب اور تشبیہات و تلمیحات کی ان کے ہاں بڑی فراوانی ہے۔ تاہم یہ مجموعہ زیادہ رواں ہے۔

عبدالعزیز خالد کی ان کوششوں سے اردو شاعری ایک طرزِ جدید سے آشنا ہو رہی ہے، اور ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔

—— حسن مثنّٰی ندوی

نگار، تذکروں کا تذکرہ نمبر

مرتب .... فرمان فتحپوری
صفحات ۳۶۲
قیمت .... چار روپے
ملنے کا پتہ ۔ ۲۴ نگار، بلدیہ میونسپل مارکیٹ، لارنس روڈ کراچی ۳

"نگار پاکستان" کا زیرِ نظر شمارہ تذکروں کا تذکرہ نمبر ہے، رسالہ نگار اردو کا وہ جریدہ ہے جس کا ہر نمبر اپنی جگہ ایک مستقل دستاویز ہے۔ اور یہ نمبر پیش کرتے ہوئے نگار نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھا ہے۔

اردو ادب میں آج تحقیق کے لئے بے حد مواد جمع ہو چکا ہے۔ اور ڈر ہے کہ اگر اس کی طرف توجہ نہ دی گئی تو بہت سے اہم حوالے تاریخ ادب کے ان ابواب میں گم ہو جائیں گے جو ان لکھے رہتے ہیں۔

اچھا ہوا کہ نگار نے تذکروں کی جانب رجوع کیا۔ اور یوں ایک اہم اور مفید مطلب دستاویز ادب کے طالب علموں تک پہنچا دی۔ ہمارے ہاں ادب کی باقاعدہ تاریخ مرتب کرنے کا سلسلہ ابتدائی دور میں نہ تھا لے دے کر چند تذکرے تھے۔ جو شعرا کے کلام ان کے مختصر حالات زندگی کے متعلق تھے۔ ان تذکروں میں کہیں بھی ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جو ایک ادبی تاریخ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی قدیم شعرا کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں وہ انہیں تذکروں کے وسیلے سے ــــ لہٰذا اس صورت میں ان کی اہمیت نہایت زیادہ ہے۔

"تذکروں کا تذکرہ نمبر" دیکھ کر اس کے مرتب کی محنت، کاوش اور جدوجہد کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جس کو پھیلانا نہایت آسان تھا۔ لیکن سمیٹنا مشکل، مرتب نے اس عظیم کام کو نہایت ہوشیاری اور دیانت اور ذمہ داری سے پورا کیا ہے۔ جس پر ان کو جتنی داد بھی دی جائے کم ہے۔ کاش دوسرے افراد کو بھی اسی قسم کے تحقیقی کاموں کی طرف راغب ہونے کی توفیق ہو۔

ــــــــ نسیم درانی

سب رنگ

مرتبین .... عرش صدیقی، مسعود اشعر

صفحات ۴۱۶

قیمت .... سات روپے

ناشر ۔۔ پاکستان رائٹرز گلڈ، سب ریجن ملتان، ملتان

ملتان گلڈ کے سب ریجن نے ملتان اور ملتان کے قرب و جوار کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر مشتمل ایک مجموعہ کتابی صورت میں "سب رنگ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب نما رسالہ میں ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں بھی شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً گلڈ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اجلاس میں پڑھی گئی تھیں۔

اس کتاب میں ۱۱ افسانے شامل ہیں۔ یوں تو افسانے اپنی جگہ اچھے اور عمدہ ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر اچھی اور بہتر تخلیقات میں فکری پہلو اور ماحول سے گہری مناسبت اور دلچسپی کا اظہار نہ ہو تب تک بہتر تخلیق کا وجود ناممکن ہے۔ مضامین، نظمیں اور غزلیں اپنی اپنی جگہ اپنے اظہار میں مکمل ہیں۔ اور اگر تسکین طلبی کی شکایت بھی کی جائے تو کیا کیا جائے۔ جبکہ زندگی اور زندگی سے متعلقہ ساری چیزیں ادھورے پن کے شکار میں مبتلا ہیں۔

بہر حال یہ مجموعہ ایک قابل قدر کوشش ہے اور اس کے مرتبین مبارکباد کے مستحق کیونکہ اس طرح پڑھنے والے کسی بھی علاقہ کی ادبی نمائندگی سے واقف ہو جاتے ہیں۔

ــــــــ نعیم آروی

کتاب علی عباس حسینی نمبر

مرتبین .... عابد سہیل، عبد الحلیم، انیس نعمت

صفحات ۱۴۴

قیمت .... ایک روپیہ پچیس پیسے

ملنے کا پتہ .... ماہنامہ کتاب، چوک۔ لکھنؤ ۳

یہ تو ایک روایت سی بن چکی تھی کہ ادھر بے چارہ کوئی ادیب یا مفلوک الحال شاعر زندگی کی بندشوں سے آزاد ہوا ادھر کسی رسالے کے ایڈیٹر نے جھٹ پٹ اپنے رسالے کا ایک "گھٹیا سا نمبر" ترتیب دے کر بازار کی زینت بنا دیا۔ گویا مدیر اسی بات کے انتظار میں بیٹھے تھے، "خدا کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"

مگر ادھر چند پر خلوص مدیروں کی بابرکت کوششوں سے یہ بیہودہ روایت کی بنیادیں اور مٹتی ہوئی نظر آ رہی ہیں اور دوسری طرف ادیب یا شاعر کو اس کی زندگی ہی میں اس کے برے یا بھلے اعمال نامے کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے "رسالہ کتاب" کے مدیر نے حسینی نمبر ترتیب دے کے ایک طرف تو روایت کی بوسیدہ عمارت پر ضرب کاری کی (کہ یہ عمارت اب نوشت ہی جائے تو اچھا ہے) اور دوسری طرف علی عباس حسینی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں بھرپور طریقے سے خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ نسبتاً نیک اور مقصدی کوشش ہے جس کے لئے مدیر موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ــــــــ نعیم آروی

نقش کراچی

ادبی ڈائجسٹ

نقش، ہر ماہ معیاری رسائل سے انتخاب پیش کرتا ہے۔

نقش، کو پاک و ہند کے عظیم فنکاروں کا تعاون حاصل ہے۔

ادارہ

شاہد احمد دہلوی، شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اردو پبلشرز کراچی

فون ۔ ۵۰۱۵۶



فرعون مصر آمن ہوتپ سوئم (۱۴۱۱ - ۱۳۷۵ ق م) اور اس کی ملکہ۔
ایک قدیم تصویر کا عکس

عصمت چغتائی

ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے، جن کا فن ایک زندہ اور ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے جس میں نیلگوں آسمان کی وسعت اور سمندر کی گہرائی اور حیات کی کشمکش کا بھرپور احساس ہے۔

بہت پہلے کی بات ہے

جب دلی سے ماہنامہ "ساقی" نے "عظیم بیگ چغتائی نمبر" اور ماہنامہ "جوہر" نے "عبدالحق نمبر" کی صورت میں ان عظیم مصنفوں کی زندگی ہی میں ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ادب میں ایک زندہ روایت کی داغ بیل ڈالی تھی

اور اب ادارہ

سیپ

اس زندہ روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے

عصمت چغتائی نمبر

کی صورت میں

پاک و ہند کی عظیم اور منفرد افسانہ نگار

کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے

اُردو کے مایۂ ناز شاعر عبدالعزیز خالد کی

تخلیقات

سرودِ رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپئے
غزل الغزلات	عہد نامہ عتیق کا نغمۂ سلیمان	ایک روپیہ پچھتر پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے	تین روپئے
برگِ خزاں	" "	چار روپئے
ورقِ ناخواندہ	" "	تین روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن معہ اضافہ ترگوم	تین روپیہ پچاس پیسے
گل نغمہ	ٹیگور کی گیتا نجلی اُردو شعر میں	چار روپئے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں	دو روپئے
کلکِ موج	افکارِ تازہ غزلیں نظمیں	سات روپئے پچاس پیسے
ماتمِ یک شہرِ آرزو	رلکے کے ڈیونو نوحے (نیا ایڈیشن)	زیرِ طبع
زرد ابغِ دل	طویل نظمیں (نیا ایڈیشن)	"
کفِ دریا	نظمیں غزلیں	"
فارقلیط	نام ختم رسل انجیل میں ہے فارقلیط	آٹھ روپئے
	ذکر و فکر رسول	
	آدمی ادبی انعام یافتہ	

مشتاق بک ڈپو، شملہ روڈ، کراچی ۱

دستک تو دے رہے ہو مگر یہ تو سوچ لو
اجڑے ہوئے مکان میں کوئی بھی ہے یا نہیں

نئی نسل کے نمائندہ فنکار

افضل منہاس

کی آفاق گیر غزلوں کا پہلا مجموعہ

دستک

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتابت و طباعت سے آراستہ ہو کر
فروری ۱۹۶۵ء میں منصۂ شہود پر آ رہا ہے!

قیمت تین روپے

حسین نظموں، دوہوں، غزلوں اور قطعات کو جلو میں لئے

دوسرا مجموعہ

ارتعاش

(زیر طبع)

بادبان پبلیکیشنز، ۲۱/۲۸ نشتر بازار۔ راولپنڈی

(شہاب الدین خاں پرنٹر پبلشر نے ملک سنگر پریس کے لئے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی سیپ ناظم آباد کراچی سے شائع کیا)